نومبر 2015

دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

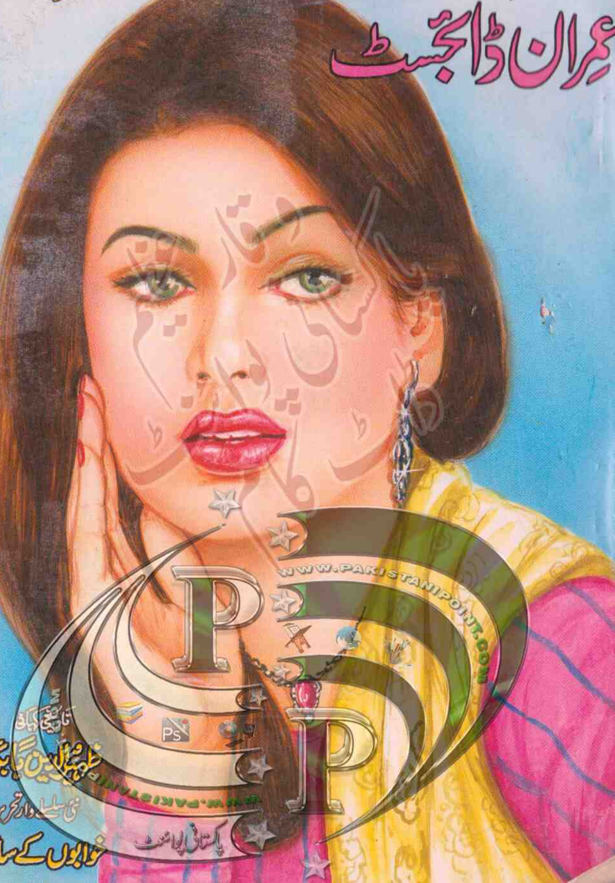

تاریخی کہانی

ظہیرالدین بابر

نئی سلسلے وار تحریر

خوابوں کے ساحل

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ

ظہیر الدین بابر
8
اسلم راہی
تاریخ گواہ ہے مسلمان حکمرانوں کے دور میں زیادہ سازشیں ہوئی ہیں اُس کا اہم سبب جہاں اختیارات، اقتدار اور دولت رہی ہے وہیں عورت بھی ہے۔

خوابوں کے ساحل
48
سیدہ عطیہ زاہرہ
ایک نوجوان کی زمین سے محبت کی کہانی

کلائمکس
89
ایم الیاس
اس شمارے کی ایک حساس و دل گداز سچی کہانی

چراغ جلتا رہا
128
انور عظیم
روس سے برآمد ایک بہار فوجی کی روداد جو متعدد دن موت سے لڑتا رہا

بھیڑیا
33
احمد صغیر صدیقی
انگریزی سے ماخوذ ایک حیرت ناک کہانی

انوکھا داؤ
73
روشن آرا
ایک ایسی ہی ماں کے بلند حوصلے کی روداد

چمگادڑ
104
ایم اے راحت
زندگی کے نشیب و فراز اور عروج و زوال کی ایک انوکھی داستان جو لمحہ بہ لمحہ آپ کو تجسس کے سحر میں جکڑ لے گی۔

سیاہ رات
151
شہناز بانو
معاشرے کے ناسور کی عکاسی کرتی ہوئی ایک سچی کہانی

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

بانی: محمود ریاض
مدیرِ اعلیٰ: عامر محمود
منتظم: محمد شفیع

سزا
160
فرحان رضوی
ایک ایسے مریض کا احوال جو علم نفسیات کو نہیں مانتا تھا

غریب شہر
178
نوازش شاہین
اس شمارے کی ایک حساس و دل گداز سچی کہانی

بے بسی
211
نادیہ ملک
ایک مایوس کن جوڑے کی کہانی

کرب
170
عاطر شاہین
اس شمارے کی حساس و جذباتی و دل گداز کہانی

قسمت
198
احمد حسن عرضی
اس شمارے کی ایک حساس تحریر

شب رفتہ
219
راشد سجان
ایک ایسے شخص کی داستان جس کا اعتبار کھو گیا تھا

اندھے راستے
234
جاوید راہی
ایک اندھے رستوں کے مسافر کی داستان

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37-اردو بازار، کراچی
نومبر 2015ء ❁ قیمت 40 روپے ❁ جلد 45 ❁ شمارہ 7

تاریخی کہانیوں کے شائقین کے لیے بطور خاص

نویں قسط

ظہیر الدین بابر

اسلم راہی

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں سب سے زیادہ سازشیں ہوئی ہیں' اس کا اہم سبب جہاں اختیارات' اقتدار اور دولت رہی ہے' وہیں عورت بھی ہے جو اس معاملے میں اہم حیثیت کی حامل ہے۔ اچھے برے ہر قوم' ہر مذہب اور ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ اسلامی مملکتوں کے استحکام کے لیے مذہب پر کاربند سپہ سالاروں اور جنگ جو سپاہیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ زیر نظر طویل تاریخی کہانی میں اپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا' وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنی مملکت کو مضبوط کرنے کے لیے کن کن امور پر توجہ دی اور اسے کمزور کرنے کے لیے سازشی عناصر نے کیا کیا جتن کیے ......شیطان صفت لوگوں نے کس کس انداز سے مسلمانوں کو کمزور کیا اور اس کے دور رس نتائج کیا برآمد ہوئے ......یہ تاریخی حقائق ہیں' جنہیں آپ کے لیے زیب داستان کیا ہے معروف قلم کار اسلم راہی نے ......

مسلمان حکمرانوں کا احوال، تاریخی حقائق، طویل داستان

دو محافظوں کے ساتھ ایک روز گوہر خانم دہلی میں اپنے باپ کی حویلی کے سامنے آئی حویلی کا صدر دروازہ دیکھتے ہی وہ حیران اور پریشان ہو گئی تھی اس لیے کہ بیرونی دروازے کو باہر سے قفل لگا ہوا تھا۔

گوہر خانم کچھ دیر تک بڑے غور سے قفل لگے دروازے کی طرف دیکھتی رہی اس موقع پر وہ اداس اور افسردہ سی ہو گئی تھی تاہم اس نے اپنے سر کو جھٹکا آگے بڑھی پھر اس نے اپنے ساتھ آنے والے دونوں محافظوں کے ساتھ برہان الدین کی حویلی کے دروازے پر دستک دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا دروازہ کھولنے والا برہان الدین تھا اتنی دیر تک برہان الدین کی بیوی سلطانہ بیگم اور بیٹا قاسم بیگ بھی صدر دروازے کے قریب آگئے تھے انہوں نے جب صدر دروازے پر گوہر خانم کو دیکھا تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی سلطانہ بیگم نے آگے بڑھ کر گوہر خانم کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا اور اسے حویلی کے اندرونی حصے کی طرف لے گئی تھی اس موقع پر اس کے ساتھ آنے والے دونوں محافظوں کو برہان الدین نے مخاطب کیا۔

”میرے عزیزو! تم بھی اندر آؤ ہمیں تواضع اور خدمت کا موقع دو۔“

اس پر ان میں سے ایک بولا اور کہنے لگا۔

”میرے محترم ہمارے لیے محترم آغا ہمایوں کا حکم ہے کہ خانم کو یہاں چھوڑنے کے بعد ہم نے فی الفور واپس جانا ہے آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ ہمیں تواضع کی پیشکش کر رہے ہیں یہ خانم کا سامان ہے اسے آپ اندر سے لے جائیں اور ہم جاتے ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی وہ دونوں وہاں سے چلے گئے تھے جبکہ برہان الدین اور قاسم بیگ دونوں گوہر خانم کا سامان حویلی کے اندر لے گئے تھے۔

سامان ایک طرف رکھنے کے بعد سب دیوان خانے میں بیٹھ گئے کچھ دیر خاموشی رہی پھر برہان الدین نے گوہر خانم کو مخاطب کیا۔

”میری بچی تو پریشان ہوئی ہو گی کہ تیرے باپ کو حویلی کے دروازے پر قفل لگا ہوا ہے۔ میری بچی تمہارا باپ اور بھائی دونوں ہی تم سے ملاقات کرنے کے لیے آگرہ گئے ہوئے ہیں۔“

برہان الدین کے ان الفاظ کے جواب میں گوہر کو کسی قدر اطمینان ہوا پھر وہ بولی اور کہنے لگی۔

”نہیں یہاں سے گئے ہوئے کتنے دن ہوئے ہوں گے۔“ برہان الدین نے کچھ سوچا پھر کہنے لگا۔

”نہیں یہاں سے گئے ہوئے کئی دن ہو گئے ہیں بیٹی بس وہ دونوں تم سے ہی ملنے گئے تھے میرے خیال میں تمہاری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

اس پر گوہر خانم بولی اور کہنے لگی۔

”بابا میرے خیال میں جس وقت وہ آگرہ میں پہنچے ہوں گے۔ اس وقت میں جہانگیر قلی بیگ کے ساتھ گنگا جمنا دو آبہ کی طرف ایک مہم کے سلسلے میں گئی ہوئی تھی۔ اب میں وہیں سے لوٹ آئی ہوں لشکر بھی ادھر آیا ہے شاید میں چند دن یہاں قیام کروں اس کے بعد لشکر کا ایک حصہ لشکر میں شامل عورتوں کو لے کر آگرہ کا رخ کرے گا۔“

اس موقع پر سلطانہ بیگم اپنی جگہ سے اٹھی اور گوہر خانم کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”بیٹی تو بیٹھ میں تیرے لیے مشروب بنا کر لاتی ہوں۔“

گوہر خانم نے فوراً ہاتھ پکڑ کر سلطانہ بیگم کو اپنے پاس بٹھا لیا پھر کہنے لگی۔

”بیٹی اگر یہ بات ہے تو جہانگیر قلی بیگ جس لشکر کے ساتھ گنگا جمنا کے دو آبہ کی طرف گیا تھا وہاں دشمن کے ساتھ جب جنگ ہوئی وہ تفصیل ہی تم ہم سے کہہ دو۔“

جواب میں مسکراتے ہوئے گوہر خانم نے گلا صاف کیا اور اس کے بعد انہیں گنگا جمنا کے دو آبہ میں لڑی جانے والی جنگوں سے متعلق تفصیل سے بتا رہی تھی۔

بیانہ کے حاکم نظام خان کے آگرہ کی طرف چلے جانے کے بعد جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ نے

بیانہ میں قیام کر لیا تھا ساتھ ہی منگٹ رائے کی قوت کا اندازہ لگانے کے لیے انہوں نے اپنے مخبروں کو بھی روانہ کر دیا تھا۔

چند روز تک دونوں نے بیانہ ہی میں قیام کیے رکھا یہاں تک کہ جو مخبر انہوں نے منگٹ رائے کے لشکر کا اندازہ لگانے کے لیے روانہ کیے تھے وہ لوٹ کے آئے۔ اس وقت جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ دونوں مغرب کی نماز کے بعد ایک ہی خیمے میں بیٹھے ہوئے باہم گفتگو کر رہے تھے کہ دو مخبروں کے آنے کی انہیں جب اطلاع دی گئی تو جہانگیر قلی بیگ نے فوراً دونوں مخبروں کو خیمے میں طلب کر لیا۔

دونوں مخبر جب خیمے میں داخل ہوئے تو بڑے خوش کن انداز میں جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ نے ان کا استقبال کیا اور اپنے سامنے بیٹھنے کے لیے کہا جب وہ دونوں بیٹھ گئے تب ایک گہری نگاہ جہانگیر قلی بیگ نے ان پر ڈالی پھر انہیں مخاطب کیا۔

”میرے عزیز ساتھیو! اب بتاؤ منگٹ رائے کے سلسلے میں تم کیا خبریں لے کر آئے ہو۔“

جہانگیر قلی بیگ کے ان الفاظ پر ان دونوں مخبروں نے پہلے ایک دوسرے کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھا آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی فیصلہ ہوا اس کے بعد ان میں سے ایک جہانگیر بیگ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”امیر راستے میں میں نے اور میرے ساتھی نے بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی تھی اور اس گفتگو کو سامنے رکھتے ہوئے ہم دونوں آپ کو یہ مشورہ دیں گے کہ منگٹ رائے کا مقابلہ کرنے سے پہلے امیر آپ تیز رفتار قاصد امیر جنید برلاس کی طرف بھجوائیں اور انہیں بھی اپنے لشکر کے ساتھ یہاں بلا لیں۔ دونوں مل کر منگٹ رائے کا مقابلہ کریں اس لیے کہ منگٹ رائے کے پاس ایک بہت بڑا لشکر ہے اور آپ اپنے چھوٹے سے لشکر کے ساتھ منگٹ رائے سے نہ ٹکرائیں۔“

اس موقع پر ہلکا سا تبسم جہانگیر قلی بیگ کے چہرے پر نمودار ہوا تھا باری باری ایک گہری نگاہ اس نے اپنے ساتھ آنے والے ان دونوں مخبروں پر ڈالی پھر اسی طرح پر سکون اور ہلکی ہلکی مسکراہٹ میں وہ کہنے لگا۔

”تمہیں پریشان اور فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے منگٹ رائے سے کیسے نبٹنا ہے یہ تو میں اور نورنگ بیگ بعد میں فیصلہ کریں گے پہلے تم لوگ میرے چند سوالوں کے جواب دو۔“

اس موقع پر جہانگیر قلی بیگ چند ثانیے خاموش رہ کر سوچتا رہا پھر مخبروں کی طرف دیکھا اور انہیں مخاطب کیا۔

”پہلے یہ بتاؤ کہ منگٹ رائے اس وقت اپنے لشکر کے ساتھ گوالیار سے کتنے فاصلے پر ہے۔“

وہی مخبر بولا اور کہنے لگا۔

”امیر ہمارے اندازے کے مطابق منگٹ رائے اس وقت گوالیار سے دس یا پندرہ میل کے فاصلے پر ہو گا اور وہاں اس نے اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کر لیا ہے اور پڑاؤ کرنے کی وجہ بھی ہے۔“

غور سے اسی مخبر کی طرف دیکھتے ہوئے جہانگیر کہنے لگا۔

”وجہ تو میں بعد میں پوچھوں گا کہ اس نے وہاں پڑاؤ کیوں کر رکھا ہے پہلے یہ بتاؤ کہ تعداد کے لحاظ سے اس کا لشکر کس قدر ہو گا۔“

مخبر نے کچھ سوچا اندازہ لگایا پھر بولا۔

”امیر اگر آپ اور امیر جنید برلاس دونوں کے لشکر کو یکجا کر دیا جائے تب بھی منگٹ رائے کے پاس جو لشکر ہے وہ آپ دونوں کے لشکر سے کم از کم دو گنا ضرور ہو گا۔“

اس موقع پر جہانگیر قلی بیگ نے سر کو جھٹکا دیا پہلے کی نسبت زیادہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی پھر کہنے لگا۔

”اگر یہ بات ہے تو فکر کی ضرورت ہی نہیں جنید برلاس کو یہاں بلانے کی ضرورت ہی نہیں ہے منگٹ رائے سے ہم یوں نبٹیں گے کہ اس کی پشتیں یاد رکھیں گی۔“

ذرا خاموش رہ کر جہانگیر قلی بیگ نے پھر سوچا دوبارہ مخبر کو مخاطب کیا۔

"اب یہ بتاؤ منگٹ رائے نے اپنے لشکر کے ساتھ کسی وجہ سے گوالیار سے دس سے پندرہ میل کے فاصلے پر پڑاؤ کر رکھا ہے کیا اسے کسی کی طرف سے مدد کی امید ہے یا کسی سے اس نے مدد طلب کر رکھی ہے یا کہیں سے اسے رسد اور کمک کا سامان ملنے والا ہے۔"

وہی مخبر جہانگیر قلی بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"امیر اس کے پاس رسد کا سامان ڈھیروں کی صورت میں ہے بلکہ ان گنت بار برداری کے جانور ہیں جو رسد کا سامان اٹھانے کے لیے رکھے گئے ہیں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ ہیں جنہیں وہ لشکریوں کی خوراک کے لیے استعمال کر رہا ہے وہ بڑی تیاری کے بعد گوالیار کا رخ کیے ہوئے ہے وہ رکا ہوا اس لیے ہے کہ اس نے اپنے کچھ امراء کو سفیر بنا کر رانا سانگا کی طرف بھجوا رکھا ہے۔

یہاں تک کہنے کے بعد اس مخبر نے دم لیا سوچا دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"امیر آپ جانتے ہیں ماضی میں پانی پت کے میدانوں میں مرنے والے راجہ بکرماجیت اور رانا سانگا ماضی میں ظہیر الدین بابر کو کئی بار کابل میں پیغام بھیج چکا تھا کہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا اگر وہ ایسا کرتا ہے اور اس سلسلے میں اگر بابر کو اس کی ضرورت پیش آئے تو وہ ضرور مدد کرے گا۔ جبکہ بکرماجیت کا یہ عالم تھا کہ اس کے تعلقات ابراہیم لودھی کے ساتھ بڑے گہرے تھے اور رانا سانگا کو وہ اپنا بدترین دشمن خیال کرتا تھا۔ رانا سانگا بھی اس سے ناخوش تھا جبکہ ابراہیم لودھی کے ساتھ بکرماجیت کے بڑے پرانے تعلقات اور مراسم تھے اسی وجہ سے رانا سانگا گوالیار کے راجہ بکرماجیت سے نہیں ٹکراتا تھا۔ حالانکہ رانا سانگا اپنی مملکت کو وسعت دینے کے لیے بڑا حریص ہے اگر ابراہیم لودھی کا ڈر اور خطرہ نہ ہوتا تو وہ گوالیار کی سلطنت پر قبضہ کر چکا ہوتا۔

رانا سانگا چاہتا یہی تھا کہ ظہیر الدین بابر کابل سے نکل کر ابراہیم لودھی سے ٹکرائے اس کا خیال تھا کہ جس طرح کسی دور میں تیمور لنگ ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور لوٹ مار کر کے واپس چلا گیا اسی طرح بابر بھی واپس چلا جائے گا اور ابراہیم لودھی کے خاتمے کے بعد پورے ہندوستان کا راجہ بننے کے لیے رانا سانگا کے لیے ساری راہیں صاف ہو جائیں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

منگٹ رائے بڑا سیانہ بڑا عقل مند شخص ہے وہ جانتا ہے کہ ماضی میں بکرماجیت اور رانا سانگا کے تعلقات کشیدہ تھے اور وہ مستقبل میں ایسا نہیں چاہتا وہ دراصل رانا سانگا کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کر کے ایک خود مختار حکمران کی حیثیت سے گوالیار پر حکومت کرنا چاہتا ہے اسی بناء پر اس نے اپنے امراء کا ایک وفد رانا سانگا کی طرف بھجوایا ہے۔

رانا سانگا کو منگٹ رائے نے یہ پیغام دیا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی اس کے عزیز اور رشتہ دار بکرماجیت کے تعلقات اس کے ساتھ اچھے نہیں تھے لیکن مستقبل میں ایسے نہیں ہوں گے۔ منگٹ رائے نے رانا سانگا کو یہ بھی پیغام بھیجا ہے کہ وہ اس کے ساتھ تعلقات میں کشیدگی نہیں بلکہ وہ اس کا ان سر زمینوں میں حلیف بن کر رہنا چاہتا ہے۔

اس نے رانا سانگا کو پیغام بھجوایا ہے کہ اگر رانا سانگا اس سے تعاون کرے تو وہ اس کے ساتھ تعاون کرے گا منگٹ رائے چاہتا ہے کہ جب وہ گوالیار پر قبضہ کرے اور وہاں اپنی حکومت قائم کرے تو رانا سانگا اس سلسلے میں اس سے تعاون کرے اور اس کی مملکت پر لالچ اور حرص کی نگاہ نہ ڈالے۔ اگر وہ ایسا کرے تو پھر ہندوستان میں رانا سانگا کو منگٹ رائے کا تعاون حاصل ہوگا اور رانا ایسا نہ کرے تو پھر منگٹ رائے اور رانا سانگا کے درمیان ایسی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو جائی گا کہ نہ منگٹ رائے گوالیار پر حکومت کر سکے گا نہ ہی رانا سانگا ایک طرح سے پورے ہندوستان پر راج

کر سکے گا۔"

یہاں تک کہنے کے بعد وہ مخبر رکا پھر گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"امیر منگٹ رائے نے جو اپنے امرا کو سفیر بنا کر رانا سانگا کی طرف بھجوایا ہے جب وہ لوٹ کر منگٹ رائے کے پاس آئیں گے تو پھر منگٹ رائے اپنے لشکر کے ساتھ پیش قدمی کرے گا اور گوالیار پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرے گا۔"

یہاں تک کہنے کے بعد وہ مخبر جب خاموش ہوا تب ان دونوں کا شانہ باری باری تھپتھپاتے ہوئے جہانگیر قلی بیگ کہنے لگا۔

"میں تم دونوں کی کارگزاری سے بڑا خوش اور مطمئن ہوں۔ اب تم ایسا کرو جا کے آرام کرو، جب ہم نے تمہاری راہنمائی میں منگٹ رائے کی طرف جانا ہوگا تو تمہیں اطلاع کریں گے لیکن ذہنی طور پر تیار رہنا دو دن کے اندر اندر شاید میں منگٹ رائے کی طرف کوچ کروں، میرے عزیز ساتھیو ہمارے لشکر کی تعداد بے شک کم ہی سہی لیکن اس کم تعداد کے لشکر سے بھی خداوند قدوس نے چاہا تو ہم منگٹ رائے کی طاقت کی چولیں ہلا کر رکھ دیں گے۔"

جہانگیر قلی بیگ کے اس جواب سے وہ دونوں مخبر بھی ایک طرح سے مطمئن ہو گئے تھے پھر وہ جہانگیر قلی بیگ کے خیمے سے نکل گئے تھے۔

دونوں مخبروں کے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر جہانگیر قلی بیگ نے اپنے ساتھی سالار نورنگ بیگ کو مخاطب کیا۔

"نورنگ بیگ میرے بھائی کیا خیال ہے۔"

نورنگ بیگ مسکرایا ایک گہری نگاہ اس موقع پر اس نے جہانگیر قلی بیگ پر ڈالی اس کے بعد کہنے لگا۔

"جہانگیر قلی میرے عزیز بھائی جو خیال اس وقت تمہارے ذہن میں ہے وہی خیال نورنگ بیگ کا ہے۔ کیا اس سے پہلے کتنی لڑائیاں دشمنوں کے ساتھ لڑیں ان میں میں نے کبھی آپ کی منصوبہ بندی سے اختلاف رائے ظاہر کیا جن میں میں تمہارے ساتھ کام کرتا رہا ہوں۔ میرے بھائی مجھے تمہارے ساتھ کام کرتے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا ہے میں تمہارے مزاج تمہاری سرشت اور تمہاری طبیعت کو اب خوب جان اور پہچان چکا ہوں۔"

نورنگ بیگ کے اس جواب پر جہانگیر قلی بیگ کھل کر مسکرا دیا پھر کہنے لگا۔ "اچھا اگر یہ بات ہے تو بتاؤ اس وقت میں کیا سوچ رہا ہوں۔" نورنگ بیگ مسکرایا کہنے لگا۔

"جہاں تک میرا اندازہ ہے میرے عزیز بھائی تم شاید یہ ارادہ کر رہے ہو کہ جنید برلاس کو اپنی مدد کے لیے نہ بلایا جائے بلکہ منگٹ رائے کے ساتھ شب خون کا کھیل شروع کیا جائے اور اسی کھیل میں اسے چاروں شانے چت کر کے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا جائے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد نورنگ بیگ جب خاموش ہوا تب ہلکی ہلکی مسکراہٹ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے جہانگیر قلی بیگ بول اٹھا۔

"میرے عزیز بھائی تیرا اندازہ درست ہے اور اب منگٹ رائے کے ساتھ رات کی تاریکی میں بلی چوہے کا کھیل ایسا شروع ہوگا کہ منگٹ رائے جو ان علاقوں کی طرف آیا ہے تو وہ اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی خیال کرے گا۔"

یہاں تک کہنے کے بعد جہانگیر قلی بیگ رکا کچھ سوچا اس کے بعد دوبارہ بولا اور کہنے لگا۔

"نورنگ بیگ لشکریوں کو صرف دو دن مزید ستانے اور آرام کرنے کا موقع دیتے ہیں اس لیے کہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ منگٹ رائے اپنے لشکر کے ساتھ گوالیار کے پاس آکر پڑاؤ کرے۔ میں چاہتا ہوں گوالیار سے دور ہی اسے واپس بھاگ جانے پر مجبور کر دیا جائے اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اپنے جن امراء کو سفیر بنا کر اس نے رانا سانگا کی طرف روانہ کیا ہے ان کی آمد سے پہلے پہلے ہمیں منگٹ رائے سے نبٹ لینا چاہیے۔"

نورنگ بیگ نے جب اس سے اتفاق کیا تب

تھوڑی دیر خاموش رہ کر جہانگیر قلی بیگ پھر بولا۔

"نورنگ بیگ میرے عزیز بھائی اگر یہ بات ہی تو جو کچھ میں کہنے لگا ہوں غور سے سنو۔"

ہمارے دو مخبر واپس آ چکے ہیں اور انہوں نے منگٹ رائے سے متعلق ہمیں تفصیل بھی بتادی ہے وہ جانتے ہیں کہ منگٹ رائے نے ان دنوں اپنے لشکر کے ساتھ کہاں پڑاؤ کیا ہے ہمارے دونوں مخبر اس کی طرف ہماری راہنمائی کریں گے میرے عزیز بھائی منگٹ رائے پر ایسے انداز میں شب خون مارا جائے گا کہ اس کا زیادہ سے زیادہ نقصان ہو اور موت ہمارے پاس سے پہلو بچا کر گزر جائے۔

منگٹ رائے یقیناً" یہ سوچ رہا ہو گا کہ ظہیرالدین بابر کا لشکر تقسیم ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس کے مقابلے میں وہ تاخیر سے آئیں گے کوئی بھی چھوٹا موٹا لشکر اس سے ٹکرانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ گویا منگٹ رائے کا یہ ارادہ ہو گا کہ ظہیرالدین بابر نے جن لشکریوں کو گنگا جمنا کے دو آبہ کی طرف بھیجا ہے جب تک وہ لشکر آپس میں مل نہیں جاتے متحد نہیں ہو جاتے اس وقت تک اس کے خلاف کوئی حرکت میں نہیں آئے گا اگر اس کا یہ ارادہ ہے تو پھر دو دن بعد اسے یقیناً" اپنے اس ارادے پر پچھتانا پڑے گا اور جدھر سے آیا ہے ادھر ہی بھاگنا پڑے گا۔"

جہانگیر قلی بیگ رکا اس کے بعد دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"نورنگ بیگ دو دن بعد ہم اپنے مخبروں کی راہنمائی میں حرکت میں آئیں گے۔ ان علاقوں میں ایسے انداز اور ایسی رفتار میں سفر کریں گے کہ منگٹ رائے کے لشکر کے پاس ہم اس وقت نمودار ہوں جس وقت مشرق سے سورج کے رونما ہونے کی سفیدی کی پہلی جھلکیاں تانک جھانک کرنے لگی ہوں فضاؤں کے اندر تھوڑی تاریکی ہو تھوڑی روشنی ہو اور اسی اندھیرے روشنی کے ملاپ میں ہم منگٹ رائے کے لشکر کو کھنگال کر رکھ دیں گے۔"

یہاں تک کہتے کہتے جہانگیر قلی بیگ رک گیا اس لیے کہ اسی لمحہ اس کے خیمے میں بزرگ جرنیل مہدی خواجہ داخل ہوا تھا۔

مہدی خواجہ کو وہاں دیکھ کر جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ دونوں حیرت زدہ سے رہ گئے تھے۔ مہدی خواجہ آگے بڑھ کر دونوں سے بغلگیر ہوا پھر تینوں بیٹھ گئے آخر جہانگیر قلی نے میری خواجہ کو مخاطب کیا۔

خیریت تو ہے آپ کس سلسلے میں آئے جواب میں مہدی خواجہ مسکرایا کہنے لگا۔

"جہانگیر قلی بیگ میں ہمایوں کے ساتھ ابھی راستے ہی میں تھا کہ ظہیرالدین بابر کے قاصد لشکر میں داخل ہوئے۔ ظہیرالدین نے میرے لیے یہ حکم جاری کیا کہ میں بیانہ جاؤں اور وہاں کا نظم و نسق سنبھال لوں۔"

مہدی خواجہ کے خاموش ہونے پر جہانگیر قلی بیگ بول اٹھا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے اس طرح بیانہ میں قیام کے دوران آپ ایک لشکر بھی ترتیب دے لیں گے اور بڑے احسن طریقے سے بیانہ کی حفاظت بھی کر لیں گے میں اور نورنگ بیگ منگٹ رائے سے ٹکرانے سے متعلق گفتگو کر رہے تھے ہم اس پر شب خون مارنے کا سلسلہ شروع کرنے والے ہیں آپ کی آمد کے بعد کم از کم ہم بیانہ کی طرف سے مطمئن ہو جائیں گے۔"

جہانگیر قلی بیگ جب خاموش ہوا تب ہلکی ہلکی مسکراہٹ میں مہندی خواجہ بولا اور کہنے لگا۔

"جہانگیر قلی بیگ میرے بیٹے ظہیرالدین بابر نے تمہارے اور نورنگ بیگ کے لیے بھی ایک پیغام بھیجا ہے، یہ تو آغا کو پتا ہے کہ بیانہ کے حاکم نظام خان سے نبٹنے کے بعد تم نے گوالیار کا رخ کرنا ہے۔ بابر کو یہ بھی خبریں پہنچ چکی ہیں کہ منگٹ رائے ایک بہت بڑا لشکر لے کر گوالیار کا رخ کر چکا ہے لہٰذا بابر چاہتا ہے کہ جب تک جنید برلاس سنبل کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد تمہارے پاس نہیں پہنچ جاتا اس وقت تک منگٹ رائے سے نہ ٹکرایا جائے۔"

مہندی خواجہ کے خاموش ہونے پر جہانگیر قلی بیگ

بول اٹھا۔

"محترم مہدی خواجہ! یہ منگٹ رائے اس وقت بقول ہمارے مخبر کے گوالیار سے دس سے پندرہ میل کے فاصلے پر اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کیے ہوئے ہے اور اس نے اپنے قاصد جو اس کے امراء ہیں انہیں رانا سانگا کی طرف بھجوایا ہے دراصل وہ رانا سانگا کے ساتھ سازباز کرنا چاہتا ہے۔

ماضی میں کیونکہ گوالیار کے راجہ بکرماجیت کے تعلقات رانا سانگا کے ساتھ اچھے نہیں تھے لہٰذا۔ منگٹ رائے اس روش کو ترک کر کے رانا سانگا کے ساتھ اچھے تعلقات پیدا کرتے ہوئے گوالیار کا حکمران بننا اور چاہتا ہے۔

اگر ہم منگٹ رائے پر حملہ آور ہونے میں تاخیر سے کام لیتے ہیں تو مجھے خدشہ ہے کہ کہیں اس مہم کے لیے رانا سانگا یقیناً" اس کی مدد کے لیے ایک لشکر اس کے حوالے نہ کر دے میں چاہتا ہوں منگٹ رائے وہ قاصد جو رانا سانگا کی طرف گئے ہیں ان کی آمد سے پہلے پہلے میں اور نورنگ بیگ دونوں منگٹ رائے سے نبٹ لیں مجھے امید ہے کہ ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

جہانگیر قلی بیگ جب خاموش ہوا تب غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مہدی خواجہ کہنے لگا۔

"بیٹے میں جانتا ہوں جو منصوبہ بندی تم ترتیب دو گے اس پر عمل کرو گے اور اس کے نتائج بھی تمہارے حق میں بہتر ہوں گے۔ اگر تم ایسا کرنا چاہتے ہو تو بچے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم کہو تو میں تمہارے ساتھ لشکر میں شامل ہوں گا پھر دیکھتے ہیں کہ بنتا ہے۔"

اس پر مسکراتے ہوئے جہانگیر قلی بیگ کہنے لگا۔

"آپ بیانہ میں رہ کر صرف بیانہ کی حفاظت کریں منگٹ رائے سے میں اور نورنگ بیگ ایسا نبٹیں گے کہ بہت جلد آپ کو اچھے خبریں سننے کو ملیں گی پہلے یہ بتائیے کہ اپنے ساتھ کچھ دستے بھی لے کر آئے ہیں۔"

جہانگیر قلی بیگ کے اس سوال پر مہدی خواجہ پھر بول اٹھا۔

"میں اپنے ساتھ کچھ دستے لے کر آیا ہوں اور انہی کے ساتھ میں بیانہ میں جو پہلے سے لشکر ہے اس کی تنظیم درست کروں گا اور بیانہ کا دفاع مضبوط کروں گا۔" مہدی خواجہ جب خاموش ہوا تب اسے مخاطب کرتے ہوئے جہانگیر قلی بیگ کہنے لگا۔

"محترمہ مہدی خواجہ اب جبکہ آپ آ گئے ہیں تو میں اور نورنگ بیگ بیانہ کی طرف سے بالکل مطمئن ہو جائیں گے کیونکہ رانا سانگا کے ایک لشکر کو جو بیانہ کی طرف بڑھ رہا تھا ہم نے اسے بدترین شکست دی ہے۔ لہٰذا مجھے اور نورنگ بیگ کو یہ خطرہ تھا کہ رانا سانگا اپنے لشکر کی اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے اپنے کسی اور لشکر کو بیانہ کی طرف بھیج دے گا لہٰذا پہلے ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ دو دن یہاں قیام کریں گے لیکن اب معاملہ تبدیل ہو گیا ہے۔

اب بیانہ کے حاکم کی حیثیت سے آپ آ گئے ہیں تو میں سمجھتا ہوں آپ بیانہ کے دفاع کو مضبوط کریں گے اس موقع پر میری آپ سے ایک گزارش ہے کہ اگر بیانہ کے حالات خراب ہوں ہماری غیر موجودگی میں رانا سانگا یا کوئی اور قوت انتقامی کاروائی کرے تو آپ شہر سے باہر نکل کر مقابلہ نہ کیجئے گا شہر کے اندر محصور رہیں تیز رفتار قاصد ہماری طرف بھجوائیں ہم آپ کی مدد کو ضرور پہنچیں گے۔ اس لیے کہ بیانہ میں آپ کے پاس تھوڑا سا لشکر ہو گا لہٰذا کھلے میدانوں میں دشمن سے مقابلہ کرنا آپ کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔"

مہدی خواجہ نے اس سے اتفاق کیا تھا چنانچہ سب نے مل کر کھانا کھایا اس کے بعد اپنے دستوں کے ساتھ مہدی خواجہ بیانہ شہر میں داخل ہو گیا تھا جبکہ جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ دونوں اپنے لشکر کو لے کر وہاں سے کوچ کر گئے تھے۔

منگٹ رائے اپنے لشکر کے ساتھ گوالیار سے لگ بھگ پندرہ میل کے فاصلے پر اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کیے ہوئے تھا۔ وہ بڑی بے فکری کی حالت میں تھا اور

اس کی بے فکری کی دو وجوہات تھیں۔

اول یہ کہ وہ جانتا تھا کہ ظہیرالدین بابر کا پورا لشکر ایک جگہ جمع نہیں بلکہ لشکر کے مختلف حصے مختلف مقامات پر دشمن قوتوں سے ٹکرا رہے ہیں لہٰذا اگر وہ گوالیار پر حملہ آور ہوتا ہی تو گوالیار کا دفاع صرف ابراہیم لودھی کا سالار تاتار خان شہر کے اندر محصور رہ کر کر سکتا ہے شہر سے باہر نہ کوئی قوت اس سے ٹکرائے گی نہ کوئی تاتار خان کی مدد کے لیے آئے گا۔

دوسری جو بے فکری اسے یہ تھی کہ اس کے پاس بہت بڑا لشکر تھا اور کسی نے اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی تھی کہ جو لشکر اس وقت تمہارے پاس ہے اتنا بڑا لشکر تو ظہیرالدین بابر کے پاس بھی نہیں ہے۔ لہٰذا منگٹ رائے آپ سے باہر ہو گیا تھا اور پھر اس کو یہ بھی اطمینان تھا کہ اس نے ایک سفارت رانا سانگا کی طرف بھجوائی ہے وہ امید رکھتا تھا کہ رانا سانگا ضرور اس سے تعاون کرے گا تاکہ مل کر ظہیرالدین بابر کو ہندوستان کی سرزمین سے چلتا کریں۔

منگٹ رائے کی طرف بڑھتے ہوئے ایک محفوظ مقام پر جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ نے اپنے لشکر کو روکا وہاں قیام کیا لشکریوں کے کھانے اور آرام کا بھی اہتمام کیا گیا اس کے بعد لشکر کے پاس جو خیمے اور سامان تھا وہ سارا وہیں رکھ دیا گیا پھر چند دستے خیموں اور سامان کو حفاظت پر چھوڑنے کے بعد جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ دونوں منگٹ رائے کے لشکر کی طرف بڑھے تھے ساتھ ہی بڑی رازداری کے ساتھ وہ دونوں اپنے گھوڑوں کو قریب رکھتے ہوئے دشمن پر ضرب لگانے کی منصوبہ بندی کو بھی آخری شکل دیتے جا رہے تھے۔

دوسری طرف گوالیار کا راجہ بننے کا خواہش مند منگٹ رائے اور اس کا سپہ سالار دھرم داس اپنی سوچوں میں تھے کہ ظہیرالدین بابر کا لشکر چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو کر باغیوں کے خلاف برسرپیکار ہے وہ نہیں جانتے تھے کہ ایک بد بلا عذاب کی صورت میں ان کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔

منگٹ رائے اور اس کے سپہ سالار دھرم داس نے رات کے وقت اپنے لشکر کا ایک حصہ مستعد رکھا تھا تاکہ لشکر کی حفاظت کا اہتمام کیا جائے باقی لشکر گہری نیند سویا ہوا تھا۔

رات اپنے ظلم کے پھندوں، ظلمت کی طنابوں کو کھینچتی ہوئی، صبح کی طرف اپنے آنچل کو دراز کرتی ہوئی شب گناہوں کے پروردوں، دنیا کے تعیشات اور رنگ رلیوں کے گھواروں کو تھپکیاں دیتی جا رہی تھی۔ ذہن کے اوطاقوں میں نیند کے غلبے گہرے ہو گئے تھے۔ رات کسی تمنا رندے کی طرح رگ رگ میں نیند کی سنسنی پھیلاتی بھاگتی چلی جا رہی تھی ایسے میں جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ بڑی تیزی سے اپنے ہدف کا رخ کر رہے تھے۔ دشمن کے قریب جا کر پہلے سے طے شدہ منصوبہ بندی کے تحت نورنگ بیگ رک گیا جبکہ اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ جہانگیر قلی بیگ موت کے مچلتے لمحوں پر شے کو بکھیر دینے والے نا آشنا اندیشوں احساس کے دروازوں پر دستک دیتی بحر کی جلتی شام، نگاہوں میں چنگاریاں بھر دینے والی صحرا کی تشنہ لبی، بے رنگ و بے لباس عکس کی سی حالت کرتے جبر و استبداد کی طرح آگے بڑھا، پھر وہ منگٹ رائے کے لشکر پر قدم قدم پر نفس نفس میں داخل ہوتی بے انت بھڑکتی آگ تجربے کے طویل سلسلے کھڑے کر کے ضبط کے حصار پر شب خون مارتے تباہی کی ساعتوں کے گورکھ دھندوں اور گونگے، بہرے اور ٹیڑھے راستوں پر غضب ناک لمحات کے رقص کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

دوسری طرف منگٹ رائے اور اس کے سپہ سالار دھرم داس نے لشکر کی حفاظت کے لیے جو حصہ چوکس رکھا تھا، وہ بھی حرکت میں آیا اور جوابی کارروائی کرتے ہوئے وہ جہانگیر قلی بیگ پر روز شب کے کشادہ دامن میں نوائے وقت کی اڑتی گونجوں، زرخیزیوں کو پیاس جان و دل کے سکون زاروں کو سلگتے جلتے کرب میں تبدیل کرتے بھوک پھیلاتے قحط اور قاتلوں کے قبیلے کی طرح حملہ آور ہو گئے تھے کچھ دیر تک جہانگیر قلی

بیگ ان پر ضربیں لگاتا رہا جم کر ان کا مقابلہ کرتا رہا اور بڑی تیزی سے ان کی تعداد بھی کم کرتا رہا اتنی دیر تک منگٹ رائے کے دوسرے لشکری جاگ اٹھے تھے اور بڑی تیزی سے اپنے آپ کو مسلح کرنے لگے تھے۔

پھر اچانک جہانگیر قلی بیگ حرکت میں آیا اور اس نے ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے پسپائی شروع کی اس کی یہ پسپائی دیکھتے ہوئے منگٹ رائے کا وہ لشکر جو اس کے ساتھ برسرپیکار تھا وہ اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔

اس موقع پر اچانک اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ نورنگ بیگ وحشت کے اندھیروں میں، چیختی ہواؤں عمر کی بے جہت مسافتوں میں، زندگی کی گردشوں کو تمام کرتے، دکھ کے استعاروں کی طرح نمودار ہوا تھا یہ سارا معاملہ شاید انہوں نے پہلے سے طے کر رکھا تھا۔

چنانچہ جونہی جہانگیر قلی بیگ نے پسپائی اختیار کی اور منگٹ رائے کے لشکر نے اس کا تعاقب کیا تو اس لشکر کی پشت کی طرف سے نورنگ بیگ سنسان فضاؤں میں ہر تمنا کو لہو لہو کرتے، نفرت کے الاؤ، عقل کی کج روی ہوش کی گمراہی، قلب کی تیرگی، نفس کی مفلسی طاری کرتے خونخوار جذبوں کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

اس موقع پر اچانک جہانگیر قلی بیگ بھی اپنے لشکر کے ساتھ پلٹ کر حملہ آور ہوا اور جس لشکر نے اس کا تعاقب شروع کیا تھا اس کو ایک طرف سے جہانگیر قلی بیگ اور دوسری طرف سے نورنگ بیگ نے پیس کر رکھ دیا تھا۔

اتنی دیر تک منگٹ رائے کے جو لشکری اپنے آپ کو مسلح کر چکے تھے وہ بڑی تیزی سے نورنگ بیگ کے لشکر کے پشتی حصے کی طرف آئے اور اس پر حملہ آور ہو گئے تھے۔

اس موقع پر طوفان کی طرح جہانگیر قلی بیگ نے اپنے کام کی ابتدا کی چنانچہ اپنے لشکر کو حرکت میں لایا اور منگٹ رائے کے لشکر کا وہ حصہ جو نورنگ بیگ کی پشت کی طرف آیا تھا جہانگیر قلی بیگ زیست کی مصاف کو تمام کرتے درد کے ہیولوں، خوف پھیلاتے رعد صحراؤں کے بدترین آشوب اور زیر لب سیاہ رنگ طوفانوں کی طرح ٹوٹ پڑا تھا۔

چند لمحوں کے اندر ہی جہانگیر قلی بیگ نے اس لشکر کی حالت زرد تپتی ریت، نامہربان گردشوں میں ذات کی محرومیوں، زیست کے سوگ اور زندگی کی نوحہ گری جیسی کر کے رکھ دی تھی۔ اتنی دیر تک جو لشکر نورنگ بیگ کے سامنے تھا اس کا خاتمہ کر کے وہ بھی پلٹا اور جو لشکر اس کی پشت کی طرف سے آیا تھا اس پر حملہ آور ہو گیا تھا۔

اب رزم گاہ کے اس حصے میں ہر ہر حروف، دکھ کے خونی لمحات، منفی عمل کے خطرات، نفرت کی آگ، جبر و استبداد کی سختیاں اور مرگ کا پھیلتا تجسس رقص کرتا تھا۔

اتنی دیر تک منگٹ رائے کا لشکر بیدار ہو کر بالکل پوری طرح تیار ہو چکا تھا لہٰذا ان گنت لشکری شام کے تاریک سایوں میں قربتوں کے لمحات کو زہر آلود کرتے طوفانوں، فطرت کی خوفناک شر خیزیوں کی طرح جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ کی طرف بڑھے تھے۔

اس موقع پر بلند آوازوں میں ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ نے ایک دوسرے کو پیغام دیا پھر دونوں نے اپنے لشکر کو اکٹھا کر لیا اور منگٹ رائے کے لشکر کا وہ حصہ جو ان پر حملہ آور ہوا تھا چڑھتے طوفانوں، کھولتی فضاؤں کی آہوں، سروں پر مسلسل پرواز کرتے کھولتے خوف اندھے قہر، جلتے پیاسے صحرا میں ہولناک خوف پھیلاتے، چیختے چلاتے بے تاب بحر اور قضا کے اٹھتے وحشی بگولوں کی طرح حملہ آور ہو گئے تھے۔

دونوں نے مل کر منگٹ رائے کے لشکر کے اس حصے کی حالت بڑی تیزی سے کالی راتوں بنجر دنوں، دلوں میں راکھ بھرتی دہکتی سسکیوں، وقت کی گھاٹیوں میں جبر کے آگے سر جھکاتی۔ اسیری اجاڑ رات کے قافلوں اور وہموں کے کھولتے خوابوں سے بھی زیادہ بری کرنا شروع کر دی تھی جب دونوں نے دیکھا کہ منگٹ رائے کا تقریباً سارا ہی لشکر اڑ رہا ہے تب انہوں نے

اپنے آپ کو سمیٹتا اور اپنے شب خون کو ختم کرتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے مشرق کی طرف سے اب روشنی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔

منگٹ رائے اور اس کے سپہ سالار دھرم داس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہو گیا ہے یہ شب خون ایسا ہولناک اور ایسا اچانک تھا کہ وہ بوکھلا سے گئے تھے اور اسی بوکھلاہٹ میں انہوں نے جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ کا تعاقب کرنے سے بھی متعلق بھی کچھ نہ سوچا۔ شاید وہ اپنے لشکر کا نقصان دیکھ رہے تھے اور اس نقصان کو دیکھتے ہوئے انہوں نے شاید حملہ آوروں کا تعاقب کرنا اپنے لیے مناسب نہ سمجھا تھا۔

منگٹ رائے اور اس کا سپہ سالار دھرم داس اپنے دوسرے سالاروں کے ساتھ ایک جگہ جمع ہوئے ادھر ادھر گھوم کر دیکھا جس حصے میں جنگ ہوئی تھی اس حصے میں ان کے لشکریوں کی لاشیں پڑی تھیں یہ منظر دیکھ کر منگٹ رائے ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ دھرم داس کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی پھر اپنے لشکریوں کے ساتھ بڑی تیزی سے اپنے زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے لگے تھے جب اس کام سے وہ فارغ ہوئے تب منگٹ رائے کے کہنے پر دھرم داس اور باقی سارے سالار منگٹ رائے کے خیمے میں جمع ہوئے۔

جب سارے سالار وہاں جمع ہو گئے تب منگٹ رائے بولا اور دکھ بھرے انداز میں کہنے لگا۔

”ہمیں تو یہ خبر دی گئی تھی کہ ظہیرالدین بابر کا لشکر مختلف حصوں میں بٹ کر باغیوں کے خلاف حرکت میں آیا ہوا ہے۔ لہٰذا ہمارے خلاف وہ کوئی بڑی کارروائی نہ کر پائیں گے لیکن یہ کون تھے جو ہم پر حملہ آور ہوئے اور ہمارے تقریباً آدھے لشکر کو کاٹتے ہوئے چلتے بنے۔ میں نے ان کا تعاقب کرنے کے لیے اس لیے نہیں کہا کہ اگر ہم ایسا کرتے تو ہمارے پیچھے جو زخمی تھے ان کی کوئی دیکھ بھال نہ کرتا اور وہ سسک سسک کر مر جاتے۔ اب سب سے پہلے ہم نے یہ جاننے کی کوشش کرنی ہے کہ حملہ آور کون تھے۔“

منگٹ رائے کے ان الفاظ کے جواب میں اس کا ایک چھوٹا سالار بولا اور اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”مہاراج میں حملہ آوروں کو جانتا ہوں میں پہلے رانا سانگا کے لشکر کے اس حصے میں تھا جو بیانہ کے مسلمان حکمران نظام خان کی مدد کے لیے گیا تھا۔ اس لشکر پر ظہیرالدین بابر کا سالار جہانگیر بیگ اور نورنگ بیگ حملہ آور ہوئے تھے ہمیں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لہٰذا میں واپس رانا سانگا کے پاس نہیں گیا بلکہ آپ کے لشکر میں شامل ہو گیا آپ کی مہربانی کہ آپ نے مجھے اپنے لشکر میں ایک چھوٹے سالار کی حیثیت سے شامل کر لیا۔

میں ظہیرالدین بابر کے ان دونوں سالاروں کو جانتا ہوں ہم پر حملہ آور ہونے والے دونوں سالار جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ ہی تھے۔

یہاں تک کہنے کے بعد وہ لشکری رکا دم لیا دوبارہ منگٹ رائے کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

مہاراج! یہ جہانگیر قلی بیگ، ظہیرالدین بابر کے چوٹی کے سالاروں میں سے ایک ہے۔ اپنی فتح اور اپنے مدمقابل کی شکست کو یقینی بنانے کا بڑا ماہر ہے اور اس کے ساتھ جو نورنگ بیگ ہے یہ ہمیشہ اس کے نائب کی حیثیت سے کام کرتا ہے اور ان دونوں کی جوڑی ایسی ہے کہ فتح مندی ان کے قدم چومتی ہے۔ ہم پر بھی یہ دونوں حملہ آور ہوئے اور اپنے شب خون کو کامیاب کر کے چلتے بنے۔“

یہاں تک کہنے کے بعد وہ سالار رکا پھر کہنے لگا۔

”مہاراج ہم سے ایک غلطی بھی ہوئی ہمیں چاہیے تھا کہ اپنے پڑاؤ کے چاروں طرف اپنے مخبر پھیلاتے جو دشمن کی نقل و حرکت سے ہمیں بروقت آگاہ کرتے افسوس ہم نے ایسا نہیں کیا جس کی وجہ سے ہمیں یہ نقصان اٹھانا پڑا۔“

وہ سالار جب خاموش ہوا تب غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے منگٹ رائے نے پھر پوچھ لیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ ہمیں ظہیرالدین بابر کے دونوں سالاروں کے پیچھے جا کر ان پر حملہ آور ہو کر

اپنے نقصان کی تلافی نہیں کرنی چاہیے اور اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو کیا کسی مناسب وقت ہمیں ان پر ایسا ہی شب خون نہیں مارنا چاہیے جس طرح انہوں نے ہم پر مار کے ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔“

اس موقع پر سارے سالار آپس میں مشورہ کرتے رہے پھر دھرم داس منگٹ رائے کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”مہاراج میرے خیال میں ہمیں اپنا پڑاؤ یہاں سے ہٹا کر گوالیار سے مزید دس سے پندرہ میل پیچھے ہٹ جانا چاہیے ہم نے اپنے کچھ سفارت کار رانا سانگا کی طرف بھجوائے ہیں اس سے آپ نے تعاون کی بھی اپیل کی ہے اگر رانا سانگا اپنے لشکر کے کچھ حصے سے ہماری مدد پر آمادہ ہوتا ہے تو پھر ہم خم ٹھونک کر ظہیرالدین بابر کے ان دونوں سالاروں کے سامنے جائیں گے اور ہر صورت میں ان سے انتقام لیں گے اور اگر رانا کوئی ایسی پیشکش نہیں کرتا تو پھر ہمیں اس سے ضرور عسکری مدد طلب کرنی چاہیے اور اس کے ذہن میں یہ بات ڈالنی چاہیے کہ آج اگر وہ ظہیرالدین بابر کے چھوٹے چھوٹے لشکروں کے خلاف ہماری مدد کرتا ہے تو کل کو جب وہ خود کھل کر ظہیرالدین بابر کے خلاف حرکت میں آئے گا تو ہم اپنی پوری طاقت اور قوت سے اس کے شانہ بشانہ ظہیرالدین بابر کے خلاف لڑیں گے۔“

منگٹ رائے نے اس تجویز کو پسند کیا تھا لہٰذا تین دن مزید وہاں قیام کرنے کے بعد منگٹ رائے اپنے لشکر کو لے کر گوالیار سے پندرہ میل مزید پیچھے ہٹ گیا تھا جبکہ جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ نے بھی چاروں طرف اپنے مخبر پھیلا رکھے تھے اور انہیں ان کے مخبروں کے ذریعے پتا چل گیا تھا کہ منگٹ رائے مزید پندرہ میل پیچھے ہٹ گیا ہے اور وہ رانا سانگا سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرے گا لہٰذا منگٹ رائے پر نگاہ رکھنے کے لیے انہوں نے بھی اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کر لیا تھا خیمے نصب کر لیے گئے تھے اور چاروں طرف جاسوس پھیلا دیے تھے تاکہ منگٹ رائے اگر انتقام لینا چاہے تو اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

☼ ☼ ☼

دوسری طرف سنبل کے نواح میں جنید برلاس ابراہیم لودھی کے سالار امین خان اور اس کے لشکر پر ہواؤں کو نم آلود کرتے دکھ کے آسیبوں، زندگی کے افق پر بنجرپن کے خواب کھڑے کرتے، طوفانوں فکر احساس کے ارتقاء پر ضرب لگاتے، نفرت کے بارود کھولتے، لمحوں کی گھبراہٹ اور لخت لخت کرتی درد کی لو کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

اس طرح جنید برلاس اور اس کے تحت کام کرنے والے سالاروں اور لشکریوں نے سنبل کے نواح میں امین خان کو بدترین شکست دی۔ اس کے لشکر کا بڑا حصہ کاٹ کر رکھ دیا امین خان فرار ہو گیا۔ سنبل کو جنید برلاس نے محفوظ کر دیا اس طرح جنید برلاس بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی دونوں مہموں سے فارغ ہو گیا تھا۔

ادھر جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ بھی احتیاط کے طور پر بڑی تیزی سے حرکت میں آئے جس جگہ پہلے انہوں نے اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کر رکھا تھا وہاں سے انہوں نے اپنا پڑاؤ ختم کیا اور پہلے کی نسبت زیادہ محفوظ مقام پر انہوں نے پڑاؤ کیا اور ساتھ ہی اپنے اردگرد نگاہ رکھنے کے لیے اپنے مخبر انہوں نے پھیلا دیے تھے اس لیے کہ وہیں قیام کر کے انہوں نے منگٹ رائے رانا سانگا کے تعلقات پر نگاہ رکھنا شروع کر دی تھی۔

☼ ☼ ☼

آگرہ میں ایک روز ظہیرالدین بابر اپنے ان سالاروں سے محو گفتگو تھا جو اس نے اپنے پاس روک رکھے تھے کہ اس کا چوبدار جس عمارت میں ظہیرالدین بابر نے قیام کیا تھا اس عمارت کے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا تھا۔

بابر جب اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ بولا اور کہنے

لگا۔

"آغا ہمارا ایک مخبر آیا ہے میں نے تھوڑی سی تفصیل اس سے جانی ہے وہ گوالیار کی طرف سے آیا ہے۔" گوالیار کا نام سن کر ظہیرالدین بابر چونکا تھا فوراً اپنے چوبدار کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

وقت ضائع کیے بغیر آنے والے مخبر کو میرے پاس بھیجو۔

چنانچہ چوبدار پیچھے ہٹ گیا تھوڑی دیر بعد ایک مخبر اس کمرے میں داخل ہوا ہاتھ کے اشارے سے ظہیرالدین بابر نے اسے اپنے پاس بیٹھنے کے لیے کہا جب وہ بیٹھ گیا تب ظہیرالدین بابر نے اسے مخاطب کیا۔

"اگر تم گوالیار کی طرف سے آئے ہو تو کہو کیا معاملہ ہے میں نے خواجہ مہدی کے ہاتھ جہانگیر قلی بیگ کو پیغام بھجوایا تھا کہ فی الحال وہ منگٹ رائے سے ٹکرانے کے سلسلے کو التوا میں ڈالے اس لیے کہ جو خبریں مجھے پہنچیں تھیں اس کے مطابق منگٹ رائے کے پاس ایک بہت بڑا لشکر ہے جبکہ جہانگیر قلی بیگ کے پاس جو لشکر ہے منگٹ رائے کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں اب تم بتاؤ منگٹ رائے اس وقت کہاں ہے اور جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ جو اپنی بیانہ کی مہم سے فارغ ہو چکے ہیں انہوں نے اس وقت کہاں قیام کر رکھا ہے۔

جواب میں ایک غائر نگاہ آنے والے اس مخبر نے ظہیرالدین بابر پر ڈالی پھر کہنے لگا۔

"آغا آپ کا پیغام محترم مہدی خواجہ کے ذریعے جہانگیر قلی کو پہنچ گیا تھا مہدی خواجہ جہانگیر قلی کے پاس اس وقت پہنچا جس وقت رانگا سانگا کے لشکر کو شکست دینے اور نظام خان کو آپ کی طرف بھجوانے کے بعد جہانگیر قلی بیگ نے اپنے لشکر کے ساتھ بیانہ کے باہر پڑاؤ کر رکھا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ کلاں نے آپ کا پیغام جہانگیر قلی بیگ تک پہنچایا کہ فی الحال وہ انتظار کرے اور منگٹ رائے سے نہ ٹکرائے۔

لیکن جہانگیر قلی نے خواجہ کلاں پر یہ انکشاف کیا کہ منگٹ رائے نے اپنے لشکر کے ساتھ گوالیار سے پندرہ میل کے فاصلے پر پڑاؤ کیا ہوا ہے اور اس نے اپنے امراء پر مشتمل ایک وفد رانا سانگا کی طرف بھجوایا ہوا ہے وہ یہ چاہتا ہے کہ ماضی میں کیونکہ گوالیار کے راجہ بکرماجیت کے تعلقات رانا سانگا سے ٹھیک نہیں تھے لہٰذا اس نے رانا سانگا کو یقین دلایا ہے وہ رانا سانگا کا حلیف بن کر رہے گا اس طرح رانا سانگا کی طرف سے منگٹ رائے کو مدد مل سکتی ہے۔

آغا دراصل جہانگیر قلی بیگ رانا سانگا کی طرف سے منگٹ رائے کے لیے مدد آنے سے پہلے پہلے اس سے نبٹ لینا چاہتا تھا چنانچہ جب خواجہ کلاں وہاں پہنچ گیا تو جہانگیر قلی بیگ نے اپنے لشکر کے ساتھ وہاں سے پڑاؤ ختم کیا اور گوالیار کے قریب ایک مناسب جگہ اس نے پڑاؤ کیا۔

آغا پھر ایسا ہوا کہ سورج طلوع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے ایک خوفناک اور جان لیوا شب خون جہانگیر قلی بیگ نے منگٹ رائے کے لشکر پر مارا اور منگٹ رائے کے ان گنت لشکریوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد جہانگیر قلی بیگ اپنے لشکر کے ساتھ سلامتی سے واپس چلا گیا۔

اس شب خون کے نتیجے میں منگٹ رائے کا اتنا نقصان ہوا کہ منگٹ رائے کے سپہ سالار دھرم داس نے جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ کا تعاقب نہیں کیا۔ ان کے لشکریوں کی لاشیں ایک طرف بکھر گئی تھیں زخمی سسک رہے تھے لہٰذا وہ اپنے زخموں کو سنبھالنے لگے۔

اس کے بعد منگٹ رائے نے اپنے سالاروں سے مشورہ کیا کہ ہمیں ایسا ہی شب خون جس طرح جہانگیر قلی نے مارا ہے انتقام کے طور پر نہیں مارنا چاہیے۔

لیکن منگٹ رائے کے سالاروں نے اسے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جہانگیر قلی بیگ آغا ظہیرالدین بابر کا ایک بڑا خونخوار سالار ہے اور اگر منگٹ رائے نے شب خون مارنے کی کوشش کی تو

اس کے بچے کھچے لشکر کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اپنے سالاروں کی اس تجویز کو منگٹ رائے نے پسند کیا پہلے وہ گوالیار سے پندرہ میل کے فاصلے پر قیام کیے ہوئے تھا اب بچے کھچے لشکر کے ساتھ وہ مزید پندرہ میل پیچھے ہٹ گیا ہے اور بڑی بے چینی سے وہ اپنے ان امراء کا انتظار کر رہا ہے جنہیں اس نے سفیر بنا کر رانا سانگا کی طرف بھجوایا تھا جبکہ اس سے کافی دور ایک محفوظ جگہ جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ نے اپنے لشکر کے ساتھ قیام کر رکھا ہے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد ظہیرالدین بابر تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہا کچھ سوچا پھر اپنے سامنے بیٹھے اپنے ایک سالار کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"فی الفور دو کام کرو سب سے آج ابھی تھوڑی دیر بعد دو تیز رفتار قاصد جنید برلاس کی طرف بھیجو۔ اسے میری طرف سے یہ پیغام بھیجو کہ میرا پیغام ملتے ہی فوراً اپنے لشکر کے ساتھ جہانگیر قلی بیگ کی طرف کوچ کر جائے اس لیے کہ ہو سکتا ہے گوالیار پر قبضہ کرنے کے لیے منگٹ رائے، رانا سانگا سے اتحاد کرے۔ اس صورت میں جہانگیر قلی بیگ نورنگ بیگ اور اس کے ساتھ کام کرنے والے لشکریوں کی جانیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ جب جنید برلاس بھی اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ ان کے پاس پہنچ جائے گا تو پھر ان کی طاقت میں اضافہ ہو جائے گا اور وہ بڑے سے بڑے دشمن کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ساتھ ہی ایک وفد گوالیار شہر میں تاتار خان کی طرف روانہ کرو چونکہ جہانگیر قلی بیگ اپنے لشکر کے ساتھ گوالیار سے دور ہٹ گیا ہے اور منگٹ رائے کے ساتھ کسی بھی وقت اس کا ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جو وفد یہاں سے جائے اس وفد کے سالار رحیم داد اور شیخ گھورن کو مقرر کیا جائے اور یہ دونوں چند دستوں کو لے کر گوالیار کا رخ کریں اور تاتار خان سے کہیں کہ گوالیار ان کے حوالے کر دے۔ یہ دونوں سالار گوالیار میں قیام کر کے وہاں کے دفاع کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی کوشش کریں گے۔"

یہ دو احکام دینے کے بعد بابر نے اپنے سالاروں کو جا کر آرام کرنے کا کہہ دیا تھا۔

ظہیرالدین بابر کے حکم پر تیز رفتار قاصد جنید برلاس کی طرف روانہ ہو گئے تھے جبکہ دو سالاروں رحیم داد اور شیخ گھورن نے گوالیار کا رخ کیا تھا۔

گوالیار پہنچ کر رحیم داد اور اس کے ساتھ شیخ گھورن نے ظہیرالدین بابر کے حکم کے مطابق تاتار خان کو یہ پیغام بھوایا کہ گوالیار ہمارے حوالے کر دے۔

تاتار خان اس وقت بڑا خوف زدہ تھا جس وقت منگٹ رائے اس پر حملہ آور ہونے کے لیے پیش قدمی کر رہا تھا۔ اب جبکہ منگٹ رائے اپنے لشکر کا نقصان اٹھانے کے بعد مزید پیچھے ہٹ گیا تھا تو تاتار خان نے گوالیار ظہیرالدین بابر کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ گوالیار میں ایک بزرگ شیخ محمد غوث رہائش رکھتے تھے۔ گوالیار میں اندر ان کی بڑی عزت اور بڑا احترام تھا انہیں اس بات پر بڑا صدمہ ہوا کہ تاتار خان نے پہلے ظہیرالدین بابر سے وعدہ کیا تھا کہ منگٹ رائے سے اس کی جان چھڑائی جائے تو وہ گوالیار ظہیرالدین بابر کے حوالے کر دے گا اور اب اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا ہے تب شیخ محمد غوث نے ظہیرالدین بابر کے سالار رحیم داد کو پیغام بھیجا کہ وہ کسی طرح قلعے کے اندر آجائے تو پھر تاتار خان کا معاملہ بڑی آسانی سے حل ہو جائے گا۔

چنانچہ اس بزرگ شیخ محمد غوث کی ہدایت کے مطابق بقول مورخین رحیم داد نے تاتار خان کو کہلا بھیجا کہ میرے ساتھ جو مسلح دستے آئے ہیں انہیں اپنی جان کا خطرہ ہے اس لیے کہ منگٹ رائے کسی بھی وقت حملہ آور ہو کر ہم سب کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں تاتار خان سے التجا کی جاتی ہے کہ وہ یہ اجازت دے دے کہ رحیم داد اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ قلعے کے اندر آ کر پناہ لے لے اور اس کے ساتھ جو مسلح دستے ہیں وہ قلعے کے باہر ہی قیام کریں گے۔

رحیم داد نے تاتار خان کو یہ بھی پیغام بھجوایا کہ تاتار خان یہ مان جائے تو رحیم داد تمام عمر اس کا احسان مند رہے گا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ تاتار خان نے رحیم داد کی اس درخواست کو قبول کرلیا۔ چنانچہ رحیم داد اپنے چند آدمیوں کے ساتھ قلعے میں داخل ہوا چنانچہ گوالیار شہر میں داخل ہونے کے بعد رحیم داد نے شیخ محمد غوث سے رابطہ کیا مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ تاتار خان پر غرور کا نشہ سوار تھا اس رات احتیاط اور ہوشیاری کو بھول کر نہایت غافل ہو کر سو گیا جبکہ رحیم داد نے شیخ محمد غور کے ساتھ مل کر رات ہی رات اپنے مسلح دستوں کو شہر کے اندر بلا لیا۔

چنانچہ صبح ہونے پر تاتار خان کو جب خبر ہوئی کہ رحیم داد کے سارے مسلح جوان شہر میں داخل ہو چکے ہیں تو مورخین لکھتے ہیں تاتار کو جب اس حقیقت کا علم ہوا تو اس کے پاس سوائے خاموشی کے کوئی چارہ نہ رہا لہٰذا اس نے چپ چاپ خاموشی کے ساتھ قلعہ اور گوالیار شہر رحیم داد کے حوالے کر دیا اور اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ گوالیار سے نکل کر آگرہ کا رخ کیا وہاں ظہیر الدین بابر کی خدمت میں حاضر ہوا بقول مورخین بابر نے اس سے اچھا سلوک کیا اور اسے ایک اچھے عہدے پر اپنے لشکر میں شامل کرلیا۔

گوالیار کی رانی بھروجہ نے مندر کے جس کمرے میں قیام کر رکھا تھا اس کمرے میں ایک روز مندر کا بڑا پروہت داخل ہوا رانی بھروجہ نے بغور اس کا جائزہ لیا بڑا پنڈت اداس اور افسردہ تھا آگے بڑھ کر جب وہ ایک نشست پر بیٹھ گیا تو رانی بھروجہ اس کے سامنے ہو بیٹھی کچھ دیر خاموشی رہی یہاں تک کہ رانی بھروجہ نے اسے مخاطب کیا۔

”پنڈت جی آپ کا چہرہ بتاتا ہے کہ آپ کے پاس کوئی خبر ہے لیکن خبر بری ہے۔ جو کچھ بھی آپ کے پاس ہے بتائیں کیا معاملہ ہے میں ہر بری خبر سننے کے لیے تیار ہوں۔“

اس موقع پر پنڈت نے گلہ صاف کیا ایک گہری نگاہ اس نے رانی بھروجہ پر ڈالی پھر کہنے لگی۔

”میں یقیناً“ آپ کے لیے ایک بری خبر لے کر آیا ہوں اور بری خبر یہ ہے کہ منگٹ رائے کے لشکر کو کافی نقصان اٹھانا پڑا ہے پہلے وہ گوالیار سے لگ بھگ پندرہ میل کے فاصلے پر اپنے لشکر کے ساتھ قیام لیے ہوئے تھا اب وہ تیس میل پیچھے ہٹ گیا ہے کیونکہ ظہیر الدین بابر کے ایک سالار نے اچانک رات کے پچھلے حصے میں اس پر جان لیوا شب خون مارا اس کے ان گنت لشکریوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور چلتا بنا یہ حملہ ایسا وحشتناک ایسا خوفناک تھا کہ منگٹ رائے اور اس کے سالار دھرم داس نے شب خون مارنے والوں کا تعاقب تک نہ کیا۔“

یہ خبر سن کر رانی بھروجہ اداس اور افسردہ ہو گئی تھی رنگ اس کا پیلا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر گہری سوچوں میں ڈوبی رہی کچھ سوچتی رہی یہاں تک کہ اس نے پنڈت کو مخاطب کیا۔

”پنڈت جی منگٹ رائے کے پاس تو جیسا کہ میں نے سنا ہے، بہت بڑا لشکر ہے پر ایک ہی شب خون میں اس کا اتنا نقصان ہو گیا کہ اسے پیچھے ہٹنا پڑا کیا آپ بتائیں گے یا آپ کو پتا ہے کہ بابر کے کس سالار نے منگٹ رائے پر یہ شب خون مارا۔“

جواب میں تلخ سی مسکراہٹ پنڈت کے چہرے پر نمودار ہوئی پھر رانی بھروجہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”بابر کے ایک سالار نے نام جس کا جہانگیر قلی بیگ بتایا جاتا ہے بڑا خوفناک شب خون منگٹ رائے پر مارا اس کے ان گنت لشکریوں کو اس نے موت کے گھاٹ اتار کر ایک طرح سے اس کے لشکر کو مفلوج بنا کر رکھ دیا ہے۔ چونکہ اس شب خون نے منگٹ رائے کی عسکری قوت پر ایک بڑی سخت اور شدید ضرب لگائی تھی لہٰذا اپنے لشکر کو درست کرنے اور ان کا حوصلہ بلند کرنے اور ساتھ ہی مزید لشکری حاصل کرنے کے لیے منگٹ رائے مزید پندرہ میل گوالیار سے پیچھے ہٹ گیا ہے۔ جو خبر آئی ہے اس کے مطابق منگٹ رائے تیاری کرنے کے بعد ظہیر الدین بابر کے سالار جہانگیر

قلی سے ٹکرائے گا اسے شکست دے کر اس سے اپنی شکست کا انتقام لے گا۔“

یہاں تک کہنے کے بعد پنڈت خاموش ہو گیا تھا۔ دوسری طرف رانی بھروجہ بھی خاموش اور اداس ہو گئی تھی کچھ دیر تک کاٹ کھانے والی خاموشی مندر کے اس کمرے میں طاری رہی یہاں تک کہ پنڈت نے پھر رانی بھروجہ کو مخاطب کیا۔

مہارانی کیا یہ وہی جہانگیر قلی بیگ ہے جسے ہماری بٹیا راجکماری رادیکا پسند کرتی ہے۔

پنڈت کے اس سوال پر رانی بھروجہ چونکی تھی کہنے لگی۔

”آپ کا اندازہ درست ہے یہ وہی جہانگیر قلی بیگ ہے اور یہ قسمت کا ایسا دھنی ہے کہ جس سمت بھی رخ کرتا ہے جس لشکر سے بھی ٹکراتا ہے کامیابی اسی کے قدم چومتی ہے۔ ہم نے سوچا کچھ تھا اور حقیقت کچھ اور نمودار ہو رہی ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ منگٹ رائے نا صرف یہ کہ بابر کو شکست دے کر گوالیار پر ہمارے خاندان کا راج بحال کر دے گا بلکہ آنے والے دور میں اگر کسی موقع پر رانا سانگا نے اس سے ٹکرانے کی کوشش کی تو رانا سانگا کو بھی وہ مار بھگائے گا۔

یہ خبریں آ رہی تھیں کہ بابر نے اپنے لشکر کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے منگٹ رائے سے جو لشکر ٹکرایا ہے وہ اس کا پورا لشکر نہیں ہو گا بلکہ اس کا ایک حصہ ہو گا‘ جہانگیر قلی بیگ کی کمانداری میں کام کر رہا ہو گا اور ساتھ ہی یہ خبریں آئی تھیں کہ بیانہ پر حصار فیروزہ میں بھی باہر کے خلاف کئی لوگوں نے بغاوت اور سرکشی کی ہے اور ادھر بھی بابر نے لشکری بھیجے ہیں اگر منگٹ رائے بابر کے صرف ایک سالار جہانگیر قلی بیگ کا مقابلہ نہیں کر سکا تو پھر بابر کے پورے لشکر کے سامنے یہ کیسے ٹھہر پائے گا۔“

یہاں تک کہنے کے بعد رانی بھروجہ نے کچھ سوچا دوبارہ وہ پنڈت کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”پنڈت جی اب مجھے ایک اور وہم بھی اٹھتا دکھائی دے رہا ہے۔“

”کیسا خوف۔“ پنڈت نے غور سے رانی بھروجہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ لیا تھا۔

رانی بھروجہ نے گلا صاف کیا پھر کہنا شروع کیا۔

”پنڈت جی اب مجھے یہ وہم ہو گیا ہے کہ منگٹ رائے بابر کے اس لشکر کے سامنے نہیں ٹھہر سکے تو میرے دل میں یہ غبار اٹھ رہے ہیں کہ آنے والے دور میں رانا سانگا بھی بابر کے سامنے نہیں ٹھہر پائے گا۔ رانا سانگا کے پاس بے شک بہت بڑی عسکری قوت اور بہت بڑی لشکری طاقت ہے لیکن بابر جیسے سالار اس کے پاس نہیں ہیں۔ بابر کے سالار موت کے منہ میں چھلانگ لگانے کا حوصلہ اور عزم رکھتے ہیں۔ پنڈت جی اس سے پہلے اسی جہانگیر قلی بیگ کو کئی طریقوں سے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی لیکن جس نے بھی اسے ہلاک کرنا چاہا اس جہانگیر قلی بیگ نے اسے موت کی گھاٹ اتار دیا۔ اب منگٹ رائے یہی نظریہ لے کر آیا تھا کہ بابر کے لشکر کو شکست دے گا اور گوالیار کی راجدھانی بحال ہو جائے گی لیکن....“ یہاں تک کہتے کہتے رانی بھروجہ کو رک جانا پڑا اس لیے کہ اس کمرے کے دروازے پر ایک شخص نمودار ہوا وہ مندر ہی کا کوئی آدمی تھا اسے دیکھتے ہی پنڈت نے کمرے میں بلا لیا اسے اپنے قریب بٹھایا پھر اسے مخاطب کیا۔

”کیا تم کوئی نئی خبر لے کر آ گئے ہو۔“

آنے والے نے اثبات میں گردن ہلائی پھر کہنے لگا

”پنڈت جی آپ کا کہنا درست ہے میں واقعی نئی خبر لے کر آیا ہوں اور خبر یہ ہے کہ جیسا کہ آپ پہلے سے جانتے ہیں جہانگیر قلی بیگ، جو بابر کا ایک سالار ہے اس نے منگٹ پر شب خون مار کر اسے نقصان پہنچایا اور منگٹ رائے اپنے لشکر کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا ہے۔ اب وہ ان سفیروں کا انتظار کر رہا ہے جو اس نے رانا سانگا کی طرف بھجوائے ہیں کہ دیکھوں وہاں سے کیا جواب آتا ہے دوسری طرف بابر کا سالار جہانگیر قلی بیگ بھی اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ یہیں ہے کہیں

گیا نہیں بلکہ میں کہوں کہ ہمارے مندر کے قریب ہی اس نے پڑاؤ کر رکھا ہے۔ یہاں سے زیادہ سے زیادہ دور بھی ہوا تو دو تین میل سے زیادہ نہیں ہوگا۔ اس دوران تبدیلی یہ آئی ہے کہ تاتار خان جس کا گوالیار پر قبضہ تھا اس نے پھر وعدہ خلافی کی ہے۔

آپ جانتے ہیں تاتار خان نے بابر کی طرف قاصد بھجوائے تھے کہ منگٹ کے خلاف اس کی مدد کی جائے تو وہ گوالیار بابر کے حوالے کر دے گا اس وقت جبکہ منگٹ رائے پیچھے ہٹ گیا ہے اور بابر کا سالار جہانگیر قلی بیگ بھی پیچھے ہٹ کر نئے حالات کا نمودار ہونے کا انتظار کر رہا ہے تو بابر نے اپنے ایک سالار رحیم داد کو چند دستے دے کر گوالیار کی طرف روانہ کیا تھا کہ تاتار خان سے گوالیار لے لے اور تاتار خان کو آگرہ بھیج دے۔

جو لوگ خبر لائے ہیں ان کا کہنا ہے کہ پہلے تاتار خان نے بابر کے سالار رحیم داد کے حوالے گوالیار کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ شہر کے اندر کے لوگوں نے تاتار خان کے بجائے بابر کے سالار رحیم داد کا ساتھ دینے کا عہد کیا تاتار خان مجبور ہوگیا۔ اس وقت شہر میں بابر کا ایک سالار نام جس کا میں نے رحیم داد بتایا ہے قیام کیے ہوئے ہے' وہ شہر کے اندر لشکر کی تعداد بھی بڑھا رہا ہے اور لشکر کو مضبوط بھی کر رہا ہے۔ تاتار خان چند محافظوں کے ساتھ گوالیار سے آگرہ کی طرف جا چکا ہے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد آنے والا جب خاموش ہوا تب رانی بھروجہ نے اسے مخاطب کیا۔

"تم ایک اچھی خبر لائے ہو اب بتاؤ کہ منگٹ رائے کو بابر کے جس لشکر نے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا ہے وہ لشکر صرف جہانگیر قلی بیگ کا ہے یا دوسرے سالاروں کے بھی لشکر ہیں۔" اس پر آنے والا بولا اور کہنے لگا۔

"مہارانی جہاں تک مجھے بتایا گیا ہے تو یہ لشکر صرف بابر کے سالار جہانگیر قلی بیگ کا ہے اور جہانگیر بیگ یوں جانیں اس وقت گھات میں ہے جونہی رانا سانگا کی طرف سے مدد ملنے کے بعد منگٹ رائے نے گوالیار کا رخ کرنے کی کوشش کی تو پہلے کی طرح یہ جہانگیر قلی اس پر پھر ضرب لگائے گا کہتے ہیں یہ بڑا خونخوار اور بڑا حاوی ہو جانے والا سالار ہے۔" آنے والا جب خاموش ہوا تب رانی بھروجہ بولی۔

"تمہارا اندازہ درست ہے کہ وہ سالار بڑا خونخوار ہے لیکن اس بار منگٹ رائے بھی اس سے دھوکہ نہیں کھائے گا وہ یہ تو جان چکا ہے کہ شب خون مار کے جہانگیر قلی بیگ نے اس کے لشکر کو نقصان پہنچایا ہے۔ منگٹ رائے جہانگیر قلی بیگ کو شب خون نہیں مارنے دے گا لیکن ایک اور مصیبت اٹھ سکتی ہے اور وہ یہ کہ اس بار منگٹ رائے اگر آگے بڑھا اور گوالیار کے قریب آیا تو اسے ایک نہیں دو قوتوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا ایک بابر کے سالار جہانگیر قلی بیگ کا جو گوالیار سے باہر ہے اور دوسرا بابر کا دوسرا سالار جس کا نام تم نے رحیم داد خان بتایا ہے شہر کے اندر ہے وہ بھی گوالیار سے نکل کر منگٹ رائے پر ضرب لگا سکتا ہے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد رانی بھروجہ رکی پھر کہنے لگی۔

"ایک بات اپنے پلے باندھ کر رکھنا کسی کو بھی باہر کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے کہ میں اور میری بیٹی رادیکا نے اس مندر میں قیام کر رکھا ہے۔

فی الحال یہ خبر کہ ہم نے کہاں قیام کر رکھا ہے منگٹ رائے تک بھی نہیں جانی چاہیے۔ منگٹ رائے کو ان لڑائیوں کے نتیجے میں شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو منگٹ رائے ہمارے لیے بیکار ہوگا ہمارا اس سے کوئی تعلق کوئی واسطہ اور کوئی رشتہ نہیں رہے گا۔ ہاں! اگر وہ کامیاب ہوتا ہے گوالیار فتح کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لیتا ہے تو پھر ہم اس مندر سے نکل کر ضرور منگٹ رائے کے پاس جانے کے لیے گوالیار کا رخ کریں گے۔"

آنے والے شخص نے رانی بھروجہ اور راجکماری کے اس مندر میں قیام کو راز میں رکھنے کا وعدہ کیا پھر

پنڈت اور وہ شخص دونوں رانی بھروجہ کے کمرے سے نکل گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

سنبل کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد بابر کے حکم کے مطابق جنید برلاس نے اپنے لشکر کے ساتھ جہانگیر قلی بیگ کا رخ کر لیا تھا جبکہ ہمایوں کے پاس جو مسلح دستے تھے ان کے ساتھ لشکر میں شامل وہ عورتیں جنہوں نے دہلی میں قیام کیا ہوا تھا' سب کو لے کر وہ آگرہ کا رخ کر گیا تھا۔

آگرہ میں آکر ساری عورتوں نے اپنے اپنے خیموں میں قیام کیا تھا جو پہلے سے پڑاؤ میں ان کے لیے مختص تھے۔ یہاں تک کہ ظہیرالدین بابر اور ہمایوں نے مل کر آگرہ شہر کے اندر ان کی مستقل رہائش کا اہتمام کرنا شروع کر دیا تھا۔

گوہر خانم ایک روز اپنے خیمے میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک اس کا باپ شریف الدین اور بھائی نجم الدین دونوں داخل ہوئے تھے۔ اپنے باپ اور بھائی کو دیکھ کر گوہر خانم کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر خیمے کے دروازے کی طرف بھاگی' اپنے باپ اور بھائی سے ملی' دونوں کو خیمے میں بٹھایا' پھر اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں آپ کے لیے مشروب کا انتظام کرتی ہوں۔" مسکراتے ہوئے شریف الدین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب ہی نشست پر بٹھا لیا' پھر کہنے لگا۔

"مجھے مشروب کے لیے زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔"

شریف الدین کے خاموش ہونے پر چونکنے کے انداز میں گوہر خانم نے پوچھ لیا۔

"لینے آئے ہیں... آپ کا مطلب نہیں سمجھی میں' گوالیار میں اپنے آبائی قصبے میں جا کر بابا میں کیا کروں گی...؟

گوہر خانم اپنی بات مکمل نہ کر سکی' اس کی بات کاٹتے ہوئے اس کا باپ شریف الدین کہنے لگا۔

"نہیں تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر گوالیار کی طرف تو نہیں لے جا رہا گوہر تمہارا شوہر جہانگیر قلی بیگ ان دنوں گوالیار ہی کی طرف ہے لیکن میری بچی میں تو تمہیں آگرہ شہر میں تمہاری حویلی کی طرف لے جانا چاہتا ہوں۔

گوہر خانم نے پھر چونکنے کے انداز میں اپنے باپ کی طرف دیکھا' پھر اس نے تعجب خیز انداز میں پوچھ لیا۔

اپنی حویلی ہیں؟

شریف الدین مسکرا دیا' بولا اور کہنے لگا۔

"میری بیٹی میں دہلی سے ایک خاص مقصد کے لیے آگرہ کی طرف آیا تھا اور وہ مقصد میں پورا کر چکا ہوں' ہم دونوں نے مل کر تمہارے اور جہانگیر قلی بیگ کے لیے آگرہ میں ایک بہترین حویلی خریدی ہے۔ اسی میں ہم نے قیام کیا ہوا ہے۔ اس کی تزئین اور آرائش کا بھی سارا کام مکمل کر دیا ہے' ہم دونوں باپ بیٹے کو تمہاری آمد کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ اس لیے کہ ہمیں یہ خبریں مل چکی تھیں کہ جہانگیر قلی بیگ تو منگٹ رائے سے نمٹنے میں مصروف ہے جبکہ تم دہلی میں ہو اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ دہلی سے عنقریب ہمایوں سب عورتوں کو لے کر آگرہ کا رخ کرنے والا ہے۔ اس بنا پر ہم دونوں باپ بیٹے نے یہیں قیام کر لیا تھا۔"

یہاں تک کہنے کے بعد شریف الدین دوبارہ گوہر خانم کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"میری بچی میں اس سلسلے میں آغا ظہیرالدین بابر سے بھی مل کر آ رہا ہوں اور ساری تفصیل میں نے ان سے کہہ دی ہے۔ انہوں نے اجازت دے دی ہے کہ میری بچی تم اپنی حویلی میں منتقل ہو جاؤ' اب اٹھو ہمارے ساتھ چلو جو ضروری سامان ہے وہ ہم لے جاتے ہیں' باقی سامان لے کر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس موقع پر گوہر خانم بے پناہ خوشی کا اظہار کر رہی تھی' اپنا ضروری سامان سمیٹا' سامان شریف الدین' نجم الدین کے علاوہ خود اس نے اٹھا لیا' پھر وہ آگرہ شہر میں داخل ہوئے۔

شریف الدین، نجم الدین دونوں باپ بیٹا گوہر خانم کو لے کر ایک صاف ستھری حویلی میں داخل ہوئے۔ حویلی درمیانے درجے کی تھی' نہ زیادہ بڑی' نہ زیادہ چھوٹی' اندر داخل ہوتے ہی تو کھلا صحن تھا' حویلی کے کافی کمرے تھے' حویلی کے بائیں جانب اصطبل تھا اور پچھواڑے میں کافی پھلدار درخت بھی تھے۔ اپنے بھائی اور باپ کے ساتھ گوہر خانم نے پہلے حویلی کا گھوم پھر کر جائزہ لیا۔ اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد تینوں آکر دیوان خانے میں بیٹھ گئے تھے۔ یہاں تک کہ شریف الدین کے کہنے پر گوہر خانم دونوں باپ بیٹے کو آگرہ سے نکل کر گنگا جمنا کے دوآبہ' وہاں سے نکل کر دہلی اور دہلی سے آگاہ کی طرف آنے کے سفر کے اپنے حالات سنا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

جہانگیر قلی بیگ نے منگٹ رائے سے نپٹنے کے لیے ایک انتہائی مناسب اور کسی قدر محفوظ جگہ اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کر رکھا تھا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے اطراف میں کچھ مخبر اور مسلح جوان بھی پھیلا رکھے تھے تاکہ اردگرد کے حالات سے باخبر رہا جائے اور منگٹ رائے یا اس کے لشکر کا کوئی حصہ اس پر شب خون مارنے میں کامیاب نہ ہو۔

اسی جگہ پڑاؤ کے دوران ایک روز جہانگیر قلی بیگ کو جنید برلاس کے آنے کی خبر ملی' چنانچہ جنید برلاس اپنے لشکر کے ساتھ جب اس جگہ آیا تو بڑے شاندار انداز میں جہانگیر قلی بیگ' نورنگ بیگ اور دوسرے ساتھی سالاروں نے جنید برلاس اس کے سالاروں اور اس کے لشکریوں کا استقبال کیا۔ پھر جنید برلاس نے اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ وہیں خیمہ زن ہونے کا حکم دے دیا تھا۔ آن کی آن میں وہاں خیمے نصب ہوگئے' پھر جہانگیر قلی کے کہنے پر سب کے لیے کھانا تیار ہونے لگا۔ اتنی دیر تک جہانگیر قلی بیگ جنید برلاس کو اپنے خیمے میں لے گیا تھا۔ نورنگ بیگ اور جنید برلاس کے ساتھ آنے والے بڑے سالار بھی ان کے ساتھ تھے جب سب بیٹھ گئے' تب گفتگو کا آغاز جہانگیر قلی بیگ نے کیا۔

"جنید برلاس میرے بھائی میں اور نورنگ بیگ جانتے ہیں کہ اب تک کیا ہوا اور منگٹ رائے کی طرف سے کیا ہونے والا ہے' اس پر مسکراتے ہوئے جنید برلاس بولا اور کہنے لگا۔

"جہانگیر قلی بیگ تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے' راستے میں مجھے پورے حالات سے آگاہی ہو چکی ہے۔ میں سمجھتا ہوں منگٹ رائے کے لشکر پر شب خون مار کر تم نے ایک طرح سے اسے مفلوج و اپاہج بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب وہ سوچ سمجھ کر ہمارے مقابلے پر آئے گا۔"

جنید برلاس کو رک جانا پڑا۔ اس لیے کہ اس کی بات کاٹتے ہوئے جہانگیر قلی بیگ بول اٹھا۔

"جنید برلاس میرے بھائی' وہ بڑی ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا ہے۔ اس نے تہیہ کر رکھا ہے کہ ہر صورت میں گوالیار حاصل کر کے وہاں کا راجہ بنے گا اور گوالیار کے پرانے خاندان کے راج کو بحال کرے گا۔ گوالیار کے سابق راجہ بکرماجیت کے تعلقات رانا سانگا کے ساتھ کبھی بھی اچھے نہیں رہے بلکہ خراب ہی رہے ہیں لیکن یہ منگٹ رائے حالانکہ بکرماجیت کا قریبی عزیز اور رشتہ دار ہے لیکن ان دنوں جیسا کہ میرے مخبروں نے اطلاع دی ہے وہ رانا سانگا کے ساتھ بڑے گہرے تعلقات استوار کرنا چاہتا ہے۔ اس نے رانا سانگا کو کچھ پیش کش بھی کی ہیں اور میرے خیال میں رانا سانگا ہمارے خلاف منگٹ رائے کی مدد ضرور کرے گا۔

یہ تو طے شدہ بات ہے کہ اب منگٹ رائے پہلے لشکر کے ساتھ حرکت میں آکر ہمارا مقابلہ نہیں کرے گا۔ وہ دو کاموں میں سے ایک کام ضرور کرے گا۔

اول تو اسے رانا سانگا سے عسکری مدد بھی مل جائے گی' جس کے ساتھ وہ ہمارے خلاف حرکت میں آسکتا ہے۔ دوئم یہ کہ جس سمت وہ گیا ہے وہاں سے نئی لشکری بھرتی کر کے ان کی مشق اور تربیت کا کام انجام دے کر دوبارہ خم ٹھونک کر ہمارے مقابلے پر آنے کی کوشش کرے گا لیکن اس کا امکان کم ہے۔ مجھے زیادہ بلکہ پختہ یقین یہی ہے کہ رانا سانگا ہمیں کمزور کرنے کے لیے یہی چاہے گا کہ اس کے علاوہ پہلے دوسری قوتیں مسلمانوں سے ٹکرائیں اور ساری قوتیں کمزور ہو جائیں اور ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رانا سانگا ہندوستان کا عظیم راجہ بننے کے خواب دیکھ رہا ہے اور مجھے امید ہے اس کے یہ خواب ادھورے رہ جائیں گے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد جہانگیر قلی بیگ نے دم لیا۔ دوبارہ وہ بولا اور خیمے میں بیٹھے سارے سالاروں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"میرے عزیز ساتھیوں۔ میرے بھائیوں اس بار ہم اس کے ساتھ شب خون کا کھیل نہیں کھیلیں گے۔ جنید برلاس میرے بھائی تمہارے آنے سے میرے ہی نہیں میرے سالاروں اور لشکریوں کے حوصلے بھی بلند کر گئے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ آغا ظہیر الدین اپنے سارے لشکریوں پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہے اور اپنے مخبروں کے ذریعے ان کی کارروائیوں اور ان کی نقل و حرکت کے علاوہ مہموں کے نتائج بھی اس تک پہنچ رہے ہیں' میں سمجھتا ہوں آغا کی یہ بڑی دانشمندی ہے کہ اس نے جنید برلاس میرے بھائی تمہیں میری طرف بھیج دیا ہے۔ اب اپنی قوت کو یکجا کر کے خم ٹھونک کر ہم خود منگٹ رائے کے خلاف حرکت میں آئیں گے اور اسے بتائیں گے کہ گوالیار کی گدی حاصل کرنا اگر ناممکن نہیں تو آسان بھی نہیں ہے۔"

جہانگیر قلی بیگ رکا' اس کے بعد کہنے لگا۔

"جنید برلاس میرے بھائی جہاں تک بیانہ کا تعلق ہے تو بیانہ کا نظام خان آگرہ جا چکا ہے' بیانہ میں اس وقت مہدی خواجہ ہیں اور انہوں نے بیانہ کے انتظامات مضبوط اور مستحکم کر کے وہاں لشکر میں اضافہ بھی کرنا شروع کر دیا ہے۔"

جہانگیر قلی بیگ پھر رکا اور اس بار کسی قدر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"ایک نئی بات بھی آپ لوگوں سے کہوں کہ جس وقت میں نے منگٹ رائے پر شب خون مار کر اسے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا تھا میں اور نورنگ بیگ یہاں آ کے پڑاؤ کر گئے تاکہ منگٹ رائے پر گہری نگاہ رکھیں کہ اب وہ کیا قدم اٹھانا چاہتا ہے تو اسی دوران آغا ظہیر الدین نے اپنے سالار رحیم داد کو کچھ دستے بھیج کر گوالیار روانہ کیا اور اسے یہ احکام جاری کیے کہ وہ تاتار خان سے کہے کہ وہ گوالیار سے نکل کر آگرہ آجائے اور گوالیار کا نظم و نسق رحیم داد کے حوالے کردے۔

جو خبریں سنی ہیں اس کے مطابق تاتار خان پہلے شہر حوالے کرنے سے انکار کر گیا تھا لیکن بعد میں وہاں کے لوگوں کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے وہ آگرہ جا چکا ہے اور اس وقت گوالیار میں ہمارا سالار رحیم داد ہے' وہ بھی اپنی عسکری قوت بڑھا رہا ہے اور کسی بھی موقع پر وہ بھی خم ٹھونک کر دشمن کا مقابلہ کر سکتا ہے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد جہانگیر قلی بیگ رکا' یہاں تک کہ گفتگو کا آغاز جنید برلاس نے کیا اور جہانگیر قلی بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"جہانگیر قلی بیگ میرے بھائی پہلے تو میں تمہاری اور نورنگ بیگ کی تعریف کروں گا کہ نہ صرف بیانہ کا خوب دفاع کیا' بلکہ منگٹ کے اتنے بڑے لشکر پر شب خون مار کر انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا' اب تمہارے لیے خبر یہ ہے کہ جس وقت آغا ظہیر الدین کی طرف سے مجھے یہ حکم ملا کہ میں اپنے لشکر کے ساتھ تمہاری طرف آجاؤں اسی وقت مجھے یہ بھی خبریں ملیں کہ ہمایوں کے لشکر میں شامل ساری عورتوں کو لے کر محافظ دستوں کے ساتھ دہلی سے نکل کر آگرہ کی طرف جا چکا ہے اور مجھے امید ہے کہ اب تک ساری عورتیں باحفاظت آگرہ پہنچ چکی ہوں گی۔"

جہانگیر قلی بیگ اور جنید برلاس کچھ دیر اپنے سارے سالاروں کے ساتھ منگٹ رائے سے نپٹنے کی منصوبہ بندی کو آخری شکل دیتے رہے' یہاں تک کہ سب کا کھانا آگیا' سب نے مل کر کھانا کھایا' اس کے بعد سارے سالار جہانگیر قلی بیگ کے خیمے سے نکل کر

اپنے خیموں کی طرف چلے گئے تھے۔ جنید برلاس کے وہاں پہنچنے کے لگ بھگ چھ سات دن بعد جہانگیر قلی بیگ کو مخبر یہ اطلاع لے کر آئے کہ منگٹ رائے اپنے لشکر کے ساتھ جس جگہ اس نے پڑاؤ کیا ہوا ہے وہاں سے کوچ کیا اور گوالیار کا رخ کیا ہے۔ آنے والے مخبروں نے اسے یہ بھی اطلاع دی کہ منگٹ رائے کو رانا سانگا کی طرف سے ایک خاصے بڑے لشکر کی مدد مل چکی ہے اور ساتھ ہی رانا سانگا نے مدد کی صورت میں بھی منگٹ رائے کی خوب مدد کی ہے' تاکہ منگٹ رائے مسلمانوں پر کڑی ضرب لگائے اور اس طرح مسلمانوں اور منگٹ رائے دونوں کی عسکری قوت کمزور ہو۔

خبر ملنے کے بعد جہانگیر قلی بیگ اور جنید برلاس نے اپنا پڑاؤ وہاں سے ختم کردیا اور منگٹ رائے کا مقابلہ کرنے کے لیے پیش قدمی کی' جہانگیر قلی بیگ نے فیصلہ کرلیا تھا کہ منگٹ رائے کی راہ وہ وہیں روکے گا جہاں اس سے پہلے اس نے منگٹ رائے پر شب خون مار کر اسے وہاں سے بھاگ جانے پر مجبور کردیا تھا۔

دوسری طرف منگٹ رائے بھی اپنے اور رانا سانگا کا متحدہ لشکر لے کر اسی سمت بڑھ رہا تھا جہاں اس سے پہلے اس نے پڑاؤ کر رکھا تھا' ابھی اس نے چند میل کا ہی سفر طے کیا ہوگا کہ اس نے جو مخبر پھیلائے تھے وہ اس کے لشکر میں شامل ہوئے۔ اس موقع پر منگٹ رائے نے اپنے لشکر کو روک دیا۔ مخبروں کو اس کے پاس بلایا گیا۔ منگٹ رائے نے انہیں مخاطب کیا۔

"دشمن سے متعلق تم کیا خبریں لے کر آئے ہو۔"

آنے والوں میں سے ایک بولا اور منگٹ رائے کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔

"مہاراج! مسلمانوں کا سالار جہانگیر قلی بیگ اپنے لشکر کے ساتھ اسی جگہ پہنچ گیا ہے' جہاں اس سے پہلے اس نے ہمارے لشکر پر شب خون مارا تھا۔"

یہ الفاظ سن کر منگٹ رائے کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی' کہنے لگا۔

گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ ظہیر الدین بابر کا سالار جہانگیر قلی بیگ خود ہی اپنی موت کے مقام پر پہنچ گیا ہے اور اسی میدان میں ہم اسے اس کے انجام تک پہنچائیں گے۔"

اس موقع پر منگٹ رائے کے پاس اس کے لشکریوں کا سپہ سالار دھرم داس منگٹ رائے کا بیٹا چندر رائے اور گوالیار کے پہلے راجہ بکرماجیت کے سپہ سالار باس دیو کا بھتیجا راج سنگھ موجود تھے۔ اس لیے کہ راج سنگھ گوالیار سے بھاگ کر منگٹ رائے کے پاس چلا گیا تھا۔ اس کے لشکر میں شامل ہوگیا تھا اور ساتھ ہی اس نے اپنے چچا باس دیو کی بیٹی رتن دیوی سے شادی بھی کرلی تھی۔ اپنے مخبروں کے ساتھ گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد منگٹ رائے نے باری باری سپہ سالار دھرم داس اور راج سنگھ کی طرف دیکھا' پھر راج سنگھ کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔

"راج سنگھ رانی بھروجہ اور راجکماری راویکا کا کچھ پتا چلا کہ وہ کہاں ہیں' آج کے دن ان دونوں کو ہمارے لشکر میں شامل ہونا چاہیے تھا۔ مسلمانوں کے سالار جہانگیر قلی بیگ کے خلاف آج جو ہم فتح حاصل کریں گے تو اس فتح کے جشن میں یقیناً" رانی بھروجہ اور راجکماری راویکا کو ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ اسی جشن جن کے دوران میں راجکماری راویکا کی اپنے بیٹے چندر سے اور رانی بھروجہ کو اپنے حرم میں داخل کروں گا اور میں سمجھتا ہوں' جس وقت میں ایسا کروں گا' میں اور میرا بیٹا صحیح طور پر گوالیار کے راج کے مالک ہوجائیں گے۔"

منگٹ رائے جب خاموش ہوا تب راج سنگھ بولا اور کہنے لگا۔

"مہاراج ہم نے اپنے آدمی مقرر کیے ہوئے ہیں۔ رانی بھروجہ اور راجکماری راویکا آگرہ سے تو نکل چکی ہیں' اب وہ کہاں ہیں اس کا پتا نہیں چل رہا۔ بہرحال ہم نے اپنے آدمی پھیلائے ہوئے ہیں اور ان کا پتا وہ ضرور لگالیں گے۔"

راج سنگھ جب خاموش ہوا' تب دھرم داس بول اٹھا۔

"مہاراج! آپ فکر نہ کریں' بہت جلد رانی بھروجہ اور راجکماری راویکا آپ کے پاس ہوں گی۔"

دھرم داس کے یہ الفاظ سن کر منگٹ رائے اور اس کا بیٹا چندر رائے دونوں خوش ہوگئے تھے۔

منگٹ رائے کچھ دیر خاموش رہ کر کچھ سوچتا رہا' پھر کہنے لگا۔

"دھرم داس اپنی روانگی کے وقت جو منصوبہ بندی ہم نے طے کی تھی' اس پر سختی سے عمل کیا جائے گا۔ دشمن کے سامنے جا کے لشکر دو ہی حصوں میں تقسیم رہے گا۔ تیسرا حصہ یہیں سے راج سنگھ اور میرے بیٹے چندر رائے کی کمان داری میں علیحدہ ہوجائے گا۔ جس وقت میں اور دھرم داس دونوں دشمن سے ٹکرائیں گے تو راج سنگھ اور چندر رائے دونوں اپنے لشکر کے ساتھ دشمن کی پشت پر یا اس کے پہلو پر ضرب لگائیں گے اور جب یہ ایسا کریں گے تو ہماری کامیابی یقینی ہوجائے گی' میرے خیال میں چندر رائے اور راج سنگھ کو یہیں سے علیحدہ ہوجانا چاہیے اور کسی مناسب جگہ گھات لگا کر جنگ کے دوران دشمن پر حملہ کرکے اپنے کام کی ابتدا کرنی چاہیے۔"

دھرم داس راج سنگھ اور چندر رائے نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ چنانچہ لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ دو حصے دھرم داس اور منگٹ رائے نے اپنے پاس رکھے' تیسرا حصہ راج سنگھ اور چندر رائے کی کمانداری میں دیا گیا جو وہیں سے علیحدہ ہوکر ایک طرف چلے گئے تھے جبکہ منگٹ رائے اور دھرم داس نے آگے بڑھنا شروع کردیا تھا۔

دوسری طرف جہانگیر قلی بیگ اور جنید برلاس بھی اپنے لشکر کے ساتھ پوری طرح تیار تھے اور بڑی بے چینی سے منگٹ رائے کے لشکر کی آمد کا انتظار کررہے تھے۔

جہانگیر قلی بیگ اور جنید برلاس کو ان کے مخبروں نے اطلاع کردی تھی کہ منگٹ رائے نے اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ دو حصے سامنے آکر مقابلہ کریں گے اور ایک حصہ جنگ کے دوران پشت کی جانب سے نمودار ہوکر ہمارے لشکر پر حملہ آور ہوگا۔ چنانچہ منگٹ رائے اور دھرم داس کی اس منصوبہ بندی کو دیکھتے ہوئے جہانگیر قلی بیگ اور جنید برلاس نے بھی اپنے لشکر کو تین ہی حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ جہانگیر قلی کے پاس دوسرا جنید برلاس تیسرا حصہ نورنگ بیگ کی کمانداری میں دیا گیا تھا اور اسے باقی دونوں حصوں کے پیچھے رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

بہرحال منگٹ رائے اور دھرم داس دونوں اپنے لشکر کے ساتھ جہانگیر قلی بیگ اور جنید برلاس کے سامنے آئے۔ اپنا پڑاؤ انہوں نے قائم کیا۔ آتے ہی انہوں نے اپنے لشکر کی صفیں درست کرنا شروع کردی تھیں۔ وہ جہانگیر قلی بیگ سے اپنا انتقام لینے کے لیے کچھ زیادہ ہی بے چین ہورہے تھے۔ دوسری طرف جہانگیر قلی بیگ اور جنید برلاس نے بھی اپنے لشکر کی صفیں درست کرلی تھیں۔ وہ انتظار کرنے لگے تھے کہ شاید وہ منگٹ رائے اور اس کے سپہ سالار دھرم داس کو پہلے حملہ آور ہونے کا حکم دینا چاہتے تھے۔ منگٹ رائے اور دھرم داس کے لشکر میں تھوڑی دیر تک بڑے بڑے طبل پیٹے جاتے رہے۔ لشکر میں جوش اور ولولہ پیدا کیا جاتا' یہاں تک کہ منگٹ رائے اور دھرم داس نے اپنے لشکر کو خاک اڑاتی چلچلاتی دھوپ میں غموں کی داستانیں کھڑی کرتی تیز اور تند موجوں کی یلغار کی طرح آگے بڑھایا یا پھر وہ سکوت کے بے کراں میں زہر بن کر' بکھرتے قہر' ایک ایک پل کو حشر سامان' ایک ایک لمحے کو عذاب میں تبدیل کرتے' گرم لہروں کے طوفان' کھولتے سمندر کی بے قرار موجوں کی طرح حملہ آور ہوئے تھے۔

دوسری طرف سب سے پہلے جہانگیر قلی بیگ نے اپنے کام کی ابتدا کی اپنے لشکر کو وہ اس طرح حرکت میں لایا جیسے بزم در بزم پھیلتی روشنی' شہر تا شہر بکھرتی قرنوں کی گونجوں' انجمن در انجمن اپنا رنگ جماتی تکبیروں' بلبستی بستی پھیلتی خوف ناک آوازوں' گلستان گلستان محیط ہوجانے والے خوف ناک عذابوں' صحرا صحرا

ریت اڑاتی بگولے کھڑے کرتی لو نے اپنا کام دکھانا شروع کیا ہو۔ اس کے بعد جہانگیر قلی بیگ منگٹ رائے کے لشکر پر انجانی منزلوں کی طلب میں قریہ قریہ قیامت برپا کرتے کھولتی آگ کے شعلوں کے رقص اندھیروں کے ہجوم میں سینوں میں سلگاہٹ بھر دینے والے غموں کے بگولوں اور غموں کی شدت قہرمانیت کی ہولناک شدت بڑھاتے عذاب لمحوں کے دھاروں رسوائی کے موسموں اور رقص کرتے شعلوں کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

جہانگیر قلی بیگ ساتھ ہی ساتھ جنید برلاس بھی اپنے لشکر کو شام کی اداسیوں میں نفرت کے رنگ بکھیرتے جسموں کو پارہ پارہ دلوں کو چھلنی چھلنی کرتے بدنصیبی کے طوفانوں کی طرح آگے بڑھا چکا تھا پھر وہ بھی منگٹ رائے اور دھرم داس کے لشکر پر فضا عجیب تر بحر سے عمیق تر تیز اور تند دھماکہ خیزیوں روحوں کی تسکین کو تنہائیوں کے دردناک عذابوں زندگی کے صحرا میں جبر کا رنج گراں کھڑا کرتے تاریخ کے تلخ ترین قصوں کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

منگٹ رائے کے لشکر کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس لیے جنگ طول پکڑنے لگی تھی۔ یہ معاملہ منگٹ رائے اور دھرم داس اپنے حق میں بہتر سمجھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جوں جوں جنگ طول پکڑے گی دشمن کے لشکر کی تعداد کم ہوتی چلی جائے گی اور وہ ان پر حاوی ہوتے چلے جائیں گے۔ ابھی تک منگٹ رائے کا بیٹا اور راج سنگھ جو لشکر کے ایک حصے کے ساتھ گھات میں چلے گئے تھے نمودار نہیں ہوئے تھے۔

اس موقع پر جہانگیر قلی بیگ نے جب دیکھا کہ جنگ طول کی طرف جا رہی تب بلند آواز میں اس نے اپنے ساتھیوں کو کہنا شروع کیا۔

"میرے طوفان بدوش ساتھیو! فوز مندی کے چمکتے ستارو! دعائے خیر سے میرے بھائیو! خوشبو کے تازہ جھونکوں دلوں کے اسرار کو عیاں کرتے بھید کے دریچے کھولتے ہوئے اور نظروں کے پردے سمیٹ دینے والے انداز میں دشمن پر حملہ آور ہو جاؤ ان پر چاروں طرف سے دلوں کا کہرام آورش کی بے چینی آنکھوں کا شرر اور درد کی بارش بن کر ان کے سارے جذبوں ان کے سارے وسوسوں کو کند اور بیکار کر کے رکھ دو۔"

جہانگیر قلی بیگ کے ان الفاظ کے جواب میں ایسا لگتا تھا جیسے جہانگیر قلی کی آواز اور اس کے کہے ہوئے الفاظ اس کے لشکریوں پر ایسے اثر انداز ہوئے ہوں جیسے درد کی بارش میں شنگرفی آنکھوں کے آنسوؤں کسی نے قہقہوں کے کاروان اور نغموں کے قافلوں میں تبدیل کر دیا ہو۔

مسلمان لشکریوں نے ایسے رد عمل کا اظہار کیا تھا۔ جیسے بے چین جسموں کو روح کی شادابی ہر سانس کو نئی زندگی کی خوشبو اداس خستہ روحوں کو کھردرے سخت الفاظ کی جگہ لب و لہجہ کو گدگداتے الفاظ مل گئے ہوں جیسے نیم کڑوے ذائقوں بھری مٹھاس اور راہ گیروں کو ٹھنڈی چھاؤں میں میٹھا رس پلاتی کیفیت ان کے حوصلوں ان کے جذبوں ان کے ولولوں کو سرائیت کر گئی ہو۔

ایک بار پھر جہانگیر قلی بیگ کی آواز لشکریوں کی سماعتوں سے ٹکرائی انہیں مخاطب کرتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

میرے دیدہ ور بھائیو! میرے دانشور ساتھیو! دشمن پسپا ہونے کے قریب ہے ان پر اب ایسی ضرب لگانی شروع کرو کہ ہماری فتح مندی اور فوز مندی اور دشمن کی شکست بڑی تیزی سے یقینی ہوتی چلی جائے۔"

جہانگیر قلی بیگ کے ان الفاظ کے جواب میں لشکری اس طرح حملہ آور ہونے لگے تھے جیسے بلند کوہستانی سلسلوں سے نمودار ہونے والے طوفانوں میں کسی نے وہ دہلیز پار کر لی ہو جو غلامی کی طرف جاتی ہے۔ وہ راہ بدل لی ہو جو آزادی کو مسیحا کرتی ہے۔ لشکری اب زور زور سے تکبیریں بلند کرتے اور بڑی تیزی سے پیش قدمی کرتے ہوئے منگٹ رائے کے لشکر میں ایک طرح سے خوف ناک انقلاب برپا کرنے لگے تھے۔ اس موقع پر راج سنگھ اور منگٹ رائے کا بیٹا چندر رائے اپنی گھات سے نکلے انہوں نے جہانگیر قلی بیگ اور جنید برلاس کے لشکر پر ضرب لگانا چاہی پھر اچانک پہلے سے طے شدہ منصوبہ بندی کے مطابق اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ نورنگ بیگ حرکت میں آیا اور وہ راج سنگھ اور چندر رائے کے لشکر پر تن کی تپتی زمین پر دلوں پر زخم پاؤں پر چھالے لگاتے جلتے سلگتے کرب اور وقت کی خونی گردش میں دلوں پر رقص کرتے پرسوز اندیشوں کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

راج سنگھ اور چندر رائے نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ جنید برلاس اور جہانگیر قلی بیگ کے لشکر کی پشت کی طرف سے حملہ آور ہوں لیکن ان پر تیزی سے حملہ آور ہوتے ہوئے نورنگ بیگ نے جب ان کے آدھے لشکر کو کاٹ کر رکھ دیا۔ تب راج سنگھ اور چندر رائے بچے کھچے لشکر کو لے کر بھاگ گئے۔ اتنی دیر تک منگٹ رائے اور دھرم داس کے لشکر کی حالت بھی جہانگیر قلی بیگ اور جنید برلاس کے سامنے تنگ دستی کے تشنج بین کرتی اندوہناک صداؤں اور زہر آلود لمحوں کی سی ہونا شروع ہو گئی تھی۔

اسی دوران منگٹ رائے اور دھرم داس کے لشکریوں میں یہ بھی خبر پہنچ گئی کہ راج سنگھ اور چندر رائے کو جو دشمن کی پشت پر حملہ آور ہونے کے لیے مقرر کیا گیا تھا تو دونوں کو بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے اور ان کے آدھے لشکر کا مسلمانوں نے خاتمہ کر دیا ہے۔ تب منگٹ رائے اور دھرم داس کے لشکر میں بھی افراتفری بددلی پھیل گئی۔ اگلی صفوں کے لشکری بڑی تیزی سے پیچھے ہٹنے لگے تھے اس سے جہانگیر قلی بیگ اور جنید برلاس نے فائدہ اٹھایا اپنے لشکریوں کو للکارتے ہوئے انہوں نے حملوں میں مزید تیزی پیدا کی جس کے نتیجے میں منگٹ رائے اور دھرم داس شکست اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جہانگیر قلی بیگ اور جنید برلاس نے سمندر کی وحشی آوازوں عذاب بھرے شام و سحر ہولناک انداز میں گور خر کا شکار کرتے بھیڑیوں طائروں کی ٹولیوں پر جھپٹتے شاہینوں کی طرح منگٹ رائے کے لشکر کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ اس کے لشکر کی تعداد کافی حد تک کم کر دی گئی منگٹ رائے اور دھرم داس اپنی جانیں بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ دوسری جانب ایک لمبا کاوا اور چکر کاٹتے ہوئے راج سنگھ اور منگٹ رائے کا بیٹا اور چندر رائے بھی منگٹ رائے اور دھرم داس سے جا ملے تھے۔

☼ ☼ ☼

رانی بھروجہ مندر کے اس کمرے میں بیٹھی تھی، جس کمرے میں اس کی رہائش تھی کہ مندر کا بڑا پنڈت اجازت لے کر اس کے کمرے میں داخل ہوا جب وہ بیٹھ گیا تب لحہ بھر کے لیے رانی بھروجہ نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر کسی قدر متفکر لہجے میں وہ بڑے پنڈت کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"آپ کے چہرے کے تاثرات بتاتے ہیں کہ جو کچھ آپ کہنے کے لیے آئے ہیں اس میں میرے لیے بہتری نہیں بلکہ فکر مندی کی کوئی بات ہے۔"

پنڈت کے چہرے پر پہلے ہی فکر مندی تھی۔ اپنے ہونٹوں پر زبان اس نے پھیری پھر دکھ بھرے انداز میں رانی بھروجہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"مہارانی آپ کا اندازہ درست ہے۔ میں دو خبریں لے کر آیا ہوں۔ دونوں خبریں آپ کے لیے اچھی نہیں ہیں۔ پہلی خبر آپ کی بیٹی راجکماری راویکا سے متعلق ہے۔ دوسری خبر آپ کے شوہر راجہ بکرما جیت کے رشتہ دار منگٹ رائے سے متعلق ہے۔"

پنڈت جب خاموش ہوا تب فکر گیر کے لہجے میں رانی بھروجہ نے اسے مخاطب کیا۔

"پنڈت جی اگر آپ میرے لیے دو بری خبریں لے کر آئے ہیں تو پہلے میں اپنی بیٹی سے متعلق سننا چاہوں گی۔"

پنڈت نے پھر کچھ سوچا ایک لمبا سانس لیا پھر کہنا شروع کیا۔

مہارانی! آپ کی بیٹی سے متعلق جو بری خبر صبح کے وقت ہم نے آپ سے اس لیے نہ کہی تھی کہ شاید

معاملہ سنبھل جائے۔ رانی بات ہے' یہ ہے صبح جب وہ لڑکی جو راج کماری رادیکا کی خدمت پر مقرر ہے۔ وہ راجکماری کے لیے کھانا لے کر گئی تو اس نے کھانا کھانے سے انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ جب تک مجھے آگرہ شہر نہ پہنچایا جائے۔ اس وقت تک میں کھاؤں پیوں گی نہیں۔"

پنڈت رکا... دم لیا' دوبارہ کہنا شروع کیا۔

رانی ہم نے یہ بات صبح کے وقت آپ کو اس لیے نہیں بتائی تھی کہ شاید راجکماری رادیکا دوپہر کو بھوک لگے تو کھانا کھالے لیکن جب دوپہر کا کھانا بھی اس کے پاس لے کر گئے تو اس نے کھانے سے انکار کردیا۔ لہٰذا معاملہ اب سنگین نظر آتا ہے اور راجکماری رادیکا کو سنبھالنا بڑا مشکل ہوجائے گا۔ اگر اسی طرح وہ کھانا کھانے سے انکار کرتی رہی تو مہارانی وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔"

یہ خبر سن کر رانی بھروجہ اداس اور افسردہ ہوگئی تھی۔ کچھ دیر تک کمرے میں کاٹ کھانے والی خاموشی طاری رہی' یہاں تک کہ رانی پھر بولی اور کہنے لگی۔

"پنڈت جی! اب دوسری خبر کہیں۔"

پنڈت پھر بولا اور کمرے میں اس کی آواز گونجی۔

"مہارانی دوسری خبر جیسا کہ میں نے آپ سے کہا کہ وہ منگٹ رائے سے متعلق ہے۔ وہ ایک بہت بڑا لشکر لے کر گوالیار کی طرف گیا تھا اور ظہیرالدین بابر کے سالار جہانگیر قلی بیگ نے اسی جگہ اس کی راہ روکی جہاں پہلے اس نے منگٹ رائے پر شب خون مارا تھا۔ میرے جو آدمی خبریں لے کر آئے ہیں ان کا کہنا ہے یہ ایک ہولناک اور دل ہلا دینے والی جنگ تھی۔ منگٹ رائے کے لشکر کی تعداد بابر کے سالار جہانگیر قلی بیگ سے بہت زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ منگٹ رائے نے اپنا ایک لشکر گھات میں بھی بٹھا دیا تھا کہ جب جنگ زوروں پر آئے تو گھات میں بیٹھا ہوا لشکر وہاں سے نکل کر دشمن کی پشت پر حملہ آور ہوجائے۔

چنانچہ زوردار جنگ ہوئی اور جس لشکر کو مقرر کیا تھا کہ وہ گھات سے نکل کر پشت پر حملہ آور ہوا اس نے پشت پر حملہ بھی کیا لیکن ناکام رہا۔ اس لیے کہ پشت کی حفاظت کے لیے ظہیرالدین بابر کے سالار نے پہلے ہی اپنا ایک لشکر مقرر کردیا تھا۔

مہارانی مختصر یہ کہ منگٹ رائے کو ایک بار پھر ظہیر الدین بابر کے سالار جہانگیر قلی بیگ کے ہاتھوں بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ وہ ادھر ہی بھاگ گیا جہاں پہلے بھاگا تھا جنگ میں اس کا بڑا نقصان ہوا ہے۔ تاہم اس کا بیٹا چندر رائے اور سپہ سالار دھرم داس محفوظ رہے۔ اس کے علاوہ گوالیار میں جو آپ کے دور کے سپہ سالار کے بھتیجے راج سنگھ نے بھی جنگ میں حصہ لیا اور وہ بھی محفوظ رہا اور سب جنوب کی طرف بھاگ گئے ہیں۔"

یہاں تک کہنے کے بعد پنڈت خاموش ہوگیا۔ کمرے میں کچھ دیر تک کاٹ کھانے والی خاموشی رہی' یہاں تک کہ رانی بھروجہ بولی اور کہنے لگی۔

"لگتا ہے ہمارے لیے حالات تنگ سے تنگ تر ہوتے جارہے ہیں اور ہم دونوں ماں بیٹی بند گلی میں پھنستی جارہی ہیں۔ میں نے اپنی بیٹی راجکماری رادیکا کی محبت کو اس لیے ٹھکرایا تھا کہ راج سنگھ نے اپنے ایک اعتبار کے آدمی کو میری طرف روانہ کیا تھا اور یہ پیش کش کی تھی کہ منگٹ رائے مجھ سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے اور اس کا بیٹا چندر رائے' راجکماری کو پسند کرتا ہے اور اسے اپنانا چاہتا ہے۔ میں نے اس فیصلے کو اس لیے قبول کرلیا تھا کہ میرے شوہر کی راج گدی پھر بحال اور آباد ہوجائے گی لیکن مجھے خبر نہیں تھی کہ منگٹ رائے جنگ کا کوئی تجربہ ہی نہیں رکھتا اور پھر حیرت کی بات اس کے ساتھ سپہ سالار دھرم داس ہے۔ راج سنگھ ہے۔ اس کا بیٹا چندر رائے ہے۔ کیا یہ سب مل کر ظہیرالدین بابر کے سالار جہانگیر قلی بیگ کا مقابلہ نہیں کرسکے۔"

رانی بھروجہ یہاں تک کہنے کے بعد رکی' کچھ سوچا' دوبارہ کمرے میں اس کی آواز گونجی تھی۔

"پنڈت جی یہ بات تو میں آپ کو پہلے بتا چکی ہوں کہ راجکماری رادیکا دل کی گہرائیوں سے ظہیرالدین بابر کے سالار جہانگیر قلی بیگ سے محبت کرتی ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کی شادی کسی مسلمان سے ہو۔ حالانکہ بعد میں مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ راجکماری نے خفیہ طور پر اسلام قبول کر رکھا ہے لیکن میں نے اسے ماننے سے انکار کردیا تھا۔ میں ہر صورت میں اپنی گوالیار کی راج گدی کو بحال رکھنا چاہتی تھی۔

لیکن اب جو حالات پیدا ہو رہے ہیں وہ ہمارے لیے بڑے سنگین ہیں۔ اگر منگٹ رائے کو دوبارہ جہانگیر قلی بیگ کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے تو اب میرا دل کہتا ہے منگٹ رائے گوالیار پر حکومت قائم نہیں کرسکتا وہ جنگ کا کوئی تجربہ ہی نہیں رکھتا۔ اگر اس کے پاس جنگ کا کوئی تجربہ ہوتا یا اس نے اپنے لشکریوں کی بہترین تربیت کی ہوتی تو یقیناً" اپنے سے چھوٹا لشکر رکھنے والے جہانگیر قلی بیگ پر وہ حاوی ہوتا اور اب تک گوالیار میں اپنی حکومت قائم کرکے اسے مضبوط اور مستحکم بنا چکا ہوتا۔

رانی رکی' دوبارہ اس نے کہنا شروع کیا۔

"دوسری بات جو منگٹ رائے کے سلسلے میں سامنے آئی ہے وہ یہ کہ وہ کوئی اچھا منتظم اور جنگجو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنے لشکریوں کی بہترین تربیت کرتا اور ہر صورت میں کامیابی کا در کھولتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کا مطلب ہے منگٹ رائے جنگ کا کوئی تجربہ نہیں رکھتا اب جبکہ وہ گوالیار حاصل نہیں کرسکا تو میں اپنی بیٹی کے ساتھ کبھی بھی اس کی طرف جانا پسند نہیں کروں گی۔ میں اپنی بیٹی کو ایک ایسے شخص سے نہیں بیاہ دوں گی جو کسی علاقے کا حاکم ہی نہ ہو اور نہ وہ نامور ہو' میں خود بھی منگٹ رائے کو ٹھکراتی ہوں' اس لیے کہ میں اس میں کوئی صفت یا اچھائی نہیں دیکھتی۔

دوسری طرف میں اپنی بیٹی کو لے کر واپس آگرہ بھی نہیں جاسکتی' اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ بھید کھل جائے گا کہ راج سنگھ کے مہیا کردہ جوانوں کے ساتھ میں نے ہی راجکماری رادیکا کے محافظوں پر حملہ کرایا تھا اور وہی محافظ رادیکا کو اٹھا کر یہاں لے آئے جن دو محافظوں پر حملہ ہوا تھا وہ اب تک مارے جاچکے ہوں گے اور وہ ظہیرالدین بابر کے لشکری تھے۔ اگر میں واپس جاتی ہوں اور یہ بھید کھلتا ہے کہ یہ کام میں نے کیا تھا تو پھر میری ہی نہیں میرے ساتھ میری بیٹی رادیکا کی بھی گردن کاٹ دی جائے گی۔ لہٰذا میں ایسا نہیں چاہتی اور آگرہ کا رخ نہیں کروں گی۔

پنڈت جی! میرے پتی کے ساتھ آپ کے بڑے پرانے تعلقات رہے ہیں۔ فی الحال اگر میں مندر میں مزید قیام کرنا چاہوں تو آپ کو کوئی اعتراض ہوگا۔

پنڈت مسکرایا' پھر بڑی اپنائیت میں کہنے لگا۔

"مہارانی آپ کس قسم کی گفتگو کررہی ہیں۔ آپ اپنی بیٹی راجکماری رادیکا کے ساتھ اگر اپنی ساری عمر بھی یہاں بیتانا چاہیں تو میں اور مندر کے لوگ آپ کی خدمت کرتے رہیں گے۔ اس سلسلے میں آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

پنڈت رکا' دوبارہ اس نے کہنا شروع کیا۔

آپ نے منگٹ رائے کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے انہیں میں تسلیم کرتا ہوں۔ آپ کی تائید کرتا ہوں کہ آپ نے ایک بے کار شخص کی طرف جانے سے انکار کردیا۔ رہی بات واپس آگرہ جانے کی تو وہاں بھی آپ کے لیے خطرات ہیں۔ اب ہمارے سامنے ایک ہی اہم کام ہے اور وہ یہ کہ کسی طریقے سے رادیکا کو پرسکون کردیں' تاکہ وہ پہلے کی طرح باقاعدگی سے کھانا کھانا شروع کردے۔ اگر وہ ایسا کرتی ہے تو پھر دونوں ماں بیٹی پرسکون طریقے سے رہ سکتی ہیں۔

پنڈت کے ان الفاظ کے جواب میں تھوڑی خاموش رہ کر بھروجہ کچھ سوچتی رہی۔ پھر ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی اور پنڈت کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"پنڈت جی اگر آپ ایک کام کریں تو معاملہ حل

ہو سکتا ہے۔"

"کون سا کام۔" پنڈت نے چونکتے ہوئے پوچھ لیا تھا۔

اس پر رانی بھروجہ بولی اور کہنے لگی۔

"آپ خود رادیکا کے پاس جائیں۔ اسے تسلی دیں۔ اسے یقین دلائیں کہ راج سنگھ کی طرف اسے خطرہ ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات ڈالنا کہ چونکہ جہانگیر قلی بیگ نے راج سنگھ کے بھائی کے علاوہ اس کے چچازاد بھائی کو بھی قتل کیا تھا۔ لہٰذا راج سنگھ اور ہمارے سپہ سالار باس دیو کی بیٹی رتن دیوی جو راج سنگھ کی بیوی ہے ہر صورت میں جہانگیر قلی بیگ کو قتل کرنے کے درپے تھے۔

پنڈت جی میرے ساتھ گفتگو کر کے سیدھے رادیکا کے پاس جائیے گا اور اس سے کہئے گا کہ راج سنگھ رتن دیوی دونوں میاں بیوی ہیں اور انہوں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ ہر صورت میں جہانگیری قلی بیگ کو موت کے گھاٹ اتاریں گے۔ رادیکا کو یہ خبر دیجیے گا کہ راج سنگھ اور رتن دیوی دونوں کو یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ راجکماری رادیکا جہانگیر قلی بیگ سے محبت کرتی ہے اور وہ دونوں میاں بیوی یہ بھی جان گئے ہیں کہ گزشتہ جنگوں کے دوران انہوں نے جو اپنے آدمی جہانگیر قلی بیگ کو قتل کرنے کے لیے لشکر میں شامل کیے تھے ان سے متعلق بھی راجکماری رادیکا جہانگیر قلی بیگ کو مختلف ذریعوں سے آگاہ کرتی رہی ہے اور اسے بچاتی رہی ہے، تاکہ وہ قتل نہ ہو جائے۔

پنڈت جی رادیکا سے یہ بھی کہئے گا کہ اس وقت اس کے لیے خطرات چاروں طرف منڈلا رہے ہیں، جس روز وہ گھڑدوڑ کے لیے اپنے محافظوں تک تو گئی تھی، اسی روز ہی راج سنگھ اور رتن دیوی کے آدمیوں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دینا تھا لیکن رادیکا سے کہنا کہ تمہاری ماتا کے کچھ پرانے جانثاروں کی وجہ سے تمہیں اس مندر میں پہنچا دیا گیا، تاکہ تم محفوظ رہو اور جب تک حالات ہمارے حق میں نہیں ہو جاتے وہ یہیں قیام کرے۔ اس لیے کہ جہانگیر قلی بیگ ان دنوں آگرہ میں نہیں ہے۔ وہ مختلف مہموں کے سلسلے میں گنگا جمنا کے دوآبہ کی طرف جا چکا ہے اور جب واپس آئے گا تو تیز رفتار قاصد اس کی طرف بھجوائے جائیں گے اور وہ اسے حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکال کر آگرہ کی طرف لے جانے کا اہتمام کرے گا۔

رادیکا پر یہ بھی ظاہر کر دینا کہ رادیکا تمہاری ماتا رانی بھروجہ بھی اپنی جان بچا کر کہیں چھپی ہوئی ہے۔ وہ آگرہ میں اپنی حویلی میں قیام نہیں رکھتی بلکہ اپنے جاننے والوں کے ہاں منتقل ہو کر اپنے آپ کو محفوظ کر چکی ہے۔ پنڈت جی جب یہ ساری داستان رادیکا سے کہیں گے تو میرا دل کہتا ہے وہ یہاں رہنے اور باقاعدگی سے کھانا کھانے کے لیے تیار ہو جائے گی۔"

مندر کے بڑے پنڈت نے رانی بھروجہ کی اس بتائی ہوئی داستان سے اتفاق کیا تھا۔ لہٰذا اپنی جگہ سے اٹھا اور رانی بھروجہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

میں ابھی جاتا ہوں اور پوری داستان راجکماری سے کہتا ہوں۔

چنانچہ اسی وقت اٹھ کر پنڈت اس کمرے میں گیا جس کمرے میں رادیکا کو رکھا گیا تھا، جو داستان سنانے کے لیے رانی بھروجہ نے کہا تھا وہ داستان بڑے عمدہ انداز میں پنڈت نے رادیکا سے کہہ دی تھی۔ یہ سب کچھ سن کر رادیکا متاثر ہوئی گہری سوچوں میں کھو گئی تھی۔ اس پر بڑے پنڈت نے رادیکا کو مزید تسلی دی۔ اس کے بعد رادیکا کھانے کے لیے تیار ہو گئی اور اس کی اطلاع پنڈت نے اس کی ماتا کو بھی کر دی تھی۔ یوں وقتی طور پر اس مندر میں رانی بھروجہ کے لیے حالات بہتر اور پرامن ہو گئے تھے۔

(جاری ہے)

☼ ☼

بھیڑیا

احمد صغیر صدیقی

کیا آپ نے کبھی کسی ایسے آدمی کی کہانی سنی ہے، جو پورے چاند کی راتوں کو بھیڑیے کا روپ دھار لیتا تھا؟

انگریزی سے ماخوذ ایک حیرت ناک کہانی

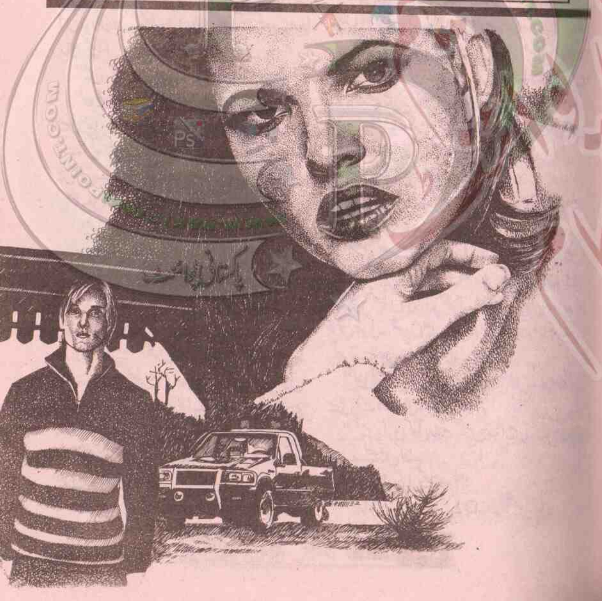

چاند کو ابھرے ہوئے ابھی صرف چند لمحے ہوئے تھے اور اب وہ جھیل کے اس پار چمک رہا تھا۔

سیما جس گھڑی اندر داخل ہوئی چاند کی ایک کرن نے آگے بڑھ کر اس کے بالوں پر ایک زرد پیلا جال بن دیا۔

لیکن اس کے اترے ہوئے چہرے پر جو چمک تھی وہ چاند کی مرہون منت نہ تھی بلکہ اس سے ایک طرح کا خوف جھلک رہا تھا۔

"تم کچھ پریشان ہو" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" اس نے آہستہ سے ہنکاری بھری۔ "وہ یقیناً" ایک بھیڑیا تھا۔"

میں نے منہ سے نکال کر پائپ کو ہاتھ میں لے لیا۔ پھر اپنی آرام کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب جا رکا۔ اس دوران وہ مسلسل ہانپتی ہوئی سی مجھے گھورے جا رہی تھی۔

"میں سمجھا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہ یقیناً" ایک بھیڑیا تھا جنگل میں وہ کافی دور تک میرا پیچھا کرتا رہا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ مڑ کر اسے دیکھ سکتی۔" اس نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ "میں اس کے پیروں کی آواز صاف سن رہی تھی اور پھر وہ اچانک ہی غرایا تھا اور میں بھاگ اٹھی تھی۔"

"اچھا؟" میں نے اسے گھورا۔

وہ زمین کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر خوف کھدا ہوا تھا۔

"کیبن کے قریب بھیڑیا؟" میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاید تمہیں معلوم نہیں اس علاقے میں دور دور تک پھیلے جنگلوں میں کہیں کوئی بھیڑیا نہیں۔ میں نے ادھر پچھلے بیس سال سے کوئی بھیڑیا نہیں دیکھا۔ تمہیں یقین نہ ہو تو بوڑھے چودھری کی دکان پر جا کر معلوم کر لو۔"

"تو پھر وہ بھیڑیے کا بھوت ہو گا۔ سیما نے جھکی جھکی نظروں کے ساتھ کہا۔

مجھے اس کی معصومیت پر ہنسی بھی آئی اور جھنجلاہٹ بھی ہوئی۔ "تم اب جاہلوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔" میں نے اسے جھڑکا۔

اچانک اس نے سر اٹھایا اور بولی۔ "وہ گزشتہ رات بھی کیبن کے ارد گرد منڈلاتا رہا تھا۔"

"خوب" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "مگر میں نے تو کچھ بھی نہیں سنا۔" رک کر میں نے اسے سمجھایا۔ "میرا خیال ہے تم شاید میری لکھی خوف ناک کہانیاں کچھ زیادہ ہی پڑھنے لگی ہو۔"

چائے کی پیالی پر نظریں جماتے ہوئے سیما نے کہا۔ "مجھے حیرت ہے کہ تم نے اس بھیڑیے کی چاپیں کبھی نہیں سنیں اور مجھے تو اس پر بھی حیرت ہے کہ جنگل میں بھی تم نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ کیا سچ مچ؟" رک کر اس نے مجھے گھورا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو آج تک ادھر کوئی بھیڑیا نظر نہیں آیا۔ تمہیں معلوم ہے تمہارے آنے سے ایک مہینہ قبل ہی سے میں ادھر ٹھہرا ہوا ہوں تاکہ اپنا ناول سکون سے مکمل کر سکوں۔ مجھے تو یہاں اس عرصے میں نہ کوئی بھوت دکھائی دیا، نہ جن، نہ کوئی جانور، نہ بھیڑیا۔ مگر میرا خیال ہے کہ ایک بار جنگل میں میں نے ایک سر خا بھی ضرور دیکھا تھا۔"

میں نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

میرا خیال تھا، وہ مسکرائے گی مگر وہ اسی طرح منہ بسورے بیٹھی رہی۔

"شاید میں نے تمہیں یہاں بلا کر غلطی کی ہے" میں نے کہا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ تم یہاں کے دور تک پھیلے جنگلوں، جھیلوں اور دور نظر آنے والی پہاڑیوں کو دیکھ کر خوش ہو گی۔ شہروں میں رہنے والے ایسے مناظر کے لیے ترستے ہیں۔ مگر مجھے تعجب ہے....."

"گویا تم مجھے پاگل سمجھ رہے ہو۔" اس نے بھنا کر میری بات کاٹ دی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے سوچ بھرے لہجے میں کہا۔

"تو پھر تم اور کیا سمجھتے ہو؟"

"میرا خیال ہے" میں نے محتاط انداز میں کہا۔

"ایسا کبھی کبھی سب کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی ماہر نفسیات اس کی وجوہات سے آگاہ کر سکتا ہے ...."

اس نے ایک بار پھر مداخلت کی۔۔۔ "دیکھو میں نہ تو احمق ہوں نہ ان پڑھ ۔۔۔ سامی ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ادھر ہے۔ تو کیا تم سمجھ رہے ہو میں خلل دماغی کا شکار ہو گئی ہوں؟"

"نہیں نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "دیکھ کر بتاؤ تم نے بھیڑیے کا تذکرہ یہاں کسی اور سے تو نہیں کیا؟"

"نہیں۔"

"اور تم کہہ رہی ہو کہ یہ سلسلہ پچھلے ہفتے سے شروع ہوا ہے؟"

"ہاں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے" میں نے کہا۔ "میں ڈاکٹر نور کو بلاتا ہوں ..... وہ ایک ماہر نفسیات ہے اور ادھر کافی عرصے سے رہ رہا ہے۔"

"مگر ڈاکٹر سے سب کچھ نہیں کہوں گی۔" سیما نے احتجاج کیا۔

"کیوں؟"

وہ چپ رہی تو میں نے کہا۔ "مجھے خود بھی تمہارے اس وہم سے دلچسپی ہو گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں بچپن میں تمہاری ماں تمہیں بھیڑیوں سے ڈراتی رہی ہو گی۔"

سیما نے سوچتے ہوئے گردن ہلائی اور بولی۔

"ہاں یہ بات تو ہے..... مجھے کچھ کچھ یاد ہے کہ....."

"خوب" میں نے جلدی سے کہا۔ "اور کیا انہوں نے نہیں یہ بھی بتایا تھا کہ کوئی شے ایسی بھی ہوتی ہے جسے بھیڑیے کا روپ کہا جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے انہوں نے تمہیں کسی آدمی کی کہانی تو نہیں سنائی تھی جو پورے چاند کی راتوں میں آدمی سے بھیڑیا بن جاتا تھا۔ اور پھر شکار کے لیے نکل جاتا تھا؟"

"شاید" سوچتے ہوئے سیما نے سسکاری سی بھری "شاید میں نے یہ کہانی سنی ہے، ہو سکتا ہے کہیں پڑھی ہو۔"

"خوب۔" میں نے کہا۔ "بس تو تم یوں سمجھو کہ جس بھوت یا بھیڑیے کا تم ذکر کر رہی ہو۔ یہ کچھ نہیں ہے۔ بس تمہارے ذہن کی پیداوار ہے۔"

میرے کچھ دیر سمجھانے کے باعث سیما کچھ پرسکون ہوئی پھر ہم دونوں سونے کے کمرے میں چلے گئے۔ سونے سے قبل میں نے لیمپ بجھا دیا۔

پورے کیبن میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ صرف چاندنی کی کچھ کرنیں تھیں جو باہر کے درختوں سے چھن کر کھڑکی سے اندر آ رہی تھیں۔ یہاں سے دور پھیلی ہوئی جھیل کسی روپہلے سمندر کی طرح دمک رہی تھی۔

سیما کچھ دیر تک بستر پر بے چین سی لیٹی رہی.... پھر آہستہ آہستہ وہ سو گئی۔

مجھے معلوم نہیں کس وقت میری آنکھ کھلی تھی۔ سیما زور زور سے مجھے جھنجھوڑ رہی تھی۔

"سنو سامی سنو۔" سرگوشی میں اس نے کہا۔ اس کی سانسیں تیز ہو گئی تھیں۔

"سن رہے ہو تم؟" اس نے دوبارہ کہا۔

"کیبن کے باہر.... دروازے پر...." میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اس نے مجھے پھر جھنجھوڑا۔ غور سے سنو۔

اوہ.... وہ دروازے کو کھرچ رہا ہے۔ جلدی سے کچھ کرو۔" اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔

میں نے تیزی سے بستر چھوڑ دیا۔

"آؤ میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

ٹارچ تلاش کرتے ہوئے میرا پیر کرسی سے ٹکرایا۔

"وہ جا رہا ہے۔" سیما نے جلدی سے کہا۔ "کچھ کرو۔"

میں لپک کر دروازے پر پہنچا۔ سیما میرے عقب میں تھی۔ میں نے زنجیر ہٹائی اور پھر احتیاط سے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور ٹارچ روشن کر دی۔

پھر میں نے پورا دروازہ کھول دیا۔

دور تک میدان تھا۔ اور میدان کے سرے پر جنگلات کا سلسلہ کسی درندے کے وجود سے یکسر خالی

تھا۔

میں نے ٹارچ جھکالی۔

اچانک سیما چیخی۔

"سامی۔۔۔ دیکھو زمین کو دیکھو اس پر اس کے پیروں کے نشانات صاف نظر آرہے ہیں۔"

میں نے دیکھا۔

واقعی وہاں زمین پر کسی درندے کے پیروں کے نشانات موجود تھے۔ بھیڑیا یقیناً" بھاری جسامت کا رہا ہو گا کیونکہ یہ نشانات خاصے چوڑے تھے۔

میں نے کچھ سوچا اور مڑ کر سیما کو دیکھا پھر میں نے کہا۔ "نہیں ڈیئر تم غلطی پر ہو۔" میں نے سکون سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو کوئی نشان نہیں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں ہے۔"

۞ ۞ ۞

دوسری صبح سیما بستر پر ہی تھی کہ میں اٹھ گیا۔ پھر میں قریبی قصبے کی طرف جانے کے ارادے سے نکل پڑا۔

میرا ارادہ دراصل رجیا سے ملنے کا تھا۔ رجیا، قصبے سے کوئی فرلانگ بھر دوری پر واقع ایک پرانے طرز کے مکان میں اپنے معمر باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ بوڑھا آدمی لقوے کا مریض تھا۔ اور ان دونوں کی گزر بسر رجیا کی آمدنی سے ہوتی تھی جو بید کے خوب صورت پرس اور دیگر اشیا بنا کر یہاں آنے والے سیاحوں کے ہاتھ فروخت کیا کرتی تھی۔

میری ملاقات رجیا سے کوئی مہینہ بھر قبل ہوئی تھی۔ میں ادھر تنہا ہی آیا تھا اور رجیا کی دکان پر جا رکا تھا تاکہ سیما کے لیے کچھ خرید کر شہر بھیج دوں۔

اور اس روز میں نے رجیا کو دیکھا تھا اور پھر میرے دل و دماغ میں اس نے ڈیرے ڈال دیے تھے۔ وہ ایک دیہاتی دوشیزہ کے روپ میں مجھے کسی جنگلی دیوی کی طرح لگی تھی۔

اس کے بال سیاہ تھے۔ یہ سیاہی اتنی گہری تھی کہ چمکتی ہوئی لگتی تھی۔ اس کی آنکھیں روشن روشن سی تھیں اور یہ جھیل جیسی گہرائی رکھتی تھیں مجھے وہ آنکھیں دو کھڑکیوں کی طرح لگی تھیں جن سے رات جھانکتی تھی۔ اس کی رنگت چمپئی تھی اور بدن بے حد سڈول۔۔۔ مضبوط اور جنسی کشش سے لبریز۔۔۔ اس کا مضبوط جسم مرد کے بازوؤں میں پگھلنا ضرور جانتا تھا۔ مجھے جلد ہی اس کا تجربہ ہو گیا تھا۔

کیونکہ دوسرے ہی دن میں پھر اس سے ملا تھا۔ وہ ایک جادو تھی۔ ایک بولتا ہوا افسوں۔ اس کا بدن گناہ کی انگڑائیاں لیتی کسی دعوت کی طرح تھا۔ جس سے منہ پھیرنے کی صلاحیت میرے اندر نہیں تھی۔

وہ اندھیری راتوں میں میری پاس آجاتی تھی۔ رات کی سیاہی میں چھپا مہکتا تھا۔ اور اندھیرے چمکتے تھے۔

البتہ سیما کے آجانے کی وجہ سے ہماری ملاقاتیں رک گئی تھیں۔ اس کی آمد پر میں نے رجیا سے کہا تھا کہ اب ہمیں چوکنا رہنا ہو گا تو وہ خوب ہنسی تھی۔

اس نے کہا۔ "مگر یہ صرف کچھ عرصے کے لیے ہے۔"

"کچھ عرصے کے لیے کیوں؟" میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہاں' ہاں بس کچھ عرصے کے لیے۔" اس نے اپنی آنکھیں مٹکائیں تھیں۔ "بس صرف اتنے عرصے کے لیے جب تک وہ زندہ ہے۔"

رجیا نے یہ جملہ بڑے اطمینان سے کہا تھا۔ مجھے بہت عجیب سا لگا مگر یہ ایک حقیقت تھا کہ سیما ایک دم سے میرے لیے ایک فضول شے بن گئی تھی۔ مجھے اب رجیا درکار تھی۔ میں رجیا میں وہ کشش پا رہا تھا جسے محبت تو نہیں کہا جا سکتا لیکن جو ہوس بھی نہ تھی۔ یہ کوئی عجیب ہی سی چیز تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرا بدن ایک ان تھک اتھاہ اور بھرپور لذت کا سودائی ہو گیا ہے۔۔۔

اور مجھے معلوم تھا کہ اسی لذت کا دائمی حصول صرف اسی طرح ممکن ہے کہ سیما راستے سے ہٹ جائے۔۔۔ مر جائے۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ میں سیما کو مار دوں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں' اس نے اطمینان سے کہا طریقے اور بھی ہیں۔"

"مثلاً"؟"

"فرض کرو وہ خود ہی چلی جائے۔۔۔"

"یعنی طلاق لے لے؟"

"نہیں۔۔۔ وہ پاگل تو بھی قرار دی جا سکتی ہے۔"

"مگر سیما پاگل تو نہیں ہے۔"

"ہاں مگر ہو جائے گی۔"

"خوب اور وہ کیوں کر؟"

"بھیڑیا دیکھ دیکھ کر وہ ہنسی تھی۔ ایک بھیڑیا اب اس کا تعاقب کرنے والا ہے۔ صرف تنہائی میں اور پھر وہ کسی کو نہیں بتائے گی۔۔۔ اور تم۔۔۔ تم اس کی ہر بات کو ماننے سے انکار کر دینا۔ اس طرح کچھ عرصے میں۔۔۔"

اس نے جملہ نامکمل چھوڑ کر شانے اچکائے۔

اس سلسلے میں' میں نے رجیا سے کوئی وضاحت نہیں مانگی تھی ہو سکتا ہے وہ گھنے جنگلوں میں اندر جا کر کسی سادھو یا جوگی سے ملی ہو۔۔۔ یا اسے خود ہی جادو ٹونے کا عمل آتا ہو۔ مجھے کچھ پتا نہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ بعد میں پھر واقعی میری بیوی کو بھیڑیا نظر آنے لگا تھا۔۔۔ حالانکہ اس نے حقیقتاً" اس سے قبل کبھی کوئی بھیڑیا نہیں دیکھا تھا۔ البتہ اس کی چاپیں ضرور سنی تھیں۔ آواز بھی سنی تھی۔ اور پھر اسی وجہ سے اس کے ذہن میں کسی اصل بھیڑیے کے بجائے بھوت کا خیال آیا تھا۔ اور اب۔۔۔ اس کا دماغ آہستہ آہستہ خواب دیکھنے لگا تھا۔ اور رجیا منتظر تھی۔ مسکرائے جا رہی تھی۔ پراسرار انداز میں۔

چوراہے پر اس صبح رجیا میری منتظر تھی۔ سورج کی روشنی میں وہ ایک عام سی دیہاتی لڑکی نظر آرہی تھی۔ اس نے میری پاس پہنچتے ہی میرے شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے اور مجھے اپنے بدن میں برف اور آگ کے ملاپ کا احساس ہونے لگا۔

"تمہاری بیوی کا کیا حال ہے؟" اس نے سرگوشی کی۔

"کچھ اچھا نہیں۔" میں نے کہا۔ "دروازے کے باہر اس نے بھیڑیے کے پیروں کے نشانات دیکھ لیے ہیں اور وہ بے حد پریشان ہے۔ وہ سمجھ رہی ہے کہ وہ کوئی بھیڑیے کا بھوت تھا۔ رجیا کے ہونٹوں پر ایک پراسرار سے مسکراہٹ ابھری۔

"کیا تم مجھے نہیں بتاؤ گی کہ یہ سب ماجرا کیا ہے؟"

وہ جواب میں صرف مسکرا دی۔

میں نے لمبی سانس لی اور کہا۔ "میرا خیال ہے تم سے کچھ پوچھنا بہتر نہیں۔"

"بے شک تم نے ٹھیک سمجھا۔" رجیا نے کہا۔

"ہمارا منصوبہ کامیاب ہو رہا ہے یہی کافی ہے جلد ہی وہ ہمارے درمیان سے ہٹ جائے گی اور پھر ہم ایک ہو جائیں گے۔ تم مجھے بہت اچھے لگے ہو ہم پھر ہمیشہ ایک رہیں گے۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر اب ہو گا کیا؟"

"ابھی تک تمہاری بیوی کو بھیڑیا نظر نہیں آیا ہے مگر اب وہ اسے نظر بھی آئے گا اور پھر وہ خوف زدہ ہو جائے گی۔ تم اس کی کوئی بات نہ ماننا۔۔۔ وہ پھر یہاں کے افسران بالا سے ملے گی یا وہ گاؤں کے آدمیوں سے ملے گی اور پھر ممکن ہے تم سے کچھ پوچھ گچھ ہو مگر تم کہنا مجھے کچھ معلوم نہیں نتیجتاً" سب اسے پاگل سمجھنے لگیں گے۔ پھر اس کا میڈیکل ہو گا۔۔۔ پھر۔۔۔

"اچھا۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تو وہ اب مجسم بھیڑیے کو بھی دیکھے گی؟"

"ہاں؟"

"اور وہ کب؟"

"آج ہی۔۔۔ اگر تم کہو۔"

"وہ تو بہت خوفزدہ ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ تو شاید کیبن سے باہر ہی نہیں جائے گی۔"

اس صورت میں رجیا نے کہا۔ "بھیڑیا خود اس کے پاس جائے گا۔"

"خوب" میں نے کہا۔ "میں آج ہی دروازے پر بنے بھیڑیے کے نشانات کو مٹا دوں گا" "یہ ٹھیک

ہے۔" رجیا نے کہا۔۔۔ "اور دیکھو تم کسی بہانے آج رات کیبن سے باہر رہنے کی کوشش کرنا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم شاید اپنی بیوی کو خوف زدہ ہوتے نہ دیکھ سکو۔"

تصور ہی تصور میں میں نے سیما کے خوف زدہ چہرے کو دیکھا۔ اس کی دہشت سے پھیلی آنکھیں مجھے نظر آئیں۔ اس کا کانپتا ہوا جسم اور ہر چاپ پر چونکتے ہوئے کان۔۔۔ پھر میں واپسی کے لیے مڑ گیا۔

میں نے اپنے پیچھے رجیا کے منہ سے نکلنے والے ایک کھنکتے ہوئے قہقہے کی آواز سنی۔ عجیب و غریب سی ہنسی تھی۔ جیسے کوئی پاگل ہنسا ہو۔

یقیناً" اس قہقہے میں غیر فطری پن پوری طرح جھلک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس شام میں نے اور سیما نے بڑی خاموشی سے کھانا کھایا۔

چاند جب ذرا چڑھ آیا اور جھیل روپہلی نظر آنے لگی تو میں نے سیما کی طرف دیکھا۔ اس کے رخساروں کے گلاب مرجھائے مرجھائے تھے آنکھیں بیمار لگ رہی تھیں اور بال الجھے ہوئے تھے۔

"میں سمجھتا ہوں میں نے کہا۔ "یہ جگہ تمہیں راس نہیں آ رہی ہے۔ مجھے تو ابھی یہاں کچھ عرصہ مزید ٹھہرنا ہوگا تم مناسب سمجھو تو شہر واپس چلی جاؤ۔"

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"میں اکیلی تو نہیں جا سکتی۔"

"کیوں؟"

"وہ میرا تعاقب کرے گا۔"

"مگر شہروں میں بھیڑیے نہیں جاتے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں۔" اس نے کہا۔ "مگر وہ عام سا بھیڑیا نہیں ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے یہ بھیڑیا کوئی خاص چیز ہے نا؟"

"ہاں۔"

"تم اس طرح کیوں سوچ رہی ہو؟"

وہ تذبذب کے عالم میں چپ رہی پھر بولی۔

"اس لیے کہ وہ صرف راتوں میں آتا ہے اور اس لیے کہ ادھر بھیڑیے نہیں ہیں۔ وہ مجھے شکار نہیں کرنا چاہتا بلکہ دہشت زدہ کر رہا ہے۔ میں اس کے اندر چھپی خباثت کو محسوس کر رہی ہوں۔۔۔ میں اس سے بچ نہیں سکتی۔"

"تم اس سے صرف اس لیے نہیں بچ سکتیں کہ وہ صرف تمہارے دماغ میں ہے۔" میں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔ "صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے میں پچھلے ہفتہ بھر سے تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ اگر تم اپنے اس خلل سے نجات حاصل نہیں کر سکتیں تو پھر مجھے ڈاکٹر نور کو بلانا ہی پڑے گا۔"

میری جھڑکی نے اسے دل برداشتہ سا کر دیا۔ اس نے برے لہجے میں کہا۔

"گویا تم مجھے واقعی پاگل سمجھنے لگے ہو؟"

"تم ہمیشہ غلط سمجھتی ہو" میں نے تند لہجے میں کہا۔ "تمہاری ذہنی کیفیت خاصی ایب نارمل ہو رہی ہے۔ میں تمہیں ڈاکٹر سے ملانا چاہتا ہوں سیدھی سی بات ہے۔" میں جھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم کہاں جا رہے ہو۔" اس نے پوچھا۔

"میں ذرا کیفے تک جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میری طبیعت مکدر ہو رہی ہے۔"

"مگر میں یہاں اکیلی ڈروں گی۔" اس نے سرگوشی کی۔

"فضول باتیں مت کرو۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "اس طرح خوف زدہ ہونا کسی طرح مناسب نہیں۔ تم کچھ دیر اکیلے رہ کر خود کو آزماؤ۔ اس طرح تمہاری ذہنی تربیت ہو جائے گی تم میں اعتماد پیدا ہوگا۔ ویسے میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔

"سامی۔۔۔" اس نے التجا کی۔

مگر میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ میں نے جاتے جاتے اسے مسکرا کر دیکھا۔

میری مقتول ایک میل کے فاصلے پر میری منتظر تھی۔ میں کیفے نہیں بلکہ رجیا کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اجیالی رات میں میرے قدم تیز تر ہو رہے تھے۔ رجیا کا مکان اندھیرے میں کھڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر وہ سو بھی گئی ہوگی تو میں اسے آسانی سے جگا لوں گا۔ اس کا مفلوج باپ میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ میں یہ چاندنی رات ضائع کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ دروازے کے پاس ہلکی سی چاپ نے مجھے چونکا دیا کوئی آہستگی باہر آیا تھا۔

"رجیا؟" میں نے آہستہ سے پکارا۔

وہ رجیا ہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر میرا بازو تھام لیا۔

"آج رات ہم جھیل کنارے گزاریں گے۔" اس کے بعد دیر تک ہم دونوں جھیل کے کنارے کھڑے رہے۔ اور جب میرے ہاتھ اس کے بدن کو حمائل ہو گئے تو اس نے خود کو علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں سامی۔۔۔ مجھے جانے دو۔"

"کیوں؟"

"میں تنہائی چاہتی ہوں۔"

"تنہائی؟۔۔۔ کیوں؟"

"بس یوں ہی۔"

"کیا کچھ گڑبڑ ہے؟"

"نہیں نہیں ایسے ہی۔"

میں نے اسے گھورا۔ کجرائی آنکھیں گھنیری زلفیں۔۔۔ اس کے بھیگے بھیگے ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ اور رخساروں پر ہلکا سا پسینہ تھا وہ ہر چند کہ میری ہی طرف منہ کیے کھڑی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے نہیں بلکہ میرے پیچھے کسی اور کو دیکھ رہی ہو غالباً" وہ جھیل پر دمکتے پورے چاند کو دیکھ رہی ہو۔ اس کی سیاہ پتلیوں میں سے دو چاند جھانک رہے تھے۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے اس کی آنکھیں پھیل رہی ہوں۔ ان میں ایک روپہلا الاؤ سا دہکنے لگا تھا۔

"جاؤ۔۔۔ سامی جاؤ۔" اس نے سسکاری سی لی۔ مگر میں رکا رہا۔

یہ موقع کھونے والا نہ تھا۔ کسی انسان کو حیوانی قالب میں جاتے دیکھنے کا عمل روز روز آدمیوں کی زندگی میں نہیں آتا۔ میں اس وقت حقیقتاً" ایک عورت کو بھیڑیے کے قالب میں جانے کا منتظر دیکھ رہا تھا۔

سب سے پہلے رجیا کی سانسیں تیز ہوئی تھیں۔ وہ بری طرح ہانپنے لگی تھی۔ میں اس کے سینے کو ابھرتے ڈوبتے دیکھ رہا تھا۔۔۔ انہیں تبدیل ہوتے دیکھ رہا تھا۔

اس کے ہاتھ آگے کی طرف ڈھلک آئے تھے۔

پھر وہ زمین پر گر گئی۔ وہ درختوں کے سائے اور اس میں سے چھنتی روشنی میں جیسے کلبلا رہی تھی۔ چاندنی جیسے مدھم ہو گئی تھی۔ اس کی جلد مٹیالی سی لگ رہی تھی اور اس میں روئیں اگنے لگے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سخت کرب میں مبتلا ہو۔

یہ بہت عجیب و غریب منظر تھا خصوصیت سے اس کے سر کو حیوان کے سر میں بدلنے کا منظر پھر اس کے کان لمبے ہو گئے اور سر میں ادھر ادھر نکل آئے۔ گردن لانبی ہو کر سامنے کو نکل پڑی۔ آنکھیں اوپر چڑھ گئیں۔ اس کے منہ سے اب تیز غراہٹیں نکل رہی تھیں۔

پھر اس کے کپڑے جسم سے الگ ہو کر زمین پر گر گئے۔ میں بھونچکا اور ششدر سا اس کے پیروں کو درندے کے پیروں میں ڈھلتے دیکھ رہا تھا۔ جہاں ہاتھ اب ایک کھر کی سی ہیئت اختیار کر رہے تھے۔ روئیں دار۔۔۔ چھریرے بالوں والی پیر۔"

اس سارے مرحلے نے مشکل سے تین منٹ لیے ہوں گے۔ میرے اندر کا خوف بے پناہ دلچسپی اور تجسس تلے دب گیا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے پورے مرحلے کو ذہن نشین کیا۔

اب یہ تبدیلی مکمل ہو چکی تھی۔

میرے سامنے اب رجیا نہیں تھیں بلکہ اس جگہ ایک مادہ بھیڑیا کھڑی ہوئی تھی۔

ہانپتی ہوئی اور چوکس۔

☼ ☼ ☼

اس لمحے مجھے معلوم ہوا کہ رجیا کے جاننے والوں کی

تعداد اتنی کم کیوں تھی۔ وہ تنہائی پسند کیوں تھی۔ اور کیوں اس نے کسی بھیڑیے کے ظہور کے بارے میں اتنے اعتماد سے مجھ سے باتیں کی تھیں۔

میں اسے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

درندے کی آنکھیں اس وقت التجائی انداز میں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ان میں میری طرف سے خوف اور شبہ جھانک رہا تھا۔ شاید وہ ڈر رہی تھی کہ میں اس سے بدظن ہو جاؤں گا۔ اس حیثیت میں اسے دیکھ کر مجھے کراہیت آنے لگے گی۔

مگر میری مسکراہٹ کو دیکھ کر اس کا اعتماد بحال ہونے لگا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی گردن تھپکی اور پیار بھرے انداز میں کہا۔ "جاؤ۔" میں نے دوبارہ کہا۔

"رجیا تم فکر نہ کرو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

میرے الفاظ سے اس چوکس درندے نے آہستہ سے قدم اٹھایا۔ پھر اس نے اچھال بھری اور قریبی جنگل کی طرف دوڑنے لگا۔

میں کچھ دیر جھیل کنارے کھڑا رہا۔ اور ابھرتے چاند کو دیکھتا رہا۔

اس لمحے میں نے سوچا۔

"تو میں ایک ایسی لڑکی کو چاہتا ہوں جو میری بیوی کو بھگانے پر تلی ہوئی ہے اور میں اس کا ساتھی بھی ہوں۔ یقیناً" وہ ایک بد روح تھی۔ میں نے سوچا شاید میں خود بھی کوئی بد روح ہوں۔"

تبھی مجھے دوری پر کسی بھیڑیے کی ڈھاریں سنائی دیں۔ میں ایک دم سے چل پڑا۔ میں جلد سے جلد اپنے کیبن میں پہنچنا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

جب میں کیبن پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اردگرد تاریکی پھیلی ہوئی ہے اور دروازہ اندر سے بند ہے۔

مجھے اندر سے سیما کی ہلکی ہلکی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ مگر وہ زندہ تھی۔

یہ ایک خیال ہی تھا کیونکہ بھیڑیے صرف ڈراتے ہی نہیں بلکہ وہ جان بھی لے لیتے ہیں۔

دروازہ کھلتے ہی وہ مجھ سے بری طرح چمٹ گئی اور زور زور سے رونے لگی۔

"وہ یہاں آیا تھا۔" وہ گھگھیائی۔ "آج میں نے اسے دیکھا بھی ہے۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا تھا۔ میرے خدا کیسی بھیانک آنکھیں تھیں سرخ سرخ انگارے جیسی پھر میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ مجھے چھپا لو سامی....

میں نے مناسب الفاظ سوچتے ہوئے کہا۔

سب تمہارا او ہم ہے.... کوئی بھیڑیا ہوتا تو تم کو زندہ نہ چھوڑتا۔ ویسے میں صبح ہوتے ہی کوئی بندوبست کروں گا۔ میں شکار پارٹی کا انتظام کر کے اگر کوئی بھیڑیا ہوا تو اسے ٹھکانے لگوا دوں گا۔"

میرے سمجھانے پر وہ ذرا سی سنبھلی اور پھر اپنے بستر پر جا گری۔

میں دوپہر تک سوتا رہا۔ پھر سیما نے مجھے جگایا۔ ناشتے کے بعد ہم دونوں نے باہر جا کر دیکھا۔ میرے کیبن کے چاروں طرف بھیڑیے کے پیروں کے نشانات موجود تھے۔

میرے لیے مکرنے کی گنجائش بہت کم تھی۔ "بہتر ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔" پھر میں چل پڑا۔

راستے بھر میں سوچتا رہا۔ منصوبے بناتا رہا۔ کیفے میں چائے کے آرڈر کے بعد سے منصوبہ بندی رک گئی۔ چودھری نے میری سمت جھکتے ہوئے اچانک پوچھا "کیوں جناب سب خیریت ہے نا؟" اس کے لہجے میں کچھ چھپا ہوا تھا۔

میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "کیوں؟"

میں نے کہا۔ "سب ٹھیک ہے۔ بس میری بیوی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"تمہارا کیبن ذرا الگ تھلگ جگہ پر ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں یہ بات تو ہے.... مگر؟"

"رات کو تم نے کوئی آواز تو نہیں سنی؟"

"ارے بھئی ادھر تو آوازوں کا راج ہے۔ جھینگروں مینڈکوں اور مکوڑوں کی آواز سے ساری رات گونجتی رہتی ہے۔"

"نہیں میں دراصل یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم نے رات کو کسی بھیڑیے کی آواز تو نہیں سنی؟ چودھری ایک دم سے اصل موضوع پر آ گیا۔

"بھیڑیے کی آواز۔" میں نے اداکاری کی۔

"مگر ادھر تو بھیڑیے نہیں ہیں۔"

"ہاں" چودھری نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن لگتا ہے کہیں سے ادھر کوئی بھیڑیا آ گیا ہے۔ تم موٹے پیرو کو جانتے ہو؟" وہی جو ایک گائیڈ ہے۔ وہ ادھر تمہارے کیبن سے کچھ فاصلے پر ہی رہتا ہے۔"

"ہاں' ہاں میں اسے جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ رات کو جھیل کے اس پار کسی شکار پارٹی کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ اس کی لڑکی گھر میں اکیلی تھی۔ اسی سے معلوم ہوا ہے کہ ادھر کوئی بھیڑیا آ گیا ہے۔"

"یہ بات اسے لڑکی نے بتائی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں یہ بات تو ڈاکٹر نور سے معلوم ہوئی ہے۔ وہ ادھر سے گزرے تھے۔ صبح کے وقت وہ پیرو کی خیریت معلوم کرنے کے لیے رکے تھے تو پتا چلا کہ کیبن کے اندر لڑکی فرش پر پڑی ہوئی ہے۔ لڑکی کیا۔ اسے لڑکی کی لاش کہو۔ بھیڑیے نے اس کا نرخرہ ادھیڑ دیا تھا۔ خدا اسے جنت نصیب کرے۔" اس نے رک کر ٹھنڈی سانس بھری۔

"ڈاکٹر نور کو وہاں زمین پر بھیڑیے کے پیروں کے نشانات بھی نظر آئے تھے۔ موٹا پیرو آج آئے گا تو وہ یقیناً" اس بھیڑیے کو جہنم رسید کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ میں خود بھی اس علاقے کی پولیس کو اطلاع دینے جا رہا ہوں۔

"سیما۔" میں نے کافی ختم کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اکیلی ہے۔ اس صورت میں مجھے گھر لوٹ جانا چاہیے۔"

☼ ☼ ☼

اب مجھے پتا چلا تھا کہ رجیا رات کو مجھ سے رخصت ہو کر کہاں گئی تھی۔

میں رجیا کے کیبن کی طرف چل دیا۔ میری دستک پر اس نے دروازہ کھولا۔ دھوپ میں اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں اس کے بال کاندھے پر بکھرے ہوئے تھے۔

"سامی" اس نے سسکی سی لی۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اسے لے کر درختوں کی طرف چل دیا۔

ایک جگہ رک کر میں نے اس کے گال پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی حیرت سے اس نے مجھے دیکھا۔

"کیوں مار رہے ہو مجھے؟" وہ چیخی۔

"تم مجھ سے پوچھتی ہو۔" میں نے غصے سے کہا۔

اور تب وہ جیسے سارا معاملہ سمجھ گئی۔

اس نے روتے ہوئے کہا۔ "سامی میں مجبور تھی۔ بہت مجبور تم نہیں سمجھ سکتے۔"

"میں نہیں سمجھ سکتا۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"تجھے پتا ہے کچھ۔ موٹے پیرو کی لڑکی مر چکی ہے۔"

"مر گئی؟" رجیا نے حیرانی سے کہا۔ "چلو اچھا ہوا۔"

"خوب۔" میں نے کہا۔ "گویا یہ کوئی اچھی بات تھی؟"

"ہاں' رجیا نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ اچھا ہی ہوا ہے۔ وہ اگر بچ جاتی تو بہت برا ہوتا۔ وہ بھی میری ہی طرح ہو جاتی.... ہیئت بدلنے پر مجبور...."

"اوہ۔" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں" وہ بولی۔ "جو کچھ ہوتا ہے میری مرضی سے نہیں ہوتا۔ شروع شروع میں تو میں اسے موقع پر گھنے

جنگلوں میں چلی جاتی تھی۔ مگر کل رات میں مجبور ہو گئی تھی۔ جبلی بھوک نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔

بے چاری لڑکی۔

"مگر۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"تم نہیں جانتیں۔ اس سے ہمارا سارا منصوبہ خاک میں مل جائے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"اب میری بیوی اسے وہم نہیں سمجھے گی۔ اسے کوئی پاگل قرار نہیں دے سکتا۔"

رجیا اچانک سناٹے میں چلی گئی۔

"مگر گھبرانے کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔

"اب کوئی اور ترکیب کرنی ہو گی۔ تم وعدہ کرو کہ اب تم کسی بھی حالت میں میری بیوی کے پاس نہیں جاؤ گی۔"

"ٹھیک ہے' رجیا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں کوشش کروں گی مگر آج رات تمہیں میرے پاس آنا ہو گا۔ تمہاری قربت مجھے حیوانی بھوک سے محفوظ رکھے گی۔"

"اچھی بات ہے میں آجاؤں گا۔"

معاً اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ شاید اسے کوئی خیال آگیا تھا۔ اس نے کہا۔

"سامی کوشش کرنا کہ چاند نکلنے سے پہلے ہی تم میرے پاس آجاؤ۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

☼ ☼ ☼

میں جب کیبن میں پہنچا تو سیما کو پیرو کی بیٹی کی ہلاکت کی خبر مل چکی تھی۔ کوئی اس کے پاس آیا تھا اور سیما کو سارا قصہ معلوم ہو گیا تھا۔ سیما نے مجھے بتایا۔ "میں نے اس سے اپنے ساتھ پیش آنے والے تمام واقعات کی تفصیل بتا دی ہے۔" آنے والے کا نام عابدی تھا اور وہ اس علاقے کا پولیس آفیسر تھا۔

ابھی ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ عابدی دوبارہ آدھمکا۔ آتے ہی اس نے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ پھر اچانک ہی اس نے مجھ سے پوچھا۔

"مسٹر سامی آپ بتائیں گے کہ رات جب بھیڑیا ادھر آیا تھا تو آپ کہاں تھے؟"

"میں قصبے میں تھا۔"

"کس جگہ۔"

"میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ کہیں رکا نہیں تھا۔"

"اچھا" عابدی چند لمحوں تک مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"ہم نے ایک گشتی پارٹی کا بندوبست کر دیا ہے۔ آپ شاید ہی اس میں شرکت پسند کریں کیونکہ میں نے سنا ہے آپ ایک رائیٹر ہیں اور پراسرار کہانیاں لکھنے کی وجہ سے کافی مشہور ہیں آپ کا کیا خیال ہے اس کیس کے بارے میں؟" میں چپ رہا۔

اس نے دوبارہ کہا۔ "یہ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ ممکن ہے آپ کی سوچ جو یقیناً مختلف ہی ہو گی' میری مدد کر سکے۔"

میں سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ پولیس آفیسر کا لہجہ زہریلا تھا۔

"کیا آپ سمجھتے ہیں۔" میں نے بھی کٹیلے انداز میں کہا۔

"کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں سب میری سرگزشت ہوتی ہے؟ کیا آپ کو میں کوئی بدروح نظر آتا ہوں۔"

میرے غصے کو محسوس کرتے ہوئے عابدی مسکرایا۔

اس نے کہا۔ "جناب میرا تو کام ہی یہی ہے کہ میں ہر ایک پر شبہ کروں۔" پھر ہنستے ہوئے اس نے کہا۔ "ذرا آپ منہ کھول کر مجھے اپنے دانت دکھا دیں۔"

میں نے منہ کھول دیا۔

اس نے دانتوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ ویسے نہیں ہیں جیسے میں نے سوچا تھا۔

میرے لیے چڑھائی کرنے کا اچھا موقع تھا۔

"مسٹر عابدی۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں آپ کا کیا خیال ہے میں کوئی جادوگر ہوں جو اپنا قالب بدل سکتا ہو.... کیا آپ سمجھتے ہیں کہ لڑکی کو میں نے ہی ہلاک کیا

ہے؟" جواب میں عابدی اٹھ پڑا... اس نے میرے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔ آپ نے مجھے خاصی اچھی معلومات فراہم کیں ہیں۔"

اس لمحے میں نے واقعی عقل مندی کی تھی اگر میں گرمی نہ دکھاتا تو شاید وہ انہیں لکیروں پر چل پڑتا۔ مجھے اچھی طرح پتا تھا کہ اس علاقے کے لوگ حد درجہ توہم پرست ہیں اور یہ سب کے سب بھوت پریت کے قائل ہیں پھر میں سیما کی سمت متوجہ ہوا۔

"اب تم مطمئن ہو جاؤ پولیس بھیڑیے کے پیچھے لگ چکی ہے۔ وہ جلد ہی مار لیا جائے گا۔"

سیما نے مطمئن ہو کر مجھے دیکھا۔ پھر میرے پاس آ کر بولی۔

"آج رات تم گھر پر ہی رہو گے میری بھویں تن گئیں۔"

"نہیں" میں نے کہا۔ "میں شکار پارٹی میں شرکت کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

"مگر اکیلے مجھے ڈر لگے گا۔"

"فضول بات ہے۔" میں نے اسے جھڑکا۔

"تم دروازے بند رکھنا... عابدی مجھے مدعو کر گیا ہے میں پارٹی میں شریک ہوں گا۔"

☼ ☼ ☼

چاند اس وقت تک چڑھا نہیں تھا جب میں رجیا کے کیبن پر پہنچا تھا۔

وہ اندھیرے میں میری منتظر کھڑی تھی۔ "تم آگئے" وہ میرے قریب پہنچتے ہوئے بولی۔ "مجھے آج ڈر سا لگ رہا ہے۔"

"کیوں؟"

"تمہیں پتا ہو گا۔" اس نے کہا "پولیس میری تلاش میں لگ چکی ہے۔ وہ میرے پاس بھی آئے تھے۔ یہ سب اس سور چودھری کی حرکت ہے جو میرے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا ہے۔"

"اچھا؟"

"ہاں۔" اس نے کہا۔ "شکار پارٹی نکل چکی ہو گی۔ وہ لوگ موٹے پیرو کے کیبن سے آغاز کریں گے اور جھیل کے دوسرے کنارے تک جائیں گے۔"

"مگر۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "آج تو بھیڑیا انہیں نظر ہی نہیں آئے گا۔ کیوں رجیا؟ آج تو ہم دونوں ساتھ ساتھ رہیں گے۔"

"ہاں' وہ سوچتے ہوئے بولی۔ اور زمین پر بیٹھ گئی۔ اس نے جیب سے ایک بوتل برامد کی۔

"تم پیو گے؟" اس نے پوچھا۔

اچانک وہ عجلت کے ساتھ مجھ سے لپٹ گئی۔

"تم نے سنا کچھ؟" اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

واقعی کہیں دوری پر آدمیوں کے منہ سے نکلنے والے ہنکارے گونج رہے تھے ساتھ ہی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ جو شکاری پارٹی کے ساتھ تھے۔ رجیا کا جسم کپکپا رہا تھا۔

میں نے اسے اپناتے ہوئے چاند کی طرف دیکھا۔ میرے چاروں طرف سناٹا تھا اور چاند کی ہلکی روشنی میں رجیا کا بھیگا بھیگا چہرہ متوحش ہو رہا تھا۔

میں نے سوچا لوگ جس بھیڑیے کی تلاش میں ہیں وہ تو میری آغوش میں رہے۔ چاند اور لڑکی کا چہرہ دونوں جیسے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ اس وقت مجھے اپنی ایک کہانی میں اپنا ہی لکھا ہوا ایک جملہ یاد آیا....

"اور جب چاند عروج پر ہوتا ہے تب اس کی کشش کی شدت انسانی بھیڑیے کی نس نس میں آگ بھر دیتی ہے اور وہ اپنا انسانی چولا اتار پھینکتا ہے اور...."

"رجیا کیا تم محسوس کر رہی ہو کہ کچھ ہونے والا ہے؟" میں نے اس کی کپکپی کے پیش نظر پوچھا۔

"نہیں.... آج رات تو نہیں۔ میں ہر لحہ تمہارے قریب ہوں گی۔"

"اور دیکھو' میں نے تنبیہہ کی۔" جب تک یہ شور شرابہ ختم نہیں ہو جاتا تم اب راتوں میں باہر نکل کر سیما کو نہیں ڈراؤ گی۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے ہامی بھری۔

"تمہیں کچھ عرصہ صبر کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔
کچھ دیر تک میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔ "اس میں کچھ وقت لگے گا۔"

"منصوبہ اتنی جلدی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میرا مطلب ہے طلاق اتنی جلدی نہیں ہو سکتی۔ بہت سی قانونی کارروائیاں ضروری ہیں۔ رجیا تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔"

"اس میں بہت وقت لگے گا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم نے وعدہ کیا ہے کہ تم انتظار کرو گی۔۔۔ تم سیما کو کوئی نقصان نہ پہنچانا۔ جب تک طلاق نہیں ہو جاتی۔۔۔ ورنہ پھر ہمارا املاپ نا ممکن ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "میں انتظار کر لوں گی۔"

پھر ہم دونوں مشروب سے شغل کرنے لگے۔ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے۔

پھر پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی تھی۔

"جاگو۔۔۔ اٹھو' اٹھو۔"

کسی آواز نے مجھے جگا دیا۔ کوئی مجھے گردن سے ہلا رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ چاند پوری طرح آسمان میں چڑھ چکا تھا اور اس کی کرنیں اب ہمارے سروں پر پڑ رہی تھیں۔

اور تب میں نے دیکھا کہ میرے سامنے ڈاکٹر نور کھڑا ہوا ہے۔

"اوہ۔۔۔" میں غنودہ انداز میں کراہا۔

اور پوچھا "رجیا کہاں ہے؟"

"رجیا؟" ڈاکٹر نے عجلت سے کہا۔ "جلدی سے اٹھو یہاں کوئی رجیا وجیا نہیں۔"

میں اٹھ گیا۔ میرے حواس اب بحال ہو رہے تھے۔

"جلدی سے میرے ساتھ چلو۔" ڈاکٹر نے عجلت سے مجھے ٹھوکا دیا۔

"کیوں؟" میں اس کے ساتھ گھسٹتے ہوئے بولا۔

"غضب ہو گیا ہے' اس نے کہا۔ "تمہاری بیوی بھیڑیے کا شکار ہو گئی ہے۔ بھیڑیا تمہاری عدم موجودی میں کس طرح کیبن میں پہنچ گیا تھا اور۔۔۔"

"اور۔۔۔" میں نے چیخ کر پوچھا۔

"اور بھیڑیے نے جانے سے قبل تمہاری بیوی کا نرخرہ ادھیڑ دیا تھا۔"

☆ ☆ ☆

میں ڈاکٹر کے ساتھ اندھیرے اجالے میں دوڑتا ہوا سوچ رہا تھا' تو رجیا نے غلط بیانی کی تھی۔ اس میں انتظار کی ہمت نہ تھی۔ وہ میرے سو جانے کے بعد ادھر گئی ہو گی۔

جب ہم کیبن میں پہنچے تو بستر پر جھکتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا۔

"مسٹر سامی۔ خوش قسمتی سے سیما مری نہیں۔ وہ صرف شدید زخمی ہے۔"

میں نے جھک کر دیکھا۔

سیما کے گلے پر پٹی کر دی گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے آنکھیں کھولیں پھر ایک کمزور سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری۔

"شکر ہے خدا کا۔" میں نے کہا۔ "کہ یہ زندہ ہے۔"

"ہاں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "میں خون روکنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ دو چار دن میں ٹھیک ہو جائے گی' رک کر ڈاکٹر نے کہا۔

"اچھا تم اب انہیں آرام کرو۔" چلتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں یہاں بروقت پہنچ گیا تھا۔ بھیڑیا کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر آیا تھا۔ شکاری پارٹی بس آ ہی رہی ہو گی۔ انہیں پیروں کے نشانات نظر آ گئے ہوں گے۔" میں نے سر ہلا دیا۔

اچانک جنگل کی سمت سے شور اٹھا۔

اس شور میں کتوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

ڈاکٹر نوری نے اپنی مونچھیں سہلاتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے پارٹی کو بھیڑیے کا پتا چل گیا ہے۔"

رک کر وہ چیخا۔۔۔ "سنو غور سے سنو۔"

نعرے اور گونج جھاڑیوں کی طرف بلند ہوتا شور پھر۔۔۔ ایک ساتھ کئی بندوقیں چلنے کی آوازیں ابھریں اور سناٹا لرزنے لگا۔

"مار لیا۔" ڈاکٹر خوش ہوتے ہوئے اچھلا۔ اس نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے شکار پارٹی کامیاب ہو گئی۔"

ہمیں اب کتوں کی آوازیں واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔ بہت سے قدموں کے دوڑنے کی آوازیں بھی اٹھ رہی تھیں۔

تب جہاں سے میدان شروع ہوتا تھا۔ کیبن کے بالکل سامنے ہمیں ایک اونچے سے قد اور بھیڑیے کا ہیولا دکھائی دینے لگا جو تیزی سے بھاگتا ہوا ادھر آ رہا تھا۔ اس کے انداز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

بھیڑیے کا بھورا جسم لمبی دوڑ میں جواب دیتا محسوس ہو رہا تھا۔۔ اس کا خون جسم سے گر گر کر راستے کو بھگو رہا تھا۔

ڈاکٹر نور نے جلدی سے اپنی جیب سے ایک ریوالور نکالا اور نشانہ لینے لگا۔

"رک جاؤ۔" میں نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر میں بھیڑیے کی طرف بڑھا۔ اس کے نزدیک پہنچ کر میں نے سرگوشی کی۔

"رجیا تم نے غلط بیانی کیوں کی؟ تمہیں انتظار کرنا تھا۔"

جواب میں ہانپتے ہوئے درندے نے میری آنکھوں میں جھانکا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے پہچان نہ پا رہی ہو۔ اس کی روشن آنکھوں میں موت کی دھند طاری ہو چلی تھی۔

"رجیا۔" میں نے اسے ہولے سے پکارا۔ میری آواز ڈاکٹر تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ مگر درندہ ضرور سن سکتا تھا۔ اور اس نے سن بھی لیا۔ اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے شناسائی ابھری پھر اس کے حلق سے ایک کراہ ابھری۔ اس کا جسم زور سے کانپا اور پھر تیورا کر زمین بوس ہو گیا۔

اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔

پھر جو منظر سامنے آیا اسے دیکھنا آسان کام نہ تھا۔

اس سے قبل جب رجیا میرے سامنے بھیڑیے کے جسم میں ڈھلی تھی میں نے یہ منظر دیکھا تھا اور اب میں اس کے حیوانی بدن کو انسانی جسم اختیار کرتے دیکھ رہا تھا ایک بھیڑیے کی لاش ایک آدمی کی لاش میں تبدیل ہو رہی تھی۔

فرش پر پڑے درندے کا جسم اچانک حجم میں بڑھنے لگا۔ اس کے کان چھوٹے ہونے لگے اس رفتار سے اس کے ہاتھ اور پیروں میں بھی فرق پڑنے لگا۔ ڈاکٹر نور جواب میرے قریب پہنچ چکا تھا زور زور سے چیخنے لگا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا میرے کان نہیں سن رہے تھے۔ میں تو

اب......؟؟

ایک خاتون مرغی کی دکان پر پہنچیں اور ایک مرغی خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ دکاندار نے ایک کٹی ہوئی صاف ستھری سالم مرغی اٹھائی اور اسے تولنے کے بعد بولا "اس کی قیمت چھتیس روپے ہے۔

خاتون نے تنقیدی نظروں سے مرغی کا جائزہ لیا اور بولیں: "یہ تو بہت چھوٹی ہے کیا آپ کے پاس اس سے بڑی مرغی نہیں ہے۔؟" اتفاق سے دکان میں وہ واحد مرغی تھی لہٰذا دکاندار نے وہی چھوٹی مرغی اُٹھائی اور عقبی کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے مرغی کو کھینچا، پنجا اس پر ایک چوٹ لگائی، مرغی کی جسامت بڑھنے پر وہ اسے لے کر واپس دکان کے اگلے حصے میں پہنچ گیا' مرغی کا وزن کر کے اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "اس مرغی کی قیمت بیالیس روپے ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" خاتون نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "آپ مجھے دونوں مرغیاں دے دیں۔"☆

رجیا کی لاش کو حیرت میں گم تکے چلا جا رہا تھا۔

تین منٹ کے اندر ہی ساری تبدیلی مکمل ہو گئی جہاں کچھ دیر قبل ایک بھیڑیا گرا تھا وہاں اب رجیا کا عریاں بدن لاش کی صورت میں پڑا ہوا تھا۔ شاخ سے ٹوٹے ہوئے کسی پتے کی طرح۔

میں نے سسکی سی لی اور منہ گھماتے ہوئے بولا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔“

تبھی ڈاکٹر کی تیز آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

ایک بار پھر اس جوان لاش میں ایک اور تبدیلی ہونے لگی تھی۔

یہ تبدیلی ناقابل برداشت تھی۔ مجھے اس وقت بس اتنا یاد تھا کہ رجیا نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کب اور کن حالات میں تبدیلی قالب کی قوت پر قادر ہوئی تھی۔ البتہ مجھے یہ ضرور معلوم تھا کہ شکار کا خون درندے کو ہمیشہ جوان رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

رجیا کا پرشباب بدن اچانک ہی ایک انتہائی عمر رسیدہ عورت کی شکل اختیار کرنے لگا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہڈیاں گلنے لگیں اور پھر۔۔۔ لاش کی جگہ صرف راکھ کا ایک ڈھیر رہ گیا۔

بعد کی باتیں بڑی تیزی سے ہوئیں۔ شکار پارٹی پہنچ گئی تھی۔

اور جب ڈاکٹر راکھ کے اس ڈھیر کا معائنہ کرنے کے لیے جھک رہا تھا۔ میرا سر گھوما تھا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔

میں دوسرے روز کافی دیر تک سوتا رہا۔ جب میں جاگا تو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر سیما کی گردن کی پٹی بدل رہا ہے۔ مجھے جاگتا دیکھ کر اس نے مجھے کوئی دوا دی تو میں ایک بار پھر نیند میں چلا گیا۔

دوسری صبح جب ڈاکٹر آیا تو میں ٹھیک ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر نے بڑی عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا اس نے لوگوں سے بھیڑیے کے بھوت ہونے کی تصدیق تو کر دی تھی مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ بھیڑیے کے روپ میں رجیا تھی۔

پھر عابدی کی مدد سے یہ سارا معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔

سیما بھی ٹھیک ہو چلی تھی۔

کل رات میں نے سیما کو سب کچھ بتا دیا تھا سارے راز اس پر ظاہر کر دیے تھے۔ جواب میں وہ صرف مسکرا دی تھی۔

میرا خیال ہے شہر واپس ہو کر وہ مجھ سے پہلی فرصت میں طلاق لے لے گی۔ ویسے مجھے پتا نہیں اس نے تبصرہ تو نہیں کیا تھا کوئی البتہ رات کو بے چین سی ضرور رہی تھی اور آج صبح ہی صبح باہر گھومنے نکل گئی ہے۔

اور میں۔۔۔

صبح سے بیٹھا۔۔۔ یہ ساری کہانی کاغذ پر منتقل کر رہا ہوں۔

ٹائپ رائٹر پر میری انگلیاں تیزی سے چلی جا رہی تھیں۔

اور اب شام ہونے لگی ہے۔ وہ اب آنے ہی والی ہو گی۔

میں کھڑکی کے پاس کھڑا چاند کو نکلتے دیکھ رہا ہوں۔

میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ سیما کو مجھ سے نفرت ہو گئی ہے اور۔۔۔ میں کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔۔۔ میں اپنی جگہ سے ہلنا نہیں چاہتا۔

یہیں رک کر مجھے سیما کا انتظار کرنا ہو گا۔

مجھے حیرت ہے زخمی ہونے کے بعد بھی۔۔۔ آخر وہ سارا دن کہاں گھومتی رہی ہے۔ زخم کے ساتھ اس طرح گھومنا مضر بھی تو ہو سکتا ہے۔

وہ زخمی ہے۔۔۔ اور یہ زخم۔۔۔ اوہ مجھے کچھ یاد آنے لگا ہے۔

اوہ۔۔۔ میرے خدا کاش سیما واپس نہ آئے۔ وہ اکیلی گھومنے چلی گئی تھی۔

میں سمجھ گیا ہوں وہ یہاں ٹھہری کیوں نہیں؟ یقیناً ”اس کا زخم۔۔۔ گل کھلا رہا ہو گا۔

مجھے یاد آ گیا ہے۔۔۔ پیرو کی بیٹی کی موت پر میں نے

اب رجیا سے کہا تھا کہ زخموں کی تاب نہ لا کر وہ مر گئی ہے۔ تو رجیا نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ بچ جانے کی صورت میں وہ لڑکی خود بھی ایک ایسی مخلوق بن جاتی جو بھیڑیے کا روپ دھارنے پر قادر ہو سکتی تھی۔

اور۔۔۔ سیما کے حلق پر بھیڑیے کا لگایا ہوا زخم موجود تھا۔ اور سیما مری نہیں تھی۔

مجھے یقین ہے یہ زخم اپنا کام کر رہا ہو گا۔ سیما جنگلوں میں آخر کیوں گئی ہے؟

میرے سامنے کھڑکی موجود ہے۔ اور میں اس سے باہر کا منظر دیکھ سکتا ہوں۔

میں نے ادھر دیکھا ہے۔۔۔ ہاں وہ آہستہ چلتی ادھر آ رہی ہے۔ چاند کی روشنی میں وہ مجھے صاف نظر آ رہی ہے۔ چاند اس کے چھچھرے بل دار جسم پر دمک رہا ہے۔ اس کی کرنیں ترچھی ہو کر اس کے سفید بھیانک دانتوں پر منعکس ہو رہی ہیں۔

سیما مجھ سے نفرت زدہ ہو چکی ہے۔ اور اب وہ واپس آ رہی ہے۔ عورت کی شکل میں نہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔۔۔ کیا میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا ہوا ہے؟ ہاں۔۔۔ وہ بند ہے۔ ادھر سے وہ اندر نہیں آ سکتی۔ وہ باہر ہی منڈلاتی رہے گی۔

دروازہ کھرچتی رہے گی۔۔۔ ہو سکتا ہے عابدی آ جائے۔۔۔ اور نہ بھی آئے تو میں کیبن کے اندر محفوظ ہوں۔ چاند ڈھلتے ہی وہ بھاگ جائے گی۔ اور اب وہ دوبارہ آئے گی میں اس سے اپنا تعلق ختم کر لوں گا۔۔۔ فوراً ہی

اب صبح ہونے تک مجھے شدید بے چینی رہے گی۔

اف۔۔۔ اس کی غراہٹیں کس قدر اونچی ہیں۔ شاید اس نے میرے ٹائپ رائٹر کی آوازیں سن لی ہیں وہ باہر بے چینی سے گھوم رہی ہے۔ انتقام کی آگ میں سلگتی ہوئی۔

مجھے چیر پھاڑ ڈالنے کے لیے بے تاب مگر میں محفوظ ہوں۔

میں کیبن کے اندر محفوظ ہوں۔

وہ مایوس ہو چکی ہے۔

وہ دروازہ کھرچ کھرچ کر جا چکی ہے۔ مجھے اس کی چاپیں مدھم ہوتی سنائی دے رہی ہیں۔ مگر یہ آہٹیں اب کسی اور سمت سے کیوں آ رہی ہیں؟

اوہ۔۔۔ یہ تو کھڑکی کی طرف سے آ رہی ہیں۔

اس کھڑکی کا شیشہ تو ابھی تک ٹوٹا ہوا ہے۔ کیبن ادھر سے بالکل غیر محفوظ ہے۔

وہ غرا رہی ہے۔۔۔ وہ کھڑکی تک پہنچنے کے بعد چھلانگ لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔

چاند کی روشنی میں وہ مجھے صاف نظر آ رہی ہے۔ ایک بھیڑیے کا جسم مجھے صاف دکھائی دے رہا ہے۔ زمین کے ساتھ چپٹا ہوا۔ اچھال بھرنے کے لیے تیار۔

☆ ☆

حق خدمت

ایک شخص کو شہر کے سب سے بڑے شعبہ جاتی اسٹور سے قیمتی اشیاء چوری کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ضمانت پر رہا ہو کر اس نے ایک وکیل صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ وکیل صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ وکیل صاحب نے ایف آئی آر کا مطالعہ کرنے کے بعد سنجیدگی سے کہا ”میں دو شرائط پر آپ کا دفاع کر سکتا ہوں، آپ کو مجھے یقین دلانا ہو گا کہ آپ بے گناہ ہیں اور یہ کہ مجھے دو ہزار روپے فیس کے طور پر ادا کریں گے۔“

ملزم نے چند لمحے غور کیا اور بولا:

”میں آپ کو پندرہ سو روپے اور ایک سیکو گھڑی پیش کر سکتا ہوں جو میں نے اس اسٹور سے دو ماہ پہلے اڑائی تھی۔ اب بتایئے کیا آپ میرا دفاع کریں گے۔!“ ☆

دعا کمرے میں اکیلی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک پلاسٹک کے کھلونے تھے۔ افریقی نسل کی ایک بڑی سی گڑیا۔ دو دوسری خوب صورت گڑیاں، تیسرا ایک پلاسٹک کا بونا۔ بونا الٹی سیدھی قلابازیاں کھا رہا تھا۔ تینوں گڑیاں ناچ رہی تھیں اور دعا ان کے درمیان زمین پر بیٹھی ہنس رہی تھی۔

"خدا کی قسم بظاہر وہ کھلونے لگتے تھے لیکن درحقیقت وہ زندہ کھلونے تھے اور ..... اور جب وہ وہاں سے چلے تو دعا بھی ان کے ساتھ چل رہی تھی۔ چھوٹی سی دعا جس نے ابھی چلنا نہیں سیکھا تھا۔ لیکن وہ اپنے قدموں سے چلتی لان سے اندر آئی تھی۔"

یہ فرزانہ کے الفاظ تھے جو اس نے ندا کو بتائے تھے اور جو منظر دیکھ کر فرزانہ بے ہوش ہو گئی تھی اور اس وقت ندا کا بے ہوش ہونے کو دل چاہ رہا تھا۔ فرزانہ نے ان کھلونوں کے جو حلیے بتائے تھے یہ انہی حلیوں کے کھلونے تھے۔ لیکن ..... کیا یہ کھلونے تھے۔ وہ ہنس رہے تھے جھوم رہے تھے۔ ناچ رہے تھے۔

ندا کے قدم جیسے جم گئے تھے۔ بدن پتھرا گیا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جا کر کسی کو بلا کر لائے اور یہ منظر دکھائے۔ پوچھے کہ بتاؤ یہ کیا ہے۔ یہ کھلونے کیسے ہیں لیکن وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتی تھی۔

پھر تقدیر نے ہی اس کی مدد کی۔ اسے اماں بی آتی نظر آئی تھیں۔ ایک دم اس کے بدن میں کرنٹ دوڑ گیا۔ اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں تھا شاہجہاں بیگم کو دعا کی حقیقت سے آگاہ کرنے کا۔ ادھر شاہجہاں بیگم نے بھی ندا کو عشیرہ کے کمرے میں جھانکتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور ان کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔

ندا کو فوراً ان کے بدلے ہوئے موڈ کا اندازہ ہو گیا۔ اس نے رازدارانہ اشارے سے اماں بی کو قریب آنے کے لیے کہا۔ لیکن اماں بی اسی رفتار سے چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئیں۔ انہوں نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن ندا نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اشارے میں سے انہیں اندر دیکھنے کے لیے کہا۔

شاہجہاں بیگم نے اندر جھانکا۔ دعا آرام سے مسہری پر سو رہی تھی۔ اردگرد کا ماحول سنسان تھا وہ کوئی خاص بات نہیں تھی کچھ لمحے وہ اسی طرح دیکھتی رہیں پھر سیدھی ہو کر ندا کو دیکھنے لگیں۔ ندا نے سرگوشی میں کہا۔

"دیکھا آپ نے؟"

"ہاں ..... تم بھی دیکھ لو! اماں بی نے سرد لہجے میں کہا اور ندا نے بے ساختہ اندر جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے ناچ کر رہ گئے۔ اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ گہرا سناٹا اس کی آواز بند ہو گئی۔ بمشکل تمام اس کے منہ سے نکلا۔

"اماں جی ..... خدا ..... خدا کی قسم ....."

"میری ساتھ آؤ ..... آؤ! اماں بی اپنے کمرے کی طرف واپس پلٹ گئیں۔ اماں بی کا انداز بے حد سرد تھا۔ وہ کہیں اور جانے کے لیے نکلیں تھیں لیکن وہ میں اپنے کمرے میں جانے کا مطلب تھا کہ صورت حال سنگین ہے۔ "بیٹھو" کمرے میں پہنچ کر انہوں نے پتھرائے لہجے میں کہا۔ "کیا چاہتی ہو؟" انہوں نے براہ راست سوال کیا۔

"اماں جی آپ یقین کریں۔ منہ سے بمشکل نکلا۔"

"جو دل کے اندر ہے بتا دو۔"

"میں کچھ نہیں چاہتی۔"

"الگ گھر لینا چاہتی ہو ....."

"نہیں ....."

"معظم اور اس کی بیوی کو گھر سے نکالنا چاہتی ہو۔"

"بالکل نہیں اماں جی۔" ندا روہانسی ہو گئی۔

"تم ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہو۔ تمہارے والدین اور پورے خاندان کی شرافت پر قسم کھائی جا سکتی ہے۔ اس خاندان کی لڑکی کو کسی غیر کے کمرے میں تاک جھانک کرنا زیب دیتا ہے۔"

"وہ اماں بی آپ یقین کریں۔ دراصل ندا سے کچھ کہا ہی نہیں جا رہا تھا۔ جو کہتی اس پر ہنسا ہی جا سکتا تھا۔ بے عقلی کی بات تھی۔

"وہ ..... اماں بی ..... دراصل کتنے پھسپھسے الفاظ ہیں۔ ایسے جیسے کوئی جھوٹ بولنے کے لیے جھوٹ تلاش کر رہا ہو ..... جاؤ ..... اخلاق و آداب خاندانی نجابت کا ورثہ ہوتے ہیں میرا خیال ہے میرے بچے میری موت کے بعد بھی منتشر ہونا پسند نہیں کریں گے۔ میں نے ان کی تربیت اسی انداز میں کی ہے۔ اس لیے فضول کوششیں مت کرو۔"

"میں ایسی کوئی کوشش نہیں کر رہی۔ ندا نے خود کو سنبھال لیا۔

"کسی کے کمرے میں جھانکنا ایک اچھا عمل ہے۔"

"بس ..... وہ ....."

"جاؤ میری باتوں پر غور کرنا۔ اماں بی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اور ندا ان کے کمرے سے نکل آئی۔ وہ غصے سے کھول رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ خوفزدہ تھی لیکن اب اماں بی کی باتوں نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ بستر پر گر پڑی۔ فرزانہ یاد آ رہی تھی دل چاہ رہا تھا اسے جا کر بتائے لیکن طبیعت عجیب ہو رہی تھی۔ فرزانہ خود آ گئی۔

"ارے خیریت ..... رو رہی ہو کیا۔"

"بھابھی ..... بڑی گڑبڑ لگ رہی ہے۔"

"کیا ہوا ....."

"بھابھی آپ جب بے ہوش ہوئی تھیں تو آپ نے کیا دیکھا تھا۔" ندا نے پوچھا اور فرزانہ نے اس رات کی تفصیل بتا دی۔

"ان میں ایک افریقی نسل کی گڑیا بھی تھی۔"

"ہاں۔"

"دو اور گڑیاں اور ایک بونا۔"

"بالکل، بالکل۔"

"آج وہ عشیرہ کے کمرے میں دعا کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ندا نے پوری تفصیل بتائی اور فرزانہ خوف سے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ پھر بولی۔

"میرے دل میں تو ایک بات اور آتی ہے ندا۔"

"کیا بھابھی۔"

"تمہیں حویلی کا دوسرا حصہ یاد ہے۔"

"شان گڑھی کی حویلی کا۔"

"ہاں ....."

"یاد ہے لیکن وہاں تو بڑا امن تھا۔ وہاں بھی جنوں کا خاندان آباد تھا لیکن انہوں نے کبھی ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔"

"میرا مطلب ہے کہ ہمیں ان سے واسطہ پڑ چکا ہے اور ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جنوں کا وجود ہے اب رہی بات عشیرہ کی تو بیشک عشیرہ بی بی نے ابھی تک ایسا کوئی روپ نہیں دکھایا جن سے ان کی اصلیت پتا چل سکتی یعنی یہ پتہ چل سکتا کہ وہ بھی جنی ہیں۔

"ہائے ..... تو کیا وہ بھی جنی ہو سکتی ہیں؟" ندا نے خوف سے کہا۔

"کبھی کبھی تم بڑی بے وقوفی کی باتیں کرتی ہو ندا۔ ارے بابا سارا کھیل سامنے ہے اور تم پوچھ رہی ہو کہ کیا عشیرہ جنی ہو سکتی ہے۔ دعا کو کون لایا ہے۔ رضوانہ نے کہا۔

"مگر دعا اس کی اولاد تو نہیں ہے۔" ندا نے کہا۔

"کوئی اور رشتہ ہو گا۔" فرزانہ نے کہا۔

"بھابی مجھے حیرت ہے۔"

"کس بات پر۔"

"معظم انہیں لندن سے لائے ہیں۔ اور خود وہ یمن کی رہنے والی ہیں۔ کیا یمن کی کسی جنی کو بھی ایک پاکستانی ہی پسند آیا تھا۔ اپنے ملک میں کوئی نہیں ملا تھا۔ دوسرے یہ کہ جن تو انسان لڑکیوں پر عاشق ہو جاتے ہیں کیا جنیاں بھی انسانوں پر عاشق ہو جاتی ہیں۔

"اللہ ہی جانے ....." فرزانہ نے بیزاری سے کہا۔

"مگر اب کریں کیا ....." ندا نے پریشانی سے کہا۔

"میری مانو تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ارے ہمارا کیا بگاڑیں گی دونوں مل کر اور پھر ہم تو جنوں کے پرانے رشتے دار ہیں۔ فرزانہ نے کہا اور ہنسنے لگی۔

"تم ہنس رہی ہو بھابھی۔ اماں بی نے اس وقت جو کچھ کہا ہے، میرا کلیجہ جل کر خاک ہو گیا ہے۔ اور یہ سب عشیرہ کی وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ اماں جی ایک

مثالی ساس تھیں۔ کتنی مہربان تھیں ہم پر عشیرو نے انہیں پھر سے کتنا دور کر دیا میں نہیں چھوڑوں گی اسے۔"

"کیا کرو گی۔"

"اس کی اصلیت سامنے لا کر رہوں گی۔ بتا کر رہوں گی اماں بی کو کہ عشیرو کیا ہے۔ اور اس نے کس طرح ہمارے معظم بھائی کو اپنے جال میں پھانسا ہے۔"

"کرو گی کیا تم۔۔۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"ارے انہیں ہی دیکھوں گی سونے شاہ کو' دیکھتی ہوں کہ سونے شاہ ہیں یا پیتل شاہ ساری زندگی ہمارے خاندان کا مال کھایا ہے۔ اب بھی اگر کام نہ آئے تو۔۔۔ ندا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"تم تو واقعی بڑی غصے میں ہو۔ فرزانہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

☼ ☼ ☼

سونے شاہ صاحب نے پر جلال نظروں سے ندا اور ماموں فیاض علی کو دیکھا۔ پھر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکروں کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ "ان تکلفات کی کیا ضرورت تھی۔ سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے۔"

"ندا جب بھی سسرال سے آتی ہے شاہ صاحب آپ کی قدم بوسی کے لیے ضرور حاضر ہوتی ہے۔" ماموں فیاض نے کہا۔

"ہمیں معلوم ہے۔ لیکن اس بار یہ کچھ پریشانی کے عالم میں نظر آتی ہے۔ ہم اس کی پیشانی پر تفکر کی لہریں دیکھ رہے ہیں۔" سونے شاہ نے کہا۔

"میں بہت پریشان ہوں شاہ صاحب' ہمارے گھر میں آگ لگ رہی ہے۔ ندا نے کہا۔

"ہم بجھا دیں گے۔ ہم بجھا دیں گے کیا بات ہے ہمیں بتاؤ۔ شاہ صاحب نے کہا اور ندا نے انہیں پوری کہانی سنا دی۔ شاہ صاحب نے آنکھیں بند کر لیں اور دیر تک خاموش بیٹھے رہے پھر ان کے منہ سے آواز نکلی۔ "اس کا تعلق شمالی یمن سے ہے جس کا دار لحکومت دمشق ہے۔ مشرق وسطی میں۔ بحر احمر کے ساحل پر واقع جزیرہ بوالحسانی کے کھنڈرات میں اس کا خاندان آباد ہے۔ وہیں سے یہ معظم علی کے پیچھے لگی ہے۔"

ندا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"سمجھیں ندا بیٹی۔" شاہ صاحب نے کہا۔

"آپ عظیم ہیں شاہ صاحب۔ آپ صاحب علم ہیں۔"

"سب کچھ آسمانوں میں ہے۔ سب کچھ آسمانوں میں ہے۔ معظم علی خود تو نہیں بتائے گا لیکن ہوا یہی ہے۔ وہ سیر کرنے گیا تھا۔ جہاں اس نے اس لڑکی کو دیکھا۔ کیا نام بتایا تم نے اس کا؟"

"عشیرو۔" ندا بولی اور شاہ صاحب مسکرا دیے۔

"سنا تم نے فیاض علی' عشیرو۔۔۔ ایسے نام انسانوں میں کہاں رکھے جاتے ہیں۔ خیر تو وہ بے چارہ تو نہیں جان سکا ہو گا کہ اصلیت کیا ہے۔ وہ اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔ اور آخر کار اس لڑکی نے اس پر قبضہ جما لیا۔

"لیکن شاہ صاحب وہ تو خود کو یمن کے ایک اعلیٰ خاندان کا فرد بتاتی ہے۔

"یہ کونسی بڑی بات ہے کوئی کچھ بھی کہہ دے تم نے تصدیق کی؟"

"نہیں۔" ندا نے کہا۔

"گھر کے کسی اور فرد نے معلوم کیا اس کے بارے میں۔"

"جی بالکل نہیں۔"

"کیا یہ کوئی معمولی بات ہے۔ اس نے سب کی آنکھوں میں خاک ڈال دی۔ خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں اس بچی کا معاملہ کچھ مشکل ہے۔"

"اصل معاملہ تو اسی بچی کا ہے شاہ صاحب! ماموں فیاض بولے اور شاہ صاحب پھر مراقبے میں چلے گئے۔ کچھ دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر ان کے منہ سے آواز نکلی۔

"اوچھو چھو۔۔۔ اوچھو چھو۔"

"کیا ہوا شاہ جی۔"

"واقعی بچی بے حد پر اسرار ہے۔ ہم نے اس کے گرد سیاہ بادلوں کے غول دیکھے ہیں۔ جونہی ہم اس کے پاس پہنچے کالے بادلوں نے اسے ہماری نگاہوں سے چھپا دیا۔

"پھر کیا ہو گا شاہ جی۔۔۔"

"ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ اور پھر مزہ تو اسی میں ہے کہ مقابلہ برابر کا ہو' لیکن اس کا بوجھ تم پر پڑے گا ندا بیٹی۔ اس کے لیے ہم معذرت چاہتے ہیں۔ ہم درویش منش ہیں۔ جو جیب میں آیا' کھایا کھلا دیا اور ختم۔"

"اس کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ مجھے کیا کرنا ہو گا۔"

"یہاں سے بہت دور ایک خانقاہ گل افشاں ہے۔ وہاں درس ہوتا ہے اور بیشمار خلقت جمع ہوتی ہے۔ اس کے لیے لنگر ہوتا ہے۔ تمہیں کم از کم دو لاکھ وہاں بھیجنے ہوں گے جو لنگر میں شامل ہو جائیں گے اور تمہاری مشکلات دور کرنے کی دعا ہو گی۔

"وہ میں کر لوں گی شاہ صاحب۔۔۔" ندا نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر دیکھ لو اور جلدی یہ کام کرو۔"

"مگر تم کرو گے کیا سونے شاہ!" ماموں فیاض نے سونے شاہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ندا ہمیں اپنے گھر لے جائے گی اور پھر وہاں جو بھی ہے اس سے دو دو ہاتھ کرنے ہوں گے۔"

"کیوں ندا کیا یہ ممکن ہے۔۔۔" ماموں فیاض نے پوچھا۔

"ہاں میں کر لوں گی۔"

"مگر کیسے۔۔۔ فیاض نے پوچھا اور ندا انہیں اپنا منصوبہ بتانے لگی۔ شاہ صاحب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہایت مناسب منصوبہ ہے۔ ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ لیکن بیٹے اپنا تحفظ بھی چاہتے ہیں۔"

"وہ کیسے شاہ صاحب۔"

"گل افشاں کی درگاہ شریف پہ رقم بھجوا دی جائے اور وہاں کے درس میں ہم شامل ہو جائیں۔ بس ہمیں تحفظ حاصل ہو جائے گا۔" شاہ صاحب نے بتایا۔

"آپ وہاں کے درس میں شامل ہو جائیں گے تو میرے ساتھ کون جائے گا۔"

"ہم۔۔۔" شاہ صاحب مسکرا کر بولے۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"سمجھو گی بھی نہیں یہ رمز کی باتیں ہیں۔ اری پگلی سونے شاہ جی ایک ہی وقت میں نہ جانے کہاں کہاں ہوتے ہیں۔" ماموں فیاض نے عقیدت سے کہا۔

"بات معمولی نہیں ہے۔ وہاں ہمارا واسطہ جنوں سے پڑے گا۔ ہم گل افشاں کے درس میں شامل ہو کر اپنی حفاظت کے لیے بھی دعا کرائیں گے۔

"آپ کب تک وہاں آ سکیں گے؟" ندا نے پوچھا۔

"یہ تم پر منحصر ہے۔"

"کیا مطلب۔۔۔"

"جتنی جلدی یہ کام شروع کرا دو اچھا ہے۔ جونہی تم رقم بھیجو گی۔ ہم پہلے گل فشاں جائیں گے پھر تمہارے پاس آ جائیں گے۔"

"میں کل چلی جاؤں گی۔ پرسوں اپنے اکاؤنٹ سے پیسے نکلوا کر آپ کو آن لائن کر دوں گی۔ اپنا اکاؤنٹ نمبر مجھے دیدیں۔"

"میرے اکاؤنٹ میں بھیج دینا میں وہاں سے پیسے لے کر شاہ صاحب کو پہنچا دوں گا۔" ماموں فیاض جلدی سے بولے اور شاہ صاحب نے گھور کر انہیں دیکھا پھر بولے۔

"ہرگز نہیں لنگر کی رقم ہے۔ تبرک کے لیے ہوتی ہے اسے یوں ادھر ادھر نہیں ہونا چاہیے۔ میرا اکاؤنٹ نمبر اپنے سیل میں فیڈ کر لو ندا بیٹی۔"

"جی جی' بتائیے۔" ندا نے اپنا سیل نکال کر کہا اور شاہ صاحب نے اپنا نمبر نوٹ کرا دیا۔

ندا کے جانے کے بعد ماموں رمضان نے شاہ صاحب کو گھورتے ہوئے کہا۔ "میں کیا تمہاری رقم کھا جاتا۔"

"یہ بات نہیں ہے جان من۔ اصل میں یہ کاغذ کے ٹکڑے ایٹم بم سے زیادہ مہلک ہوتے ہیں یوں سمجھ لو یہ کیمیاوی ہتھیار ہیں جو انسان کے حواس معطل کردیتے ہیں۔ ہر طرح کے رشتوں کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں لمحوں میں۔" شاہ صاحب نے کہا۔

"مجھ سے چرب زبانی مت کرو۔ مجھے کیا ملے گا؟" ماموں فیاض نے کہا۔

"پورا دس فیصد۔" شاہ صاحب بولے۔

"دماغ خراب ہوا ہے کیا؟" ماموں ریاض بھنا کر بولے۔

"کیوں بھئی؟" شاہ صاحب نے ان کے غصے کو نظر انداز کر کے کہا۔

"پچیس فیصد سے ایک پائی کم نہیں۔"

"یعنی دو لاکھ میں سے پچاس ہزار۔ اور وہ بھی مفت میں تم سوچو ریاض بات بہت سنجیدہ ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں جن بھی نکل آئیں اور ہمیں لینے کے دینے پڑ جائیں۔ تمہیں یاد ہے رنگ پور گئے تھے ایک بار اس بچی پر سچ مچ کا جن تھا اور جو مار پڑی تھی وہ آج تک یاد ہے۔"

"پچاس ہزار... شاہ جی پورے پچاس ہزار جلدی بولو... بچی ابھی باپ کے گھر ہے ماموں رمضان نے کیا اور شاہ جی انہیں گھورتے رہے پھر لفظوں کے جملے اور آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

☼ ☼ ☼

"ہاں سب ٹھیک ہو گیا ہے سونے شاہ جی آنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ بس انہیں ایک درس میں شریک ہونا ہے اس کے بعد آجائیں گے۔"

"جو کچھ تم نے ان سے کہا ہے انہوں نے مان لیا ہے۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"ماموں کے بڑے گہرے دوست ہیں۔ مان لیا انہوں نے۔" ندا نے کہا دو لاکھ کا ذکر اس نے بالکل نہیں کیا تھا یہ اس کا راز تھا۔

"بڑی بات ہے۔" فرزانہ بولی۔

"میں ایک اور بات سوچ رہی ہوں بھابھی۔"

"کیا۔"

"میں سعادت کو اس بارے میں رازدار بنا لوں۔"

"دماغ خراب ہوا ہے کیا" فرزانہ چمک کر بولی۔

"ارے کیوں۔"

"جانتی ہو سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ گھٹنے ہمیشہ پیٹ کی طرف جھکتے ہیں۔ سارے کے سارے ایک ہو جائیں گے۔"

"مگر دوسری بات بھی تو ہے۔" ندا فکر سے بولی۔

"کیا...؟"

"اگر کبھی سعادت کو پتا چل گیا کہ میں نے ان سے چھپا کر یہ سب کیا ہے تو وہ مجھ سے بدظن ہو جائیں گے۔"

"یہ خطرہ تو مول لینا پڑے گا۔ اب اکھلی میں سر دیا ہے تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔" فرزانہ نے کہا۔

"یعنی بھابھی آپ کا مطلب ہے؟" ندا نے سوچتے ہوئے کہا۔

"بالکل مت بتانا کسی کو "میں جانوں تم جانو اور بس تمہیں اندازہ ہے کہ یہ سارے بھائی اپنی ماں کے پجاری ہیں اور اماں بی کو عشیو نے اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ فرزانہ نے کیا اور ندا سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر بولی۔

"ٹھیک ہے بھابھی۔" ندا نے کیا۔

پھر اسی رات اس وقت جب شوہر بیوی کی ہر بات بڑی توجہ سے سنتا ہے اور بیوی اپنی ہر فرمائش پوری کراتی ہے۔ ندا نے پوچھا "آپ نے میرے گھر والوں کے بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھا ان کی خیریت بھی نہیں پوچھی جبکہ پہلے آپ...

"بالکل نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو اس بارے میں بات شروع کرنے والا تھا۔ سعادت نے کیا۔

"ابو کہہ رہے تھے بہت عرصہ سے سعادت کو نہیں دیکھا۔

"چلیں گے کسی دن مل کر آؤں گا۔"

"ماموں صلاح الدین نے تو اتنے سوالات کر ڈالے آپ کے بارے میں کہ میں جواب بھی نہ دے سکی۔

"ماموں صلاح الدین میرا مطلب ہے ماموں ریاض کو تو میں جانتا ہوں یہ صلاح الدین کا نام تو میں نے پہلی بار سنا ہے۔"

بالکل پہلی بار سنا ہو گا۔"

"کیوں..."

"اس لیے کہ وہ تو ہم لوگوں کی زندگی سے نکل ہی گئے تھے۔ پہلے ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ اصل میں امی خود دو بہنیں تھیں لیکن نانا ابو کی ایک اور بہن تھیں جو سوتیلی تھیں۔ ان بہن کی ایک بیٹی رقیہ خالہ تھیں اور ماموں صلاح الدین بھی انہی کے بیٹے تھے۔ رقیہ خالا کا انتقال ہو گیا تو ماموں صلاح الدین ہمارے پاس ہی رہیں گے۔ بچپن ہی سے عبادت گزار تھے اور روحانیت کی طرف مائل تھے ایک طرح سے دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے ہر وقت چلے وظیفے اور بس۔ اگر انہیں کسی سے رغبت تھی تو وہ میں تھی۔

"اچھا ہماری طرح۔" سعادت نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"پوری بات تو سن لیں۔ آپ سمجھ گئے نا ماموں صلاح الدین کی بات۔"

"خدا قسم ایک لفظ جو سمجھ میں آیا ہو۔" سعادت نے کہا۔

"پلیز... بی سیریس ماموں صلاح الدین کے بارے میں بتانا ضروری ہے۔" ندا نے کیا۔

"جی ارشاد۔" سعادت نے کیا۔

"آخر کار وہ گھر سے چلے گئے۔ کبھی سال دو سال میں گھر کا چکر لگا لیتے ہیں۔ آج کل آئے ہوئے ہیں۔"

"ہوں۔"

"مجھے بہت چاہتے ہیں ابھی ملے تھے۔"

"جی پھر..."

"پلیز میری بات سنو۔"

"سناؤ بابا... سعادت بوجھل آواز میں بولا۔

"میں انہیں کچھ دن کے لیے اپنے ہاں بلانا چاہتی ہوں۔"

"ویری گڈ۔"

"کیا ویری گڈ۔"

"بلا لو۔"

"وہ کچھ دن یہاں رہیں گے۔"

"تو پھر..." گھر چھوٹا ہے کیا۔

"میرا مطلب ہے دوسرے لوگ۔"

"انہیں یہاں سے کہیں اور منتقل کر دوں۔"

"آپ سنجیدہ نہیں ہوں گے۔"

"ہو گیا... سعادت گہری سانس لے کر بولا۔

"ماموں صلاح الدین میرے پاس آکر کچھ عرصہ رہنا چاہتے ہیں۔ میں بڑے بھائی اور اماں جی سے اس بارے میں کیا کہوں۔"

"اماں جی کو پوری بات بتا کر اجازت لے لیں۔"

"پہلے آپ سے اجازت لینی ضروری تھی۔"

"لے لی...! سعادت مخمور لہجے میں بولا۔

☼ ☼ ☼

"ارے تو اس میں اتنا سنجیدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ بیشمار کمرے موجود ہیں نیچے بھی اوپر بھی جہاں چاہو انتظام کر دو۔ اماں بی نے فراخ دلی سے کہا۔

"عمر رسیدہ آدمی ہیں اماں بی میرے خیال میں نیچے ہی ٹھیک رہے گا۔ میں عقبی لان کی طرف کا کمرہ ٹھیک کرائے دیتی ہوں۔ ویسے بھی وہ راتوں کو عبادت وغیرہ کرتے ہیں۔" ندا نے مطمئن ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

ماموں صلاح الدین کا پرتپاک استقبال کیا گیا تھا۔ سعادت اور ندا خود انہیں لینے ریلوے اسٹیشن پہنچے تھے۔ گھر میں بھی اماں بی اور جو لوگ اس وقت موجود تھے انہوں نے انہیں خوش آمدید کہا تھا۔ سونے شاہ صاحب زیادہ پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے۔ لیکن دنیا ساز اور گھاگ انسان تھے۔ اس گھر کی شان و شوکت سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ بہت بڑی جگہ آگئے ہیں۔ اس

گھر کے مکین اگر قبضے میں آ گئے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔

چنانچہ خود کو بہت لیے دیے رہتے۔ اماں بی نے کہا۔

"آپ ہمارے لیے بہت قابل احترام ہیں۔ بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ آپ جیسے بزرگ کی آمد ہمارے لیے باعث برکت ہے۔ آپ یہاں کوئی تکلیف نہ اٹھائیے۔"

"بہت شکریہ بس ہمارے ایک عمل سے آپ کو تکلیف پہنچے گی۔ ہم رات کو کچھ پڑھنے کے عادی ہیں۔ آپ کے باغ کے کسی سنسان گوشے کو استعمال کریں تو زحمت تو نہ ہوگی۔

"ارے نہیں ماموں صاحب یہ تو ہمارے لیے برکت کی بات ہے۔"

صلاح الدین صاحب کو جبکہ یہ ان کا اصلی نام نہیں تھا۔ بڑی عزت بڑا احترام ملا تھا۔ تین دن انہوں نے بڑے پرسکون رہ کر گزارے۔ ایک ایک فرد کا جائزہ لیا خاص طور سے عشیرو کو دیکھا اور پھر دعا کو۔ جانے تو خیر کیا تھے بس اداکاری کرنی تھی۔

چوتھے دن انہوں نے عشیرو سے کہا۔ "ہمیں کچھ وقت دو گی بیٹی۔"

"جی ماموں صاحب حکم۔" عشیرو اپنی نیک فطرت کی وجہ سے دوسروں کی طرح ماموں صاحب کا احترام کرتی تھی۔

"ہمارے کمرے میں نہ جاؤ! ماموں صاحب نے کہا۔ ان کا انداز عجیب سا تھا لیکن بزرگ آدمی تھے۔ زیادہ محسوس نہ کیا گیا۔ البتہ معظم علی کو بہت برا لگا۔ عشیرو نے معظم کی طرف دیکھا اور بولی۔

Don't Rude Plz (براہ کرم سخت نہ ہو)

He is a Hob (وہ ایک مسخرہ ہے) معظم علی نے تلخی سے کہا۔

"پھر بھی پلیز۔۔۔ عشیرو نے لجاجت سے کہا۔ اس دوران شاہ صاحب اپنے کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس گفتگو پر توجہ نہیں دی تھی۔

کمرے میں پہنچ کر انہوں نے معظم علی کی طرف دیکھا اور بولے میں نے تم سے آنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ خیر اچھا ہوا تم بھی آ گئے۔ میں اپنا ایک شک دور کرنا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب نے ایک خاص قسم کی چھڑی جسے وہ اپنے ساتھ لائے تھے اور جن کی موٹھ بندر کے سر جیسی تھی۔ اٹھائی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ معظم جو ان کی بات کے جواب میں کوئی سخت بات کہنے والے تھے خاموش رہے۔ شاہ صاحب نے ان دونوں کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور چھڑی سامنے کر لی۔

"یہ ان کوسا اولویا کی کھوپڑی ہے اور جو انکوسا اولویا کو جانتا ہے اسے معلوم ہے کہ جو اس کے ساتھ جھوٹ بولتا ہے پورے ایک چاند کے بعد اس کی صورت بھی اس جیسی ہو جاتی ہے۔

ایک ماہ کیوں لگ جاتا ہے ماموں صاحب معظم علی نے طنزیہ کہا۔

"یہ اندر کی بات ہے۔"

"میں جانتا ہوں یہ اندر کی بات۔" معظم علی نے کہا۔

"کیا جانتے ہو۔"

"یہی کہ اس دوران آپ یہاں سے رفوچکر ہو جائیں گے۔ پھر آپ کی بات کی تصدیق کے لیے کون آپ کو تلاش کرتا پھرے گا۔"

"مان لو میری بات معظم۔" عشیرو نے لجاجت سے کہا۔

"او کے او کے۔"

"کیا بات ہے کیا یہ جانا چاہتے ہیں۔ ایسا ہے تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"نہیں ماموں جان۔ آپ بات کریں۔"

"اس کھوپڑی کی طرف دیکھو! اور جو سوال میں کروں مجھے بتاؤ۔"

"جی۔"

"قبیلے کا نام کیا ہے۔"

"سماۃ الدین کہلاتا ہے۔ صفا کے شمال میں عرس

الدین مشہور جگہ ہے۔

"اس نوجوان پر کب عاشق ہوئی تھیں۔ شاہ صاحب نے پوچھا۔

"ایک ہزار ایک سو بتیس سال پہلے اس وقت صرف ستر سال کی نوخیز صفیہ تھی۔ عشیرو نے پوری سنجیدگی سے کہا اور شاہ صاحب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"اس وقت تمہاری عمر کیا ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"ایک ہزار دو سو دو!" عشیرو اطمینان سے بولی۔

"کسی خاص مقصد سے اس خاندان میں داخل ہوئی ہو۔

"ہاں۔۔۔" عشیرو نے کہا۔

"مزید بتاؤ۔"

"میری طویل عمر کا ایک راز ہے۔"

"ایک ہزار سال پورے ہونے کے بعد مجھے چھ زندہ انسانوں کے کلیجے کھانے ہوں گے۔ اس کے بعد ہی مجھے آگے کی زندگی ملے گی۔ بس یہ کام مجھے اس کوٹھی میں کرنا ہے۔

"ہوں تو یہ مقصد ہے تمہارا۔" شاہ صاحب بولے۔

"ہاں اور یہ کام میں جلد شروع کرنے والی ہوں۔" عشیرو نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ اب وہ بہترین اداکاری کر رہی تھی اور معظم علی کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔

"اور وہ بچی کون ہے۔ وہ تمہاری نہیں معلوم ہوتی۔"

"یہ بات وہ خود بتائے گی۔" عشیرو نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم اس سے پوچھ لیں گے! بس تم سے اتنا ہی معلوم کرنا تھا۔" شاہ صاحب نے کہا اور بندر کے سر والی چھڑی اس کی جگہ سے ہٹا لی۔

عشیرو نے سر کو زور سے جھٹکا اور معظم علی کی طرف دیکھنے لگی۔ شاہ صاحب بولے "اب تم جا سکتی ہو۔" عشیرو اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ شاہ صاحب کے کمرے سے کچھ فاصلے تک تو وہ سنجیدگی سے چلتی رہی، پھر جو اس نے ہنسنا شروع کیا تو ادھر ادھر گرنے لگی۔ معظم علی بمشکل اسے سنبھال کر کمرے تک لائے تھے۔ وہ غصے سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اندر آ کر معظم علی نے کہا۔

"اب یہ تماشہ میری سمجھ میں آ رہا ہے۔"

"چھوڑو معظم علی۔ مجھے تو بڑا مزہ آ رہا ہے۔ حالانکہ مجھے پاکستان آئے ہوئے بہت سے دن ہو گئے۔ لیکن ہر بار ایک نئی بات سامنے آتی ہے۔

"اب کونسی بات سامنے آئی۔" معظم علی نے پوچھا۔

"یہ شخص وچ ڈاکٹر ہے نا۔ جادوگر۔" عشیرو نے کہا اور معظم علی کو بھی ہنسی آ گئی۔ پھر وہ بولے۔

"اور یہ تمہارے لیے آیا ہے۔"

"مگر اسے لایا کون ہے۔"

"ندا اس کا ماموں ہے نا۔ یا پھر اسے ماموں بنا کر لائی ہے۔"

"او مائی گاڈ۔۔۔ اب یہ کیا کرے گا۔"

"ڈگڈگی بجا کر بندر نچائے گا۔ میں کل صبح ہی اسے ٹھیک کر دوں گا۔"

"نہیں معظم۔ پلیز ویسے یہ دعا کے لیے کچھ نہ کرے۔"

"ایک بات تم سے کہوں عشیرو۔"

"ہاں ضرور۔۔۔"

"دعا کے محافظ بہت سے ہیں اس کی طرف سے فکر مند نہ ہونا۔"

"محافظ۔۔۔" عشیرو نے سوال کیا۔

"دعا کے موضوع پر ہم بہت بار بات کر چکے ہیں۔ عشیرو میں نے طویل زندگی ملک سے باہر گزاری ہے۔ بہت جدید اور سائنسی ماحول دیکھا ہے لیکن یقین کرو اس وقت بھی جب تم نہیں تھیں میرے ساتھ ہمیں اپنے بچپن، اپنے وطن اور اب خاص طور سے یہ کہوں گا کہ شان گلی میں اپنی حویلی کے بارے میں وہی خیالات رکھتا تھا جو بچپن سے میرے دل و دماغ میں

تھے۔ حویلی کے دوسرے حصے میں آتش زادے ہمارے پڑوسی تھے۔ صدیوں سے میرے خاندان والے ان کے ساتھ اچھے پڑوسیوں کی طرح رہتے تھے۔ ہمارے درمیان کبھی نااتفاقی نہیں ہوئی۔ یوں سمجھو ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے اور ہیں۔ رحمان اور رفیقہ نے بڑی سادگی سے ہمیں دعا کے اپنے پاس پہنچنے کی کہانی سنا دی۔ کیا وہ کہانی نارمل تھی۔

"نہیں...!" عشیرہ نے متاثر لہجے میں کہا۔

"برستی بارش میں ایک بزرگ اسے سینے سے لگائے ڈاک بنگلے میں آئے اور اپنی امانت ان دونوں کو دے کر دنیا سے چلے گئے اور عشیرہ یہ بھی میرا ایمان ہے کہ یہ امانت ہر قیمت پر ہم تک پہنچنی تھی بلکہ یہ ہمارے لیے ہی ڈاک بنگلے پہنچائی گئی تھی اور یہ ہم تک آگئی۔ یہاں آکر دعا کے معاملے میں جو انوکھے واقعات ہمارے سامنے آئے وہ تمہیں بھی معلوم ہیں اور مجھے بھی اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کچھ مافوق الفطرت قوتوں کا حصار دعا کے گرد موجود ہے اور میں اس سے مطمئن ہوں۔

"اور میں بھی۔" عشیرہ نے کہا۔

"بالکل وہ ہمیں بالکل انوکھی نہیں لگتی۔ مجھے سب سے اطمینان یہ ہے کہ اماں بی دعا کو بہت چاہتی ہیں اور اماں بی یقیناً" بہت کچھ سمجھتی ہوں گی۔ ندا اپنے میکے گئی تھیں اور اس کے بعد یہ ماموں نمودار ہوئے کوئی بات نہیں انہیں حق ہے کہ اپنے کسی بھی عزیز کو یہاں لائیں یہ ان کے شوہر کا گھر ہے لیکن عزیز نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو پھر..."

"یہ کر کیا رہا تھا۔"

"ارے یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے بس ماحول ہوتا ہے کسی بھی جگہ کا لوگ بے وقوف بنتے ہیں یہ بے وقوف بناتے ہیں۔ ان کا بھی کیا قصور ہے۔"

"پلیز ان کا تماشہ دیکھیں یہ کرتے کیا ہیں۔" عشیرہ نے کہا۔

"ایک کام ضرور کرنا۔ ان کے ہاتھوں سے ملی ہوئی کوئی چیز کبھی نہ کھانا ندا یا فرزانہ بھابھی کوئی کھیل کھیلیں اس میں شریک نہ ہونا اور دعا کا بھی خیال رکھنا۔

"ٹھیک ہے۔ ویسے میں نے اپنا کام انہیں سمجھا دیا ہے۔"

"اپنا کام..."

"ہاں..." عشیرہ نے کہا اور ہنس پڑی۔

"کونسا کام یار۔"

"جس کے لیے میں اس خاندان میں داخل ہوئی ہوں۔ ویسے تمہیں میری عمر پر اعتراض تو نہیں ہے۔ ایک ہزار دو سو دو، زیادہ تو نہیں ہوتے۔ اور تم دیکھنا جب میں چھ کلیجے کھالوں گی تو ایک دم پھر سے جوان ہو جاؤں گی۔"

"ایک درخواست کروں۔" معظم علی نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہوں کیا۔"

"اس سے زیادہ جوان نہ ہونا پلیز۔ معظم علی نے کہا اور عشیرہ کو اپنے بازوؤں میں گھسیٹ لیا۔"

"میں جاگ رہی ہوں۔" ایک معصوم سی آواز سنائی دی۔

✡ ✡ ✡

سونے شاہ اماں بی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ "بات یہ ہے، بہن صاحبہ کہ بچپن ہی سے دل درویشیت کی طرف مائل تھا۔ تارک الدنیا لوگوں کی صحبت حاصل رہی۔ ان کی قربت سے، جو بینائی حاصل ہوئی وہ کبھی کبھی کام آجاتی ہے۔"

"آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔" یہ اماں بی نے پوچھا۔

"آہ، آپ کو تکلیف کی راحت کا تو اندازہ ہی نہیں ہے۔ تکلیف کا ایک اپنا مزہ ہے۔" شاہ صاحب نے مستانہ وار کہا۔

"جو تکلیف ہے نذیر خان کو بتا دیجئے۔ اسے ہدایت کر دی گئی ہے کہ آپ کا خیال رکھے۔" شاہ

جہاں بیگم نے ایک ملازم کے بارے میں بتایا۔

"نہیں ہم کچھ اور کہنا چاہتے تھے۔"

"جی فرمایئے۔"

"آپ لوگ کتنے اچھے ہیں۔ کتنے ملنسار، کتنے خوش اخلاق دوسروں کے ساتھ اتنی محبت سے پیش آنے والے۔ لیکن امی گھر کے آسمانوں پر ایک منحوس کالی چادر تنتی جا رہی ہے۔

"کالی چادر..."

"ہاں ہم ایک بد روح یہاں آگھسی ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔" اماں بی کا لہجہ بدل گیا۔

"بچپن ہی سے ندا کو بہت چاہا ہے اور وہ اس گھر کی بہو ہے۔"

"تو پھر...؟"

"اس گھر کی بھلائی کے خواہاں ہیں یہ کیسے ممکن ہے ہم نے اتنا علم سیکھا ہے اور ہم اپنی بھانجی کے گھر میں اس بد روح کو برداشت کریں...!"

"آپ کا شکریہ بھائی صاحب۔ دراصل ہم ان توہمات کے قائل نہیں ہیں اور ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ اس لیے آپ ایک مہمان کی حیثیت سے بخوشی یہاں رہیں اور ایسی کوئی زحمت نہ کریں! اماں بی کا لہجہ خشک ہو گیا لیکن سونے شاہ نے ہار نہ مانی۔

"درویشوں کے ساتھ یہی تو مشکل ہوتی ہے۔

"کیا..."

"آپ لوگ نہیں سمجھتے۔ اس زمین پر ایک حکومت سرکار کی ہوتی ہے، جس کے لیے الیکشن ہوتے ہیں۔ صدارتوں اور وزارتوں کے انتخاب ہوتے ہیں۔ عہدے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس سے ہٹ کر اس دنیا پر ایک اور حکومت ہوتی ہے۔ قطبوں کی ابدالوں کی، ولیوں کی، درویشوں کی ان پر ذمے داریاں عائد کی جاتی ہیں۔ امن و امان کی انسانوں کو ارواح خبیثہ سے بچانے کی ہمیں بھی کچھ حقیر سی ذمے داریاں سونپی گئی ہیں۔

"ذمے داریاں...؟" اماں جی نے کہا۔

"جی اور ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ یہاں بد روحیں بسیرا کر رہی ہیں۔"

"آپ ان بد روحوں کو یہاں سے نکالیں گے۔"

"سو فیصدی ہماری ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔"

"ندا نے لگائی ہے۔"

"جی ہاں... جی نہیں۔" شاہ صاحب گڑبڑا گئے۔

"آپ سچ مچ ندا کے ماموں ہیں۔"

"بالکل میں۔"

"پہلے تو میں آپ کے بارے میں اس بات کی تصدیق کراتی ہوں اور اگر آپ ندا کے ماموں نہ نکلے اور کوئی ڈھکوسلے باز نکلے تو میں کم از کم جعلسازی کے الزام میں ایک سال کی سزا کراؤں گی۔ ورنہ دوسری صورت میں آپ خاموشی سے جتنے دن یہاں رہنا چاہیں رہیں سمجھ لیا آپ نے۔

شاہ صاحب کو اندازہ ہو گیا کہ واسطہ بڑا خطرناک ہے۔ گھر کی سربراہ شاہجہاں بیگم تھیں انہوں نے براہ راست ان پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اگر شاہجہاں بیگم ہاتھ آگئیں تو پھر کس کو مجال تھی کہ شاہ صاحب کو یہاں سے نکال سکتا جہاں انہیں بہترین آسانیاں فراہم کی گئی تھیں۔ جلدی سے بولے۔

نہیں معزز خاتون... خلوص کا ایک عمل ہونا ہے، ہم کئی دن سے اس گھر کا نمک کھا رہے ہیں۔ آپ معلوم کرا لیجیے ہم ندا کے ماموں ہی ہیں۔ دوسری صورت میں اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ہمیں خاموشی اختیار کر لینی چاہیے تو جو حکم عالی! ہم چند روز مہمان رہ کر چلے جائیں گے۔

"یہی آپ کے حق میں بہتر ہے۔" اماں جی نے کہا۔

شاہ صاحب اماں بی کے کمرے سے نکل آئے لیکن اماں بی دیر تک سوچتی رہیں۔ وہ خود بھی زیرک تھیں اور پھر شاہن گلی کی حویلی میں انہوں نے پوری عمر گزاری تھی اور ان کا واسطہ آتشی مخلوق سے پڑا تھا دونوں بالکل پر امن رہے تھے بلکہ یہ ایک مثال تھی۔ عشیرہ کے بارے میں تو انہیں ذرہ برابر کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کوئی غیر انسانی مخلوق ہے۔ لیکن دعا کی

حقیقت وہ سمجھ چکی تھیں۔ حالات پر غور بھی کیا تھا۔ معظم علی نے جو کہانی سنائی تھی اس پر انہیں یقین نہیں آیا تھا لیکن انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ انہیں یقین نہیں آیا۔ البتہ یہ بات وہ جان گئی تھیں کہ دعا کے ساتھ کوئی خاص کہانی منسلک ہے۔

فرزانہ اور ندا کے گٹھ جوڑ کا بھی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے عشیرہ کے خلاف محاذ بنا لیا ہے۔ وہ تو شکر تھا کہ ندرت پر ان کا بس نہیں چلا تھا ورنہ وہ ندرت کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتیں۔ بہرحال یہ ان کے پیر صاحب ندا کے ماموں تو بالکل نہیں لگتے تھے۔ لیکن اب انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان پر گہری نگاہ رکھیں گی۔ البتہ وہ کچھ سوچ کر اپنی جگہ سے اٹھیں اور عشیرہ کے کمرے کی طرف چل پڑیں۔

عشیرہ اس وقت کمرے میں نہیں تھیں ہاں دعا اپنے بستر میں جاگ رہی تھی۔ وہ ان کے قریب پہنچ گئیں۔ اسے دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں "دعا میری بچی تم جو کوئی بھی ہو مجھے اس سے غرض نہیں۔ بس تم میرے دل کا ٹکڑا بن چکی ہو، میں تمہیں کبھی اس خاندان سے جدا نہیں کروں گی۔ بیٹی میں کمزور ہوں۔ بہت سے امور سے ناواقف ہوں۔ بس ان حاسدوں سے اپنا خیال رکھنا اور میں آپ سب سے مخاطب ہوں۔ آپ ضرور دعا کی نگرانی کر رہے ہوں گے۔ اس کا خیال رکھیے۔"

یہ کہہ کر اماں بی نے دعا کی پیشانی چومی اور باہر نکل آئیں۔

دوسری طرف شاہ صاحب اماں بی کے خطرناک لہجے اور ہوش اڑانے والے جملوں سے سیدھے ہو گئے تھے۔ یہ لوگ بڑی حیثیت والے تھے۔ سب کچھ کر سکتے تھے۔ ایک سال کی جیل شاہ صاحب کے تو پسینے چھوٹ گئے تھے۔ سیدھے ندا کے پاس پہنچے تھے۔

"آیئے ماموں جان آپ خوش تو ہیں ندا نے ان کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

"بہت خوش ہوں۔ ماموں جان نے کہا اور ان کے لہجے پر ندا چونک پڑی۔

"کیا بات ہے۔"

"ایک سال کی سزا تجویز کی گئی ہے میرے لیے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں۔" ندا حیرانی سے بولی اور شاہ صاحب نے اماں بی سے ہونے والی ساری باتیں ندا کو سنا دیں اس کے بعد بولے۔

"اگر ماموں نے وہاں سے تصدیق کرائی کہ ہم تمہارے ماموں ہیں یا نہیں تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ غلط ہے۔"

"تو اس سے کیا ہو گا۔" ندا نے پھنکار کر کہا۔

"حیثیت والے لوگ ہیں، لے دے کر سب معلوم کرا لیں گے۔" شاہ صاحب بولے۔

"اور میں بے حیثیت ہوں۔" ندا نے غرا کر کہا۔

"نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"آپ سے میرا کوئی سگا رشتہ نہیں ہے۔ لیکن میرا ایک گھر ہے۔ ہمارے تعلقات ہیں۔ میں آپ کو سگا ماموں سمجھتی ہوں آپ بچپن سے مجھے اپنی سگی بھانجی سمجھتے ہیں۔ اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ شاہ صاحب میں صرف اپنے شوہر سے تعاون کر رہی ہوں۔ اگر اپنی سی پر آ گئی تو ان لوگوں کے حلق میں ہڈی بن جاؤں گی۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں۔ میں ایک ایک کو دیکھ لوں گی۔ رہے وہاں کے معاملات تو وہ ماموں ریاض سنبھال لیں گے۔

"ٹھیک ہے۔ اب دل مطمئن ہو گیا۔" شاہ صاحب نے کہا۔

اور دوسرے ہی دن انہوں نے ایک کارنامہ سر انجام دے دیا۔ ندا کے بارے میں اندازہ لگا لیا تھا کہ مضبوط پارٹی ہے ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہے چنانچہ نڈر ہو گئے تھے۔ کچھ کر کے دکھانا چاہتے تھے انہوں نے عشیرہ اور معظم علی کو کار میں بیٹھ کر باہر جاتے ہوئے دیکھ لیا اور فوراً ہی اپنے ایک عمل کے لیے تیار ہو گئے۔

ندا کے ماموں تھے۔ یہاں انہیں کافی آزادی ملی ہوئی تھی اس لیے عشیرہ کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو دعا اپنے بستر پر اکیلی

تھی۔ دروازہ کھول کر آہستہ سے اندر داخل ہو گئے۔ لیکن جیسے ہی بستر کے قریب پہنچے اچھل پڑے۔

دعا کے سرہانے کالے رنگ کا ایک ناگ بیٹھا ہوا تھا۔ لمبے سانپ نے کنڈلی ماری ہوئی تھی اور اس کا پھن دعا کے رخسار پہ تھا جو کچھ بھی تھا، تھے تو انسان ہی ان کے حلق سے دہاڑ نکلی سانپ، سانپ بھاگو بچاؤ سانپ۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف لپکے لیکن پاؤں لباس میں الجھا اور دروازے کی طرف سے رخ بدل گیا۔ وہ ایک دوسری دیوار سے جا کر ٹکرائے۔

ادھر سانپ نے دعا کے رخسار سے پھن اٹھایا۔ زہر آلود نظروں سے شاہ صاحب کو دیکھا اور پھر تیزی سے پلنگ کے نیچے اتر کر شاہ صاحب پر جھپٹا! شاہ صاحب کی تو جان نکل گئی۔ حلق پھاڑ کر چیخے "بچاؤ ... ارے بچاؤ" ان کی آواز کئی ملازموں نے سن لی اور وہ دروازہ کھول کر دھڑادھڑ کرتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ان کے آنے سے سانپ کی توجہ بھی بٹ گئی اور اس نے رخ بدلا۔ اس دوران شاہ صاحب نے اپنے بندر کے سر والی موٹھ کی چھڑی سانپ پر ماری اور اتفاق سے وار کاری لگا۔ سانپ کا پھن بری طرح زخمی ہو گیا۔ اس نے زمین پر کئی لوٹیں لگائیں پھر لہراتا ہوا مسہری کے نیچے گھس گیا۔

شاہ صاحب کی بری حالت تھی۔ حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بس مسہری کی طرف اشارہ کیے جا رہے تھے۔ نوکروں نے بھی سانپ کو مسہری کے نیچے گھستے ہوئے دیکھ لیا تھا اور مور کی ہمت بھی مسہری کی طرف بڑھنے کی نہیں پڑ رہی تھی۔

اس چیخ پکار پر پورا گھر جمع ہو گیا۔ اماں بی، ندا، فرزانہ اور دوسرے ملازم۔ اماں بی ہی آگے بڑھیں اور انہوں نے دعا کو گود میں لے لیا۔ پھر ماموں نے خود ہی مسہری کے نیچے اور پھر پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ سانپ کا کہیں نشان نہیں ملا تھا۔ تب انہوں نے شاہ صاحب کو گھورتے ہوئے کہا۔

"آپ کو سانپ کا پتا کیسے چلا؟"

"گزر رہا تھا ادھر سے دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ کھلا کیا ہوا تھا سو فیصدی کھولا گیا تھا۔ مجھے سانپ اندر داخل ہوتا نظر آیا۔ بس میں اندر داخل ہو گیا۔ اس نے مجھ پر حملہ کیا تو میں نے اس سے مقابلہ کر کے اسے زخمی کر دیا۔ اتنی دیر میں ملازمین اندر گھس آئے۔" شاہ صاحب نے کہانی سنا دی۔

ملازم اگر اپنی آنکھوں سے سانپ کو نہ دیکھ لیتے تو شاید ماموں کی بات پر شبہہ کیا جاتا۔ لیکن سانپ کا قصہ تو یہاں بہت دن سے چل رہا تھا البتہ ندا نے طنز کیا۔

"آج کل یہ کوٹھی سانپوں کی آماجگاہ بن گئی ہے۔ بڑے سانپ دیکھے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ پتا نہیں چل رہا ہے کہ اچانک یہ سانپ آ کہاں سے گئے ہیں۔"

"یہ تو خیر جہاں سے بھی آئے ہیں۔ لیکن کچھ نئے سانپ بھی لا کر یہاں بسائے جا رہے ہیں۔ پہلے ان کے سر کچلنے کا مناسب انتظام کرنا پڑے گا۔" اماں بی نے کہا۔ اصل میں اماں بی نے ندا کی اور ندا نے اماں بی کی دونوں نے ایک دوسرے کی بات اچھی طرح سمجھ لی تھی۔

☼ ☼ ☼

چاند بھرپور کھلا ہوا تھا۔ مدھم مدھم ہوا نے سماں باندھا ہوا تھا۔ بیلے کے پھولوں کی خوشبو چاروں طرف چکراتی پھر رہی تھی اور ... ایک پھولوں کے کنج کے عقب میں ایک ناقابل یقین منظر نمایاں تھا۔

دعا اب بہت چھوٹی نہیں رہی تھی۔ وہ پیدل بھی چل لیتی تھی اور ٹوٹے پھوٹے لفظ منہ سے نکال لیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ شاداب گھاس پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس سے کچھ فاصلے پہ ایک سفید پوش شخص بیٹھا ہوا تھا۔

دعا کے پاس اس کے مخصوص کھلونے رکھے ہوئے تھے۔ اسے ان کھلونوں سے خاص ہی رغبت محسوس ہوتی تھی۔ یہ وہی چاروں کھلونے تھے۔ جو اس کے کمرے میں بھی دیکھے گئے تھے۔

سفید پوش شخص جس کا چہرہ بے حد پروقار تھا محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کے منہ

سے نکلا۔

"دعا..."

دعا نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر ٹوٹی آواز میں بولی۔ "نانو..."

سفید پوش شخص کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس وقت ایک ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی اور سفید پوش کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔

کنج کے دوسری طرف سے ایک شخص نمودار ہوا تھا۔ یہ دودھ جیسے سفید رنگ کا مالک' بے حد دلکش نقوش والا دراز قامت شخص تھا۔ قد لمبا' عمر تقریباً" پینتیس سال ہو گی۔ دودھ جیسے سفید رنگ کے چہرے پر ہلکی گہرے سیاہ رنگ کی داڑھی تھی۔ اس کی پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

سفید پوش کے چہرے پر ناخوشگواری کے آثار پیدا ہو گئے۔

نووارد دعا سے کچھ فاصلے پر رکا پھر اس نے اپنے لباس سے ایک خوب صورت گڈا نکالا۔ یہ گڈا بھی کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا تھا اور اس قدر خوب صورت تھا کہ اس پر نگاہ نہ ٹکے۔ اس نے گڈا زمین پہ رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا میں اسے بھی اس کے کھلونوں میں شامل کر دوں سید صاحب۔"

"ہرگز نہیں۔ اس کے اپنے کھلونے کافی ہیں۔" بزرگ نے کہا۔

"یہ بھی اس کا اپنا کھلونا ہے۔" نووارد نے عاجزی سے کہا۔

"نہیں اس کا ان اپنوں سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔" بزرگ نے کہا۔

"رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے سید صاحب وقت بے شک لگ جاتا ہے لیکن رشتے دماغ کی گہرائیوں میں رہتے ہیں آپ انہیں شعور سے مٹا دیں' وہ لاشعور میں چلے جاتے ہیں۔ آپ انہیں لاشعور سے بھی نکال دیں تو وہ تحت الشعور میں چلے جاتے ہیں اور جب دماغ کی باریک رگوں میں رہنے والے خون میں طاقت پیدا ہوتی ہے اور وہ مطلق العنان ہوتا ہے تو اسے شعور اور لاشعور کا بھی ادراک ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی یادیں اس سے چند قدم کے فاصلے پر ہوتی ہیں۔" نووارد نے کہا۔

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔"

"زندگی میں کبھی اس کی جرات کی ہے۔"

"میں نے اسے اپنی زندگی کے عوض حاصل کیا ہے۔" بزرگ نے کہا۔

"یہ آپ کی ہے... بس"

"نہیں تم یہ سازشیں نہ کرو اسے میرے سامنے سے ہٹاؤ۔" بزرگ نے پلاسٹک کی طرف اشارہ کیا۔

"حالانکہ اس کا قصور نہیں ہے۔ گڈا اور بولا۔

"بے وقوف ہو تم۔ تم نے بہت گہری چال سوچی تھی۔ لیکن جاؤ مجھ سے کوئی غلط قدم نہ اٹھواؤ۔ اسے یہاں سے ہٹا دو۔"

"سمنان جاؤ" نووارد نے کہا اور پلاسٹک کا گڈا واپسی کے لیے مڑ گیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھولوں کے اس کنج کے عقب میں چلا گیا۔

"تم زخمی ہو۔" بزرگ نے پہلی بار نرم لہجے میں کہا۔

"ہاں ہر جگہ کچھ بے وقوف ہوتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" بزرگ نے پوچھا۔

"مٹی کی تخلیق میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ مٹی سے ہی نفرت کرتی ہے۔ کچھ لوگ یہاں ایسا ہی کر رہے ہیں۔ خیر یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ مجھے فکر نہیں ہے۔"

"دعا محفوظ ہاتھوں میں ہے اس کی فکر نہ کرو۔"

"میں جانتا ہوں۔" نووارد نے کہا پھر کچھ لمحوں کے بعد بولا "سمنان کے بارے میں ایک بار پھر درخواست کروں گا۔"

"میرے ذہن کو آتش نہ بناؤ۔ ورنہ میں بہت بڑا کھیل ختم کر دوں گا اور تم مجھے ایک بدترین گناہ کا شکار کرو گے" بزرگ نے شرربار لہجے میں کہا۔

"لیکن... نووارد بولا تو بزرگ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں دعا کو ختم کر دوں گا۔ میں اس سے زندگی چھین لوں گا۔" بزرگ جوش سے بولے۔ نووارد ایک

لمحے کے لیے لرز گیا۔ پھر واپس مڑ کر کنج کے دوسری طرف چلا گیا۔

سفید پوش بزرگ کچھ لمحے اسی طرح خاموش رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔ "دعا بیٹی جاؤ اب آرام کرو۔" دعا خاموشی سے اٹھ گئی۔ پھر وہ کھلونوں کے قافلے کے ساتھ اندر چل پڑی پلاسٹک جیسی شے سے بنے یہ کھلونے اس کے ساتھ چل پڑے اور چند لمحوں کے بعد یہ اندر داخل ہو گئے۔ سفید پوش بزرگ انہیں دیکھتے رہے اور جب وہ اندر داخل ہو گئے تو وہ چراغ کی طرح بجھ کر ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

✡ ✡ ✡

سونے شاہ نے سانپ کو زخمی ضرور کر دیا تھا لیکن اس کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ ایک تو انہیں یہ روایت یاد تھی کہ چوٹ کھایا ہوا سانپ بدلہ ضرور لیتا ہے۔ دوسرے وہ حیران تھے کہ نوکروں نے کمرے کے چپے چپے کا جائزہ لے لیا تھا مگر سانپ کا نام و نشان نہیں ملا تھا۔ تیسری سب سے خوفناک بات یہ تھی کہ سانپ جس طرح دعا کے رخسار پر پھن رکھے بیٹھا تھا اس سے اس کے اور دعا کے پیار کا پتا چلتا تھا۔

لیکن کیوں...

فرزانہ اور ندا ایک دوسرے کی رازدار تھیں اس لیے سونے شاہ کی اصلیت دونوں کو معلوم تھی اور سونے شاہ کو بھی یہ بات بتا دی گئی تھی۔ چنانچہ اس وقت ایک محفوظ جگہ تینوں کی میٹنگ ہو رہی تھی۔

"میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ بات اتنی خطرناک ہو گی۔" سونے شاہ نے کہا۔

"کتنی خطرناک..." ندا بولی۔

"اس گھر میں جنوں نے بسیرا کر لیا ہے۔"

"وہ تو ہم نے آپ کو پہلے ہی بتایا تھا۔ اور پھر جنوں سے تو اس خاندان کی پرانی رشتے داری ہے۔"

"رشتے داری ہے۔ کیا مطلب۔"

"ہم لوگ شان گلی میں رہتے تھے۔ وہاں ہماری حویلی میں..." فرزانہ نے پوری تفصیل بتائی اور شاہ صاحب مزید گھبرا گئے۔

"میں نے وار کر دیا ہے لگتا ہے وہ سانپ بھی جن تھا اور وہ میرے ہاتھوں سے زخمی ہو گیا ہے۔ خیر اللہ مالک ہے۔"

"آپ نے جڑ پر تو ہاتھ ڈالا ہی نہیں شاہ صاحب۔" فرزانہ نے کہا۔

"کونسی جڑ...؟"

"ارے وہ عشیرہ۔"

"اتنا آسان نہیں ہوتا سب کچھ پہلے کونپلوں کو تو دیکھ لوں۔ پھر جڑ کو دیکھوں گا۔" شاہ صاحب نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ انہیں واقعی خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ عام طور سے یوں ہوتا ہے کہ کچھ واقعات بالکل اتفاقیہ ہو جاتے ہیں اور توہم پرست لوگ سمجھتے ہیں کہ گھروں پر آسیبی سائے منڈلا رہے ہیں۔ ایسے میں ان سڑک چھاپ عاملوں کی چاندی ہو جاتی ہے اور یہ خوب کمائی کر لیتے ہیں لیکن کبھی کبھی غلط بھی ہو جاتا ہے۔ اور شاہ صاحب کو لگ رہا تھا کہ کچھ غلط ہی ہو گیا ہے۔ خاص طور سے سانپ والے واقعے سے وہ کافی خوفزدہ تھے۔

دوسری طرف اماں جی کی فطرت میں کچھ تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ خاص طور سے جب سے پرانے سامان میں جب اچانک وہ کتاب انہیں مل گئی تھی تو انہیں بڑی رہنمائی حاصل ہوئی تھی فرزانہ اور ندا کی عشیرہ سے جلن اور دونوں کی ملی بھگت سے وہ اچھی طرح واقف ہو گئی تھیں۔ اور اب انہیں ماموں صاحب پر بھی پورا پورا شک ہو گیا تھا۔ ندا کا اچانک میکے جانا اور ایک ماموں صاحب کو لے آنا بے معنی نہیں تھا۔ اور یہ ماموں صاحب جو زندگی میں پہلے کبھی سامنے نہیں آئے تھے۔ انہیں اس بات کا تو یقین تھا کہ شاہ صاحب دعا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ پھر بھی دشمن کی طرف سے ہوشیار رہنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ غور کر کے انہوں نے اپنے ایک پرانے ملازم کو طلب کر لیا۔

یہ ملازم بھی انہیں کے پاس پلا بڑھا تھا اور اسے سب جمہورا کہتے تھے۔ سیدھا سادا دیہاتی تھا۔ پہلوانی

کا شوق تھا۔ عقل، بھی بدن کا حصہ بن چکی تھی لیکن حکم کا غلام تھا۔ خوب طاقت ور تھا جمورے کی طلبی ہو گئی۔

"کیسے ہو جمورے۔" اماں بی نے پوچھا۔

"کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔"

"نہیں جی بس ایک چھپکلی تنگ کر رہی ہے آج کل۔"

"چھپکلی۔"

"ہاں جی! چھت پر ٹنگی ہوتی ہے بس ڈر ہی لگتا رہتا ہے کہ اب گری تب گری۔ اس کا کوئی علاج بتائیں۔"

"علاج۔" اماں بھی ہنس کر بولیں۔

"ہاں جی! بس اس کی تکلیف ہے۔"

"تو ایک کام کرو!" اماں جی نے بدستور ہنستے ہوئے کہا۔

"جی بتایئے...."

"اپنی چارپائی اپنے کوارٹر کے سامنے کھلی جگہ بچھا لیا کرو۔ نہ چھت ہوگی نہ چھپکلی آئے گی۔"

"ایں!" جمہورے سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر خوش ہو کر بولا۔ "یہ ترکیب تو بڑی بڑھیا ہے۔ آج سے ایسا ہی کروں گا بڑی مالکن!"

"اچھا اب ایک بات غور سے سنو۔" شاہجہاں بیگم نے کہا اور اسے آہستہ آہستہ کچھ سمجھانے لگیں۔ جمورے غور سے سن رہا تھا۔ سب کچھ سننے کے بعد اس نے جھٹکے دار آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے بڑی مالکن۔"

✵ ✵ ✵

سونے شاہ کے فرشتوں کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ ایک خوفناک بلا جس کا اپر چیمبر پوری طرح خالی ہے ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ یہ جمہورا تھا جو ایک مشین جیسا تھا۔ اماں جی نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ دعا کا خیال رکھے کوئی دعا کو نقصان نہ پہنچانے پائے اور جمہورا اپنا فرض انجام دے رہا تھا۔

ادھر سونے شاہ، دعا کا راز جاننے میں مصروف تھے۔ ان حالات میں وہ ویسے ہی فرار ہو جاتے لیکن اول تو ریاض احمد سے دوستی تھی دوسرے خاصی رقم وصول کر چکے تھے، جس پہ خیال تھا کہ دعا کی حقیقت کا پتا چل جائے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اور عشیرہ کوئی دوسری ہی مخلوق ہیں اس کے بعد وہ یہاں سے نکل جائیں۔ باقی کاموں کے لیے دوسرے عامل موجود ہیں ان سے رجوع کیا جائے۔

اس وقت بھی گھر میں بہت کم لوگ تھے۔ انہوں نے عشیرہ کو کار میں جاتے دیکھ لیا تھا۔ معظم علی تو پہلے ہی اپنے آفس چلے گئے تھے۔ گھر سنسان ہی پڑا تھا۔ وہ موقع پا کر دعا کے کمرے میں چلے گئے۔ دعا گہری نیند سو رہی تھی۔ سونے شاہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون ہے تو بی بی مجھے بتا دے تاکہ میرا کام ختم ہو جائے!" یہ کہتے ہوئے ان کی نگاہ دعا کے گلے میں پڑے سونے کے لاکٹ پر پڑی، جس میں ایک انتہائی قیمتی ہیرا جگمگا رہا تھا۔ سونے شاہ کا دل اچھل پڑا، یہ ہیرا۔ یہ ہیرا تو بے حد قیمتی ہے۔ اور ہیرا واقعی بیش قیمت تھا یہ دعا کو مسز گردیزی نے "تحفتاً" دیا تھا۔ شاہ صاحب کے منہ میں پانی بھر آیا۔

آہستہ سے جھکے اور لاکٹ دعا کی گردن سے اتار لیا۔ اس کی چین بھی بہت وزنی تھی۔ لیکن دوسرے لمحے ان کے کانوں کے پاس بم پھٹا۔ لاکٹ ایٹم بم بن گیا تھا، بادلوں جیسی ایک گرج کانوں کے بالکل پاس سنائی دی تھی۔

"چور کے بچے چوری کرتا ہے۔ آواز کے ساتھ ہی شاہ صاحب فضا میں بلند ہوتے چلے گئے تھے اور پھر زمین پر گرے تھے۔ لیکن اس طاقت سے کہ پھر حواس قائم نہیں رہے تھے۔

جمورے کی آواز بھی لاؤڈ اسپیکر کے بغیر کافی تھی۔ وہ زور زور سے چیخ رہا تھا آن کی آن میں گھر میں، جو کوئی موجود تھا، آموجود ہوا۔ شاہ صاحب کی ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ لگی تھی۔ اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں پا رہے تھے۔

"کیا ہوا کیا ہو گیا سب مل کر پوچھ رہے تھے۔

"چوری کر رہا تھا چور کا بچہ۔" وہ بھی جمہورے کے سامنے۔

ندا بھی آگئی تھی۔ سونے شاہ کی کیفیت دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ وہ سمجھی کہ شاہ جی کا جنوں سے ٹاکرا ہو گیا ہے۔

"کیا ہو گیا ماموں جان؟ اٹھئے تو سہی۔"

"چل بسے ہم ندا بیٹی کہا سنا معاف کر دینا شاہ صاحب بولے۔

"اٹھئے تو سہی۔ زمین پر کیوں پڑے ہیں۔ ندا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔

"جا چکے ہیں ہم دنیا سے اس کرین کے بچے سے کہو ہمیں اٹھا کر آسمان پر پھینک دے۔" شاہ جی نے کہا۔

"کس کرین کے بچے سے۔"

"یہی جو زمانہ قدیم کا جلاد کھڑا ہے۔ ہائے کمبخت نے سر سے اونچا کر کے دے مارا تھا۔

"اماں جی بھی آکر کھڑی ہو گئی تھیں اور سنجیدگی سے خاموش کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں۔

"کیا ہوا تھا جمہورے مجھے بتا۔" فرزانہ نے کہا۔

"چھوٹی بچی کا ہار اتار کر بھاگ رہا تھا ہم نے پکڑ لیا۔ ہم ٹھیک ہے بی بی صاحب ہمارا ڈیٹی ہے۔" جمہورے نے جواب دیا۔

ہار شاہ صاحب کی جیب سے برآمد ہو گیا۔ ندا کا منہ لٹک گیا تھا۔ کچھ بھی نہ بول سکی۔ اماں جی نے سخت لہجے میں کہا۔ "انہیں ان کے کمرے میں پہنچا دو۔ ندا تم ان کی چوٹ کے بارے میں دیکھو ضروری سمجھو تو سعادت کو فون کر دو۔ اور یہ ہار مجھے دو، کسی نے تحفے میں دیا ہے۔ باقی لوگ اپنے کمروں میں جاؤ۔ تماشا مت بناؤ۔"

اماں جی کے الفاظ زہر میں بجھے ہوئے تھے۔ کسی اور کو کوئی ہدایت کرنے کے بجائے انہوں نے جو کچھ کہا تھا ندا سے کہا تھا اس کا مطلب بہت گہرا تھا۔ جمہورے نے ہی شاہ صاحب کو کسی بچے کی طرح گود میں اٹھا کر ان کے کمرے میں پہنچایا تھا۔ اماں بی اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ وہ دعا کو بھی اپنے کمرے سے لے گئی تھیں۔

غرض یہ کہ رات کے کھانے پر سونے شاہ موجود نہیں تھے۔ ان کا کمرہ بھی خالی ہو گیا تھا۔ صرف انہیں واپس بھیج دیا گیا تھا۔ ندا کھانے کی ٹیبل پر موجود تھی لیکن شاید سعادت نے اس کی اچھی طرح خبر لی تھی جس کے اثرات اس کے چہرے پر نظر آرہے تھے۔ ویسے ایک گہری خاموشی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ لیکن ہار یا شاہ صاحب کے بارے میں کسی نے کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ البتہ رات کو معظم علی نے عشیرہ سے کیا تھا۔

"تم ان حالات سے بددل تو نہیں ہو عشیرہ۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو معظم یہ سب میرے لیے کلاسک ہے۔ میں نے کہاں ایسا ماحول دیکھا ہے۔" عشیرہ نے بڑے پیار سے کیا۔

"ہاں اس سے انجوائے کرنا۔ اس سے بددل نہ ہونا۔" معظم علی نے کیا۔

✵ ✵ ✵

گھر میں ایک دم خوشیوں کا طوفان آگیا تھا۔ ریحانہ، اور عرشہ آرہی تھیں۔ یہ دونوں شاہجہاں بیگم کی بیٹیاں تھیں جو کینیڈا میں تھیں۔ ان کے شوہر بہت مصروف رہتے تھے اس لیے وہ کئی کئی سال کے بعد چکر لگاتی تھیں۔

اس بار بھی کئی سال کے بعد آرہی تھیں۔ اماں بی بھی بہت خوش تھیں۔ خاص بات یہ تھی کہ معظم علی کی ملاقات بہت طویل عرصے کے بعد بہنوں سے ہونے والی تھی۔ غرض یہ کہ کئی راتوں سے جاگا جا رہا تھا۔ تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ مہمانوں کے آنے کا وقت آگیا۔ گاڑیوں کا پورا جلوس ایئرپورٹ پہنچا تھا اور سب نے آنے والوں کا استقبال کیا تھا۔ گلے ملے تھے۔

ان لوگوں کے بچے بھی ساتھ تھے پھول جیسے پیارے بچے۔ دونوں بہنیں بڑے جذباتی انداز میں بھائی اور پھر عشیرہ سے ملی تھیں۔

"آپ ہمارے لیے اجنبی نہیں ہیں بھابی آپ کی اور دعا کی بہت بڑی بڑی تصویریں ہمارے ڈرائنگ روم میں لگی ہیں۔"

"کیوں نہیں مجھے اندازہ ہے۔" عشیرو نے کہا۔

"آپ یقین کریں ایک بہت بڑا ایڈورٹائزنگ کمپنی کے ڈائرکٹر نے تو کافی فورس کیا کہ وہ دعا کو اپنے ایک پروڈکٹ کے لیے شوٹ کرنا چاہتے ہیں۔ میرے شوہر' میرے میاں نے کہا کہ میری ساس صاحبہ آپ کو شوٹ کردیں گی۔ کبھی خواب میں بھی نہ سوچیں۔"

مسز گردیزی اور ان کی بیٹیاں بھی ایئرپورٹ سے گھر تک ساتھ آئی تھیں اور عظیم الشان کوٹھی کھچا کھچ بھر گئی تھی۔ خواتین کی مخصوص تقریبات جاری ہو گئی تھیں' تحفے تحائف' ایک دوسرے پر تبصرے۔ عشیرو اور دعا تو سب کی جان بن گئی تھیں۔ فرزانہ اور ندا بظاہر سب کے ساتھ تھیں لیکن اندر جو کچھ تھا اس ہنگامہ آرائی پر تو اسے باہر نکالنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔

بڑی دلچسپ صورت حال تھی۔ کنیڈا سے آنے والے چھوٹے چھوٹے بچے بھی خوب انجوائے کر رہے تھے' دعا بھی خوش نظر آتی تھی۔ حالانکہ وہ بہت چھوٹی تھی لیکن ان نئے لوگوں کی آمد کی خوشی اس کے چہرے پر نظر آتی تھی۔ گھر میں دوسرے بچے بھی تھے جن میں خاص طور سے فرزانہ کے بچے اب سمجھدار ہو گئے تھے اور اسکول وغیرہ جانے لگے تھے۔ لیکن فرزانہ نے ذاتی عناد کی وجہ سے انہیں دعا سے زیادہ قریب نہیں ہونے دیا تھا۔ سب نے محسوس کیا تھا کہ نئے آنے والے بچوں سے دعا بہت خوش ہے۔

خاص طور سے رمانہ کا بیٹا دل شان جو اس وقت صرف پانچ سال کا تھا دعا کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ "مما اسے اپنے کمرے میں سلاؤ نا مما۔" دل شان نے دعا کے لیے اپنی ماں سے کہا اور رومانہ ہنسنے لگی۔

"وہ اپنی ماما کے پاس سوتی ہے بیٹے جیسے آپ اپنی ماما کے روم میں سوتے ہو۔"

"ماما وہ بہت اچھی ہے۔"

"ہاں بیٹے۔"

"ماما آپ اس کی ماما سے کہیں وہ ہمیں دعا Gift دے دیں۔"

"ارے نہیں بیٹے' کسی اور کے سامنے ایسی بات نہیں کہہ دینا اس کی ماما اور پاپا بہت ناراض ہوں گے۔ رمانہ نے بیٹے کو سمجھایا لیکن ہنستے ہوئے اس نے یہ بات اپنی ماں سے کہہ دی۔ "میرا بیٹا تو دعا کو اپنے ساتھ کینیڈا لے جانا چاہتا ہے اماں جی وہ اسے گفٹ مانگ رہا ہے۔"

"کیا مطلب... اماں بی کی سمجھ میں بات نہ آسکی۔ تو رمانہ نے پوری بات انہیں بتائی اس کا خیال تھا اماں جی یہ معصوم خواہش سن کر ہنسیں گی لیکن اماں بی سنجیدہ ہو گئیں۔

"ارے آپ کیا سوچنے لگیں۔" رمانہ بولی۔

"نہیں کوئی خاص بات نہیں۔"

"ویسے اماں بی ایک بات کہوں۔"

"ہوں۔"

"کیوں نہ اس بار ایک اینگیجمنٹ کرلی جائے۔

"کیا..."

"خاندانوں میں ایسا ہوتا بھی رہا ہے۔ ہرچند کہ یہ رسم فرسودہ ہے لیکن اس سے بہت سے رشتے مضبوط بھی ہوتے ہیں۔ کیوں نہ ہم یہاں ایک خوب صورت سی تقریب کرلیں اور ان دونوں کی منگنی کردیں۔" رمانہ نے کہا۔

"نہیں رمانہ' ایسا ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں اماں بی۔" رومانہ بولی۔

"بہت سی باتیں ہیں اول تو اب یہ تماشے بڑے فرسودہ اور غیر مہذب سمجھے جاتے ہیں۔ اور ہوتے بھی ہیں' پھر تمہارا کیا خیال ہے معظم علی یہ فرمائش سنتے ہی تیار ہو جائیں گے۔ غلط بھی ہے بچپن ہی سے بچوں کے ذہن خراب کر دیے جاتے ہیں اور پھر اور بھی باتیں ہیں۔" اماں بی نے دور تک سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا...؟"

"وہ معظم علی یا عشیرو کی اولاد بھی ہے۔"

"ارے ہاں۔ فرزانہ بھابھی نے ... ان یہ تذکرہ

شروع کیا تھا لیکن کوئی آ گیا تھا اس لیے وہ ایک دم خاموش ہو گئی تھیں۔ مجھے عجیب سا لگا تھا۔"

"کون آ گیا تھا۔"

"شاید ندرت۔"

"ہاں رمانہ ساری زندگی یہ گھر ہر طرح کی احمقانہ سیاست سے پاک رہا۔ میں نے پوری طرح اسے بیلنس رکھا لیکن معظم علی کے واپس آنے کے بعد صورت حال ایک دم بدل گئی۔"

"وجہ اماں جی۔"

"حسد' رشک' جلن۔" اماں بی نے جواب دیا۔

"وہ عشیرو بھابھی کیا..."

"نہیں وہ شریف خون ہے۔ شریف زادی ہے۔ لیکن..."

"اوہ یہ تو افسوس کی بات ہے۔ پہلے تو سب ٹھیک تھا اور دعا کے لیے آپ کیا کہہ رہی تھیں۔

"دعا عشیرو کی اولاد نہیں ہے۔ وہ..." اماں بی نے بہت مختصر طریقے سے دعا کے بارے میں بتایا۔ اس میں انہوں نے اس کے پراسرار ہونے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

دعا اب خاصی سمجھ دار ہو گئی تھی۔ پیروں بھی چلنے لگی تھی۔ یہ خاص طور سے دیکھا گیا کہ وہ دل شان کے ساتھ زیادہ خوش رہتی ہے۔ اس کے ساتھ کھیلتی ہے۔ لیکن اس دوران اس کے پراسرار کھلونے اس کے قریب نہیں آئے تھے۔

✲ ✲ ✲

بے حد خوب صورت عمارت تھی۔ جس جگہ واقع تھی وہاں کے بارے میں خواب میں بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ ایسے کسی علاقے میں یہ جادو کا عمل واقع ہو سکتا ہے۔ ہر طرف میلوں دور تک جنگل بکھرا ہوا تھا اور اس جنگل میں اس لمحات تک آنے کے لیے کوئی سڑک نہیں تھی۔ کوئی پگڈنڈی نہیں تھی۔

اس وقت عمارت کے ایک بے حد وسیع ہال میں قدیم طرز کی عالیشان کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں پر عمدہ پوشاکوں میں ملبوس لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سفید قیمتی عبائیں ان پر خوب سج رہی تھیں' کچھ پردہ پوش خواتین بھی تھیں جن میں خاص طور سے دو خواتین نمایاں تھیں لیکن ان کے چہرے نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔

ہال کے بیچوں بیچ ایک عجیب سا دائرہ روشن تھا۔ اس دائرے سے سفید سفید دھواں خارج ہو رہا تھا جس کی پراسرار مرطوب خوشبو وسیع ترین ہال میں بکھری ہوئی تھی۔ دائرے کے پاس ایک انتہائی ضعیف بزرگ بیٹھے ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ حالانکہ ہال میں کافی لوگ موجود تھے لیکن گہری خاموشی طاری تھی۔

کچھ لمحوں کے بعد بزرگ نے تسبیح پر کچھ پھونکا اور اسے ایک طرف رکھ دیا۔ اسی وقت ہال میں ایک ہلکی سی بھنبھناہٹ ابھری اور تمام نظریں اس دروازے کی طرف اٹھ گئیں جہاں سے ایک دراز قامت شخصیت اندر داخل ہو رہی تھی۔ یہ بے داغ سفید کفن میں ملبوس ایک ایسی شخصیت تھی جس کا چہرہ بھی ڈھکا ہوا تھا۔

اس شخصیت کے اندر قدم رکھتے ہی ہال میں جتنے لوگ موجود تھے سب کے سب اٹھ کھڑے ہوئے جن میں دائرے کے پاس بیٹھے ہوئے بزرگ بھی تھے۔ کفن پوش شخصیت آہستہ آہستہ آگے بڑھی تو ایک پردہ پوش خاتون اپنی جگہ سے اٹھ گئیں۔

"ادھر تشریف لے آیئے سید صاحب۔"

"آپ جانتی ہیں دنیا چھوڑ کر چلے جانے والوں کو طلب کرنا گناہ ہے عفیفہ۔ لیکن آپ نے حاضرات کا عمل کر کے یہ گناہ کیا ہے۔" کفن پوش نے کہا۔

"حد سے بڑھی ہوئی مجبوری تھی سید صاحب۔" خاتون نے کہا۔

"فرمایئے۔ میرے لیے کیا خدمت ہے۔"

"عالی حبیبی کو زخمی کر دیا گیا ہے۔ وہ میرا لخت جگر ہے۔" خاتون نے کہا۔

"وہ بھی تو غلطی کر رہے تھے۔" کفن پوش نے کہا۔

"کیا غلطی کر رہے تھے۔"

"وہ سب دنیا دار لوگ ہیں۔ ایک سانپ کو بار بار دیکھا جا رہا تھا۔ خوف تو تھا ہی۔

"مگر اس نے کسی کو نقصان تو نہیں پہنچایا۔" خاتون نے کہا۔

"یہ کون جانتا ہے۔" کفن پوش نے کہا۔

"اس گھر کے رہنے والے ہر فرد کو زندہ در گور کیا جا سکتا ہے۔ اس عمارت کو ذہن کی گہرائیوں میں دفن کیا جا سکتا ہے۔ لیکن.... وہاں دعا رہتی ہے۔"

"آپ نے مجھے یہ اطلاع دینے کے لیے بلایا ہے۔" کفن پوش نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"نہیں، معذرت قبول فرمایئے۔ عالی جبیبی کی زخمی پیشانی نے جذباتی کر دیا تھا۔" خاتون نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"جی آگے فرمایئے۔" کفن پوش نے کہا۔

"دعا کے بارے میں بات کرتی ہے۔" خاتون نے کہا۔

"وہ آدم زادوں کے درمیان پہنچ چکی ہے۔ جو خوشحال اور آسودہ حال ہیں۔ وہ وہاں غیر مطمئن نہیں ہے۔"

"پھر بھی اس سے ہمارا رشتہ تو ہے۔"

"میں نے اسے کب چھینا ہے لیکن وہ ممکن نہیں جو کسی بھی طور سوچا جائے۔"

"ہم نے سمنان کو وہاں بھیجا تھا۔" خاتون نے کہا۔

"وہی کہانی دوہرانے کے لیے جن نے میرا جگر چھلنی کیا تھا۔" سید صاحب کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔

"نہیں ایک تعلق برقرار رکھنے کے لیے۔" خاتون بولیں۔

"مجھے منظور نہیں۔" سید صاحب نے کہا اور خاموشی طاری ہو گئی۔ یہ خاموشی کافی دیر رہی، پھر خاتون نے کہا۔

"ہم بھی زخمی ہیں سید صاحب۔ میں عالی جبیبی کی ماں ہوں آپ دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں۔

"دل...." سید صاحب طنزیہ ہنسے۔ "وہ تو منوں مٹی کے نیچے جا کر مٹی ہو گیا۔"

"خدارا کچھ کیجئے۔" خاتون نے کہا۔

"آپ جو حکم کریں۔"

"اسے ہم سے بھی منسلک رہنے دیں۔"

"میں مداخلت کروں۔" وہ بزرگ بولے جو حاضرات کر رہے تھے۔

"جی امام عطری آپ دانا ہیں۔"

"اس بات کو ایک عرصہ کے لیے چھوڑ دیا جائے۔"

"کیا مطلب...."

"اسے جوان ہونے دیا جائے۔ اس کے دماغ سے یہ تصور نکال دیا جائے کہ وہ کون ہے۔ اسے اپنے طور پر سوچنے اور کرنے دیا جائے پھر جب وہ خود سے پہلا سوال کرے کہ آخر میں کون ہوں تو اس پر ساری حقیقتیں واضح کر دی جائیں اور فیصلہ اس پر چھوڑ دیا جائے۔

بزرگ کی اس حکیمانہ بات پہ گہری خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ پھر خاتون نے کہا۔

"انوکھا فیصلہ ہے۔"

"لیکن بے حد جامع اور منصفانہ۔" وہاں بیٹھے بہت سے لوگ بول پڑے۔

"تو کیا ہم اس سے سارے رشتے توڑ لیں۔" خاتون بولیں۔

"نہیں اس پر سایہ رکھا جائے۔ اس کی رگوں میں جو خون ہے وہ تو گردش میں رہے گا۔ خون کی اصل کون چھین سکتا ہے۔ لیکن اسے اس کا احساس نہ ادھر سے دلایا جائے نہ ادھر سے۔

"کیوں سید صاحب؟"

"بات کافی حد تک معقول ہے۔ لیکن ایک شرط کے ساتھ۔" سید صاحب نے کہا۔

"جی فرمایئے۔"

"کسی بھی طرز عمل کے طور پر اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہ کی جائے۔ کوئی ایسا کردار اس کے قریب جانے کی کوشش نہ کرے جسے وہ نہ سمجھ سکے۔"

"آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔" کس نے کہا۔

"میں سمجھ گئی ہوں۔" خاتون نے غمناک لہجے میں کہا۔

"کیا...." سوال کیا گیا۔

"سید صاحب سمنان کی بات کر رہے ہیں۔"

"کیوں سید صاحب۔"

"کوئی بھی ہو عالی جبیبی یا اور کوئی اس کے ذہن پر کوئی اثر انداز نہ ہو۔"

"اس طرح تو وہ ہم سے روشناس بھی نہیں ہو گی۔"

"میں یہ چاہتا بھی نہیں ہوں۔" سید صاحب نے کہا۔

"نہیں سید صاحب یہ غلط ہے آپ تعاون نہیں کر رہے۔"

"تعاون کیا تھا میں نے آپ لوگ بھول گئے۔"

"وہ تعاون نہیں تھا۔"

"پھر کیا تھا۔"

"مجبوری تھی۔" آپ نے حالات سے سمجھوتہ کیا۔" امام علی نے کہا۔

"نہیں ایک راستہ تھا میرے پاس۔" سید صاحب نے کہا۔ "میں اسے زہر دے سکتا تھا۔

"اوہو.... بات نے غلط رخ اختیار کر لیا۔" خاتون گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں بات بالکل صحیح رخ پر ہو رہی ہے۔ آپ لوگوں نے اپنا اختیار استعمال کیا ہے اور مجھے اپنی عدالت میں طلب کر کے مجھ پر اثر ڈالنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد مجھے اختیار حاصل ہے کہ میں اپنے دلائل کو ترازو میں رکھوں۔"

سید صاحب کی آواز پر جلال ہو گئی۔

خاتون نے پھر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ ہمارے معزز مہمان ہیں سید صاحب۔"

"بڑے عجیب الفاظ ہیں آپ کے۔" سید صاحب نے طنزیہ کہا۔

"کیوں...."

"ہماری خاموشی کو مجبوری کہا جا رہا ہے۔ حالانکہ ایسا نہ تھا۔ اور اب آپ دعا کے حق میں کانٹے بونے جا رہے ہیں۔ کیا آپ اس کا انجام دیکھنا چاہتے ہیں۔" سید صاحب کے لہجے میں بادلوں جیسی گڑگڑاہٹ تھی۔ گہری خاموشی طاری ہو گئی جو دیر تک قائم رہی۔ پھر سید صاحب ہی نے کیا۔ "کیا میں واپس جا سکتا ہوں۔"

"آپ ہر حال میں ہمارے لیے قابل احترام ہیں سید علی صاحب، مسئلہ اتنا الجھا ہوا ہے کہ آپ کو زحمت دینی پڑی۔ آپ کا احسان ہو گا کہ اس کا کوئی حل نکال دیجئے۔ ورنہ دونوں طرف الجھن رہے گی۔

"دعا کو وہاں سے ہٹا لیا جائے گا۔ اسے تلاش نہیں کیا جا سکے گا۔" ایک گوشے میں بیٹھے ایک باریش نے کہا اور ہر طرف ایک بھنبھناہٹ سی گونج اٹھی۔ خاتون نے غصیلی نظروں سے ادھر دیکھا اور پھر اس کی پر وقار آواز ابھری۔"

"جلانول۔"

"جی عزت جلانول۔"

"اٹھ کر آگے آؤ...." خاتون نے کہا اور وہ باریش اپنی عبا سمیٹ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور خاتون سے کچھ فاصلے پر آ کھڑا ہوا۔ "کس کی اجازت سے یہ الفاظ کہے تم نے۔"

"آپ جانتی ہیں عزت آرا۔ میں نے اپنے بیٹے کو زخمی دیکھا ہے۔ وہ وہاں تباہی مچا سکتا تھا لیکن اس نے عزت آرا کے مرتبے کا خیال رکھا۔"

"تو تم دعا کو وہاں سے ہٹا کر اس طرح گم کرو گے کہ اسے تلاش نہیں کیا جا سکے گا۔"

"میں آپ کو اپنے ان الفاظ کی وجہ بتا چکا ہوں۔" جلانول نے کہا۔

"ٹھیک ہے جلانول، اب بات سید صاحب کی نہیں رہی ہے۔ ہم تمہیں موقع دیتے ہیں کہ دعا کو اس خاندان سے جدا کر کے لے جاؤ اور اسے روپوش کر دو۔ ہم تمہاری اس کوشش کو ناکام بنائیں گے اور تمہاری قوتوں کا جائزہ لیں گے۔ خاتون نے بھاری لہجے میں

کہا۔ اور بہت سے عباپوش کھڑے ہو گئے۔ وہ سب غصیلے انداز میں جلانول کو دیکھ رہے تھے۔ امام عطری نے کہا۔

"تم نے عزت آرا کے سامنے ان کے مہمان کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں۔ تمہیں اس کی جرات کیسے ہوئی۔ تمہاری سزا لازمی ہو گئی۔

"میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

"اس کا فیصلہ شوریٰ کرے گی۔ تم اس وقت باہر نکل جاؤ اور خود کو حرم گاہ کے محافظوں کے سامنے قیدی کی حیثیت سے پیش کر دو۔ ہاں اگر تم چاہو تو فرار کی کوشش کر سکتے ہو۔

"میں ایک بار پھر۔" جلانول نے کہا۔

"دو بار گستاخی کر چکے ہو تیسری بار مجرم قرار دے دیے جاؤ گے۔ امام عطری نے کہا اور جلانول نے گردن جھکا دی پھر وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔" دیر تک سناٹا چھایا رہا تھا۔ پھر خاتون نے کہا۔

"ہم آپ سے عاجزی سے تعاون کی درخواست کرتے ہیں اور سعید صاحب۔" خدارا اس مشکل کا کوئی حل نکالیے۔" سعید صاحب کچھ لمحے خاموش رہے پھر بولے۔

"آپ حکم فرمائیے۔"

"اگر ہم امام عطری کے مشورے پر غور کر لیں تو؟"

"یعنی....."

"دعا کو ذہنی طور پر آزاد چھوڑ دیا جائے۔ کسی غیر مرئی عمل میں اس سے تعاون نہ کیا جائے ہاں اس کے اندر ماں باپ کی طرف سے جو قدرتی صلاحتیں ہیں اور جو کسی حد تک غیر انسانی ہیں انہیں قائم رہنے دیا جائے ۔ یعنی کچھ ایسے عمل جو عام لوگ نہیں کر سکتے۔ ان میں مداخلت نہ کی جائے اور جو ممکن بھی نہیں ہیں۔ پھر جب وہ ذہنی طور پر مکمل ہو جائے اور اپنے اچھے برے کا تعین کر سکے تو اسے اس کی حقیقت کا انکشاف کیا جائے۔ پھر اس کی آگے کی زندگی کا فیصلہ اس پر چھوڑ دیا جائے۔

"ٹھیک ہے لیکن اس کے باوجود کچھ پابندیاں قبول کی جائیں۔"

"وہ کیا۔"

"کوئی بھی ایسا کردار دعا کا نگراں نہ رہے۔ جو اسے خود سے متاثر کرنے کی کوشش کرے۔"

"دعا کے مکمل تحفظ کے لیے اگر کبھی مداخلت کر لی جائے تو۔"

"اس میں حرج نہیں ہے۔" لیکن اس سے فاصلہ اختیار کیا جائے۔

"منظور کیا جاتا ہے۔" خاتون نے کہا۔

☼ ☼ ☼

رمانہ وغیرہ واپس چلی گئی تھیں۔ کافی دن یہاں رہیں تھیں اور بہت خوش رہی تھیں۔ آخر میں دونوں کے شوہر بھی آ گئے تھے۔ معظم علی سے ان کی ملاقات بھی بہت عرصہ کے بعد ہوئی تھی۔ عشیرہ کو سب نے پسند کیا تھا اور دعا تو بس آنکھوں کے راستے دلوں میں گھس جانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ جو دیکھتا وارفتہ ہو جاتا۔ رمانہ نے دوسری بار براہ راست معظم علی سے کہا تھا۔

"معظم بھائی ان شاء اللہ آپ سے سینکڑوں ملاقاتیں ہوں گی۔ لیکن جب بھی دعا کو زندگی کے دوسرے دور میں داخل کرنے کا فیصلہ کریں میرے دل شان کو نظر میں رکھیں۔" اس بات پر معظم علی خوب ہنسا تھا۔ اس نے عشیرہ سے کہا تھا۔

"پاکستان میں ایسے لطیفوں کا بھی رواج ہے عشیرہ اور وہ اس طرح کے رشتوں کی تفصیل عشیرہ کو بتانے لگا۔ عشیرہ نے دلسوزی سے کہا۔

"ہائے کیسی پیار بھری روایت ہے۔ چھوٹے چھوٹے دولہا دلہن۔ یہ سوچ کر ملتے ہوئے کہ مستقبل میں دونوں ایک دوسرے کے جیون ساتھی ہوں گے۔"

"نہیں عشیرہ۔ اس طرح کے احمقانہ فیصلوں سے بڑے بڑے المیوں نے جنم لیا ہے۔ تاہم رمانہ بہن میرا وعدہ ہے کہ جوان ہو کر ان دونوں نے ایک دوسرے کو

پسند کیا اور ایک دوسرے کی زندگی میں شامل ہونے کی خواہش کی تو میں اور عشیرہ راستے کی رکاوٹ نہیں بنیں گے اور خوشی سے ان کی شادی کر دیں گے۔"

ویسے یہ ضرور محسوس کیا گیا کہ دعا بھی دوسروں کی نسبت شان سے زیادہ گھلی ملی رہی تھی۔

رمانہ وغیرہ چلی گئیں گھر میں تھوڑی سی اداسی پھیل گئی تھی۔ گو اس سلسلے میں سلمان گردیزی کے اہل خاندان نے بڑا خیال رکھا تھا ان کا پورا خاندان لحہ لحہ ان لوگوں کے ساتھ شامل رہا تھا۔ رمانہ اور عرشہ کو انہوں نے اتنی سیر کرائی تھی اور اتنا کچھ دیا تھا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن فراست علی اور سعادت علی کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہی کیفیت ان کی بیگمات کی تھی۔ حالانکہ گردیزی صاحب نے ان کے نقصانات دوسرے طریقے سے پورے کر دیے تھے۔ جن کی انہوں نے انہیں خبر بھی نہیں ہونے دی تھی لیکن معظم علی جانتے تھے۔

فراست علی کا خیال تھا کہ گردیزی صاحب معظم علی کو جس کاروبار کی طرف مائل کر رہے ہیں وہ آگے چل کر انہیں کے کاروباری راستے کاٹے گا لیکن گردیزی صاحب نے کیس ہی بدل دیا تھا۔ ان کے مشورے سے معظم علی نے اپنی دوسری زمینوں پر اناج وغیرہ اگانے کے بجائے باغات لگوا دیے تھے اور ان پر بہترین موسمی پھل لگوائے تھے۔ ایسے پھل جو جلد تیار ہو جاتے ہیں۔ ان باغات نے چند ہی سالوں میں سونا اگلنا شروع کر دیا تھا اور ان کے پھلوں کو امارات میں بہت بڑا مقام حاصل ہو گیا تھا۔ امارات کے کھرب پتی ان باغات کی پوری پوری فصلیں خریدنے کے لیے خزانوں کے منہ کھولے کھڑے تھے لیکن اس کے لیے بھی گردیزی صاحب کے مشورے سے معظم علی نے پورے امارات کی ریاستوں سے رابطے رکھے تھے۔

یہ کاروباری گر معظم علی کو نہیں آتے تھے لیکن گردیزی صاحب کے مشوروں سے وہ یہ سب کر رہے تھے اور جس کام میں ہاتھ ڈالتے وہ کمال حاصل کر جاتا تھا۔

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے ذہن میں کوئی خیال آتا ہے جسے میں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں مجھے دو فیصد بھی امید نہیں ہوتی کہ وہ منصوبہ اتنا کامیاب ہو گا لیکن..... خوب تقدیر ہے یار تمہاری۔" گردیزی صاحب کہتے۔

"لیکن میں اسے اپنے محسن کی خلوص نیتی سمجھتا ہوں۔" اس طرح کی باتیں ان لوگوں میں ہوتی تھیں ۔ ادھر دعا میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ وہ بڑی بھی ہو رہی تھی اور یہ تبدیلیاں اس کے بڑے ہونے سے بھی منسوب کی جا رہی تھیں۔ اب وہ پیروں چلنے لگی تھی اور خود اپنے چھوٹے کام کرنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ وہ کچھ سنجیدہ بھی ہوتی جا رہی تھی۔ فرزانہ اور ندا نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ عشیرہ اور دعا سے اپنی

ہنسیئے

عدم تحفظ

ایک خاتون اپنے بچے کو ماہر نفسیات کے پاس لے گئیں۔ بچے سے بہت سے سوالات کرنے کے بعد ماہر نفسیات نے کہا:

"بچے کی تحلیل نفسی کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بچہ لاشعوری طور پر عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہے۔"

خاتون نے پریشان ہو کر کہا:

"لیکن میں تو اسے اس لیے آپ کے پاس لائی تھی کہ اس کی وجہ سے پورا محلہ ہی عدم تحفظ کا شکار ہے۔

☆......☆

☆

”اس میں کچھ تبدیلیاں محسوس ہو رہی ہیں۔“

نفرت کبھی کم نہ ہونے دیں گی چنانچہ وہ بدستور دعا کی تاک میں رہتی تھیں۔

”ہاں اور اب وہ کھلونے بھی اس کے پاس نہیں نظر آتے۔“ وہ باتیں کرتی تھیں لیکن ان کے لیے دوسرے اور بھی کھیل تھے۔

دعا اب اکیلی باہر بڑے لان پر نکل جاتی تھی جہاں خوب صورت درخت لگے ہوئے تھے۔ ایک دن ایک درخت پر سرخ سر اور کئی رنگ کے پروں والا ایک طوطا آکر بیٹھ گیا۔ دعا گھاس پر خاموش اور اداس بیٹھی تھی۔ طوطا پہلے درخت کی شاخ پر بیٹھا رہا پھر نیچے آکر دعا کے پاس بیٹھ گیا۔ دعا نے اسے ایک نگاہ دیکھا لیکن پھر ناپسندیدگی سے رخ بدل لیا۔

پھر یہ طوطا روزانہ آنے لگا۔ دعا نہ ہوتی تو وہ خاموش بیٹھا رہتا۔ دعا آجاتی تو اڑ کر اس کے پاس آبیٹھتا۔ لیکن دعا نے ایک بار بھی اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔ پھر ایک دن فرزانہ اور ندا نے ایک اور منظر دیکھا وہ کئی بار اس طوطے کو دیکھ چکی تھیں۔ اس دن انہوں نے دیکھا کہ طوطا دعا کی گود میں چڑھ گیا جونہی اس نے دعا کی گود میں پنجے رکھے دعا نے چیخ ماری اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن دوسرا منظر اس سے بھی زیادہ حیران کن تھا ایک درخت کے پیچھے سے ایک چھوٹے قد کا عبا پوش باہر نکل آیا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی تھی۔ اس نے کسی قدر ناگواری سے طوطے کو دیکھا۔ دعا ڈر کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ پستہ قد آدمی نے جھک کر طوطے کو پکڑ لیا۔ لیکن دوسرے لمحے طوطے نے اس کی کلائی میں کاٹ لیا۔ پستہ قامت کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور طوطا فضا میں پرواز کر گیا۔

پستہ قامت اپنی کلائی مسل رہا تھا پھر وہ جھکا اور دوسرے لمحے اس کا بدن ایک پرندے کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ وہ پاؤں نیچے دبا کر اڑا اور طوطے کے پیچھے پرواز کرنے لگا کچھ لمحوں میں دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

”دیکھا تم نے۔“ فرزانہ نے ندا سے کہا۔

”ہم تو سمجھے تھے کہ بات شان گلی کی حویلی میں ہی ختم ہو گئی۔ مگر لگ رہا ہے۔ ان لوگوں نے دوسرا رخ بھی کر لیا ہے۔“

”کن لوگوں نے۔“

”وہی پرانی حویلی والوں نے۔“ ندا بولی۔

”تم نے بڑی عجیب بات کہی ہے ندا ارے کہیں اس عشیو کا تعلق پرانی حویلی والوں میں ہے کہ نہیں۔“

”دنیا کے سامنے منہ پیٹتی رہو بھابھی کوئی ہماری سن کر نہ دے گا۔ بس خاموش ہی رہو۔ ندا بولی۔

”جو کچھ ابھی دیکھا ہے بھولا جا سکتا ہے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ انسان سے پرندہ بنا اور فضا میں پھر۔

”پھر۔ فرزانہ نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔

اور وقت کے بھی پر لگے تھے۔ وہ بھی پھر ہونے لگا۔ فرزانہ وغیرہ کے اپنے بچوں کو کبھی دعا سے قریب نہیں ہونے دیا۔ گھر میں اب بہت سے بچے بڑے ہو گئے تھے۔ انہیں اعلیٰ درجے کے سکولوں میں داخل کیا گیا لیکن خاص طور سے الگ اسکولوں میں جہاں دعا داخل نہیں ہوئی تھی۔

اسکول کی زندگی میں بھی دعا ایک معمہ بنی رہی، فراست، سعادت نے اپنے بچوں پہ بھی خوب محنت کی تھی لیکن دعا کمال کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی غیر معمولی عمل نہیں دیکھا گیا تھا لیکن اس کی تعلیمی حیثیت نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ اسکول، پھر کالج۔ ایف ایس سی کے بعد گردیزی صاحب میں نے اس کے لیے میڈیکل کا شعبہ متعین کیا اور دعا اس میں بھی بہترین حیثیت سے کامیاب ہوئی۔ تب اس کے لیے Neurological Surgery بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

Fellow of Royal College of Surgens Glasgow

اور معظم علی سارے انتظامات کرنے لگے۔ گویا دعا کی داستان اب زندگی کی دوسری منزل میں داخل ہونے جا رہی تھی جہاں اس پراسرار داستان کا دوسرا اور انوکھے اور دلکش واقعات کا منتظر تھا۔

(جاری ہے)

انوکھا دائو

روشن آرا

ماں نام ہے ایثار و قربانی کا، الفتوں قرب کا، تحفظ کا، احساس کا اور پرسکون سائبان کا لیکن معاشرے کے فرسودہ رسم و رواج بعض اوقات اولاد کو ماں کی محبت سے محروم کر دیتے ہیں۔

ایک ایسی ہی ماں کے بلند حوصلے کی روداد

پسینہ تھا کہ بلقیس بانو کے سارے بدن پر کسی چشمے کی طرح پھوٹ رہا تھا۔

انہوں نے پسینے میں تر پیشانی، چہرے اور گردن کے حصے اور قدرے کھلے گریبان کو چھوٹے سے رومال سے دو تین مرتبہ صاف اور سامنے کی طرف دیکھنے لگیں۔ دور دور تک کسی بس، منی بس اور اور کسی سواری کا نام و نشان نہ تھا۔ سڑک بل کھاتی، لہراتی اور مڑتی ہوئی بہت دور چلی گئی تھی۔ بس کے انتظار میں کھڑے کھڑے ان کے پاؤں شل ہو گئے تھے۔ درد کی لہر ریڑھ کی ہڈی اور پیروں میں اٹھی تو ان کے وجود کو جیسے ہلا کے رکھ دیتی۔ جسم میں تھکن سے چور چور ہو رہا تھا۔

ایسے وقت میں انہیں پرندوں اور پریوں کے جیسے پروں کی کمی محسوس ہوئی۔ پر لگے ہوتے تو وہ اڑ کے اور پرواز کرتی ہوئیں گھر پہنچ چکی ہوتیں... اور پھر غسل خانے میں گھس کے لباس اتار کے شاور کے نیچے کھڑی ہو جائیں۔ رم جھم برستی پھوار سے ان کے جسم کو کیسی فرحت اور تازگی محسوس ہوتی اور ساری کسل مندی اتر جاتی۔

انہیں اس بات سے بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ کوئی بھی روٹ کی کوئی بھی بس ابھی تک کیوں نہیں آئی...؟ آج تو انتظار کی حد ہو گئی تھی۔ معلوم نہیں ان بسوں کو کیا ہو گیا تھا۔ ان پر ایسا کون سا قہر نازل ہو گیا تھا جو ادھر کا راستہ بھول گئی تھیں۔ انہوں نے بڑی بے قراری اور بے چینی سے دستی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے سوچا کہ دو بج چکے ہیں۔ وقت دیکھتے ہی انہیں احساس ہوا کہ وہ پورے ایک گھنٹے سے بس کے انتظار میں خوار ہو رہی ہیں۔

انہوں نے تھوڑی دیر کے بعد اس سمت بڑی امید سے دیکھا جہاں سے بسیں آتی تھیں۔ تار کول کی سڑک دھوپ میں چمک رہی تھی اور وہ دور دور تک خالی خالی ویران اور سنسان سی لگ رہی تھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا...؟ ایک برس پہلے کسی جگہ ایکسی ڈنٹ ہونے سے نصف گھنٹہ بس کا انتظار کرنا پڑا تھا۔

دھوپ تھی کہ لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی وجہ سے چہل پہل میں نمایاں فرق اور کمی آگئی تھی اور ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ پرائیوٹ گاڑیاں، اکادکا رکشا اور ٹیکسیاں جو آٹے میں نمک کے برابر تھیں تیزی سے گزرتی جا رہی تھیں۔ دوپہر کا سناٹا گہرا ہوتا جا رہا تھا... تیز دھوپ تھی کہ جسم میں نیزے کی انی کی طرح چبھ رہی تھی۔ اسکول اور کالج کی بہت ساری بچیاں اور لڑکیاں پیدل یا کسی نہ کسی طرح دوڑ دھوپ کر کے خالی رکشا اور ٹیکسی کر کے چلی گئی تھیں۔ پھر بھی بہت ساری بچیاں اور لڑکیاں بستوں اور کاپیوں کا بوجھ جسموں پر لادے کڑی دھوپ میں کھڑی پسینے میں شرابور ہو رہی تھیں۔ انہیں ان مردوں پر سخت غصہ آ رہا تھا جو بس اسٹاپ کے قریبی درختوں کی گھنی چھاؤں میں مزے سے کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے... ان خود غرض لوگوں نے ان معصوم بچیوں اور لڑکیوں کی تکلیف کا ذرا برابر بھی احساس نہیں ہو رہا تھا۔

بلقیس بانو نے انہیں خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے مخالف سمت میں دیکھا تو ان کا دل اچھل کے حلق میں آگیا... ان کے دل کے کسی کونے میں ایک نادیدہ آواز نے پکارا... بلقیس بانو... بلقیس بانو...! تم دور سے آتی ہوئی اس چمکیلی اور لمبی کار کو دیکھ رہی ہو نا...؟ اسے پہچانتی ہو نا...؟

اس لمحے ان کی ساری تھکن، کمر اور پیروں کا درد... غصہ اور کوفت یک لخت دور ہو گئے۔ معلوم نہیں کہاں سے ان کے جسم میں اتنی جان سی آگئی کہ وہ بڑی سرعت سے گھومیں اور غیر محسوس انداز سے درخت کے عقب کی طرف بڑھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ لڑکیوں اور مردوں کو ان کی بدلتی ہوئی کیفیت کا احساس ہو۔ اس طرف کچھ لڑکیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے انہیں دیکھا تو سمٹ اور سکڑ کے ان کے لیے جگہ بنائی۔

"آنٹی...! آپ ادھر آجائیں۔"

"نہیں... میں ادھر ٹھیک ہوں۔" وہ ان کے پیچھے کھڑے ہو کے اپنے آپ کو جیسے چھپانے لگیں۔

"آنٹی...!" ایک دس برس کی لڑکی نے رو دینے والے لہجے میں پوچھا۔ "یہ آج کوئی سی بھی بسیں کیوں نہیں آ رہی ہیں؟"

"معلوم نہیں..." انہوں نے بے رخی سے جواب دیا۔ وہ کن انکھیوں سے سڑک کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ چند ثانیوں کے بعد وہ کار ان کے سامنے سے گزرنے والی تھی۔ ان کا دل جو سینے میں بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے جیسے ان سے پوچھا۔

"بلقیس بانو...! بالفرض اگر یہ رک گئی تو آپ کیا کریں گی؟"

"نہیں... نہیں یہ کار نہیں رک سکتی؟" انہوں نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ "اسے کسی قیمت پر رکنا نہیں چاہیے۔"

"اگر یہ کار رک جاتی ہے تو تب تم کیا کرو گی...؟"

بلقیس بانو کا دل جیسے ضدی ہو گیا تھا۔

اس روز کیا ہوا تھا...؟ وہ دن وہ بھولی تو نہیں تھی۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا جیسے کل کی بات ہو... آج ہی کی بات ہو... بہت سی باتیں بعض اوقات خلش بن کے کسی تیز اور نوکیلے خنجر کی طرح پیوست ہو جاتی ہیں... ان کے دل کے کسی کونے میں پھانس بن کے آج بھی گڑ گیا ہوا سا تھا۔ وہ شام کے وقت رابعہ کے ساتھ لالو کھیت میں کچھ چیزیں خرید کے گھر لوٹ رہی تھیں۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ موسم بھی بڑا خوش گوار اور فرحت بخش تھا۔ کریم آباد کے چوراہے پر رکشا رک گیا۔ ادھر ٹریفک جام ہو گیا تھا۔ ٹریفک پولیس نے لالو کھیت سے آنے والے ٹریفک کو روک دیا تھا اور دوسری سمت سے آنے والی گاڑیوں کو گزرنے دے رہی تھی۔ رکشا کے پاس ایک خوب صورت سیاہ رنگ کی گاڑی آ کے رکی اس گاڑی کو دیکھتے ہی انہیں اپنے ابو کی گاڑی یاد آگئی۔ ان کے پاس بھی ایسی ہی گاڑی ہوا کرتی تھی۔ انہیں سیاہ رنگ کی گاڑی بہت پسند تھی۔ وہ دن ان کی نگاہوں میں گھومنے لگے جو خوابوں کی طرح حسین تھے۔ جب گاڑی میں گھومنے نکلتے تھے تب بہت لطف آتا تھا۔

زندگی اس وقت بڑے مزے اور سکون سے گزر رہی تھی۔ مسائل کیا ہوتے ہیں وہ نہیں جانتی تھیں۔ کوئی الجھن نہیں تھی... کوئی دکھ درد نہیں تھا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ زندگی کے نشیب و فراز کیا ہوتے ہیں... احساس کے سوا دل میں اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔

اس گاڑی کی پچھلی نشست پر رکھے ڈھیر سارے پیکٹوں کے پاس ایک چھوٹا سا لڑکا بیٹھا تھا۔ وہ گاڑی کے رکتے ہی کھڑکی کے پاس آ کر باہر جھانکنے لگا۔ پھر مسکراتے ہوئے اپنا ننھا اور خوب صورت ہاتھ باہر نکال کے ہلانے لگا۔ بچہ نہ صرف بے حد معصوم اور خوب صورت تھا بلکہ باتمیز بھی لگتا تھا۔ انہیں اس بچے پر بے اختیار پیار آگیا۔ ان کا دل چاہا تھا کہ اسے اپنی بانہوں میں بھر لیں۔ اس کے بازوؤں اور چہرے پر اتنے بوسے ثبت کر دیں کہ کوئی جگہ بوسوں سے بچ نہ سکے۔ وہ اس کے جواباً" ساتھ ساتھ ہاتھ ہلانے لگیں... پھر کسی ان جانے جذبے سے مغلوب ہو کے انہوں نے اس کا ننھا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے آنکھوں سے لگایا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دعا دی اسے کسی کی نظر نہ لگے۔

اس بچے کی ماں گاڑی چلا رہی تھی۔ وہ اسٹیئرنگ پر بیٹھی کسی اور سمت دیکھ رہی تھی۔ اس لیے وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکیں۔ اس کے ریشمی سیاہ بال گردن تک بڑی نفاست سے ترشے ہوئے تھے۔ گاڑی اور وضع قطع سے کسی امیر گھرانے کی لگ رہی تھی۔ اس عورت نے شاید عقبی آئینے میں اپنے بچے کو کھڑکی سے باہر ہاتھ نکالتے دیکھ لیا تھا۔ وہ تیزی سے گھومی تاکہ بچے کو کھڑکی کے پاس سے ہٹا سکے۔ ان دونوں کی نظریں ملیں تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "رضوانہ...؟"

یہ آواز اتنی ہلکی تھی ان کے سینے میں گھٹ کے رہ گئی۔ وہ ایک لمحے کے لیے ساکت و جامد سی ہو کے رہ گئیں۔

انہوں نے دیکھا کہ رضوانہ کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گیا۔ اس نے حیرت بھری منجمد نظروں

سے انہیں دیکھا۔ اس پر جیسے سکتہ سا چھا گیا وہ دم بخود سی تھی۔ شاید اس لمحے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا بولے۔ وہ انہیں خواب کی سی حالت میں دیکھ رہی تھی۔

"رضوانہ آپا...!"

رابعہ اس کی طرف دیکھ کے مسرت آمیز لہجے میں چلائی۔ "آپ...؟" اس کی زبان خوشی سے لڑکھڑا رہی تھی اس کا بس چلتا تو شاید وہ رکشا سے اتر کے گاڑی میں جا بیٹھتی۔

بلقیس بانو نے ایک دم سے چونک کے رضوانہ پر سے اپنی نظریں ہٹالیں۔ پھر رابعہ کی طرف گھور کے دیکھا۔ رابعہ نے انہیں اپنی طرف خشمگیں نظروں سے گھورتے پایا تو اس کی آنکھوں میں طاقت ور برقی قمقموں جیسی روشنی اور چہرے پر بکھری مسکراہٹ نے دم توڑ دیا وہ سہم سی گئی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک ان کہی سی التجا چھا گئی۔

"امی... !امی...!" کار سے ایک درد بھری آواز نکلی جس میں سارے جہاں کا پیار اور محبت کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی۔ انہوں نے اس درد بھری آواز کا کوئی جواب نہیں دیا... انہوں نے بے رحمی سے منہ پھیر لیا تھا... یہ آواز پتھر کو بھی موم کرنے والی تھی۔ انہوں نے نہ تو اس کا کوئی اثر لیا اور نہ ہی جذباتی ہوئی تھیں... ان کے اعصاب کسی چٹان کی طرح ان کے وجود پر بھاری ہو رہے تھے۔ وہ بہری گونگی بن گئی تھیں۔

پھر انہوں نے رکشا والے سے تیز و تند لہجے میں کہا۔

"بائیں جانب سے کتنے رکشا نکل گئے... تم یہاں رکشا روک کے کیا تماشا دیکھ رہے ہو۔ جلدی چلو... مجھے دیر ہو رہی ہے؟" رکشا والا کچھ کہتا۔ اتفاق سے اسی وقت ٹریفک کے لیے راستہ کھل گیا تھا... رکشا ایک جھٹکے سے چل پڑا۔ کار بڑی دور تک رکشا کے ساتھ چلتی رہی تھی۔ وہ پیارا سا بچہ ان سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ مسلسل ہاتھ ہلائے جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ انہوں نے محسوس کرتے ہوئے بھی اس کی طرف دیکھنا تک گوارا نہیں کیا۔

رابعہ چور نظروں سے بچے اور کار کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے اندر محبت کا جو طوفان اٹھ رہا تھا وہ اس کے تمتماتے ہوئے چہرے اور اور آنکھوں میں چھائی گھٹا سے عیاں تھا۔

یہ سب کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اپنے دل پر جبر کی سل رکھ لی تھی۔

انہیں اپنی ممتا کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہوئے انہیں اپنی ممتا کو کس بے رحمی سے روندنا اور کچلنا پڑا... یہ ان کا دل ہی جانتا تھا... ان کے وجود میں کیسا طوفان اٹھ رہا تھا اس کا احساس رابعہ اور رضوانہ نہیں کر سکتی تھیں... انہوں نے کتنے ضبط... جتن اور تحمل سے آنسوؤں کے سیلاب کو روکنے کے لیے بند باندھ دیے تھے۔

پھر ان کے رکشا اور رضوانہ کی کار کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ اس لیے کہ کار کا راستہ اور تھا اور ان کا راستہ اور تھا... وہی درد بھری آواز جس نے ان کا کلیجہ چھلنی کر دیا تھا پھر ایک بار ان کے کانوں میں گونجتی تو پھر سارے بند ایک ایک کر کے ٹوٹ جاتے... پھر انہیں اپنے آپ پر قابو نہ رہتا... وہ راستے ہی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔

رابعہ نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ کھانے کے لیے بیٹھیں تو ایک نوالہ بھی حلق سے نہ اتر سکا۔ گولے کی طرح اٹکتا اور پھنستا ہوا لگتا رہا تھا۔

رابعہ کے دل پر کیا کچھ بیت گئی ہے اس کا اندازہ تو انہیں بھی تھا۔ اس لیے کہ آخر وہ رضوانہ کی بہن تھی... رات سونے کے لیے بستر پر دراز ہوئی تو وہ کتنی ہی دیر تک جاگتی اور بے چین دکھائی دی تھی اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ جیسے انگاروں پر لوٹ رہی ہو۔ انہیں بھی اس معصوم اور پیارے بچے کے تصور نے جیسے سونے نہیں دیا تھا... اس کی چمکتی اور مسکراتی آنکھیں، چہرے کی دمک اور معصومیت ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی شوخ مسکراہٹ اور اس کے ننھے ننھے گول مٹول اور تو جیسے... ہاتھ ہلانے کے انداز نے ان کا چین و

سکون لوٹ لیا تھا۔

وہی کار آج پھر بڑی شان اور آن سے فراٹے بھرتی آ رہی تھی... اور پھر ان کی نگاہوں کے سامنے سے زن سے گزر گئی۔ کار نجم چلا رہا تھا... اگلی نشست پر رضوانہ اس کے برابر بیٹھی اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کیے جا رہی تھی اور اسے اپنی نظروں میں جذب کیے ہوئی تھی... پچھلی نشست پر وہی خوب صورت گول مٹول اور پیارا سا بچہ صاف ستھرے اور سفید براق کرتہ پاجامہ میں معصوم ننھا سا فرشتہ دکھائی دیا۔ اس سفید لباس نے بچے کو ملکوتی بنا دیا تھا۔ ان کے دل کے کونے سے ایک دعا نکلی۔

میرے جگر کے ٹکڑے... سدا ہنستے اور مسکراتے رہو۔

بلقیس بانو نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ انہیں اپنے سارے جسم اور چہرے پر ٹھنڈی ٹھنڈی بوندوں کا احساس ہوا۔ ان کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی تھی... انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اندر سے ان کا کلیجہ مسلسل مسل رہا ہو... آج پھر وہ اپنی ممتا کو کچل رہی ہوں... اسے دبا دینا چاہتی تھیں آج وہ اپنا سر نہ اٹھا سکے۔

"باجی...!" ان کے اسکول کی ایک بڑی لڑکی نے ان کے پاس آ کر روہانسی لہجے میں پوچھا "بس آتی دکھائی نہیں دیتی ہے...؟"

"میری سمجھ میں خود نہیں آ رہا ہے کہ آج بسوں کو کیا ہو گیا ہے...؟" انہوں نے اپنی اضطراری کیفیت پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا...؟"

کالج کے دو لڑکے جو موٹر سائیکل پر مخالف سمت سے آ رہے تھے انہوں نے درخت کے سائے میں گاڑی روک لی تو ایک عمر رسیدہ شخص نے ان سے پوچھا۔ "کیا بات ہے... کسی بھی روٹ کی کوئی بس نہیں آ رہی ہے؟"

"بس ڈرائیور سے پولیس والوں کا کسی بات پر جھگڑا ہو گیا... پولیس والوں نے بس ڈرائیور کو اتنا مارا کہ وہ نہ صرف زخمی بلکہ بے ہوش ہو گیا... اس لیے کوچز اور بس والوں نے اچانک ہڑتال کر دی اور سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر کے ہڑتال کر دی اور ایک پولیس وین اور پیٹرول پمپ کو آگ بھی لگا دی۔"

لڑکے اتنا بتا کے دوسری سمت چل دیے۔

ادھر جو گہرا سناٹا تھا... اور ویرانی چھائی ہوئی تھی اس خبر سے درہم برہم ہو گئی۔ دو ایک خالی رکشا اور ایک ٹیکسی دور سے آتی دکھائی دی کچھ لوگ ان کی طرف لپکے۔ دوسرے اسکول کی ٹیچریں بھی ان میں تھیں۔ ہڑتال کی خبر سن کے نو عمر لڑکیوں کے چہرے بجھ گئے۔ انہیں ایسا لگا کہ جیسے وہ تھکن سے چور ابھی گر پڑیں گی۔ انہوں نے درخت کے تنے کا سہارا لیا تو وہ گرنے سے بچ گئیں۔ ان کے اسکول کی بچیاں ان کے گرد جمع ہو گئیں۔ وہ بہت پریشان ہو رہی تھیں اور سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"دیکھو ایسا کرو... کوئی خالی رکشا آ گیا تو اسے روک کے کرایہ طے کر لیں اور آپس میں برابر بانٹ لیں۔" انہوں نے مشورہ دیا۔

اتفاق سے ان کے سامنے ایک رکشا خالی ہوا تو ان لڑکیوں نے اس پر ہلہ بول دیا... دو ایک نے ایسی گاڑیوں سے لفٹ لے لی جسے عورتیں چلا رہی تھیں پھر ان لڑکیوں کے علاوہ اور لڑکیاں گھس گئیں تو ان کے لیے جگہ نہیں رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جیسے میدان خالی سا ہو گیا تھا۔ صرف دو ایک جوان مرد تھے جو اسکوٹر والوں سے لفٹ لے کے چل دیے۔

بلقیس بانو نے سوچا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ رکشا کر لیں۔ دوسرے لمحے خیال آیا کہ ان کا بجٹ کرائے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ رکشا ٹیکسی والے ایسے ہی منہ مانگا کرایہ مانگتے تھے اور اب تو ان کی مجبوری کا خیال کر کے اور پھیل جائیں گے۔ دو تین سو سے زیادہ کرایہ طلب کر لیں گے... اب ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اتنی دور پیدل جائیں۔ کیوں کہ بھوک پیاس سے ان کا برا حال ہو رہا تھا... ادھر ادھر دیکھا کہ شاید کوئی خالی رکشا نظر آ جائے... لیکن کوئی

نام ونشان نہیں تھا پھر ہمت کرکے پیدل چل پڑیں کے شاید آگے کسی بس اسٹاپ پر کوئی بس یا رکشا مل جائے۔

نہ جانے کیوں انہیں احساس ہونے لگا کہ ان کا پیدل چلنا کس قدر ذلت کا باعث اور دشوار ہے۔ اگر کسی جاننے والے نے اگر دیکھ لیا تو وہ ان پر ہنسے گا... استہزاء کرے گا۔ چہ میگوئیاں ہوں گی۔ کسی تقریب میں انہیں دیکھ کے سرگوشیاں ہوں گی... لوگوں کو کہنے کا موقع ملے گا کہ وہ اپنی ضد اور سرکشی کی سزا بھگت رہی ہیں... ایک بڑے اسکول کی ہیڈ مسٹریس اور نواب خاندان کی عورت گھر پیدل جا رہی ہے... اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ وہ رکشا یا ٹیکسی میں جاسکے... بغاوت کا انجام کس قدر تلخ اور بھیانک ہوتا ہے۔

بلقیس بانو کو پولیس اور بس والوں پر غصہ آنے لگا... آخر یہ سب کچھ کیا ہونے لگا ہے۔ آئے دن کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ کبھی طلبا ہڑتال کر رہے... اور یہ سیاسی جماعتیں کسی نہ کسی مرضی خلاف بات پر جلوس اور ریلیاں نکال رہے ہیں۔ کبھی تو لسانی فسادات ٹوٹ پڑتے ہیں... تو کبھی رکشا، ٹیکسی اور بس والوں کی ہڑتال ہو جاتی ہے... تکلیف اور پریشانی کسے اٹھانی پڑتی ہے...! عام لوگوں کو... عورتیں اور بچوں کو... آخر ہم سب کہاں جا رہے ہیں...؟ یہ راستہ کدھر جاتا ہے...! کیا یہ ریشہ دوانیاں ملک کے لیے زہر نہیں ہیں...؟ وہ یہ سب کچھ سوچ سوچ کے جذباتی ہونے لگی تھیں... ان کے پیر منوں بھاری ہو گئے تھے... ایک قدم چلنا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔

یوں تو رکشا ان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ لیکن وہ ایک قریبی بس اسٹاپ پر جو دوسری گلی اور محلے میں تھا وہاں سے بس لینے جا رہی تھیں... وہ تین سو کرایہ دینا نہیں چاہتی تھیں۔ ان کی نظر ایک شناسا پر پڑی۔ اس نے انہیں دیکھا نہیں تھا لیکن انہوں نے دیکھ لیا تھا۔ کہیں اس کی نظر ان پر نہ پڑ جائے۔ اس لیے انہوں نے مجبوراً "فوراً" ایک خالی رکشا روک لیا جو بغلی گلی سے نکلا تھا۔ پھر اس نے کرایہ طے کیا... اس نے ساڑھے تین سو روپے کہا تو انہوں نے مول تول نہیں کی۔ فوراً ہی اپنے آپ کو رکشا کی نشست پر ڈھیر کرتے ہوئے اس سے کہا۔ "عزیز آباد چلو..."

رکشا نے بہ مشکل نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ان کا سینہ دھک سے ہو کے رہ گیا۔

رکشا کے پاس سے جو ٹیکسی تیزی سے گزری تھی اس میں راحیلہ بیٹھی ہوئی تھی... اگر راحیلہ انہیں پیدل چلتے ہوئے دیکھ لیتی تو کیا ہوتا...! اب تک ان کی راحیلہ سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ اس اذیت ناک واقعے کے بعد انہوں نے آج پہلی مرتبہ راحیلہ کو دیکھا تھا۔

آج رضوانہ اور راحیلہ کیوں نظر آگئیں...! انہوں نے بڑے کرب سے اپنے دل سے پوچھا۔

کیا اس لیے کہ اپنے سکھ کی زندگی جھلک دکھا کے ان کا منہ چڑانے کے لیے...؟

کیا ان کی اس اجڑی کرب ناک زندگی کا ذمے دار کون ہے...؟

انہوں نے اپنی کنپٹیوں کے بالوں کو درست کرتے ہوئے اپنے آپ سے سوال کیا۔

آج ان کے اردگرد اتنی ساری مصیبتیں... تکلیفیں اور ذہنی کرب اور انتشار ہے... دکھ بھری زندگی جو چھائی ہوئی ہے اس کا کسے دوش دیں...! اپنے آپ کو یا جمال احمد کو...

انہوں نے پہلی بار جمال احمد کی بھرپور دل کش اور سحرانگیز شخصیت کا نکھار اپنے گھر میں دیکھا تھا۔ یوں تو وہ برسوں سے جمال احمد کو دیکھتی آ رہی تھیں... لیکن اس وقت ان کے دل کے کسی کونے میں ان کے لیے کوئی عزت اور وقعت نہیں تھی۔ وہ انہیں ایک عام سا نوجوان سمجھتی تھیں... جمال احمد ان کے محلے کے ایک غریب بیوہ بوڑھی ماں کے بیٹے اور بیوہ بہن اور ان کے بچوں کے سرپرست تھے... یہ بات تو انہیں بعد میں معلوم ہوئی تھی... وہ تو صرف ان کی شکل صورت سے واقف تھیں جب وہ اپنی گاڑی میں محلے سے

گزرتی تھیں تو جمال احمد ان نوجوانوں میں سے تھے جو ان کی کار اور امیری سے متاثر نہ تھے... ایک بار جب ان کی بوڑھی ماں نے ان کے ابو کے پاس آکر ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اس محلے کے بزرگ کی حیثیت سے جمال احمد کو سمجھائیں کہ وہ سیاست میں حصہ نہ لیں۔ تب انہیں جمال احمد کی شخصیت کو جاننے کی خواہش ہوئی تھی۔

جب جمال احمد کی ان کے یہاں طلبی ہوئی تھی تب انہوں نے جمال احمد کو قریب اور توجہ سے دیکھا تھا... سفید کرتے پاجامے میں ملبوس... شاعروں جیسے لمبے لمبے بکھرے بال... دراز قد، صحت مند اور توانا جسم... آنکھوں پر سیاہ چشمہ... کھلی کھلی سی رنگت... چہرے کے نقش و نگار اور مردانہ وجاہت ایسی کہ دل بار بار دیکھنے کو چاہے... جب وہ ان کے بنگلے کے احاطے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھیں۔ انہوں نے باوقار انداز میں برآمدے کی طرف بڑھتے دیکھا تھا... ان پر عظیم الشان اور وسیع ترین اور پرشکوہ بنگلے کا ذرا بھی رعب نہیں پڑا تھا۔

نہ جانے کیوں ان میں جمال احمد سے دلچسپی کا احساس ہوا۔ وہ بھی ابو کے ساتھ نشست میں چلی گئی تھیں۔ وہ احتراماً کھڑے ہو گئے تھے۔ ابو ان سے پہلے تو اسی انداز سے گفتگو کرتے رہے تھے۔ پھر اچانک بولے۔

"سیاست تو امیروں کا کھیل ہے... تمہارے لیے اپنی ماں اور بیوہ بہن کا خیال رکھنا زیادہ ضروری ہے۔"

"مجھے ہر وقت ان کی فکر رہتی ہے اور میں ان کا خیال بھی رکھتا ہوں۔" جمال احمد نے بڑے ادب سے جواب دیا تھا۔ "اس کار زار میں مجھ سے بھی زیادہ غریب لوگ ہیں۔"

"کیا تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ اس سیاست کی وجہ سے کسی بڑی مصیبت کا شکار ہو گئے تو تمہارے گھر کا کیا بنے گا...؟" اس کے ابو بولے "دو وقت کی روٹی کے حصول کے لیے کیا کرو گے؟"

"رب العزت نے وعدہ کیا ہے کہ میں انسان اور ہر جان دار کو اس کا رزق ضرور دوں گا... میں نے یہ سب کچھ اس پر چھوڑ دیا ہے... میں اپنے ملک اور لوگوں کو غیبت کی آگ سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں... اس لیے کہ آج کی نسل انتشار پسندی کے اندھے جنون میں مبتلا ہو گئی ہے... لوگ بھائی چارے اور خلوص و محبت کی جگہ ایک دوسرے سے نفرت کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔"

انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ ان کے ابو سے جمال احمد کی باتوں کا جواب بن نہیں پڑا تھا... وہ کچھ دیر تک ذہن پر ڈال کے سوچتے رہے تھے کہ اس پرعزم انسان کو کیسے سمجھائیں... وہ اس شخص کو دیکھ رہی تھیں کہ جس کے خیالات بہت بلند اور عظیم تھے... آنکھوں کی چمک... چہرے کا عزم اور اعتماد... ان سب باتوں نے انہیں بے حد متاثر کیا تھا جس کی انہیں توقع نہیں تھی۔

ایک روز ابو ایک سیاسی جلسے سے واپس لوٹے تو انہوں نے انہیں بتایا تھا۔

"بیٹی...! جمال احمد نے ایسی زبردست تقریر کی تھی کہ دوسری مخالف سیاسی پارٹی کے نوجوان کارکن جلسے میں گڑبڑ کے ارادے سے آئے تھے وہ گڑبڑ کرنا بھول گئے۔

انہوں نے دوسرے دن کے اخبار میں ان کی تقریر پڑھی تھی۔ اس اخبار کے کالم نویس نے بہت سراہا تھا اور لکھا تھا کہ ایسے ایسے قابل، ہونہار اور مخلص نوجوانوں کی ملک کو اشد ضرورت ہے۔

جب انہوں نے یونی ورسٹی میں داخلہ لیا تو وہاں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔

وہ ان کی شخصیت کی ایسی اسیر ہوئیں وہ بھی سیاست میں حصہ لینے لگیں۔ ان کا ہر وقت قرب اور اٹھنا بیٹھنا شروع ہو گیا وہ کل تک ان کے لیے ایک عام سے آدمی تھے۔ رفتہ رفتہ جمال احمد کے جوہر کھلنے لگے وہ ان کے لیے ایک عظیم آدمی بن گئے تھے... پھر وہ غیر محسوس انداز سے ان کے دل کے نہاں خانے میں جگہ بنانے لگے۔ ایک وقت وہ آیا کہ جب انہوں نے

محسوس کیا وہ ان کی محبت اور خواب بن گئے۔۔۔ رات جب وہ بستر پر سونے کے لیے روانہ ہوتی تھیں تو جمال احمد کا پیکر چشم تصور میں ابھر آتا تھا۔ وہ ان کی کمزوری بن گئے تھے۔ اگر وہ ایک دن بھی جمال احمد کو دیکھ نہیں لیتیں۔۔۔ مل نہیں لیتیں۔۔۔ ان کے دل کو چین و قرار نہ آتا تھا۔۔۔ وہ حیران اور پریشان تھیں کہ یہ انہیں کیا ہو گیا ہے۔

دل۔۔۔ نادان اور اندھا ہوتا ہے۔ اس دل ناداں نے ایک روز بڑا ہنگامہ کیا۔

اس کے ابو کا تعلق ڈھاکا کے نواب خاندان سے تھا۔ خاندانی رئیس تھے۔۔۔ ان کے ابو نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ وسیع الخیال تھے۔۔۔ ان کے ابو کی روشن خیالی صرف باتوں تک کی حد تک محدود نہ تھی۔ جب انہوں نے بڑے بڑے گھرانوں کے مقابلے میں جمال احمد کو رفیق سفر بنانے پر ترجیح دی تو ابو تھوڑی سے چوں چرا کے بعد ان کی شادی جمال احمد سے کرنے پر تیار ہو گئے جس نے بھی سنا اسے یقین نہیں آیا۔۔۔ کیوں کہ وہ کوئی عام قسم کی نہ تھیں۔۔۔ لاکھوں میں ایک تھیں۔۔۔ چودھویں کا چاند بھی انہیں دیکھ کے شرما جائے۔ یونیورسٹی میں ایک سے ایک حسین بنگالی لڑکیاں تھیں لیکن ان کے مانند نہیں۔ ان کا حسن وشباب اور نشیب و فراز مثالی تھے۔۔۔ ان کی جوانی اور دل کشی پر لڑکیاں رشک کرتی تھیں۔ وہ جب تک یونیورسٹی کی طالبہ رہی تھیں انہیں ہر برس کوئین آف یونی ورسٹی کا خطاب ملتا تھا ۔۔۔ لڑکوں کی حالت یہ تھی کہ انہیں دیکھ کے آہیں بھرتے۔۔۔ عشق نامہ لکھتے۔۔۔ شاعری کرتے۔۔۔ مصور لڑکے ان کی تصویریں بنا کے اپنی خواب گاہوں میں سجاتے تھے۔ راتوں کو ان کے چشم تصور میں ان سے باتیں کرتے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ان میں بھی پندار حسن نے جنم نہیں لیا تھا۔

خاندان کے اور لوگوں کی ہمت اور مجال نہیں تھی کہ ان کے ابو کے فیصلے میرا اعتراض کرتے اور محاذ بناتے۔۔۔ البتہ کچھ دنوں تک شور شرابا کرتے رہے تھے۔ ان کی امی نے ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی کسی نواب گھرانے کی بہو بنے۔۔۔ انہوں نے یہ فیصلہ سن کے خودکشی کرنے کی دھمکی دے دی تھی۔ کیوں کہ جمال احمد کا تصور یہ تھا کہ وہ غریب تھے۔ ان کا کوئی خاندانی حسب نسب نہیں تھا ۔۔۔ ابو نے ان کو بہت سمجھایا تھا کہ قیامت کے روز خاندان۔۔۔ حسب نسب اور ذات پات کام نہیں آئے گی۔ صرف اعمال کام آئیں گے۔۔۔ جمال احمد کی سب سے بڑی دولت ' وہ نہ صرف اعلیٰ تعلیم ہے بلکہ وہ ایک شریف ' نیک اور با اخلاق ہیں۔ ان کے پاس جو کردار کی دولت ہے وہ آج کل ایک فیصد نوجوانوں کے پاس بھی نہیں ہے۔

ان کے لیے جن بڑے گھرانوں سے رشتے آئے تھے اور آ رہے تھے ان لڑکوں کا کردار اچھا نہ تھا۔ چوں کہ دولت کی فراوانی تھی اس لیے وہ اوباش قسم کے ہیں۔۔۔ عیاش فطرت کے ہیں۔۔۔ جوا کھیلتے ہیں۔۔۔ شراب نوشی کی لت بھی پڑی ہوئی ہے۔ ان کے ابو نے کہا تھا کہ ایسے لڑکوں سے رشتہ کرنے کی بجائے لڑکی کو کسی کنوئیں میں دھکا دے دینا پسند کروں گا۔ میں لڑکی کا باپ ہوں دشمن نہیں۔۔۔

امی کی دھمکیوں اور ہزار مخالفت کے باوجود ان کی شادی بڑی دھوم دھام سے جمال احمد سے ہو گئی تھی۔

امی اور بہت سارے رشتہ داروں نے اس تقریب میں شرکت نہیں کی۔۔۔ یہ یک طرفہ دھوم دھام اور روایتیں تھیں۔ اس لیے کہ جمال احمد کے پاس کچھ نہ تھا۔ ان کے ابو نے ہیرے جواہرات کے زیورات دس سیٹ دیے تھے۔۔۔ کیا کچھ نہیں دیا تھا۔۔۔ ایک بنگلہ بھی دیا تھا۔۔۔ جمال احمد نے صرف انہیں قبول کیا تھا۔ انہوں نے دوسرے دن یہ کہہ کے تمام زیورات لوٹا دیے تھے ان کے پاس اتنی رقم ہے اور نہ اتنی آمدنی ہے کہ اس کی زکوٰۃ ادا کر سکیں۔ یہ مکان بھی اس لیے قبول نہیں کیا کہ وہ ان کی اپنی کمائی کا نہیں ہے۔۔۔ جمال احمد نے انہیں صرف چند جوڑوں میں قبول کیا تھا۔۔۔ انہوں نے پیشگی یہ شرط بھی رکھی تھی کہ انہیں شوہر

کی آمدنی میں گزارہ کرنا ہوگا۔۔۔ ان کے ابو سے وہ کبھی کسی قسم کی مالی مدد یا کوئی اور مدد قبول نہیں کریں گے۔ ان کے ابو نے وہ تمام ہیرے جواہرات اور قیمتی زیورات جہیز میں دیے ہیں وہ جمال احمد نے بینک لاکرز میں رکھ دیے ہیں جو غلط بات تھی۔ لیکن اس کا کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔

شادی کے ایک برس کے بعد جب رضوانہ پیدا ہوئی تب ہیضہ پھوٹ پڑا تھا۔ گو اس وبا پر جلد قابو پا لیا گیا لیکن ان کے خاندان کا کوئی فرد نہیں بچ سکا تھا۔ ان کی والدہ ' بیوہ بہن اور اس کے بچے اس وبا کی نذر ہو گئے تھے۔ کہنے والوں نے ان سے یہ بھی کہا تمہاری ماں کی بد دعائیں رنگ لائیں ہیں۔ انہوں نے جو کھڑی شام جمال احمد کے گھر والوں کو بد دعائیں دی تھیں اس کا یہ نتیجہ ہے۔ وہ اس عام سی زندگی سے شاہانہ زندگی کے مقابلے میں بہت خوش تھیں۔ جمال احمد نے انہیں جو محبت دی تھی وہ ایسی چاہت تھی کہ وہ ان کی توقع سے کہیں بڑھ کے تھی۔ اور پھر جمال احمد ایک خوددار اور با اصول شخص تھے۔ انہوں نے انہیں کبھی کسی قسم کی کمی اور تکلیف ہونے نہیں دی تھی۔

راحیلہ کی پیدائش کے دو برس بعد نفرت کا وہ بیج جو اس ملک میں بویا گیا تھا وہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ بنگلہ دیش ایک درد اور عذاب ناک پھوڑا بن کے ابھرا تھا۔ ان کی امی تو کبھی کی ایک حادثے میں اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ ایسا خون خرابا ہوا کہ اس نسلی فسادات میں غنڈوں نے ان کے ابو کو شہید کر دیا اور ان کا حویلی نما مکان لوٹ کے اسے نذر آتش کر دیا۔۔۔ اور پھر جمال احمد کے جانی دشمن بن گئے تھے۔ اس لیے کہ عصبیت کے خلاف تھے جو برسوں سے پھیلائی جا رہی تھی۔ ایک بنگالی عورت نے اپنی جان پر کھیل کے انہیں بنگلہ دیش سے نکالا اور نیپال کسی نہ کسی طرح پہنچا دیا۔

وہ اور جمال احمد کراچی پہنچ گئے۔ یہاں ان کے شوہر نے وکالت کی پریکٹس شروع کر دی۔ رابعہ کی پیدائش کے دو برس بعد وہ ایک عارضہ میں مبتلا ہو کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان پر تو قیامت گزر گئی۔ مگر انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اس لیے ان کے رفیق حیات نے انہیں سکھایا ہوا تھا کہ حالات سے کس طرح نبرد آزما ہوا جاتا ہے۔ زندگی کے اسرار و رموز سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔

وہ نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ وہ چاہتیں تو کسی بھی اچھی فرم میں ملازمت کر سکتی تھیں اور انہیں اچھا عہدہ مل جاتا مگر انہیں دفتر میں مردوں کی غلامی پسند نہیں تھی۔ یہ جو عورتیں دفتروں میں ملازمت کر رہی تھیں وہ شوہروں کی حاکمیت کے مقابلے میں افسروں اور اعلیٰ عہدیداروں کی غلامی پسند کرتی تھیں۔ اس ذلت کا کڑوا گھونٹ پیتی رہتی تھیں۔ انہوں نے دفتر کی بجائے لڑکیوں کے کسی اسکول میں ملازمت کو ترجیح دی۔ اس میں عزت تھی۔ وقار تھا۔ آزادی اور سکون بھی تھا۔ انہوں نے ایک اچھے اسکول میں استانی کی ملازمت کر لی۔ ان کے لیے جو سب سے بڑی دولت تھی وہ اپنا مکان تھا۔ ان کے شوہر نے کراچی پہنچتے ہی سب سے پہلے مکان خریدا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے سہاگ کے زیورات کی قربانی دی تھی۔

ڈھاکا سے آنے والوں میں بہت سارے ان کے اور ابو کے رشتہ دار بھی تھے۔۔۔ ان لوگوں نے انہیں مصیبت میں دیکھ کے رشتہ جوڑنے کی کوشش نہیں کی ۔ البتہ ان کے بارے میں یہ بات مشہور کر دی تھی کہ ان کے پاس خاندان کے بے حد قیمتی ہیرے جواہرات موجود ہیں اس کی وجہ سے کئی لوگوں نے ان سے شادی کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ وہ مرد ان کے حسن وشباب پر بھی ریجھ گئے تھے۔ انہوں نے شادی سے صاف انکار کر دیا تھا۔

وہ اس لیے شادی کر کے گھر بسانا اور کسی مرد کا سہارا لینا نہیں چاہتی تھیں کہ انہوں نے اپنی زندگی میں صرف اور صرف جمال احمد سے محبت کی تھی۔ وہ کسی کو نہ تو محبت دے سکتی تھیں اور نہ ہی انہیں جمال احمد جیسی محبت مل سکتی تھی۔ کیوں کہ ان لوگوں میں شادی کرنے میں ریاکاری ' منافقت اور غرض تھی۔

انہوں نے اپنے اور اسکول کے بچوں کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ ان کا غم، معصوم اور فرشتوں جیسے بچوں کے باعث مٹتا گیا... اس نئی زندگی میں انہیں جمال احمد کی روح مسکراتی نظر آتی تھی۔ جمال احمد ان سے اکثر کہتے رہتے تھے کہ... انسان کی ساری زندگی جدوجہد میں گزرے تو زندگی کہلاتی ہے... دیکھا جائے تو وہ شخص جانور کی طرح ہے، جس میں کوئی جذبہ اور مقصد نہ ہو۔

ان کی تینوں لڑکیاں ان کی توقع سے کہیں زیادہ ذہین اور قابل نکلیں۔ انہوں نے اپنی لڑکیوں کی، لڑکوں کی طرح تربیت دی تاکہ ان میں کوئی کسر اور کمی نہ رہ جائے۔ وہ بڑی باصلاحیت تھیں۔

انہیں اپنی زندگی میں سب سے زیادہ مسرت اس وقت ہوئی جب رضوانہ نے ایم اے... ملیحہ نے بی اے اور رابعہ نے امتیازی نمبروں سے میٹرک کیا اور سندھ میں اول آئی تھی۔

اسکول کی دو ایک استانیاں ان کی سہیلیاں تھیں جو ان کے رشتہ داروں سے بڑھ کے بھی پرخلوص اور محبت کرنے والی تھیں۔ ان کی بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ لیکن ان کی بیٹیاں شادی کے بعد خوش و خرم زندگی نہیں گزار رہی تھیں... اس لیے کہ نہ صرف ان کے شوہر بلکہ ساس اور نند بھی اچھا جہیز نہ لانے اور شادی روایتی انداز سے نہ کرنے پر طعنہ دیتیں اور دوسرے گھرانوں کی بہوؤں سے موازنہ کرتی تھیں۔ ان کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی تھی۔

وہ بڑی دکھی اور پریشان تھیں۔ غریب تھیں اور ان کی آمدنی محدود تھی... وہ کہاں سے اپنی بیٹیوں کے لیے اچھا جہیز لائیں۔ وہ ان کا دکھ درد بانٹنے کے لیے ان کے ہاں چلی جاتیں اور چھٹیوں یا تہواروں پر اپنے ہاں بلا لیتی تھیں۔ ان کے پاس ان کے تسلی و تشفی کے مرہم کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔

ان کی زندگی تو ان کے لیے ایک حادثہ بنی رہی تھی۔ کتنے سارے حادثے رونما ہوتے رہے تھے۔ زندگی کا ایک لمبا عرصہ حادثات ہی میں گزر گیا تھا۔ وہ جیسے ان کی عادی ہونے لگی تھیں۔

ایک روز ایک نئے حادثے نے اچانک اور غیر متوقع طور پر انہیں ششدر اور بدحواس کردیا۔

رضوانہ نے راحیلہ کی زبان سے کہلوایا کہ... اس نے اپنی زندگی کے لیے ایک ساتھی کا انتخاب کرلیا ہے وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے... انہوں نے جب یہ بات سنی تو ان پر کوئی بجلی سی آگری۔ یہ بات تو نہیں تھی کہ انہیں اپنی لڑکیوں پر اعتبار نہیں رہا تھا... دراصل وہ آج کے لڑکوں کے کردار سے مطمئن نہیں تھیں۔ لڑکے ایسے سانچوں میں ڈھل رہے تھے کہ انہیں اپنی قدروقیمت کا پاس نہیں رہا تھا۔ اس بات کا ذرا بھی ملال نہیں تھا کہ وہ ان کے نقش قدم پر چل پڑی ہے۔ دکھ اس بات کا تھا اس نے شریک زندگی کے انتخاب میں جلد بازی کی تھی اور ان سے مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔ انہیں رضوانہ پر اعتماد تھا۔ اس میں اچھے برے کی تمیز تھی۔ وہ کوئی نوعمر لڑکی نہیں تھی کسی ایسے ویسے لڑکے کا انتخاب کرتی۔

انہوں نے راحیلہ کی بات سن کے کچھ نہیں کہا اور نہ ہی سرزنش کی تھی کہ رضوانہ نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا... تاہم انہوں نے ایک روز اس کے انتخاب کو پرکھنے کے لیے لڑکے کو چائے پر مدعو کرلیا۔

اس روز رضوانہ بڑی بے قراری سے گھر میں گھومتی اور اپنے آپ کو ان کی نظروں سے چھپاتی اور سامنا کرنے سے کتراتی رہی تھی... اس کا یہ اضطراب ان کی سمجھ سے باہر تھا۔

تاہم شام کے وقت وہ پرسکون ہوگئی تھی جیسے اس کا اعتماد لوٹ آیا ہو۔

لڑکے کو جو وقت دیا گیا تھا اس کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ انہوں نے کپڑے تبدیل کیے... کوئی نصف گھنٹے کی تاخیر گھر سے باہر گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ ایک خوب صورت اور لمبی سی گاڑی میں آیا تھا۔ محلے اور گلی کے گھروں، دروازوں اور کھڑکیوں سے جھانک کے لڑکیاں، عورتیں اور بچے ہی نہیں مرد بھی کار اور اسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے انہوں نے ایسی کار

نہ دیکھی ہو۔ اس سے بھی کہیں قیمتی گاڑیاں سڑکوں پر دوڑتی دکھائی تھیں۔ لیکن اس محلے میں نہ تھی اس لیے سنسنی پھیل گئی تھی اور اس لڑکے کی توجہ ہر کسی نے کھینچ لی تھی۔

جب وہ نشست گاہ میں پہنچیں تو اس لڑکے کی جاذب نظر شخصیت نے انہیں بے حد متاثر کیا تھا۔ لڑکے نے ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ عمدہ جامہ زیب تھا۔ چہرے مہرے اور وضع قطع سے اعلیٰ خاندان کا نظر آیا تھا۔

اس کے سلام کا جواب دے کے اس تاخیر پر سرزنش کیے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس لیے کہ وہ ایک اسکول ہیڈ مسٹریس تھیں تاخیر برداشت کرنے کی عادی نہ تھیں۔

"میں ایک ڈاکٹر ہوں۔" اس نے جواب دیا "یہ ایک ایمرجنسی کیس کی وجہ سے مجھے دیر ہوگئی۔ کسی مریض کی جان بچانا میرا پہلا فرض ہے۔"

وہ ہاشمی سے مل کے بہت خوش ہوئی تھیں۔ جب رخصت ہوا تو ان پر اپنی شخصیت کا اثر چھوڑ گیا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے رضوانہ کے لیے موزوں تھا اور بہت اچھا جوڑ بھی تھا۔ وہ دل میں رضوانہ کے انتخاب کی داد دیے بغیر نہ رہ سکی تھیں۔

راحیلہ نے ان کی رائے ہاشمی کے بارے میں دریافت کی تو انہوں نے اسے جواب دیا کہ شادی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے... لڑکے کی خوب صورتی اور وجاہت سے فیصلہ نہیں کیا جاسکتا ہے... انہیں ابھی لڑکے والوں کے گھر کے افراد سے ملنا اور خاندان کو بھی دیکھنا ہے۔ تیسرے دن ہاشمی کی ماں اور بہنیں دعوت پر ان سے ملنے اور رضوانہ کو بھی دیکھنے آئی تھیں۔ انہوں نے ابھی تک رضوانہ کو دیکھا ہوا نہیں تھا، ان کا اندازہ تھا کہ وہ لوگ دولت مند ہوں گے۔ وہ صحیح نکلا، ماضی میں لڑکے کے والد ڈھاکا میں بزنس کرتے تھے۔ وہ بھی ان کے خاندان سے واقف تھے۔ ان کی امارت اور حیثیت اور شہرت کے بارے میں علم رکھتے تھے... ہاشمی کی ماں نے باتوں باتوں میں بتایا کہ ان کی بڑی بہو ایک سرکاری افسر کی بیٹی ہے۔ اس کے باپ نے لاکھوں کا جہیز دیا۔ جوڑے میں دو لاکھ اور ہنی مون کے لیے بھی دو لاکھ کی رقم دی... ایک لگژری فلیٹ کلفٹن میں دیا۔

پھر انہیں ہاشمی کی کیا قیمت دینا ہوگی...! انہوں نے دل میں سوچا۔ ہاشمی مشہور فزیشن اور سرجن ہے۔ وہ ایک مریض کے معائنے کی فیس ہزار روپے لیتا ہے۔ کوئی آپریشن کرتا ہے پچاس ہزار سے کم نہیں لیتا ہے... روزانہ تیس سے چالیس مریض دیکھتا بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ ان کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے...!

پھر انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد شادی سے انکار کردیا۔ اس کی وجہ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ ماں کی کوئی نہ کوئی ایک عادت بیٹیوں میں بھی آتی ہے۔ ورثہ میں ملتی ہے۔

رضوانہ میں بھی ان کی ضد آگئی۔ اس نے بھی ان کی طرح بغاوت کردی جس طرح انہوں نے اپنی ماں سے کی تھی۔ اس نے ان کی مرضی کے خلاف ہاشمی سے شادی کرلی۔ رضوانہ کے سسرالیوں نے بڑی دھوم دھام سے اپنے بیٹے کی شادی کی تقریب منعقد کی... شادی سے قبل بھی رضوانہ کی ہونے والی نند منانے اور شرکت کرنے کی دعوت دی تھی جو انہوں نے انکار کردیا... دوسرے دن رضوانہ اور ہاشمی ان سے ملنے آئے تھے۔ انہوں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔ ان کی شکلیں تک نہیں دیکھیں اور نہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ رضوانہ، دروازے سے لگ کے بہت روئی تھی اور تب بھی ان کا دل نہیں پسیجا تھا... پھر وہ اور ہاشمی چلے گئے۔

انہوں نے صرف اتنا کہا کہ اپنی ماں کی طرح بیٹی کی سرکشی اور بغاوت پر اسے بددعا نہیں دی... اور نہ ہی کوئی دعا... وہ پتھر دل عورت بنی رہی تھیں۔

راحیلہ نے بھی وہی کیا جو رضوانہ نے کیا تھا۔

اس کا شوہر شعیب ایک انجینئر تھا۔ اس کے خواب اور خیالات بھی بہت بلند تھے جن کا عکس اس کی آنکھوں میں دکھائی دیتا تھا... اس نے اپنے وطن عزیز

کی تعمیر و ترقی کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا تھا اور سہانے خواب دیکھتا رہتا تھا۔ اس کے ذہن میں بہت سارے منصوبے تھے جس سے اس کے عزم کا اظہار ہوتا تھا۔

جب وہ ان سے ملنے آیا تو اس کے خیالات سن کے اس کے جذبے سے بڑی متاثر ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایسی سوچ بہت کم نوجوانوں میں پائی تھی... ایسا جذبہ تو جمال احمد میں بھی تھا۔

شعیب کا گھرانہ بھی بیٹے کی قیمت چاہتا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ ڈھاکا کے نواب خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے پاس بہت بھاری دولت اور ہیرے جواہرات بھی ہیں... چوں کہ یہ گھرانہ ڈھاکا میں رہتا تھا اور دولت مندوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس گھرانے کو ان کی شادی اور ان کے ابو نے جو ہیرے، جواہرات کے زیورات کے سیٹ، رقم اور بنگلہ دیا تھا وہ اور ان کی شادی کے بارے میں جانتا تھا۔ اس گھر کی خواتین نے شادی کے اندر انہیں زیورات سے لدا پھندا دیکھا تھا۔

وہ اس رشتے کو نامنظور کرتے ہوئے یہ بات اچھی طرح سمجھتی تھیں کہ شعیب جیسے نوجوان جو عزم کرتے ہیں اسے پورا کر کے رہتے ہیں۔ راحیلہ بھی ان کی بیٹی تھی۔ اس میں ان کی جیسی ہی سرکشی کی فطرت موجود تھی۔ پھر ان کی شادی روایتی انداز سے ہو گئی۔ شادی کا سارا انتظام شعیب کے گھر والوں نے ہی کیا تھا... شعیب کے پھوپھی نے راحیلہ کو ایک ماں کی طرح اپنے گھر سے رخصت کیا تھا تاکہ احساس کمتری نہ ہو اور پھر رضوانہ نے بھی شرکت کی تھی... وہ اس روز بھی اپنے کمرے میں بند پڑی رہی تھیں۔ رابعہ کو سختی سے تاکید کر دی تھی کہ دونوں دلہا دلہن آئیں تو گھر کا دروازہ نہ کھولے... لیکن ان دونوں نے کبھی بھولے سے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔

وقت تیزی سے گزرتا چلا گیا... ان دو بڑے حادثات نے ان کے دل پر جو زخم لگائے تھے... وقت مرہم نے انہیں مندمل کرنا شروع کر دیا مگر ان میں بھی ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ کرب ناک اذیت سے ان کا دل خون کے آنسو رونے لگا تھا۔ آج ان دونوں کو دیکھ کے ان کے زخم پھر سے تازہ ہو گئے۔ ان سے پھر لہو رسنے لگا۔

رکشا عزیز آباد میں داخل ہوا تو انہوں نے مخالف سمت والی گلی میں مڑنے کے لیے کہا۔ پھر رابعہ کے بارے میں سوچا... وہ ایک گرلز کالج میں لیکچرار ہو گئی تھی۔ اس آنے والی پہلی تاریخ کو پہلی تن خواہ ملنے والی تھی۔ مگر اب خرچ کی سہولت ہونے والی تھی... مگر ان کے سینے میں جو ممتا کی تڑپ اور ہوک اٹھتی ہے... اس کا کیا ہوگا...!

ایک برس ایک مہینے کی طرح گزر گیا۔ اب رابعہ کی شادی ہو جانا چاہیے۔ انہوں نے سوچا اس کی عمر ہو رہی تھی اور اس کے لیے رشتے آنے شروع ہو گئے تھے۔ عابدہ نے ان کو ایک رشتے کے بارے میں بتایا تھا۔ عابدہ بھی ان کے اسکول میں پڑھاتی تھی۔ وہ بہت دنوں سے انہیں گھر بلا رہی تھی... انہوں نے سوچا کہ چلو آج اس کے ہاں ہو آتے ہیں۔ اس طرح ایک پنتھ دو کاج ہو جائیں گے اور عابدہ کی شکایت بھی دور ہو جائے گی۔

وہ سہ پہر کے وقت گھر سے نکلیں۔ منی بس میں نارتھ ناظم آباد جا رہی تھیں تو نخی حسن کے پاس جو کچھ دیکھا اس نے ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا کر دیا۔ ایک لمحے کے سر چکرا گیا... ان کی نظریں دھوکا کیسے کھا سکتی تھیں... وہ ان کی بیٹی رابعہ تھی جو ایک نوجوان کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھی کہیں جا رہی تھی... اس سے باتیں بھی کیے جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر گلابیاں بکھری تھیں... ایک عجیب سی سرشاری سی اس پر چھائی ہوئی تھی۔

اب عابدہ کے ہاں جانا لاحاصل تھا۔ ان کے دل میں دکھ کی لہر سی اٹھی... یہ کیا بات ہے...؟ انہوں نے بھی اپنی پسند کی شادی کی اور اپنی ماں سے سرکشی اور بغاوت کی تو ان کی بیٹیاں بھی انہی کے نقش قدم پر چل پڑیں۔ ان کی فطرت لڑکیوں کی فطرت کا حصہ کیوں بن گئیں آخر...؟

دن ڈوبنے کے بعد رابعہ گھر آئی تو اس کی حرکات و سکنات سے خوشی عیاں تھی جو کسی کو پانے سے ملتی تھی۔ گو اس نے اپنی دانست میں اس خوشی کو چھپایا ہوا تھا مگر اس کا چہرہ تو دل کا آئینہ تھا۔ اس آئینے میں سب کچھ صاف نظر آیا تھا۔ آخر وہ بھی تو اس راہ پر سے گزر چکی تھیں۔ وہ بھی تو محبت آشنا تھیں۔

”رابعہ...!“ انہوں نے اسے آواز دی تو ان کے سامنے آ کے کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں محبت کے چراغ روشن تھے۔ انہوں نے بدستور اس کی طرف دیکھا تو وہ ان کی تیز اور گہری نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ اپنی آنکھوں پر لمبی پلکوں کی چلمن گرا لی۔ چہرہ سرخ سا ہو گیا تھا۔

”جی امی...!“ وہ فرش کو گھورتی ہوئی بولی۔ ”آپ نے مجھے بلایا؟“

”تم نہ صرف ایک باشعور اور پروقار لڑکی اور لیکچرار بھی ہو... تمہیں ایک غیر مرد کے ساتھ اسکوٹر پر یوں گھومنا پھرنا زیب نہیں دیتا ہے... تمہاری اسٹوڈنٹ دیکھیں گی تو کیا سوچیں اور کہیں گی۔“

”جی... جی۔“ وہ سراسیمہ ہو گئی۔ اس کا چہرہ اوپر نہ اٹھ سکا۔ وہ پسینے میں نہا گیا تھا۔

”کل شام تم اسے چائے پر بلا لو... میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”جی...“ رابعہ نے چونک کے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں جلتے چراغ بجھ گئے تھے اور اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں کہے دے رہی تھیں کہ آپ اسے اس لیے بلا رہی ہیں کہ پھر وہی کہانی دہرائی جائے۔ اس نے چاہا کہ وہ صاف گوئی سے کہہ دے کہ آپ کو کسی بیٹی کا انتخاب کبھی پسند نہیں آیا۔ لیکن یہ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ ”جی اچھا۔“

بلقیس بانو نے قمر احمد کو دیکھا تو رابعہ کی پسند اور انتخاب پر بے حد تعجب ہوا۔ وہ اپنی دونوں بہنوں سے کہیں حسین اور پرکشش اور جاذب تھی۔ اس کے رنگ روپ نے انہیں متاثر نہیں کیا۔ وہ سانولے رنگ کا تھا۔ البتہ اس کے چہرے نقش و نگار دل آویز

مسکراہٹیں

سروے کرنے والے ایک صاحب نے ایک سرکاری دفتر کے انچارج سے پوچھا۔

”آپ کے ہاں کتنے آدمی کام کرتے ہیں۔؟“

انہوں نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر جواب دیا۔ ”سو میں سے دو تین۔“

☆☆☆

شام کے اخبار۔ کے ایڈیٹر نے نہایت پریشانی کے عالم میں رپورٹر سے کہا۔

”اخبار کے پریس میں جانے کا وقت قریب آ گیا ہے اور ابھی تک شہر میں کوئی ایسا سنسنی خیز جرم نہیں ہوا جس کی مزے دار سی ہیڈ لائن لگائی جا سکے۔“ ”آپ فکر نہ کریں سر! کچھ نہ کچھ ہو ہی جائیگا۔“ رپورٹر نے انہیں تسلی۔ ”فطرتِ انسانی پر میرا یقین بہت مضبوط ہے۔“

☆☆☆

کثرت شراب نوشی کے الزام میں گرفتار ہونے والے ایک شخص نے لاس اینجلس کی عدالت میں مؤقف اختیار کیا کہ اسے طبی بنیادوں پر معافی دے جائے۔ اس سے جب اس کی وضاحت چاہی گئی تو اس نے بتایا کہ ڈاکٹر نے اسے بھڑ کے کاٹنے پر وہسکی لگانے کا مشورہ دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہسکی باہر کے بجائے اندر سے بہتر اثر کرے گی۔ چنانچہ وہ تکلیف دور ہونے کے انتظار میں پیے جا رہا تھا۔

☆☆☆

عقلمندی کی بات

راز کو راز رکھنا بڑی ذہانت اور عقلمندی کی بات ہے۔ لیکن اُمید رکھنا کہ دوسرے بھی اس راز کو راز میں رکھیں گے۔ سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔

اور تیکھے تیکھے تھے۔ چہرے پر نمک تھا۔ وہ خوب صورت اور وجیہہ نہیں تھا۔ جب کہ رضوانہ اور راحیلہ کے بہت خوب صورت وجیہہ تھے۔

وہ آج کی نوجوان اور خصوصاً تعلیم یافتہ لڑکیوں کی پسند اور ان کے خیالات سے بخوبی واقف تھیں۔ وہ خواب دیکھتی تھیں۔ لڑکیوں کی اکثریت ایسے مردوں سے شادی کی خواہش مند ہوتی تھیں جو فلمی ہیروں کی طرح ہو تاکہ حسین جوڑا کہلا سکے۔ اپنے آئیڈیل تلاش کرتی تھیں۔ وہ ظاہری خوب صورتی پر جان دیتی تھیں کہ... لڑکے کے کردار اور شرافت کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی تھی۔ سراب کے پیچھے اندھا دھند دوڑتی تھیں۔ قمر احمد ایک کاسمیٹک فرم میں سیلز مین تھا۔ ماں کے سوا دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔

قمر احمد کے جانے کے بعد انہوں نے رابعہ سے پوچھا "تم نے قمر احمد میں ایسی کون سی خوبی دیکھی جو اسے پسند کیا؟"

ایک تو وہ میرے ابو کی طرح خود دار شریف ہیں جیسا کہ آپ ان کے بارے میں بتاتی رہتی ہیں۔ دوسری بات ان کے اور میرے خیالات میں ہم آہنگی ہے۔ اور پھر ان کی زندگی میں بڑی سادگی اور قناعت پسندی ہے۔"

"تم ایم اے اور لیکچرار ہو... وہ انٹر ہے... بھلا یہ کیا جوڑ ہوا...؟"

زندگی گزارنے میں انٹر اور ایم اے کا کیا سوال ہے امی...!" رابعہ کہنے لگی۔ "بعض لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بھی جاہلوں کی سی سوچ رکھتے ہیں' تنگ لفظ بھی ہوتے ہیں۔ یہ وہ سلجھے ہوئے خیالات کے ہیں۔ میں کسی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوں۔ نہ ہی میں نے ان کی ظاہری حیثیت اور ان کی ڈگری کے بارے میں سوچا۔

بلقیس بانو دوسرے دن قمر احمد کے ہاں پہنچ گئیں۔ نارتھ کراچی میں تین کمروں کا ایک مکان تھا۔ قمر احمد کی ماں ایک سیدھی سادی اور پرخلوص عورت تھی۔ اسے نہ تو جہیز کی تمنا تھی اور نہ ہی جوڑے کی رقم اور زیورات کی... وہ چاہتی تھی کہ رابعہ اس کے گھر میں نور بن کے آئے... وہ ایک جوڑے میں آئے گی تو دل میں بسی رہے گی... وہ دل و جان سے بہو کی خدمت کرے گی۔ کبھی اس پر روایتی ساس کا سایہ بھی نہیں پڑے گا۔

اس عورت کے خیالات نے انہیں جیسے بن مول خرید لیا تھا... کیسی عجیب سی خواہش ہے... انہوں نے دل میں سوچا کہ مائیں اپنی خدمت کے لیے بہوئیں لاتی ہیں... یہ عورت بہو کی خدمت کرے گی۔ انہوں نے رخصت ہوتے وقت اس سے کہا۔

"میری بیٹی آپ کی خدمت کرے گی۔ اسے ایک ماں کی سی مامتا اور سہارے کی ضرورت ہے۔"

اس رات انہیں بڑی دیر تک نیند نہیں آسکی۔ وہ خود غرض ہو کے اپنے بارے میں سوچنے لگی تھیں... رابعہ چلی گئی تو اس گھر میں کیا رہ جائے گا...! رضوانہ اور راحیلہ کے جانے کے بعد گھر ویسے ہی بھائیں بھائیں کرنے لگا ہے۔ اس کے گھر سے رخصت ہوتے ہی قبرستان جیسا سناٹا چھا جائے گا... ہر کمرے اور در و دیوار پر خزاں کا گمان ہو گا۔ ویرانی بڑھ جائے گی... تنہائی کسی ناگ کی طرح ان کے وجود کو ڈستی رہے گی... پھر وہ اپنی زندگی کے خلا کو کیسے پر کریں گی...؟ میری کتابیں جو ہمیشہ میری ساتھی رہی ہیں ان میں میرا دل نہیں لگے...؟ میری زندگی کیسے بسر ہو گی...؟ آخر میں کب تک رابعہ کا بیاہ نہیں کروں گی... اگر اس نے میرے انکار پر رضوانہ اور راحیلہ کی طرح قدم اٹھایا تو پھر کیا ہو گا... پھر میں کیا کروں گی...؟

بلقیس بانو نے ایک روز رابعہ کو ساتھ لیا اور اچانک رضوانہ کے ہاں پہنچ گئیں۔ رضوانہ نے انہیں اپنے ہاں جو دیکھا تو تڑپ کے ان کے سینے سے آلگی۔ برسوں سے ان کے وجود میں جو آتش فشاں دہک رہا تھا وہ یک لخت پھٹ پڑا تھا۔ انہوں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ رضوانہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔ اس کی بڑی عزت ہے۔ ساس' نندیں اور دیور اسے بہت چاہتے ہیں۔ پھر وہ راحیلہ کے ہاں پہنچیں۔ وہ بھی یہاں

بڑے سکھ' عزت' سے ہے اور سسرال والوں کی چاہت کے سائبان میں زندگی گزار رہی ہے... ایک ماں چاہتی بھی کیا ہے...؟ اس کی بیٹی سسرال میں محبت اور عزت سے رہے... ایک طرح وہ اپنی سسرال میں ایک مہارانی کی طرح راج کر رہی ہے۔

تین مہینے کے بعد رابعہ کی شادی نہایت سادگی اور پروقار طریقے سے انجام پا گئی۔ ان کے گھر سے پہلی بار ایک خوب صورت لڑکی ہاتھوں میں مہندی لگائے' سرخ جوڑا پہنے' روایتی انداز میں ماں کی دعائیں لے کے رخصت ہوئی۔

رضوانہ اور راحیلہ نے بھی ایسے ہی خواب دیکھے تھے لیکن وہ پورے نہ ہو سکے تھے۔ رابعہ کی رخصتی کے بعد دونوں داماد جو بے حد تھکے ہوئے تھے اپنے اپنے گھر والوں کے ساتھ آرام کرنے چلے گئے۔ انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کو روک لیا تھا۔ اس لیے کہ کل بھی ان کی ضرورت تھی اور انہیں ان سے باتیں بھی کرنی تھیں۔ پانچ برس سے ان کے سینے میں ایک راز جو خلش بن کے کسی خنجر کی طرح پیوست تھا وہ آج اسے نکالنا چاہتی تھیں۔ ان کے کہنے پر وہ دونوں اپنے اپنے بچوں کو سلا کے ان کے پاس آبیٹھیں۔

"کیا آپ ہم سے کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہیں امی...!" رضوانہ نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟"

"ہاں... میں تم دونوں سے آج ایک راز کی بات کہنا چاہتی ہوں۔" انہوں نے ایک لمبی سانس لے کے جواب دیا۔ "اس طرح آج میں پہلی مرتبہ سکون کی نیند سو سکوں گی... میرے سینے سے ایک بوجھ اتر جائے گا... وہ چٹان کا سا بوجھ جو میرے سینے پر پانچ برس سے ہے۔"

"کون سا راز...؟ کیسا راز...؟" ان دونوں نے حیرت سے ان کی شکل دیکھی۔

"ایک ایسا راز جو شاید کبھی تمہارے کام آسکے... اس لیے کہ وقت اور حالات کا کوئی بھروسا نہیں... آگے چل کے کیا وقت آئے گا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا... لہٰذا اس راز کی حفاظت کرنا... خدانخواستہ جیسا وقت مجھ پر آیا اگر تم پر بھی آئے تو اس راز پر عمل کرنا۔"

"آخر وہ کون سا راز ہے امی...! جس نے آپ کو پانچ برسوں سے اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے؟" رضوانہ کے چہرے پر استعجاب چھا گیا۔

"یہ وہ راز ہے جس میں تم دونوں کی عزت کا سوال ہے۔ اسے کبھی کسی حالت میں کسی اور پر ظاہر نہیں کرنا... ورنہ تم دونوں پچھتاؤ گی۔"

"ہماری عزت کا سوال...؟" راحیلہ بولی۔ "آپ بے فکر رہیں... ہم اس راز کو اپنے سینے میں دفن رکھیں گے... اس لیے عزت سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ عزت تو صرف ایک بار ملتی ہے۔"

قابل دید

ایک دن دو چیونٹیاں خوراک تلاش کر رہی تھیں اچانک راستے میں ان کو ایک ہاتھ ملا۔ ایک چیونٹی دوسری سے تیزی سے بولی۔

"وہ دیکھو سامنے سے ہاتھی چلا آرہا ہے۔ آج اس کو مار گرائیں۔"

یہ سن کر دوسری نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔

"رہنے دو پھر کبھی سہی۔ آج وہ بے چارا اکیلا ہے۔ اور ہم دو ہیں۔"

☆

ایک چوہیا اپنے تین ننھے منے بچوں کے ساتھ شام کی سیر کو نکلی کہ ایک بلی سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس سے پہلے کہ بلی ان کی طرف جھپٹتی، چوہیا اپنی پوری طاقت سے چلائی۔

"بھوں بھوں...... بھوں بھاؤں۔"

بلی ہکا بکا رہ گئی اور اپنے قدموں واپس دوڑ گئی۔

چوہیا نے اپنے بچوں سے کہا۔

"اب تم جان گئے ہو گے کہ اپنی مادری زبان سیکھنے کے علاوہ بھی کوئی اور زبان سیکھنا کتنا ضروری ہے۔" ☆

"اس عزت کی خاطر تو مجھے داؤ لگانا پڑا۔" انہوں نے جواب دیا۔ "اگر میں یہ داؤ نہیں لگاتی تو تم دونوں کی شادیاں نہیں ہو سکتی تھیں۔"

"آپ نے تو کوئی داؤ نہیں لگایا امی.....!" رضوانہ بولی۔ "آپ نے ہم دونوں کی شادیوں میں رکاوٹ کھڑی کی..... دیوار بن گئیں۔ آپ نے بغیر کسی وجہ کے ہماری شادیاں کرنے سے انکار کر دیا تھا..... یہ تو ہماری سرکشی، نافرمانی اور ضد تھی جس کی وجہ سے یہ شادیاں ہو گئیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ہم اپنی پسند اور مرضی کی شادی کر کے کس طرح خسارے میں نہیں رہیں..... ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہی ہیں اور پھر ہماری سسرال میں ہماری کتنی عزت اور محبت ہے ..... معلوم نہیں کیوں اور کس وجہ سے آپ نے ایسا کیا ..... بہرکیف ہمیں آپ سے کوئی شکوہ شکایت نہیں ہے۔"

"تم دونوں میری بات کی تہ میں نہیں پہنچیں....." وہ بے حد سنجیدہ ہو گئیں۔ "تم دونوں اچھی طرح سے یہ بات جانتی ہو کہ ہمارا معاشرہ کس قدر جابر اور ظالم قسم کا ہے..... خاص کر عورتیں، جو بڑی تنگ نظر اور روایت پسند، ذہنی طور پر پس ماندہ اور سخت گیر ہوتی ہیں۔ نام و نمود ان کی کمزوری ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ایک ظالمانہ دستور ہے کہ لڑکی بھی دو جو باعزت پرورش کی ہوئی اور اس کے علاوہ جہیز اور تعلیم یافتہ بھی ہو..... صرف یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ یہاں لڑکے کی قیمت بھی دینا پڑتی ہے۔ اسے جوڑے کی رقم بھی دینا پڑتی ہے اس بات کا ہرجانہ دیا جا رہا ہے کہ ہم نے بہت بڑا کوئی جرم کیا ہے؟ ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم لڑکی والے ہیں۔ ان لڑکیوں کی سسرال میں کوئی عزت نہیں ہوتی ہے جو معمولی جہیز لے کے جاتی ہیں۔ تم دونوں نے جن لڑکوں کو پسند کیا اتفاق سے وہ دونوں بڑے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے گھر کی عورتوں کی خواہش تھی کہ تم دونوں بہت سارا جہیز لے کے آؤ۔ وہ جوڑے میں لاکھوں روپے کے خواب دیکھ رہی تھیں، اسی لیے کہ میرا تعلق نواب خاندان سے تھا۔ انہیں مجھ سے بہت ساری توقعات وابستہ تھیں۔ میں جانتی تھی کہ ان کے ہاں جاؤ گی تو کوئی عزت نہ ہو گی۔ اس لیے کہ میرے پاس دینے کے لیے کچھ نہ تھا۔ اس لیے میں نے انکار کر دیا تھا۔

"یہ آپ کا خوف اور وہم تھا۔" راحیلہ نے تکرار کی۔ "ہم نے جو شادیاں کیں تو ہمارے پاس کیا تھا۔ ہم کیا لے کے گئی تھیں.....؟" کچھ بھی تو نہیں..... ہماری عزت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سب ہی محبت سے پیش آئے۔ آج تک ہمیں کسی نے طعنہ نہیں دیا۔"

"اس کی یہ وجہ نہیں ہے.....! اصل وجہ یہ ہے کہ ان لڑکوں نے اپنی پسند اور مرضی سے شادیاں کیں۔ اس لیے تمہیں کسی نے جہیز نہ دینے کا طعنہ نہیں دیا ..... اگر میں تمہیں ایک جوڑے میں رخصت کر دیتی تو تم دونوں کا جینا حرام کر دیا جاتا۔ میں نے انکار یہ جانتے بوجھتے کیا تھا یہ لڑکے تم سے ہر قیمت پر شادی کر کے رہیں گے۔ اس طرح میں جوڑے کی رقم اور جہیز سے بچ جاؤں گی۔ خاندان کا بھرم اور عزت بھی رہ جائے گی۔ اس طرح میری تدبیر کارگر ہوئی اور تم دونوں کے گھر بس گئے۔"

ان دونوں پر سکتہ سا چھا گیا۔ تھوڑی دیر بعد رضوانہ بولی۔ "آپ سچ کہتی ہیں امی! اگر ہم معمولی سے جہیز کے ساتھ جائیں تو ہماری زندگی دوبھر ہو جاتی جیسے میری جیٹھانی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ان کی شادی کو ساٹھ برس کا عرصہ ہو رہا ہے ان کا معمولی جہیز لانا ان کے لیے عذاب بن کے رہ گیا میری ساس آج بھی اس غریب کو طعنے دیتی رہتی ہیں۔"

"آپ بہت نازک کھیل کھیل گئی ہیں امی!" راحیلہ بولی "اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے گھر بس گئے۔"

"لیکن مجھے اس داؤ کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ..... مجھے پانچ برس تک اپنی ممتا کو کچلنا پڑا..... کیا اس سے بڑی کوئی قیمت ہو سکتی ہے.....؟"

☼ ☼

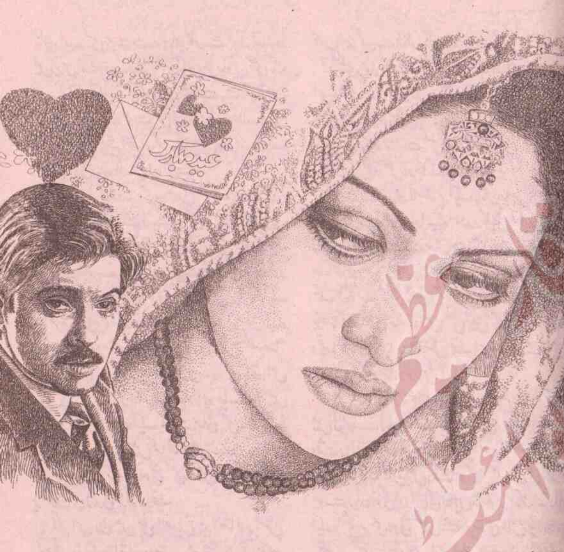

کلائمکس

ایم الیاس

آدمی جانے کیوں ایسی بات سوچنے سے قاصر رہتا ہے شاید اس لیے کہ اسے ایسی بات کا احساس نہیں رہتا ہے اور دماغ معطل ہو جاتا ہے۔

اس شمارے کی ایک حساس و دل گداز سچی کہانی

میرے بچپن کا دوست ونود کمار لندن سے بیس برس بعد لوٹا تو بے پناہ دولت لایا تھا۔ اس نے سری لنکا میں کولمبو شہر کے مضافات نیگمبو میں ساحل سمندر پر ایک نیا جدید ترین ہوٹل تعمیر کیا۔ وہ بھی مچھیرا تھا

لیکن اب کسی بہت بڑے ساہوکار سے کم نہ تھا۔ وہ تین برس کے بعد ممبئی شہر آیا تو پرانی یادیں بھی تازہ کرنے اپنی آبائی بستی اور ہم پیشہ سے ملنے آیا تو اس نے کئی دوستوں کو دعوت تھی کہ وہ اس کے علاقے میں آکر اپنا آبائی پیشہ اختیار کرسکتے ہیں یہاں نہ صرف معقول آمدنی ہے بلکہ سکون بھی ہے۔

میری کوئی اولاد نہ تھی۔ میری شریک حیات بیس برس بعد داغ مفارقت دے گئی تھی۔ چوں کہ میرا دل دنیا سے اچاٹ ہوچکا تھا اس لیے میں سری لنکا چلا گیا۔ وہاں ونود کمار نے مجھے ایک نہایت خوب صورت اور مضبوط جھونپڑی بھی بنا کردی تھی۔ دس برس کا ایک لمبا عرصہ کسی خواب کی طرح بیت گیا۔ گرمیوں کے دنوں میں ہندوستان اور امریکی یورپی سیاح خصوصاً سیاح لڑکیاں اور خواتین آتی تھیں۔ وہ سن باتھ اس لیے لیتی تھیں کہ ان کا رنگ سانولا ہوجائے۔ انہیں اپنی گوری چٹی رنگت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ میں نے وہاں اپنا پیشہ ترک نہیں کیا تھا۔ میں نے دس برسوں میں خاصی رقم جمع کی ہوئی تھی۔ میں تنہائی کی لیکن پرسکون سی زندگی گزار رہا تھا۔

اگر اس دن میں علی الصباح نہ اٹھتا اور بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا شاید وہ سب کچھ پیش نہ آتا جو بعد میں پیش آیا تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ مجھے یا مجھے کسی کو بھی رونما ہونے والے واقعات کا پہلے سے علم نہیں ہوتا۔ اس دن جب میں اٹھا تو سورج اپنی تمام تر تمازت کے ساتھ چمک رہا تھا۔ دور میلوں تک اس مغربی ساحل کے اس حصہ کا موسم بڑا گرم اور مرغوب محسوس ہو رہا تھا۔ ناشتا زہر مار کرنے کے بعد میں اپنی ایئرگن اور غوطہ خوری میں مدد دینے والی دوسری چیزیں مثلاً نقاب۔۔۔ پیروں میں پہننے کے لیے بطخ نما جوتے لے کر ساحل پر پہنچ گیا۔

موسم کا رنگ دیکھ کر مجھے جان لینا چاہیے تھا کہ آج کا دن ایئرگن سے شکار کے لیے موزوں نہیں ہے۔

لیکن چوں کہ مجھے پریشانی میں مبتلا ہونا تھا اس لیے اس وقت میری سمجھ میں یہ معمولی سی بات نہیں آئی۔ آدمی جانے کیوں ایسی بات سوچنے سے قاصر رہتا ہے شاید اس لیے کہ اسے کسی بات کا احساس نہیں رہتا ہے اور دماغ معطل ہوجاتا ہے۔

سمندر میں کچھ فاصلہ پر ایک چٹان باہر نکلی ہوئی تھی۔ میں نے غوطہ مارا نیچے سمندر کا پانی سفید چھوٹی چھوٹی مچھلیوں سے جسے یہاں چندرا یعنی چاند کا روپ کہا جاتا تھا دودھیا معلوم دیتا تھا۔ میں چٹان کے نچلے حصے تک پہنچ گیا۔ لیکن مچھلیوں کا ہجوم کم ہونے کی بجائے بڑھتا گیا۔ ایسی حالت میں کسی بڑی مچھلی یا شارک وغیرہ کا نظر آنا بہت مشکل تھا۔ اس لیے میں اپنی بدنصیبی کو کوستا ہوا واپس آگیا۔

میں کنارے پر پہنچا ہی تھا کہ ایک ہجوم سا نظر آیا۔ میں زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹہ پانی میں رہا تھا اور جس وقت روانہ ہوا تھا اس وقت ساحل تقریباً سنسان اور ویران سا تھا۔ لیکن اس وقت جو بھیڑ تھی ان کی تعداد سو سے زیادہ ہوگی اور ان کی نگاہیں مچھلیاں پکڑنے والی ایک کشتی پر جمی ہوئی تھیں جسے دو مقامی ملاح چلا رہے تھے۔۔۔ کشتی سمندر میں ادھر ادھر گھوم رہی تھی اور ایک ملاح کشتی کے کنارے پر جھکا ہوا تھا۔ وہ پانی والی دوربین کی مدد سے سمندر کے اندر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔۔۔ ہجوم سرگوشیاں کرتے ہوئے کچھ حیران و پریشان نظر آیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی ہے۔۔۔ ہجوم سے قدرے فاصلے پر چند سنہالی مچھیرے کھڑے تھے وہ بھی کھسر پھسر کر رہے تھے۔

میں نے ان کے پاس جا کر پوچھا "آخر معاملہ کیا ہے۔۔۔ لوگ جمع کیوں ہیں؟"

"کولمبو شہر سے آتی ہوئی ایک مس بیگم صاحبہ۔۔۔!" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیا ڈوب گئی۔۔۔؟" میں نے اس سے پھر پوچھا۔ کیا اس کی تلاش کی جا رہی ہے؟"

"نہیں ڈوبی تو نہیں۔۔۔" دوسرے نے جواب دیا۔ "کوئی شے اسے لے گئی ہے؟"

"کیا عمر تھی اس کی۔۔۔؟ کیا وہ سنہالی تھی یا کوئی غیر ملکی سیاح تھی یا گوری چمڑی کی۔۔۔ امریکی یورپی۔۔۔؟"

"اس کی عمر بیس اکیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔۔۔ ہندوستانی تھی۔ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی کشش بھی۔۔۔"

"کیا تم میں سے کسی نے اسے دیکھا تھا کہ اسے کون سی شے لے جا رہی ہے۔۔۔ کوئی لڑکا اور مرد۔۔۔!"

"ہم نے اسے کل ساحل پر تیرتے دیکھا تھا۔۔۔ وہ اپنی آنٹی کے ساتھ آئی ہوئی ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم کہ وہ اپنی آنٹی کے ساتھ آئی ہوئی ہے۔۔۔؟"

"وہ دیکھیے۔۔۔ اس کی آنٹی ایک طرف کھڑی ہوئی اپنی بھانجی کی پراسرار گم شدگی پر پولیس سے بات کر رہی ہے۔ بہت پریشان ہے۔۔۔ اور روتی بھی جا رہی ہے۔۔۔ کل ہوٹل کے ملازم نے ہمیں بتایا تھا جو انہیں مشروبات ساحل پر صرف کر رہا تھا۔"

میرے دل کے کسی کونے میں ایک خیال اور شبہ سا پیدا ہوا کہ کہیں اسے بدمعاش اغوا کر کے نہ لے گئے ہوں۔۔۔؟ یہ کوئی پہلا واقعہ نہ تھا۔۔۔ ہر برس جب سیزن کے وقت سیاح مرد لڑکیاں عورتیں آتی تھیں لڑکیاں عورتیں اغوا ہوجاتی تھیں۔ خصوصاً امریکی یورپی۔۔۔ کیوں کہ وہ بے حجابانہ ساحل پر تیرتی اور نہاتی تھیں ایک عجیب سی بات تھی کہ امریکہ یورپی لڑکیاں عورتیں اپنی رنگت سانولی کرنے ساحل کے کنارے تیز دھوپ میں گھنٹوں بیٹھی رہتی تھیں۔۔۔ جب کہ ایشیا کی لڑکیاں عورتیں گوری رنگت کے لیے جانے میک اپ کے کیا کیا لوازمات استعمال کرتی تھیں۔ ان غیر ملکی سیاح لڑکیوں عورتوں کو اس بات کا کوئی احساس نہیں ہوتا تھا کہ یہ امریکہ یورپ کا کوئی ساحل ہے۔ یہاں کے لوگ گوری رنگت پر جان دیتے ہیں۔ اس لیے ان کا اغوا ہوجانا فطری امر ہوتا تھا۔

جیسا کہ ایک نے مجھے بتایا "وہ علی الصباح سورج طلوع ہونے سے قبل سمندر میں تیر رہی تھی اور تیرتے تیرتے غائب ہوگئی۔"

میرا دوست ہوٹل کا مالک ونود ایک بوڑھی عورت کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ یہ وہی عورت تھی جو پولیس انسپکٹر سے بات کرتے کرتے ونود سے بات کرنے لگی تھی۔ یہ پولیس کیس اس لیے نہیں بنتا تھا کہ لڑکی اپنی خالہ سے کہہ کر نکلی تھی کہ وہ نہانے سمندر میں جا رہی ہے۔

ونود اس عورت سے کہیں پریشان اور ہراساں تھا۔ میں نے اندازہ لگالیا کہ اسے کیا پریشانی لاحق ہے۔ اس طرح کا حادثہ ہوٹل کے بزنس کو تباہ کرسکتا تھا۔ لوگ یہاں سمندر میں تیرتے اور تفریح اور وقت گزاری کے لیے آتے تھے۔۔۔ یہ شہر اور ساحل سمندر نہایت ہی خوب صورت تھا۔ کولمبو شہر کے مقابلے میں نہایت پرسکون تھا اور اس کی بڑی شہرت تھی۔۔۔ اگر یہ بات پھیل جائے کہ یہ ساحل خطرناک ہے تو پھر کوئی سیاح ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔" گزشتہ دو ماہ میں یہ دوسری عورت تھی۔ وہ سابقہ واقعہ ابھی تازہ تھا۔

میرا قیاس یہ تھا کہ غالباً کوئی شارک اس علاقے میں آگئی تھی اگر ایسی بات تھی تو صرف آہنی جال لگا کر ہی روکا جاسکتا تھا۔ شارک کا اندیشہ اس لیے تھا کہ یہاں سمندر تھا۔ سمندر میں اس کا آنا ناقابل فہم نہ تھا۔

ماہی گیر کی کشتی مزید کچھ دیر کی تلاش اور چپہ چپہ چھاننے کے بعد ناکام واپس آگئی تھی۔ ساحل پر جمع لوگ ایک ایک دو دو کر کے واپس جانے لگے۔ جو شے بھی اس لڑکی کی پراسرار گم شدگی کی ذمہ دار تھی وہ اسے سالم ہی لے گئی تھی۔ کیوں کہ تلاش کرنے والوں کو کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا تھا۔

میں بھی اپنی جھونپڑی میں واپس آگیا۔۔۔ لیکن مجھے آئے دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ ہوٹل کا ایک

ویٹراندر آیا۔
"آپ کو مسٹر ونود بلا رہے ہیں۔۔۔ ابھی اور اسی وقت۔" وہ بولا۔
میں خوامخواہ کوئی پریشانی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ دل میں آیا کہ صاف انکار کردوں۔۔۔ مگر ونود میرا دوست تھا۔ اس لیے مروت آڑے آگئی۔
"اچھی بات ہے۔۔۔ میں آرہا ہوں۔" میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔
میں پتلون اور قمیص پہن کر ویٹر کے ساتھ گولڈن ہوٹل کی طرف چل دیا۔ ونود اپنے دفتر میں بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہاں دو پنکھے لگے ہونے کے باوجود گرمی اور حبس میں کوئی کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بے قراری کے ساتھ ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر میری طرف بڑھا۔
"امرناتھ یار۔۔۔! صبح صبح ایک افسوسناک واقعہ پیش آگیا ہے۔" اس نے تشویش سے کہا۔
"ہاں۔۔۔ میں جانتا ہوں میرے علم میں بھی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "کیا تم نے اس لیے فوراً بلایا ہے؟"
"ہاں۔۔۔" وہ افسردگی سے بولا "اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔"
"جو کچھ کرنا ہے وہ بھی تمہیں دو ماہ پہلے ہی بتا چکا ہوں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "لیکن تم نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔"
"تم جال لگانے کی بات کر رہے ہو نا۔۔۔ مگر جانتے ہو کہ ایک جال لگانے میں کتنا خرچ آئے گا۔۔۔؟ مجھے ہوٹل میں رنگ و روغن کرائے۔۔۔ فرنیچر اور سازو سامان خریدے چھ ماہ ہی تو ہوئے ہیں۔۔۔ نئی حکومت کیا آئی اس نے ٹیکس بھی بڑھا دیا ہے۔۔۔ اس کے علاوہ آمدنی کا چوتھائی حصہ بلڈنگ سوسائٹی کو بھی دینا پڑتا ہے۔ تم تمام باتوں سے واقف ہو۔۔۔ میں مقروض ہو چکا ہوں۔ جب تک میرا قرض ادا نہیں ہو جاتا میں کوئی اضافی خرچ کرنے سے قاصر ہوں۔۔۔ مجھے گزارا کرنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔"

اس کی بات بالکل درست تھی۔ ہوٹل کو جدید ترین بنانے کے لیے اس نے بڑا سرمایہ لگا دیا تھا۔۔۔ کیوں کہ ساحل سے باہر اور بھی ہوٹل تھے۔ ہوٹل کے اخراجات اور ملازمین کی تن خواہیں اور بونس دینے کے لیے اسے بینک سے رقم لینا پڑی تھی اور پھر ادائیگی کی شرط بھی یہی ٹھہری تھی کہ جب تک قرض ادا نہ ہو جائے۔ ہوٹل کی تین چوتھائی آمدنی اس مد میں دیتا رہے گا۔
چناں چہ یہ مدت اس کے لیے ڈوبنے یا پار لگنے کی جیسی اہمیت رکھتی تھی۔ غالباً یہی اس کی پریشانی کی وجہ بھی تھی۔ اگر اس وقت اس کے گاہک لوٹ جاتے تو اس کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہ رہ جاتی۔ وہ چاروں طرف سے مصیبت کے گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔
پہلے مجھے اس بات کا احساس نہ ہوا تھا کہ لڑکی کی پراسرار گم شدگی ونود کے لیے کتنی خطرناک ہو سکتی ہے۔ اب اس کی باتوں سے اندازہ ہوا تو میں بھی پریشان ہو گیا۔۔۔ ونود نہ صرف بچپن کا بلکہ بہت اچھا اور مخلص بھی تھا۔ ایک سال پہلے مجھے پاسپورٹ کے کھو جانے کے باعث ڈی پورٹ کیا جا رہا تھا اور مجھ پر آوارہ گردی اور ایک عورت سے شادی کر کے فراڈ دینے کا بھی الزام تھا۔ میرے ایک دشمن کی بدمعاشی تھی۔ اس نے نہ صرف اثر و رسوخ سے بلکہ بھاری جرمانہ ادا کر کے میری گلو خلاصی کرائی تھی اور یہ اس کوشش کا نتیجہ تھا کہ یہ جھونپڑی کی زمین اور شہریت مجھے مل گئی تھی اور اب یہ جھونپڑی اور زمین میری ملکیت تھے۔
"مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ حادثہ کس طرح رونما ہوا۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔
"تفصیل کچھ زیادہ نہیں ہے۔" ونود نے جواب دیا۔ "مسز ریٹا چرن اپنی نوجوان بھانجی کے ساتھ میرے ہوٹل میں مقیم ہیں۔۔۔ ساحل پر جہاں لباس تبدیل کرنے کے لیے کمرے بنے ہوئے ہیں علی الصباح مسز ریٹا کرسی ڈالے ان کمروں کے باہر کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔۔۔ اور ان کی بھانجی جو واقعی بہت حسین لڑکی تھی سامنے سمندر میں تیر رہی تھی۔۔۔ دو منٹ کے بعد

جب پڑھتے پڑھتے اچانک نظر اٹھا کے دیکھا تو لڑکی غائب تھی۔۔۔ تمہارے خیال میں کیا واقعی اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہو گا۔۔۔؟"
"کیا وہ چٹانوں کے قریب تیر اور نہا رہی تھی۔۔۔؟" ساحل پر ہی تھی شاید وہ ڈوب گئی ہو" پھر اس نے اپنا خیال ظاہر کیا "مدد کے لیے کسی کو پکارے بغیر ہی۔۔۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر اور ناقابل فہم ہے۔"
"اگر وہ چٹانوں کے قریب کہیں تھی تو پھر کسی آکٹوپس کا شکار تو نہیں ہو سکتی تھی۔" میں سر کھجاتے ہوئے بولا "غالباً" کوئی شارک جیو فش اسے نگل گئی ہو۔"
"یہ جیو فش کیا ہوتی ہے؟"
ایک بہت بڑی اور خوفناک مچھلی۔" میں نے بتایا "جب یہ سانس اپنے اندر کھینچتی ہے تو اس کی سانس میں اتنی طاقت ہوتی اس کی سانس کی زد میں آنے والی قرب و جوار کی ہر شے اس کے منہ میں پہنچ جاتی ہے۔۔۔ خاص طور سے سبز رنگ کی جیو فش زیادہ خطرناک ہوتی ہے اور یہ با آسانی ایک پورے انسان کو نگل سکتی ہے۔"
"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یقیناً" کوئی جیو فش اس ساحل پر آگئی ہے۔" ونود نے ہراساں اور پریشان ہو کر کہا۔ "یہ ایک سنگین مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔۔۔ کبھی اس کا ذکر آیا اور نہ جیو فش آئی۔ دس برسوں سے یہاں ہوں۔"
"لیکن۔۔۔ لیکن عام طور پر جیو فش ایسے ساحلوں کا رخ نہیں کرتیں جو انسان کے استعمال میں رہتا ہو۔"
"لیکن میرا خیال ہے کہ وہ کوئی جیو فش ہی ہے۔" ونود نے اپنا چشمہ ناک پر درست کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یاد نہیں کہ پچھلے مہینے ایک لڑکا اس طرح غائب ہو چکا ہے۔۔۔ دونوں حادثوں میں بے حد مماثلت ہے۔ بہرحال وہ کوئی جیو فش ہو یا شارک کچھ نہ کچھ ہے ضرور اور میں چاہتا ہوں کہ تم اسے زندہ یا مردہ پکڑ کر باہر نکال دو۔"
"اگر تمہارا اس سے اطمینان ہو سکتا ہے تو کل میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "تم خوف زدہ اور پریشان نہ ہو۔ وہ میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتی۔"
"کل نہیں آج۔۔۔" وہ جلدی سے تکرار کرتے ہوئے بولا۔ "بلکہ ابھی۔۔۔ تم سمجھے نہیں۔۔۔ اپنے گاہکوں کو مطمئن کرنے کے لیے میرا کچھ نہ کچھ کرنا اشد ضروری ہے۔۔۔ کل تک بہت تاخیر ہو جائے گی اور کوئی تعجب نہیں کہ وہ ہوٹل بدلنا شروع ہو جائیں۔۔۔ تم جانتے ہو کہ یہ سیزن ہے۔ جان، ہمیں دو تین ماہ اتنی غیر ملکی کرنسی گاہکوں سے مل جاتی ہے کہ تمام اخراجات نکل آتے ہیں۔ یہ ڈالر، پونڈ اور مارک ہیروں کی مالیت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔۔۔ حکومت بھی ٹیکس میں پچیس فیصد رعایت دیتی ہے۔"
"تب تم جلدی سے جاؤ اور ان کے بل بناؤ۔" میں نے بے اعتنائی سے کہا۔ "میں آج بہرحال غوطہ خوری کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہوں۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے پانی میں گیا تھا اور پانی اتنا گدلا ہو رہا تھا کہ میں اپنی اسپر گن میں لگے ہوئے تیر کی نوک بھی دیکھنے سے قاصر تھا۔۔۔ تم جو کچھ چاہتے ہو وہ صاف پانی میں بھی مشکل کام ہے۔ میں کوئی فوق الفطرت آدمی نہیں ہوں۔۔۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ایک معمولی شکاری ہوں جو اپنی اسپر گن سے مچھلیوں کو شکار کر کے ان کی آمدنی پر گزر اوقات کر رہا ہے۔۔۔ تم نے وہ مچھلیاں بھی دیکھی ہیں جو میں شکار کرتا ہوں اور تمہارے ہوٹل بھی سپلائی کرتا ہوں۔ وہ زیادہ سے زیادہ دس پونڈ کی ہوتی ہیں۔۔۔ کبھی کبھی اتفاق اور خوش قسمتی سے ساٹھ ستر پونڈ کی مچھلی بھی ہاتھ لگ جاتی ہے۔ لیکن اسے شکار کرنے میں جو محنت کرنی پڑتی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔"
"بیکار باتیں مت کرو۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔ "وہ جو تم نے بارہ فٹ کی شارک ماری تھی۔۔۔؟ کیا بھول گئے؟"
"وہ بات دوسری تھی۔۔۔" اس نے جواب دیا "تم جانتے ہو اور تمہیں بتا بھی چکا ہوں کہ مجھے اپنی جان

بچانے کے لیے اسے مارنا پڑا... وہ میری زندگی اور موت کا مسئلہ تھا... میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔"

"اور یہ بھی موت اور زندگی کا مسئلہ ہے۔" ونود نے بے چارگی سے کہا۔ "میں تمہیں مقامی کرنسی نہیں بلکہ امریکی پچاس ڈالر دوں گا۔"

"مجھے نہ تو تمہاری مقامی کرنسی اور امریکی ڈالر کی ضرورت ہے ونود... میں کہہ چکا ہوں۔"

ونود نے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ وہ تیزی سے اپنی میز کی طرف تیزی سے بڑھا۔ دراز کھول کے چیک بک نکالی۔ ایک چیک کاٹ کر میری طرف بڑھایا۔

"سو ڈالر..." وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ امریکی سو ڈالر میرے لیے کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔

"تم مذاق کر رہے ہو...؟" میں نے کہا۔ اس نے چیک سلپ میری طرف بڑھا دی۔ "میرا غیر ملکی کرنسی اکاؤنٹ امریکن ایکسپرس بھی ہے۔ میں نے چیک سلپ کی طرف دیکھا اور اس کی طرف... میں نے اس کے ہاتھ سے چیک لے کر اس کے پرزے پرزے کر دیے اور ایک گہری سانس لے کر کہا۔"

"اگر تم اس قدر پریشان اور ہراساں ہو تو میں تیار ہوں۔ آخر تمہارا دوست تو ہوں ونود...!"

ونود نے فرش پر بکھرے ہوئے چیک کے پرزے دیکھے تو اس کے چہرے پر بشاشت کی سرخی دوڑ گئی۔

"امرناتھ...!" اس نے میرا بازو تھام کر پر جوش لہجے میں بولا۔ "واقعی تم سچے اور مخلص دوست ہو۔"

✡ ✡ ✡

بیس منٹ کے بعد میں سمندر کے پانی میں کھڑا ہوا تھا اور میرے ہاتھ میں فولادی بھالا تھا اور شارک کو پکڑنے والی مضبوط رسی بھی تھی۔ جس کا ایک سرا بھالے کے آخری حصے سے بندھا ہوا تھا اور دوسرا سرا ساحل پر پام کے درخت سے باندھ دیا گیا تھا۔

ونود لباس تبدیل کرنے کے کمروں کے سامنے جنگلے پر جھکا ہوا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ نظر آیا تھا۔ اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے گرم جوشی سے ہاتھ ہلایا۔ میں نے مسکراتے ہوئے غوطہ خوری کا نقاب اوڑھا اور تیرنے لگا۔

جیسے جیسے میں آگے بڑھتا جا رہا تھا اس کا لچھا کھولتا جا رہا تھا... خلیج کے تقریباً" وسط میں پہنچ کر میں نے ایک گہری سانس لی اور پانی میں غوطہ مارا۔ میں تقریباً" تیس فٹ گہرائی میں اترتا چلا گیا۔ تہہ میں اونچی اونچی چٹانوں کے اوپر تیرتے ہوئے میں نے گدلے پانی میں چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ چند مچھلیاں ادھر ادھر تیر رہی تھیں جنھوں نے میری موجودگی کی چنداں پروا نہیں کی... اچانک مجھے ایک بڑی سی چٹان نظر آئی جس میں ایک خاصے بڑے غار کا دہانہ نظر آیا تھا۔ یہ جگہ بلاشبہ ایسی تھی جہاں کوئی بڑی مچھلی اپنا ٹھکانہ بنا سکتی تھی۔

میں سانس لینے کے لیے پانی کی سطح پر ابھرا۔ چند لمحے آرام کیا اور پھر ایک گہری سانس لے کر غوطہ لگایا۔ اس مرتبہ میں نے اس غار میں گھسنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ نیم تاریکی میں اپنے فولادی بھالے سے راستہ ٹٹولتا ہوا غار کے اندر داخل ہوا۔ میں کچھ دور گیا تھا کہ پانی میں ہل چل سی پیدا ہوئی اور کوئی سیاہ چپٹا جسم خوف زدہ انداز سے میرے قریب سے نکلا۔ میرے دل کی دھڑکن جیسے ایک لمحے کے لیے رک سی گئی۔

آکٹوپس...؟

میں نے دل میں سوچا لیکن جب وہ چیز دور چلی گئی تو میں نے دیکھا کہ وہ محض ایک گرو پر مچھلی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں بھگوان کا شکر ادا کیا۔ اس گڑبڑ میں میری سانس گھٹنے لگی تھی۔ میں تیزی سے پھر ابھرا۔ لیکن پھر بھی سطح تک پہنچتے پہنچتے کچھ پانی میری سانس کی نالی میں چلا گیا۔

میں سطح پر آ کر دیر تک کھانستا رہا... آخر جب قدرے سکون ہوا تو میں نے ایک بار پھر پھیپھڑوں میں ہوا بھری اور سمندر کی تہہ میں چلا گیا۔

غار میں جس حد تک نظر کام کر سکتی تھی میں نے دیکھی مگر کوئی شے دکھائی نہیں دی... اس کے بعد میں نے کئی مرتبہ غوطے مارے... خلیج کے ایک سرے سے دوسرے کنارے تک دیکھا مگر کوئی شارک نظر نہیں آئی... حیرت کی بات اس لیے تھی کہ جب شکاری جانور کو ایک بار انسانی خون لگ جائے تو وہ چپ نہیں بیٹھتا... کیوں کہ انسانی خون کی مہک، لذت اور ذائقہ کسی اور کے خون میں نہیں ہوتا ہے۔

آخر تھک کر میں رسی لپیٹتا ہوا پانی سے باہر نکل آیا۔ اس وقت تک ہوٹل کے دس بارہ گاھک کنارے پر کھڑے میری جدوجہد دیکھ رہے تھے۔ ان میں سفید فام خواتین بھی تھیں۔ ان میں ونود بھی موجود تھا۔ مجھے پانی سے باہر آتا دیکھ کر وہ جلدی سے میری طرف لپکا۔

"مجھے تو کوئی چیز ہی نہیں ملی...؟" اس کے میرے پاس پہنچنے سے قبل ہی میں نے دور ہی سے پکار کر کہا۔

"لیکن تم نے ابھی ہر جگہ تلاش کہاں کیا ہے؟" ونود نے مجھ سے زیادہ اونچی آواز میں کہا۔

"یہ تم نے کیسے کہہ دیا... میں نے کوئی مقام نہیں چھوڑا؟" میں نے جواب دیا۔

"نہیں..." وہ تقریباً" چیخ رہا تھا۔ میں نے خود دیکھا اور محسوس کیا ہے کہ کئی جگہیں رہ گئی ہیں... میرا خیال ہے کہ اب تم تھک گئے ہو... اس لیے تھوڑی دیر آرام کر لو۔ لنچ کے بعد دوبارہ تلاش کرنا؟" پھر اس نے میرے قریب آ کر میرے بازو میں ہاتھ ڈالا اور ساتھ ساتھ چلتے اس نے سرگوشی کی۔

"مجھے ان لوگوں کو سنانے کے لیے کہنا پڑ رہا ہے۔ تم کچھ خیال مت کرنا میری بات کا۔"

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ہونٹ ہلا دیے جیسے اس کی بات کا جواب دے رہا ہوں۔ پھر اس نے قدرے توقف کے بعد کہا تو اس کی آواز اونچی تھی۔

"بہت خوب تو تم دوپہر کے بعد دوبارہ دیکھو گے... بڑی اچھی بات ہے ویل ڈن۔"

میں نے خاموشی سے پام کے درخت کی رسی کھولی اور اپنی جھونپڑی کی طرف چل دیا۔ ونود بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"ناراض مت ہو امرناتھ...!" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "مجھے اپنے گاہکوں کو مطمئن کرنا ہے... ہم ان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ سمندر میں کوئی چیز نہیں ہے۔ اس سے اس صورت حال پر کوئی اثر نہیں پڑے گا... تمہیں ان کے اطمینان کے لیے کچھ نہ کچھ دکھانا ہی ہو گا... کیا تمہیں یقین ہے کہ تہ میں بھی کوئی خطرناک مچھلی نہیں ہے؟"

"مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ میرے بھگوان اب ہم کیا کریں گے؟ میری بات سنو امرناتھ...!"

"نہیں..." میں نے درمیان میں تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "میری بات کا یقین کرو۔"

"کیا...؟" وہ چونک گیا اور اس کے چہرے پر ناگواری سی آگئی۔

"میں نے کہا تھا کہ میں کچھ سننا نہیں چاہتا... تم نے جو کہا تھا وہ میں نے کر دیا۔ میں اب اپنی جھونپڑی میں جا کر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"امرناتھ...! یہ تم بے مروتی کی بات کیوں کر رہے؟" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو؟" میں اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ "اس لیے کہ آج میرا موڈ بہت خراب ہے... ممکن ہے موسم کا یا بے خوابی کا اور دوسری بات یہ ہے کہ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔"

"مجھے مایوس مت کرو امرناتھ...!" ونود نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر کوئی اور جانور ہوتا تو میں تم سے اصرار نہ کرتا... تم جانتے ہو کہ میں نے بچپن ہی سے تیرنا موقوف کر دیا تھا۔ اگر تیرنا آتا ہوتا تو تم سے اصرار نہ کرتا... میں خود ہی کچھ نہ کچھ کر لیتا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "تم ابھی کیا کہہ رہے تھے...؟" میں نے پوچھا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر خلیج میں کوئی شے نہیں

ہے تو تو کیا ہم دور سے کوئی اور چیز پکڑ کے خلیج میں نہیں لاسکتے۔ کوئی اتنی بڑی چیز جو ایک اتنی بڑی جوان لڑکی کو کھا سکتی ہو۔ اسے سمندر کے اندر اندر کہیں سے گھسیٹ کے لے آئیں اور پھر یہاں سب کے سامنے اسے پانی سے نکال لیں۔ میں نے اوپر سے نیچے تک گھور کے دیکھا۔ میری ہنسی نہ رکی تو میں بے اختیار ہنسنے لگا۔

"تم واقعی بہت پریشان معلوم ہوتے ہو....؟" میں نے ہنسی روک کر کہا۔ "کیا دور کی کوڑی لائے ہو.... لیکن یہ تو بتاؤ کہ اتنی بڑی مچھلی میں لاؤں کہاں سے....؟"

"یہ میں نہیں جانتا.... تمہیں ضرور ایسی کوئی جگہ معلوم ہوگی.... آخر تم مچھلی کا شکار جانے کہاں کہاں جا کر کرتے رہتے ہو....؟ کیا تم کوئی جیوفش پکڑ کر نہیں لا سکتے ہو....؟"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے معلوم تھا کہ جیوفش کہاں سے لا سکتا ہوں.... میں جانتا تھا کہ ایک بیل سے بھی زیادہ لمبی چوڑی جیوفش کہاں ہے۔ عام طور پر اس علاقہ میں جیوفش نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن اپنے شکار کے دوران ساحل سے تقریباً" ایک میل کے فاصلے پر میں نے ایک ڈوبی موٹر لانچ کے اندر ایک جیوفش کو قیام پذیر دیکھا تھا۔ لیکن میں کشتی کے بغیر غوطہ خوری کرکے مچھلیاں مارتا تھا۔ لیکن اتنی بڑی مچھلی اس طرح شکار نہیں کی جاتی.... اگر کوشش بھی کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھوں اور اسے شکار کرتے کرتے خود شکار ہو جاؤں۔

جب میں نے ونود کو اس جیوفش کے بارے میں بتایا تو وہ کہنے لگا۔

"ہم اسے کسی ایڈونچر ڈراما کی طرح اسٹیج کریں گے.... میں ہوٹل کے تمام مہمانوں کو یہ زبردست سنسنی خیز اور انوکھا ڈراما دیکھنے کے لیے مدعو کروں گا.... تم اپنا نیزہ لے کر سمندر میں غوطہ مارو گے اور نیزہ اس کے جسم کے آرپار کردو گے.... پھر ہم تمہیں اور مچھلی کو اوپر کھینچ لائیں گے.... پھر ہر فرد مطمئن ہو جائے گا کہ اس خونی بلا کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ آزادی سے نہانے اور تیرنے میں کوئی خوف اور اندیشہ نہیں رہا اور پھر لوگ تمہیں ہیرو خیال کریں گے۔ یہ یورپی لڑکیاں عورتیں بڑی قدر کرتی ہیں ایسے ایڈونچر ہیرو کی.... وہ تمہیں جیمز بانڈ سمجھ کر دل میں بٹھالیں گی اور مہربان ہو جائیں گی۔"

"لیکن فرض کرو کہ لوگوں نے اس کا پیٹ چاک کر کے دیکھا اور انہیں لاش اور لاش کی باقیات نہیں ملیں تب....؟" میں نے اعتراض کیا۔ "ذرا اس رخ پر بھی غور کرو۔"

ونود صرف چند لمحہ خاموش اور کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"ہم لوگوں کو اتنا موقع ہی نہیں دیں گے.... اس سے پہلے کہ کسی کے دماغ میں یہ خیال آئے اسے کہیں دور پھینکوا دیں گے۔ میں مانتا ہوں کہ اس میں تھوڑا بہت خطرہ ہے۔ مگر یہ عین ممکن ہے کہ ہماری یہ ترکیب کام آجائے۔"

اس وقت تک ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میری جھونپڑی تک پہنچ گئے تھے۔ وہ میرے پیچھے اندر چلا آیا۔ وہ بدستور میری خوشامد درامد میں لگا ہوا تھا۔ منت سماجت بھی کرنے لگا گڑگڑایا.... ظاہر ہے اس کا یہ رویہ اور انکساری اس لیے تھی کہ اس کا ہوٹل اور کاروبار نہ بیٹھ جائے۔ یہ سیزن تھا آمدنی کا سنہرا موقع تھا اس نے ہر قسم کی دلیل اور مجھے ہر طرح کی سہولت فراہم کرنے کا وعدہ کیا.... اس نے کہا کہ میں چاہوں تو وہ مجھے ہوٹل کی جدید ترین اور تیز رفتار موٹر بوٹ دے سکتا ہے.... مددگار کی ضرورت ہو تو اس کے ہوٹل کے عملے سے جتنے آدمی چاہوں اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ونود سے گفتگو کے دوران میں متواتر سوچے جارہا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ جیوفش اس وقت سے میرے اعصاب پر مسلط تھی۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اور یہ کئی ماہ پہلے کی بات تھی۔ تب ہی سے میں

اسے شکار کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرتا رہا۔ یہ جیوفش چھ فٹ سے بھی زیادہ لمبی تھی اور سو پونڈ سے بھی کہیں زیادہ بھاری تھی۔

اگر میرے پاس موٹر بوٹ ہوتی تو میں اسے بہت پہلے ہی مار چکا ہوتا۔

اب جو ونود نے ہوٹل کی موٹر لانچ دینے کا وعدہ کیا تو مجھے خیال آیا کہ یہ ایک ایسا سنہرا موقع ہے جسے مجھے ضائع کرنا نہیں چاہیے۔ بظاہر میں نے اپنا رویہ اس طرح کا رکھا جیسے مجھے اس کام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور جیسے آخرکار میں محض ونود کے خیال سے اس جیوفش کو شکار کرنے پر آمادہ ہو گیا ہوں۔ میں نے اسے کوئی نصف گھنٹے تک الجھائے رکھا اور پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنی رضامندی ظاہر کردی۔

☼ ☼ ☼

کچھ دیر بعد میں سمندر میں ڈوبی ہوئی لانچ تک پہنچ گیا۔

یہ مقام اگرچہ ہوٹل سے ایک میل کے فاصلے پر تھا مگر کنارے سے ایک ڈیڑھ فرلانگ سے زیادہ دور نہ رہا ہوگا۔ میرے ساتھ موٹر لانچ پر ہوٹل کے تین افراد تھے۔ ایک بوڑھا ملازم جو لباس تبدیل کرنے والے کمروں پر متعین رہتا تھا اور دونوں جوان لڑکے جو موٹر لانچ چلا رہے تھے۔ میں نے اپنے فولادی نیزے کا معائنہ کیا اور اس بات کا اطمینان کرلیا کہ ضرورت کے وقت کسی رکاوٹ کے بغیر اپنا کام کر سکتا ہے۔ نیزے کے ساتھ تقریباً" دو سو فٹ مضبوط رسی تھی جس کا دوسرا سرا لانچ کی ایک سیٹ کے لوہے کے فریم سے بندھا ہوا تھا۔ میں نے لڑکوں کو ہدایت کی کہ وہ لانچ کا انجن بند کردیں کیوں کہ بڑی مچھلیاں دوپہر کے وقت آرام کرنے اور سونے کی عادی ہوتی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اگر ہم خاموشی اور احتیاط کے ساتھ آگے بڑھیں تو عین ممکن ہے کہ جیوفش کو ڈوبی ہوئی لانچ کے ڈیک پر آرام سے لیٹا ہوا پائیں اور اسے آسانی سے شکار کرلیں۔

میں نے ایک سیٹ کا کشن اٹھا کر اس کے نیچے اس جگہ رکھ دیا تھا جہاں وہ لانچ کے کنارے سے رگڑ کھا رہی تھی اور لڑکوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ رسی کشتی پر ہی رہے تاکہ جب جیوفش نیزہ کھا کر بھاگے اور رسی تیزی سے اس کے اس کے ساتھ چلے تو وہ لانچ کے کنارے سے رگڑ کھا کر کمزور نہ ہو جائے۔

پھر میں نے انہیں کچھ اشارات سمجھائے اور بتایا کہ کس اشارے پر انہیں کیا کرنا ہے۔ لڑکے کچھ خوف زدہ سے نظر آرہے تھے اور بوڑھا ملازم اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے برابر ناس سونگھ رہا تھا اور چھینکیں مار رہا تھا۔

ڈوبی ہوئی لانچ سے پچاس فٹ کے فاصلہ پر رک کر میں نے پانی میں جھانکا اور دیکھا۔ مگر میں پھر بھی تہ تک نہ دیکھ سکتا تھا۔ میں نے غوطہ مارا اور لانچ کے قسول تک بڑھتا چلا گیا۔ لانچ کا ڈھانچہ میرے نیچے تھا لیکن جیوفش تو در کنار اس کا سایہ بھی کہیں نظر نہیں آیا میں نے اپنے کان کسی بھی آہٹ سننے پر لگائے مگر کوئی آواز سنائی نہیں دی میں سطح پر ابھرا۔ دوبارہ پھیپھڑوں میں ہوا بھری اور پھر نیچے چلا۔ میں اس درجہ محتاط تھا کہ میری پوری کوشش تھی کہ پانی میں میری کسی حرکت سے ارتعاش پیدا نہ ہو جو مچھلی کو ہوشیار کردے لانچ پر پہنچ کر میں نے چاروں طرف دیکھا اور اپنے آپ کو اس خوف و دہشت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنے لگا جو اس دیوہیکل مچھلی کو دیکھ کے غیرارادی طور پر غیر محسوس کرنے والا تھا۔ ہر جگہ دیکھتا ہوا میں لانچ کے عقبی ترشہ پر آیا جہاں میں نے پہلی جیوفش کو آرام کرتے دیکھا تھا۔ لیکن وہ آج کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

میں سطح پر ابھرا۔ سانس درست کی اور پھیپھڑوں میں دوبارہ ہوا بھرتے ہوئے غوطہ لگایا۔ اس طرح میں تقریباً" چھ مرتبہ اوپر آیا اور نیچے گیا۔ ہر بار تھوڑا تھوڑا کرکے میں نے پوری لانچ کا جائزہ لیا۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ دو ہی باتیں ممکن تھیں.... یا تو وہ لانچ

کے اندر چھپی بیٹھی ہوئی تھی یا پھر کہیں چلی گئی تھی اور دونوں میں سے کون سی بات درست ہے یہ جاننے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا... میں خوب گہری سانس لیتے ہوئے ایک اور غوطہ مارا اور غار نما گڑھے کے دہانے پر جا کھڑا ہوا جو لانچ میں بن گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں فولادی نیزہ حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ چند لمحے گزر گئے تھے۔ کچھ نہ ہوا۔

پھر میں نے کچھ سوچ کر نیزے سے غار کے دہانے پر ضرب لگائی اور کسی ردعمل کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک میں نے کچھ محسوس کیا۔ یوں لگا جیسے کوئی شے میرے بہت ہی قریب ہو پلٹ کر دیکھا اور میرے اوسان خطا ہوتے ہوئے بچے... جیوفش کچھ ہی فاصلے پر اپنا غار منہ کھولے میری جانب بڑھ رہی تھی۔

اس نے سانس کھینچی اور میں اس کی جانب کھنچتا چلا گیا جیسے کوئی لوہے کا ٹکڑا طاقت ور مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ چند ثانیہ کے اندر میں ثابت و سالم اس کے پیٹ میں پہنچ سکتا تھا، لیکن میں نے اپنے اوسان بحال کیے رکھے۔ فولادی نیزے والا ہاتھ آگے بڑھایا اور نیزے کو سیدھا پکڑنے کی بجائے اسے کھڑی پوزیشن میں کر دیا۔

دوسرے لمحہ میرا نیزہ اس کے منہ کے اندر کسی ستون کی مانند کھڑا ہوا تھا۔ جیوفش نے اپنا منہ بند کیا اور نیزہ دونوں جانب سے اس کے جبڑوں میں گھستا چلا گیا۔ پھر یوں معلوم ہوا کہ جیسے سمندر میں طوفان آگیا ہو۔ میں اس کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے جتنی تیزی سے ممکن تھا سطح پر آیا اور اپنے آدمیوں کو رسی کھینچنے کا اشارہ کیا پھر خود بھی تیرتے ہوئے موٹر بوٹ پر چڑھ گیا اور اپنے ساتھیوں کی مدد کرنے کے خیال سے رسی پکڑ لی۔ مگر مجھے حیرت ہوئی کہ اس کی دوسری جانب قطعی کسی قسم کی مزاحمت محسوس نہیں ہو رہی تھی رسی بڑی آسانی سے کھنچی چلی آ رہی تھی۔ مایوسی سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ نیزہ مچھلی کے منہ سے نکل گیا ہے میں نے اپنے آپ کو کوستے ہوئے رسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس لعنتی جیوفش نے یقیناً نیزہ اگل دیا تھا۔ میں نے مایوسی اور جھنجھلاہٹ میں غوطہ خوری کا اپنا نقاب اتار کر عرشہ پر پٹخ دیا۔ میرے ساتھی رسی کھینچ رہے تھے۔ دفعتاً میں نے ان کے منہ سے کلمہ حیرت بلند ہوتے سنا اور تیزی سے پلٹ کر دیکھا تو سمندر کی سطح پر ایک بھاری بھرکم جسم ابھر رہا تھا۔ یہ جیوفش تھی جو مر چکی تھی۔

وہ الٹ گئی تھی اور فولادی نیزہ بدستور اس کے کھلے ہوئے منہ میں گڑا ہوا تھا۔ جب نعرہائے تحسین و مسرت کچھ کم ہوئے تو میں نے اسے سیدھا کیا اور اس وقت دیکھا کہ اس کی فوری موت کا سبب کیا تھا۔ نیزہ ایک جانب گیا تھا نیزہ ایک جانب سے اس کے حلق کو چیرتا ہوا دماغ میں اتر گیا تھا اور دوسری جانب گردن سے باہر نکل آیا تھا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی... مچھلی واقعی دیوہیکل تھی۔ تقریباً سات فٹ لمبی اور چار سو پونڈ وزنی۔

ہوٹل سے کچھ دور پہلے ہی میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ موٹر بوٹ کو واپس بوٹ ہاؤس لے جائیں اور خود رسی پکڑ کے سمندر میں کود گیا۔ اتنی بڑی مچھلی کو تنہا پانی کے اندر کھینچنا کوئی آسان کام نہیں تھا مگر میں کسی نہ کسی طرح سے اسے خلیج میں لے آیا۔ یہ لنچ ٹائم تھا اور چوں کہ ہوٹل کے تمام مہمان اس وقت ڈائننگ ہال میں کھانا کھا رہے تھے۔ اس لیے ساحل پر کوئی ایک فرد بھی نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے ایک گہرا غوطہ لگایا اور سمندر کی تہ میں پہنچ کر رسی کو ایک بڑی سی چٹان کے گرد باندھ دیا تھا کہ جیوفش پانی میں رہے اور اوپر سے دیکھنے والوں کو نظر نہ آئے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں کچھ خجل اور پشیمان سا سمندر سے باہر نکلا شاید پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا تھا کہ ہم کس طرح ہوٹل کے مہمانوں کو بے وقوف بنانے کا ارادہ کر رہے ہیں اور یہ بات مجھے کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اگر اس صبح وہ لڑکی کسی شارک مچھلی کا شکار نہ ہو گئی ہوتی یہ ایک دلچسپ مذاق ہوتا... لیکن اس کی موت اور اس خیال نے ہم مہمانوں کو

سمندر کے محفوظ ہونے کا فریب دے رہے ہیں اس کی تمام دلچسپی ختم کر دی تھی۔

میں نے اپنی جھونپڑی میں جا کر لباس تبدیل کیا۔ پھر ہوٹل جا کر ونود سے ملاقات کی۔ وہ اس وقت کھانا کھا رہا تھا مگر میری صورت دیکھتے ہی کھانا چھوڑ کر میز سے کھڑا ہو گیا۔ وہ اتنی اضطراب آمیز عجلت میں میری طرف لپکا کہ گریبان سے نیپکن نکالنا بھی بھول گیا۔ میرا بازو پکڑ کے ایک الگ گوشے میں تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے گیا۔

"کہو... یار! کیسا رہا...؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔ "کیا تم اسے پکڑنے میں کامیاب ہو گئے؟"

"ہاں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"بہت خوب۔" ونود نے خوش ہو کر میرا شانہ تھپ تھپایا۔ "میں جانتا تھا کہ تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ آؤ کھانا کھالو..."

"تمہیں پتا ہے کہ میں اس بھیڑ بھاڑ میں کھانا پسند نہیں کرتا۔"

"پھر میں تمہارے لیے آفس میں کھانا منگوائے دیتا ہوں۔" ونود نے کہا۔ "کیا مچھلی بہت بڑی ہے؟"

"ہاں... کافی بڑی ہے۔"

"خوب... بہت خوب... ویل ڈن۔" ونود نے مجھے شاباش دی۔ "کیوں نہ اس خوشی میں ایک ایک جام پیا جائے۔"

"تم جانتے ہو کہ میں شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔"

"تم کبھی کبھی تو پی لیتے ہو..." اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ "بات کیا ہے دوست؟"

"کوئی خاص بات نہیں..." میں ہچکچایا "تم اپنی ترکیب پر بہت خوش ہو نا...؟"

"ہاں... کیوں نہیں۔" ونود نے اپنی ناک کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "مگر تم خوش نظر نہیں آ رہے ہو۔ کیا معاملہ ہے؟"

"کچھ نہیں..." میں نے ٹال دیا۔ "ونود ایک اچھا آدمی تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں ایک معمولی بات کو غیر ضروری اہمیت دے رہا ہوں اس قدر جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔

"میں نے تین بجے سہ پہر کا پروگرام بنایا ہے۔" ونود نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا اور جانے کے لیے تیزی سے گھوم گیا۔

ونود کچھ سوچتے ہوئے وہیں کھڑا رہ گیا۔ دوسری طرف میں اپنی جھونپڑی کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ شاید سارا قصور میرا ہی ہے۔ مجھے صبح کو اتنی جلدی نہیں اٹھنا چاہیے تھا بلکہ آج جھونپڑی سے باہر میں نہ نکلتا تو اور زیادہ اچھا تھا۔

تھوڑی سی نیند لے کر میں ٹھیک تین بجے اٹھ بیٹھا۔ اپنی غوطہ خوری کی تمام ضروری چیزیں ساتھ لیں اور ساحل پر پہنچ گیا۔ ہوٹل کے سامنے کا پورا ساحل لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ونود نے ضرورت سے زیادہ پبلسٹی کر دی تھی۔ مجھے سمندر کی طرف جاتے ہوئے خجالت سی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی سب لوگوں کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ میرے لیے ایک ایک قدم اٹھانا دشوار ہو گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر میں ایک مرد جیوفش سے کس طرح ایسی متاثر کن سنسنی خیز جنگ لڑ سکتا ہوں۔ جو اتنے بہت سے تماشائیوں کو حقیقت پر مبنی نظر آئے۔

ونود مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکا تو میں دانت پیستے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"احمق آدمی! تمہیں اتنی بھیڑ جمع کرنے کے لیے کس نے کہا تھا...؟ کیا یہ کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے؟"

ونود نے دانت نکال دیے... "جتنے زیادہ لوگ ہوں گے ہوٹل کے لیے اتنا ہی اچھا ہو گا؟ تم بھی ذرا بھرپور اداکاری سے کام لینا۔"

پھر وہ میرا بازو پکڑ کے ناظرین کے سامنے لے گیا اور غوطہ خوری کا لباس پہننے میں میری مدد کرنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ میری مہارت، تجربے اور نشانے کی تعریفیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ میں لوگوں کی

طرف نہ دیکھوں؟ مگر وہ ہر جانب موجود تھے اور میرا ان سے نظریں بچانا عملی طور پر ناممکن تھا۔ ان میں سے بیشتر کے چہرے سنجیدہ تھے مگر نوجوان یورپی لڑکیاں ایسی بھی تھیں جن کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بڑی دلچسپی سے اس وقت کی منتظر ہیں جب شارک اپنا لقمہ تر بنائے گی اور انہیں ایک سنسنی خیز منظر دیکھنے کو ملے گا۔

میں رسی پکڑنے کے لیے تین مقامی باشندوں کی خدمات حاصل کرلی تھیں۔ ممکن ہے اس نے انہیں اعتماد میں لے کر بتادیا ہو گا کہ یہ محض ایک ناٹک ہے جس میں انہیں ایک مخصوص پارٹ ادا کرنا ہے۔ بہرحال وہ تینوں جسم، تنومند اور طاقت ور نظر آرہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پام کے درخت سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ رسی کو سنبھال سکتے ہیں۔

میں سمندر کی طرف بڑھا تو پورے مجمع نے پرجوش انداز سے تالیاں بجائیں۔ میں نے جلدی سے غوطہ خوری کا نقاب چہرے پر سرکایا اور اس سے پہلے کہ ان میں سے کچھ سیاح امریکی لڑکیوں عورتوں اور ان کے ساتھی مردوں نے مجھ پر پھول برسائے اور میں سمندر میں کود گیا۔ میں نے خلیج کے ہر حصے میں تقریباً" چھ مرتبہ غوطہ لگایا یوں جیسے کسی شے کو تلاش کررہا ہوں۔ ہر مرتبہ سانس بھرکے میں کوئی دس گیارہ فٹ تک گہرائی میں جاتا۔ دو ڈھائی منٹ تک اندر رہتا اور پھر ادھر آجاتا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح بار بار غوطہ لگانے سے دیکھنے والوں پر یہ تاثر قائم ہو گا کہ میں بڑی تندہی سے اس شارک مچھلی کو تلاش کررہا ہوں۔ جو اب تک دو انسانی جانوں کے زیاں کا باعث بن چکی تھی۔

آخر کار میں اس چٹان کی طرف بڑھا جہاں میں نے جیو فش کو رسی سے باندھ رکھا تھا۔

میں نے غوطہ مارا اور تہہ میں چٹان تک اترتا چلا گیا۔ یہاں خاصی تاریکی تھی۔ پہلے غوطے میں مجھے مچھلی نظر نہیں آئی۔ میں نے دوسرا غوطہ لگایا اور چٹان کے گرد گھوم کے دیکھا۔ لیکن جیو فش اب بھی نگاہوں سے اوجھل تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب سے اندیشے نے سر ابھارنا شروع کیا مجھے پوری طرح یقین تھا کہ میں نے جیو فش کو اس چٹان سے باندھا تھا۔ مگر شاید میں اسے ٹھیک طرح سے باندھ نہیں سکا تھا۔ میں نے تیزی سے چٹان کے گرد دو تین چکر لگائے۔ آس پاس بھی دیکھا مگر جیو فش غائب ہو چکی تھی۔ میں نے چٹان کے نیچے ٹٹول کر دیکھا۔ رسی کا حلقہ بدستور موجود تھا۔ میں نے رسی کو آہستہ آہستہ کھینچنا شروع کیا یہاں تک اس کا دوسرا سرا میرے ہاتھ میں آگیا۔ دوسرا سرا جہاں جیو فش کو ہونا چاہیے تھا مگر اب وہاں صرف فولادی نیزہ اور مچھلی کے جبڑے کی ہڈی باقی رہ گئی تھی۔

میں سطح آب پر ابھرا... اب کیا ہو گا؟ میں سوچ رہا تھا... یا تو جیو فش مری نہیں تھی صرف عارضی طور پر بے ہوش ہو گئی تھی اور ہوش میں آنے کے بعد زور لگا کر بھاگ نکلی۔ اگرچہ اس کوشش میں اسے اپنے جبڑے کی ہڈی سے دست بردار ہونا یا پھر کوئی اور اس کی بو پاکر آئی اور اسے سالم نگل گئی۔ لیکن حقیقت کچھ بھی رہی ہو۔ اب میں ونود سے کیا کہوں گا! ان لوگوں کو کس طرح سے سمجھاؤں گا۔ بے بسی کے عالم میں میں نے پھر ایک غوطہ لگایا۔ شاید وہ کسی طرح چھوٹ گئی ہو اور اب بھی آس پاس کہیں موجود ہو گی۔ میں کوئی دو گز آگے ہی بڑھا تھا کہ رک گیا۔ مجھ سے آگے کوئی چیز موجود تھی۔ جو بظاہر کسی بہت بڑے لنگر کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے چاروں سمت دیکھا ذرا اور آگے چلا۔ میرے اندر سے کوئی نادیدہ آواز چیخ چیخ کر مجھے رکنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ لیکن میں ایسا مضطرب اور الجھا ہوا تھا کہ اس آواز کو نظر انداز کرتے ہوئے اور آگے چلا اور اس لنگر کے نما شے کے قریب پہنچ گیا اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل کی دھڑکن رک گئی ہو... جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سر سے پاؤں تک ایک پھرپھری سی اترتی چلی گئی۔ بہت احتیاط سے اور بہت ہی آہستگی اور غیر محسوس انداز سے پیچھے ہٹا اور پھر کچھ دور پہنچتے ہی تیزی سے سطح کا رخ کیا۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ میں اوپر ابھرا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاؤں کہ میں نے ابھی سمندر کی تہہ میں کیا دیکھا ہے۔ ایک بہت بڑی کوہ پیکر ہیڈ شارک (وہ شارک جس کا سر ہتھوڑے کی طرح ہوتا ہے) شارک خاندان کی سب سے خطرناک مچھلی۔

میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ پورے مجمع کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس لمحہ وہ مجھے سنگدل تماشائیوں کا ایسا گروہ محسوس ہوئے جو قدیم تاریخ کے کسی دور میں رہتے انسان اور خوں خوار شیر کی لڑائی دیکھنے کے لیے بے تاب ہوں۔ میرے لیے دوبارہ غوطہ لگانے اور اس خوفناک مچھلی سے مقابلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے رسی کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ فولادی نیزہ چیک کیا اور اپنی سلامتی سے قطعی مایوس ہو کر سمندر کی تہہ میں چلا صرف ایک بات میرے حق میں تھی اور وہ یہ کہ کوہ پیکر شارک جیو فش کا ناشتا کرکے اب آرام سے آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے وہ کسی تارپیڈو کی مانند نظر آرہی تھی۔ اگر میں اس وقت سمندر کے پانی کی بجائے نائٹرو گلیسرین میں تیر رہا ہوتا تب ہی شاید اس احتیاط سے آگے نہ بڑھتا جس احتیاط اور خاموشی سے اس وقت حرکت کر رہا ہوتا یہ بھی خوش قسمتی ہی تھی کہ میرا اندازہ درست ثابت ہوا اور میں ٹھیک اس کے سر پر پہنچ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس خطرناک مچھلی کے مقابلے میں میری کامیابی صرف ایک ہی طریقہ ہے... یعنی وہی طریقہ جس سے میں نے جیو فش کو شکار کیا تھا۔ یعنی اگر کسی طرح میں اس کے سر پر پہنچا اپنا فولادی نیزی اس کے دماغ میں اتار سکوں تب شاید... لیکن یہ وقت کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کا نہیں تھا۔

میں نے اپنا نیزہ سنبھالا... اس ہتھوڑے نما سر کو دیکھا جس کی لمبائی کسی طرح پانچ فٹ سے کم نہیں ہو گی۔ دل ہی دل میں دماغ کی جگہ کا تعین کیا۔ بھگوان سے اپنی کامیابی کی پرارتھنا کی اور اپنی انتہائی قوت صرف کرتے ہوئے اس کے سر پر نیزہ دے مارا... اور پھر یوں محسوس ہوا کہ جیسے سمندر کی تہہ میں کوئی بم پھٹ گیا۔ میں تیزی سے سطح کی طرف چلا۔ اوپر آتے ہی میں نے چیخ کر تینوں مقامی باشندوں سے جو رسی تھامے کھڑے ہوئے تھے رسی کھینچنے کے لیے کہا اور خود بھی کنارے کی طرف چلا۔ لیکن میرے کہنے کی ضرورت نہ تھی رسی پہلے ہی تن چکی تھی سنہالی باشندے ہوشیار ہو گئے تھے... لیکن ان غریبوں کو معلوم نہیں تھا کہ انہیں کس سے مقابلہ درپیش ہے... رسی کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور دوسرے لمحہ اپنی تمام تر طاقت صرف کرنے کے باوجود تینوں زمین بوس ہو چکے تھے۔ وہ گھسٹتے ہوئے سمندر کی طرف چلے۔ پہلے ایک نے گھبرا کر رسی چھوڑی اور پھر باقی دونوں نے اس کی تقلید کی۔

رسی تیزی سے میرے قریب سے گزری۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ ایک دم سے مجھے ایسے لگا جیسے میں نے جلتے ہوئے انگارے ہاتھ میں اٹھا لیے ہوں۔ جہاں تین قوی ہیکل آدمی ناکام رہے ہوں وہاں میری کیا حقیقت تھی۔ میں تیزی سے سمندر کی طرف چلا۔ میری غوطہ خوری کی نقاب اتر گئی تھی۔ پانی میری آنکھوں اور میرے منہ گھسنے لگا۔ میں نے شارک کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ نظر نہیں آئی لیکن رسی برابر مجھے کھینچ رہی تھی اور تب رسی میں ڈھیلا پن پیدا ہونا غالباً" شارک نے اپنی سمت تبدیل کرلیا تھا۔

پھر میں اوپر آیا دیکھا کہ میرے قریب ہی ساحل پر ڈائیونگ ٹاور نظر آرہا ہے۔ یعنی وہ بلند تختہ جہاں سے شوقیہ تیرنے والے سمندر میں چھلانگ لگاتے ہیں۔ یہ تختہ لکڑی کے مضبوط شہتیروں کے اوپر بنایا گیا تھا۔ میں نے انتہائی پھرتی سے کام لیتے ہوئی رسی کو ایک شہتیر سے لپیٹ دیا اور خود بھی رسی پکڑتے ہوئے سہارے کے لیے دوسرے شہتیر سے پیر لگا دیے۔ رسی ایک مرتبہ پھر تنی شارک نے زور لگایا اور موٹا شہتیر چرچرا کے اتنی آسانی سے ٹوٹ گیا جیسے وہ کوئی معمولی چھڑی رہا ہو۔ رسی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ٹھیک اسی لمحہ کنارے کھڑے ہوئے مجمع میں

سے کچھ باہمت نوجوان سفید فام سیاح شور مچاتے ہوئے ہر طرف سے سمندر میں کودنے لگے۔ شہتیر ٹوٹنے سے ٹاور کے تختے الگ ہو کر سمندر میں گرنے لگے تھے۔ غالباً" کوئی تختہ میرے سر پر لگا۔ پھر مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔

☼ ☼ ☼

مجھے ہوش آیا تو میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ میں مر چکا ہوں اور اب نرک میں ہوں۔ کیوں کہ میرا پورا جسم جیسے جل رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ میں دھوپ تپتے ہوئے پتھروں پر لیٹا ہوا ہوں۔ کوئی مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا مجھ پر اس طرح دباؤ ڈال رہا تھا جیسے کسی گیلے کمبل کو نچوڑ رہا ہو۔ شاید کچھ پانی میرے پیٹ میں گھس گیا تھا جسے وہ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوا تو کسی اور نے مجھے سہارا دے کر بٹھا دیا۔ جس سے محسوس ہوا کہ یہ کوئی عورت تھی اور میرے چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگوں نے مجھے مبارک باد اور شاباش دینی شروع کر دی۔ ان نوجوان سفید فام لڑکیوں نے جو میری موت کی خواہاں تھی میرے رخسار کے بوسے لیے پھر نہ جانے کس طرح اور کہاں سے نکل کر ونود میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے زوردار طریقے سے میری پشت تھپتھپائی۔

"بہت خوب۔ بہت خوب... تم نے تو کمال کر دیا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

مگر اس کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات صاف ظاہر تھے... یقیناً" اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہو گا کہ یہ سب کیا ہو گیا۔

"مجھے افسوس ہے..." میں نے مایوسی سے کہا۔ "میں اسے روک نہیں سکا۔"

ایک لمحہ کے لیے اس نے مجھے الجھن بھری نظروں سے دیکھا اور پھر مسکرانے لگا۔ پھر اپنا ہاتھ اٹھا کر ایک سمت اشارہ کیا۔

"سن رہے ہو... ؟ یہ کیسی آوازیں آ رہی ہیں... ؟"

"مجمع کے شور سے بالکل اوپر نمایاں کچھ الفاظ ایک کورس کے انداز میں میرے کانوں سے ٹکرائے۔

"جمہوری والا... جمہوری والا..."

سری لنکا میں دستور ہے کہ مقامی سنہالی باشندے جب بھی سمندر سے کوئی بڑی شارک مچھلی نکال رہے ہوتے ہیں تو سب مل کر ایک طرح کا گانا گاتے ہیں جسے "جمہوری والا" کہا جاتا ہے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا لوگوں کو ہٹاتے ہوئے کنارے پر آیا اور حیرت سے دیکھا کہ وہ پیکر ہیڈ شارک سمندر کی سطح پر بالکل بے حس و حرکت پڑی ہے اور تیس چالیس سنہالی باشندے رسی پکڑے اسے کنارے پر لا رہے ہیں۔

آخری جھٹکے نے اس کا کام تمام کر دیا۔" ونود نے کہا۔ "تمہارا نیزہ غالباً" اس کے دماغ میں اتر گیا تھا۔

اس رات میں نے اپنا بہترین ہندوستانی لباس زیب تن کیا۔ سفید براق کرتہ پاجامہ... اس شان دار کارنامہ کی خوشی میں ہوٹل کی انتظامیہ نے ایک شان دار اور پر تکلف ڈنر کا اہتمام کیا تھا جس میں مجھے مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔ دعوت بڑی کامیاب رہی لوگوں نے مجھے بڑی گرم جوشی سے مبارک باد دی۔ غیر ملکی سیاح لڑکیوں عورتوں نے میرے ساتھ رقص کیا۔ میں رقص نہیں جانتا تھا لیکن جیسے جیسے ان کے ساتھ رقص کرنا پڑا اور پھر مجھے انعام یہ ملا کہ غیر ملکی کرنسی بھی تحفے میں دی گئی۔ تین ہزار ڈالر اور برٹش پونڈ اس کارنامے پر ملے۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ میں ایک برس تک پر تعیش زندگی گزار سکتا تھا۔ میں سچ مچ خود کو کسی ہیرو سے کم محسوس نہیں کر رہا تھا۔

"اب صرف ایک ہی دلچسپ بات قابل ذکر رہ گئی ہے کہ دعوت کے آخری لمحات میں وہ لڑکی جس کی وجہ سے سارا ڈراما ہوا تھا وہ اچانک نمودار ہو گئی۔ اس کے ساتھ ایک خوب صورت اور وجیہہ نوجوان بھی تھا جسے لڑکی کی خالہ نے خاص طور پر اور دوسرے لوگوں نے عام طور پر قطعاً" پسند نہیں کیا۔ پتا چلا کہ وہ نوجوان اس

لڑکی کا محبوب تھا۔ جو کار لیے ہوٹل کے عقب میں موجود تھا۔ جب لڑکی نے سمندر میں تیرتے ہوئے اپنی خالہ کو غافل پایا تو وہ چپکے سے باہر نکلی اور محبوب کے ساتھ چل دی۔ وہ دونوں دن بھر ادھر ادھر گھومتے، تفریح اور سیر کرتے رہے۔

☼ ☼ ☼

خالہ بھانجی میں خوب لڑائی ہوئی جس نے دعوت میں بد مزگی پیدا کر دی۔ جب ڈنر ختم ہوا تو میں ان دونوں کو الجھتا اور لڑتا چھوڑ کر خاموشی سے باہر نکل آیا۔ جھونپڑی کی طرف جا رہا تھا کہ ونود آ گیا۔ میں اسے تمام حقیقت سے آگاہ کر چکا تھا۔

"ہماری بنیادی تجویز پر پانی پھر گیا تھا لیکن جو کچھ ہوا اس سے بہتر اور موثر ثابت ہوا۔ تم نے واقعی جان پر کھیل کر اس شارک کا مقابلہ کیا... تم نے میرے اور میرے ہوٹل کے لیے جو کچھ کیا ہے اسے میں عمر بھر بھلا نہیں سکوں گا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک گہری سانس لی۔ مون سون ہواؤں کی آمد آمد تھی۔ فضا میں ان کا نمکین ذائقہ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ وہاں اس وقت موسم گرما شباب پر ہو گا اور سمندر میں مچھلیاں ہی مچھلیاں ہوں گی۔ یہ تصور میرے لیے بڑا خوشگوار کن تھا میں ٹرانکول جا کر خوب دولت کماؤں گا۔

"تم شاید ٹرانکول جانے کا سوچ رہے ہو... تاکہ وہاں مچھلیاں پکڑ کے کولمبو کے فائیو اسٹارز ہوٹلز کو سپلائی کر کے دولت کما سکو۔ اس کے لیے موٹر بوٹ کی ضرورت ہو گی تاکہ سیزن سے بھرپور فائدہ اٹھا سکو۔ تم میری موٹر بوٹ لے جا سکتے ہو۔ میری طرف سے یہ انعام ہے۔" ہم دونوں نے ایک دوسرے سے بڑے خلوص اور گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ واقعی موٹر بوٹ میرے لیے بہت بڑا انعام تھا... لیکن یہ انعام اس لڑکی کی وجہ سے ملا جو پراسرار طور پر غائب ہو کر آ گئی تھی۔ اس نے ڈرامے کو کلائمکس پر پہنچایا تھا۔ ورنہ لوگ یہ سمجھتے کہ اسے شارک نے ہی ہضم کر لیا تھا۔ ☼

دوست

ہمارے ٹیچر مشتاق نامی لڑکے سے بہت بیزار تھے۔ مشتاق کا کمال یہ تھا کہ اسے جو بھی مضمون لکھنے کو کہتے۔ اس میں کہیں نہ کہیں سے "میرا بہترین دوست" ضرور فٹ کر دیتا تھا۔ کیونکہ یہ وہ واحد مضمون تھا جو اس کو فرفر یاد تھا مثلاً اگر کہا جاتا کہ ریلوے اسٹیشن پر مضمون لکھو تو وہ کچھ یوں لکھتا کہ میں اور میرے ماں باپ چچوں کی ملیاں جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن گئے۔ وہاں گاڑی کھڑی تھی اور گاڑی میں میرا بہترین دوست زاہد حسین بیٹھا تھا۔ زاہد حسین میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بہن بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں آفیسر ہے۔ زاہد حسین بہت اچھا لڑکا ہے۔"

اگر اسے "میرا استاد" مضمون لکھنے کو کہتے تو وہ لکھتا کہ ماسٹر افتخار میرے پسندیدہ استاد ہیں۔ ایک روز میں ان کے گھر گیا۔ وہاں میرا بہترین دوست زاہد حسین بیٹھا تھا۔ زاہد حسین میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بہن بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں آفیسر ہے۔ زاہد حسین بہت اچھا لڑکا ہے۔

ظاہر ہے جب کرکٹ میچ یا پکنک کی باری آتی تو وہاں بھی زاہد حسین موجود ہوتا۔ تنگ آ کر ماسٹر صاحب نے کہا کہ دیکھو یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ہر جگہ تمہارا دوست زاہد حسین موجود ہو۔ آج تم ہوائی جہاز پر مضمون لکھو اور یاد رکھو کہ ہوائی جہاز میں زاہد حسین موجود نہیں ہے۔

دوسرے دن مشتاق نے جو مضمون لکھا وہ کچھ اس طرح سے تھا۔ "میں اپنے ماں باپ کے ساتھ ایئرپورٹ گیا۔ وہاں جہاز کھڑا تھا۔ جہاز کے دو پر تھے اس میں ہم بیٹھ گئے۔ جہاز میں زاہد حسین نہیں تھا پھر جہاز اڑنے لگا۔ میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا تو زمین پر میرا بہترین دوست زاہد حسین جا رہا تھا۔ زاہد حسین میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بہن بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں آفیسر ہے۔ زاہد حسین بہت اچھا لڑکا ہے۔"

ماسٹر صاحب نے مضمون پڑھ کر مولا بخش اٹھا لیا اور مشتاق غریب کا جلوس نکال دیا۔

(کتاب "گزارہ نہیں ہوتا" سے اقتباس)

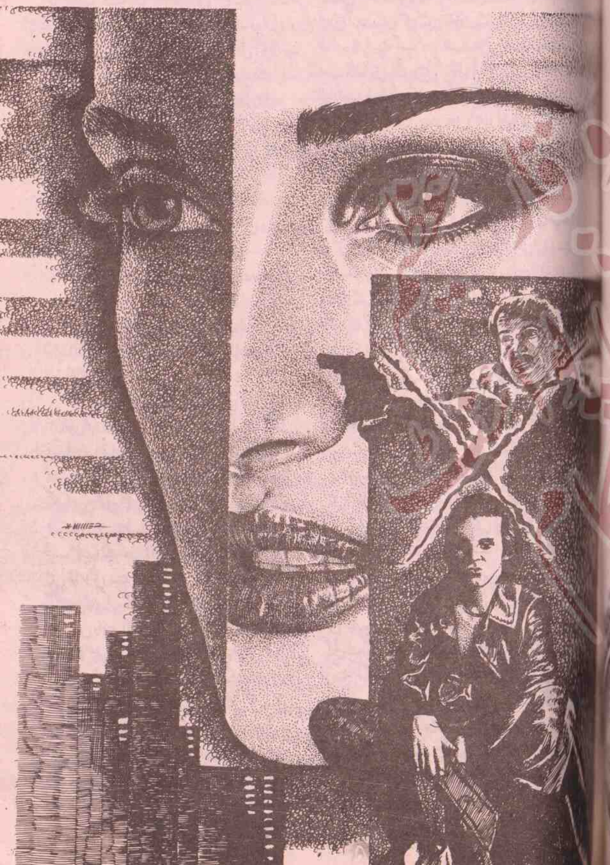

چمگادڑ

انیسویں قسط

ایم اے راحت

ایک شخص کی داستان جس نے زندگی کی حقیقتوں سے آشکار ہونے کے بعد اپنی نئی منزلوں کی تلاش شروع کر دی۔ وہ جو رشتوں پر یقین رکھتا تھا۔ اپنوں کی لالچ کا شکار بنا۔ اس کے خلاف بنی سازشوں نے اسے ایک مختلف انسان بنا دیا۔ وہ ہر مشکل کے سامنے سینہ سپر تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز اور عروج و زوال کی ایک انوکھی داستان جو لمحہ بہ لمحہ آپ کو تجسس کے سحر میں جکڑ لے گی۔

عمران ڈائجسٹ کا پرتجسس دل ہلا دینے والا سلسلہ

ملکہ ہانس کا ایک وارث پردیس میں اپنے دشمنوں سے نبرد آزما تھا' اور دشمن بھی چھپ کر وار کرنا ہی شاید اپنا مسلک سمجھتے تھے' بہرحال میں ان کے ہر حملے کا جواب دینے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ وہ لڑکی جو میرے قتل کے ارادے سے ہوٹل میں آئی تھی' اب اپنے فلیٹ تک مجھے لے آئی تھی اور پھر وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئی اور پھر کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"بیٹھو..... آرام سے بیٹھ جاؤ' خدا کی قسم ایسی دیوانگی کے دورے بس کبھی کبھی ہی پڑتے ہیں' کئی بار مجھے ان دوروں سے نقصان بھی اٹھانا پڑا ہے۔"

"دورے۔" میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا' لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا پھر اس نے زور سے آنکھیں بھینچ کر گردن جھٹکی اور بولی۔

"وہ واش روم ہے میں دوسرے کمرے کے واش روم میں جارہی ہوں اور اطمینان رکھو' نہ کسی کو تمہارے بارے میں اطلاع دوں گی اور نہ وہاں سے توپ اٹھا کر لاؤں گی' جس سے تمہیں اڑا دوں۔" میں ہنسنے لگا' میں نے کہا۔

"دراصل میں جس قوم سے میرا تعلق ہے اس میں مہمانوں کو زندگی سے زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ مہمان' میزبان پر اعتبار کرتے ہیں' یہ میری اپنی سوچ ہے' تمہارے دل میں اگر کوئی کھوٹ پیدا ہوئی تو بہرحال مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوگا کیونکہ تمہارا تعلق نہ میرے وطن سے ہے نہ میری قوم سے۔" اس نے ایک سنجیدہ نگاہ مجھ پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں خاموشی سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرکے بیٹھ گیا تھا' اب جب زندگی کو اس انداز میں داؤ پر لگا ہی دیا ہے تو کیا ڈرنا' جو ہوگا دیکھا جائے گا' میرے ذہن کے دریچوں میں موہنی جھانکنے لگی ایک حسین تصور اور بس جس کے ساتھ زندگی کے کچھ خواب وابستہ تھے اور پھر آنکھ کھل گئی۔ کئی بار ایسا ہوا تھا ماضی کی یادیں ایک ایسا سرمایہ ہوتی ہیں جنہیں انسان جب چاہے کسی پٹارے کی طرح کھول کر بیٹھ جائے کسی بھی سمت رخ کرلے' واقعات ہی واقعات ایک ایسا خزانہ جو کبھی ختم نہ ہو۔

موہنی کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات' وہ بھی جب وہ میری صحت کے لیے کوشاں تھی اور وہ بھی جب وہ میری قربت میں تھی' میں فضاؤں میں اس کی بو سونگھتا تھا اور پھر اپنے آپ کو یہ کہہ کر ہوش دلا لیتا تھا کہ یہ سب افسانوی باتیں ہیں' مثالی کہانیاں ہیں' فضاؤں میں لیلیٰ کی خوشبو مجنوں کو آتی تھی کیونکہ وہ صاحب جنون تھا میں تو ہوش مند ہوں' بھلا فضا میں کسی کی خوشبو کہاں نشر ہوتی ہے اور پھر تمارا کے کون سے علاقے میں وہ موجود ہے مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ یہاں ہے بھی یا نہیں' اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس عمارت میں میرے اور مورے پر جو حملہ کیا گیا تھا وہ کسی کی جانب سے تھا۔ یہ لڑکی اگر واقعی ہی ایسی بے وقوف عورت ہے جیسا کہ ظاہر کررہی ہے تو شاید اس بارے میں کچھ بتا سکے' ویسے دونوں ہی قسم کے تجربات تھے مجھے' ایسی عورتیں بھی اس دنیا میں ہوتی ہیں' یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر بہت زیادہ تعجب کیا جائے ویسے عورتیں کم ہوتی ہیں' لیکن ہوسکتا ہے کہ اس کی زندگی سے کوئی ایسی کہانی وابستہ ہو جو الگ نوعیت کی حامل ہے' البتہ اگر یہ عورت مجھے اس بارے میں بتادے گی تو کام آسان ہوجائے گا۔

مورے پتا نہیں کہاں مرا ہوگا' زندہ بھی ہے یا نہیں' بظاہر تو اس بات کے امکانات تھے کہ ڈکٹر کوم ابھی تک میرے بارے میں نہیں جان سکا ہے اور بھمر کی ہی حیثیت سے اس نے اب تک میری پذیرائی کی ہی' کچھ باتیں مجھے مورے نے بھی بتائی تھیں' وہ باتیں واقعی بالکل سچ نکلی تھیں۔ یعنی یہ کہ اس عمارت میں ہم پر حملہ ہوسکتا ہے بڑی پراسرار کیفیت تھی' آخر حملہ آور کون تھے' یہ بات تو مورے ہی بتا سکتا ہے۔ وہ چند لمحات کے بعد واپس آگئی' اس نے ایک ٹرالی سنبھالی ہوئی تھی جس پر سے کافی کی خوشبو اڑ رہی تھی' شاہ زیب نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا' ٹرالی پر کچھ سینڈوچ اور بسکٹ وغیرہ رکھے ہوئے تھے' ٹرالی میرے سامنے لگا کر وہ میرے قریب

بیٹھ گئی اور بولی۔

"کافی کے علاوہ اور کوئی چیز تازہ نہیں ہے' لیکن حفظان صحت کے تمام اصولوں کے مطابق ہے اس لیے گریز کی ضرورت نہیں ہے' اس سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

میں ایک مدہم سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہوگیا تھا' بہرحال ہم کھانے میں مصروف ہوگئے تو وہ دوبارہ بولی۔

"اور نہ ہی کافی میں بے ہوشی کی دوا ہے جس سے تمہیں بے ہوش کرکے ان لوگوں کے حوالے کردوں' سمجھ رہے ہو نا؟" وہ مسکرائی اور بولی۔

"اور یہ بھی سوچ رہے ہوگے تم کہ بہت زیادہ چرب زبانی کا مظاہرہ کرکے' تمہیں مرعوب کرنے کی کوشش کررہی ہوں۔"

"تم کیا کررہی ہو مجھے کچھ نہیں معلوم' لیکن کیا تم مجھے اس بات کی داد نہیں دوگی کہ تم نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا' میں نے مدافعت کی تم ناکام رہیں اور اس کے بعد فاتح ہوکر تمہارے پاس موجود ہوں۔" وہ بات کا برا ماننے کے بجائے قہقہہ مار کر ہنس پڑی اور بولی۔

"دیوانہ پھر کسے کہتے ہیں اور یہی دیوانگی زندگی کا ثبوت ہوتی ہے' ارے کیا فرق پڑتا ہے موت تو ہر طرح سے آجاتی ہے' دل کی اتنی سی بات بھی نہ مانی جائے' چلو چھوڑو کسی چکر میں پڑگئے ہم لوگ' سناؤ تم کیا ہو' کیوں ہو' دشمن کیوں پال رکھے ہیں' کوئی سیکریٹ مشن رکھتے ہو' کیا قصہ ہے؟"

"اب یہ بھی بتادوں تمہیں؟"

"نہ بتاؤ' اب جبکہ میں تمہیں دوستوں کے سے انداز میں یہاں لے آئی ہوں۔ تم سے متاثر ہوکر تو اس گھر کی چھت کے نیچے تمہاری ہر خواہش میری لیے قابل احترام ہے' تم نے کچھ وقت پہلے کہا تھا کہ تمہارا تعلق ایک ایسی قوم اور ملک سے ہے جو مہمان کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں' میں نہ تمہاری قوم کی باشندہ ہوں نہ تمہارے وطن سے میرا تعلق ہے' لیکن بات مجھے بہت پسند آئی تھی' میں کوشش کررہی ہوں کہ وہی ڈرامہ خود بھی کروں۔" اس نے ایک بسکٹ اٹھا کر دانتوں سے کاٹتے ہوئے کہا۔ میں مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر میں نے کہا۔

"اگر یہ بات ہے میڈم تو پھر تو یہ بات میرے لیے بڑی فائدہ مند ہوسکتی ہے اور میں تمہاری اس جذباتی کیفیت سے بڑا فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔" وہ سنجیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔

"کیا فائدہ' کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ کہ اب چونکہ میں تمہارا مہمان ہوں اور تم میرے لیے بڑے پراہتمام جذبات کا اظہار کرچکی ہو اس لیے میں تم سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ سارا قصہ کیا ہے؟ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے مجھے ختم کرنے کے لیے تمہاری خدمات حاصل کیں اور ان کا مقصد کیا ہے؟" اس نے کافی کے دو تین گھونٹ لیے پھر بولی۔

"یقین کرو مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے؟ البتہ وہ اتنا جانتے تھے کہ میں کرائے کی قاتل ہوں اور اس طرح کے کام کرلیا کرتی ہوں۔ ٹیلی فون پر مجھ سے رابطہ قائم کیا گیا تھا بولنے والا ایسا آدمی تھا جس کی آواز نہ مردانہ تھی نہ زنانہ' کئی بار ٹیلی فون کرکے اس نے مجھ سے سارے سودے طے کیے اور ایڈوانس کی رقم بڑے پراسرار طریقے سے مجھے ایک چھوٹے سے بچے کے ہاتھوں سے حاصل ہوئی۔ زندگی میں ایسے واقعات بے شمار آئے ہیں اور ویسے بھی میں اب ان پر غور نہیں کرتی' میرا مقصد تو صرف کام کرنا ہوتا ہے۔"

"اور اب جبکہ تم اس کوشش میں ناکام ہوگئیں تو کیا کروگی؟"

"ناکامی کا اعتراف کرلوں گی اور ایڈوانس کی رقم انہیں واپس کردوں گی۔"

"کیا اس پر وہ تمہارے خلاف نہیں ہوجائیں گے؟"

"ایسا ہوا نہیں ہے ابھی تک' ہاں جو لوگ براہ راست مجھ سے مل لیتے ہیں وہ پھر اس بات سے خوف

زدہ رہتے ہیں کہ ان کا راز فاش نہ کردوں، لیکن چونکہ میں نے ایسا کبھی کیا نہیں ہے اور پھر ظاہر ہے لوگ ہر ایرے غیرے سے کام نہیں لے لیتے پہلے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں پھر اس کے سپرد کوئی ذمے داری کرتے ہیں، ان لوگوں نے بھی کچھ نہ کچھ تو معلومات حاصل کی ہی ہوں گی۔"

"ہوں.... بہر حال تمہارا نقصان ہوگیا۔"

"فضول باتیں مت کرو پوچھ لیا کرو مجھ سے میرے بارے میں، اب اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کروگے؟"

"کوئی ایسی اہم بات ہے ہی نہیں، جو میں بتاؤں، معمولی سا آدمی ہوں، جرم کی دنیا سے تھوڑا بہت تعلق رہا ہے جرائم پیشہ افراد میرے پیچھے لگے رہتے ہیں، پچھلے دنوں ایک شخص نے ایک چھوٹے سے جھگڑے کی بنیاد پر میری بیوی کو اغوا کرلیا اور بعد میں مجھے اطلاع ملی کہ وہ تماسرا میں ہے، بس اسی کی تلاش میں یہاں آیا تھا، ابھی تک اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوسکا۔"

"اس کے باوجود تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ وہ کون لوگ ہیں جو میرے ذریعے تمہیں نقصان پہنچانا چاہتے تھے؟" وہ بولی۔

"ظاہر ہے انہوں نے جس جھگڑے کی بنیاد پر تمہاری بیوی کو اغوا کیا ہے وہ معمولی جھگڑا نہیں ہوگا۔ انہیں تمہارے یہاں آنے کی امید ہوگی، کچھ خوف ہوگا تمہاری طرف سے اور اس کے لیے انہوں نے مجھے استعمال کرنے کی کوشش کی۔"

"ہاں ایسا ہے اور ایسا ہی ہوسکتا ہے۔"

"بہر حال تم ایک دلیر آدمی ہو اور نجانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ آسانی سے ان کے قبضے میں نہیں آسکوگے۔"

"بہر حال مجھے اچھے لگے ہو، میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا معاوضہ اس کے لیے حاضر ہوں، ویسے ظاہر ہے جو عورت تمہاری بیوی ہوگی اس سے محبت بھی کرتے ہوگے؟"

"بہت زیادہ، درحقیقت اس کے گم ہوجانے سے میں معطل ہوگیا ہوں۔"

"بہت خطرناک لوگ ہیں، بہت بڑی حیثیت کے حامل ہیں ان کے معاملے میں میں ایک معمولی سی شخصیت ہوں۔"

"کوئی اور تفصیل بتاؤ؟"

"تعلق اسرائیل سے ہے، اسرائیلی ایجنسی کا ایک اہم رکن وکٹر گوم۔"

"یہودی نسل کا ہے؟" عورت کے انداز میں ایک نفرت کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔

"ظاہر ہے...."

"اوہ مجھے یہودیوں سے بے پناہ نفرت ہے، بے پناہ نفرت تم تصور بھی نہیں کرسکتے کہ کہ...."

"بہر حال چھوڑو ان باتوں کو وہ کہاں ہے، کیا مجھے اس کے بارے میں بتاسکتے ہو؟"

"نہیں.... یوں سمجھ لو کہ میں اندھیرے میں تیر مار رہا ہوں، کوئی ٹارگٹ نہیں ہے، بس ایک ایسے مسئلے پر وہ ہمارا دشمن بن گیا جس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے میں نے اسے بتانے کی کوشش کی، لیکن بدبخت ماننے پر تیار نہ ہوا، چلو چھوڑو اس بات کو۔"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہی، میں نے تمہیں خود پیش کش کی ہے کہ اگر تھوڑی بہت میری ضرورت ہو تو میں تمہاری مدد کرسکتی ہوں۔"

"بے حد شکریہ، وکٹر گوم کے بارے میں اگر تمہیں کہیں سے کچھ معلوم ہوجائے تو یوں سمجھ لو کہ میرے لیے بے حد کار آمد رہے گا اور اس سے بھی زیادہ یہ پتا چل جائے کہ موہنی کے بارے میں یہ اطلاع ملی ہے کہ وہ تماسرا میں موجود ہے کہاں ہے، تو تم یہ سمجھ لو کہ اس سے بڑا احسان میری زندگی پر اور کوئی نہیں ہوگا۔"

"سنو میں یہ بات معلوم کرکے تمہیں بتادوں گی، تم اس سلسلے میں بالکل بے فکر رہو اور اس کے علاوہ میں تمہیں یہ پیش کش بھی کرتی ہوں کہ تم یہاں قیام کرو اور اس وقت تک آرام کرو جب تک کہ تمہارا مشن پورا نہ ہوجائے، دیکھو میرے ہاتھ بہت مختصر

نہیں ہیں، میں بے شک تنہا کام کرتی ہوں، لیکن اپنی لائن کے لاتعداد لوگوں سے میرا تعلق رہتا ہے اور وہ میری خواہش پر میرا کام کردیتے تھے، چنانچہ میں کوشش کروں گی کہ کسی طرح سے تمہاری بیوی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوسکیں۔"

میں نے احسان مند نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ ہنس کر بولی۔ "نہیں یہ تو ایک معاوضہ ہے جسے تم وصول کرنے کے حق دار ہو اور بات سمجھ رہے ہوگے کہ معاوضہ کس بات کا ہے، یہی میں نے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور تم نے مجھ پر قابو پانے کے بعد میرے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا، یہ اس کا معاوضہ ہے۔"

میں مسکرا کر خوش ہوگیا تھا، اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور اس نے جلدی سے کافی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"پروگرام کے مطابق انہیں اسی وقت مجھ سے گفتگو کرنی تھی تم یہ دوسرا ریسیور اٹھالو، ایک ہی لائن ہے۔" اس نے کہا اور میں نے اس بات پر تکلف نہیں کیا وہ آگے بڑھی اور اس کا ریسیور اٹھالیا تھا پھر وہ بولی۔

"یس۔"

"تم واپس آگئیں۔" ایک باریک آواز ابھری۔

"تم بہت جاہل آدمی معلوم ہوتے ہو، کیا بات کرنے کا یہی انداز ہے، نہ ہیلو نہ ہائے، تم واپس آگئیں، کیا میں ٹیلیفون بند کردوں؟"

"ارے نہیں نہیں مائی ڈیئر، میں تو دی پوائنٹ بات کرنے کا عادی ہوں، کچھ ایسی مصروفیات تھیں میری کہ میں خود تمہاری مدد کے لیے کسی کو وہاں نہیں بھیج سکا، اب تم خوش خبری سناؤ اور یہ بتاؤ کہ کیا اس وقت اس کے کمرے کے گرد پولیس موجود ہے اور اس کی لاش کو سنبھالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔"

"تم کون ہو، ایک بار مجھ سے ملاقات کرو تاکہ میں تمہاری خبر لے سکوں۔" عورت نے غصیلی آواز میں کہا اور میری طرف دیکھ کر آنکھ مار کر مسکرائی۔

"کیا مطلب؟" دوسری طرف سے آواز ابھری۔

"تم نے جس شخصیت سے مجھے بھڑایا ہے کیا وہ انسان ہی ہے؟"

"کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"وہ ایک وحشی سانڈ تھا جس سے مجھے جان بچانا مشکل ہوگئی، میں زخمی ہوں اور...."

"تم صرف یہ بتاؤ کہ تم اسے ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئیں یا نہیں؟"

"صرف یہ پوچھو کہ اسے مارنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد میرے جسم پر کتنے زخم ہیں؟"

"تو تم اسے قتل نہیں کرسکیں؟"

"نہیں بھاڑ میں جاؤ تم اور وہ بھی، اپنے ایڈوانس کی رقم...." لیکن ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دوسری طرف سے ٹیلی فون کا ریسیور دھڑ سے رکھ دیا گیا اور وہ اپنا ریسیور ہاتھ میں لیے مسکراتی رہی، پھر اس نے دو تین بار ہیلو کہا اور پھر ریسیور رکھ دیا اور ٹھنڈی سانس لے کر چھت کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"شکر ہے بس اتنی ناراضی پر ہی بات ختم ہوگئی، تم نے ساری باتیں سن لیں نا۔"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو اب یوں کرو آرام سے سوجاؤ، آؤ میرے ساتھ میں تمہیں تمہارے بیڈ روم میں پہنچادوں، آجاؤ۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور مجبوراً مجھے بھی اٹھنا پڑا، میں نے کہا۔

"اچانک ڈیئر۔"

"ہاں نیند آرہی ہے، آؤ اب باقی باتیں صبح کے ناشتے پر ہوں گی۔"

وہ کمرے سے نکلی تو مجھے بھی اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکلنا پڑا پھر وہ مجھے ایک بیڈ روم میں لے گئی اور میری طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

"بھول کر بھی نہ سوچنا کہ میں ایک عورت کی نگاہ سے تمہیں دیکھ رہی ہوں، تم نے اپنے وطن میں مہمانوں کی پذیرائی کا تذکرہ کیا تھا نا، کیا تمہارے ہاں رشتوں کا تقدس بھی ہوتا ہے، یعنی زبان سے اگر کچھ

کہہ دیا جائے کسی کو تو...؟"

"زندگی سے زیادہ قیمتی؟"

"تھوڑا بہت معلوم ہے مجھے تو سنو، میں بالکل اس بات سے اتفاق نہیں کرتی کہ میرے دل میں تمہارے لیے محبت کا درخت اگ آیا ہے، لیکن اگر زبانی بات کرتے ہو تو مجھے اپنی ماں کی بیٹی کا درجہ دے سکتے ہو، یا تم مجھے اپنی بہن کہہ سکتے ہو، چلو دروازہ بند کرلو۔"

وہ مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں سانس روکے دروازے کی جانب دیکھتا رہا تھا، یہ آخری الفاظ ایسے تھے جنہوں نے مجھے چت کردیا تھا، اب تک تو خیر جس انداز میں وقت گزار تا رہا تھا وہ الگ تھا، لیکن یہ عورت مجھے متاثر کرنے کا باعث بن گئی تھی۔ پھر رات پرسکون گزری تھی۔ یہی کہہ سکتا ہوں اور اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں، وقت جو تبدیلیاں حالات میں پیدا کردیتا تھا میں انہیں قبول کرلیتا تھا۔

صبح جاگنے کے بعد غسل خانے میں داخل ہوگیا، دوسرا لباس تو تھا نہیں، غسل کرکے وہی لباس پہن لیا، پھر باہر نکلا تھا کہ وہ انتظار کرتی ہوئی نظر آئی، میں اسے دیکھ کر بڑے خلوص سے مسکرایا تھا۔ مجھے رات کے الفاظ یاد تھے، ناشتے کی میز پر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بہت عرصے کے بعد میں نے اتنے اہتمام سے صبح کا ناشتا تیار کیا ہے، یہ اہتمام اس وقت کرتی تھی جب جوشان زندہ تھا۔"

"جوشان۔" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ بولی۔

"ہاں تم نہ بھی پوچھتے تو میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتی۔ سمجھ لو میرا محبوب تھا ہم دونوں نے ایک مارشل آرٹس کلب میں تربیت حاصل کی تھی، وہ بہت ذہین، بہت ہی اعلا حیثیت کا مالک تھا، پھر ایک تنظیم نے اسے اپنے لیے حاصل کرلیا، میں بھی اس کے ساتھ ہی تھی، ہم دونوں شادی کرنے والے تھے، لیکن پھر وہ ایک حادثے کا شکار ہوکر ہلاک ہوگیا، اسے کچھ نامعلوم لوگوں نے قتل کردیا، یہ ہونا تھا پھر میں نے تنظیم سے علیحدگی اختیار کرلی، مجھ پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور اس جنون نے نجانے مجھے کہاں سے کہاں لا پھینکا، بس یوں سمجھ لو کھلے سمندر میں ایک ہلکی سی کشتی کی مانند تھی، موجوں کے تھپیڑے جدھر بھی لے جارہے تھے، چلی جارہی تھی، زندگی کا اختتام اسی طرح چاہتی ہوں جس طرح جوشان کا ہوا تھا، اسی لیے اتنا خطرناک راستہ اختیار کیا ہے، موت کی کبھی پروا نہیں کرتی کام کرتی ہوں، رقومات ملتی ہیں، بہت بڑا بینک بیلنس جمع ہوگیا ہے، لیکن اس کا استعمال بھی جائز ہی ہوتا ہے، تفصیل نہ پوچھنا۔" میں خاموشی سے اس کی کہانی سنتا رہا، ناشتا ختم کرنے کے بعد اس نے کہا۔

"کچھ مصروفیات ہیں میری روزانہ جاتی ہوں، بتاؤں گی نہیں کہاں، تم آرام سے فلیٹ میں رہو، یہاں کبھی کوئی نہیں آتا، کسی کو معلوم ہی نہیں ہے کہ یہاں کون رہتا ہے اور میرے بارے میں تو کسی کو بالکل ہی نہیں معلوم چنانچہ کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔"

"میں بھی نکلنا چاہتا ہوں یہاں سے۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر بولی۔

"میرا مطلب ہے میرا بھی ایک مشن ہے۔"

"تم بے فکر رہو، میں تمہیں معلوم کرکے بتاؤں گی کہ تمہاری بیوی یہاں کہاں ہے، یہ بات میں بھولی نہیں ہوں۔"

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ میں بھی تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔"

"لیکن تمہارے لیے باہر کی دنیا میں خطرہ ہے، جبکہ تم اپنے دشمنوں کو جانتے بھی نہیں ہو۔"

"میرے دشمنوں نے اس سے پہلے بھی لاتعداد بار مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی اور اب بھی وہ کوشش کررہے ہیں میں بچتا رہا ہوں، ایک ایمان یہ بھی ہے میرا کہ جب میرے اللہ کو منظور ہوگا وہ میری واپسی کا پروانہ جاری کردے گا اور اس پروانے کو کوئی ملتوی نہیں کرسکتا۔"

"اوکے اپنا خیال رکھنا اور واپس یہیں فلیٹ پر آنا، تمہارے پاس پستول ہے وہ پستول رہنے دو، میں تمہیں ایک شاندار ریوالور دیتی ہوں اور کارتوس وغیرہ بھی، احتیاط سے اپنے پاس رکھ لو، بس اس بات کا خیال رکھنا کہ اس کا لائسنس نہیں ہے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا، مجھے واقعی اچھے ہتھیار کی ضرورت تھی، بغلی ہولسٹر کو میں نے قمیص اتار کر پہنا اصل میں مجھے مورے کی تلاش تھی، ہوسکتا ہے وہ بھی مجھے تلاش کررہا ہو، اب ان واقعات کے تحت گوشہ نشینی تو اختیار نہیں کی جاسکتی تھی، تھوڑی سی جدوجہد ضروری تھی۔ ہوسکتا ہے وکٹر گوم بھی تماسرا پہنچ گیا ہو، ابھی تک بہرحال میرا اور اس کا معاملہ خراب نہیں ہوا تھا اور مجھے مسٹر ہمو کی حیثیت سے اپنے ساتھیوں میں ہی سمجھتا تھا، اگر مورے مل گیا تو ہوسکتا ہے اس سے کچھ اور انکشافات بھی ہوں کیوں کہ بہرحال وکٹر گوم نے مجھے یہاں بھیجا تھا۔

کچھ دیر کے بعد میں فلیٹ سے باہر نکل آیا اور اس کے بعد تماسرا کی شہر گردی کرنے لگا، پہلی بار میں نے اس شہر کو غور سے دیکھا تھا، اچھی حیثیت کا حامل تھا سڑکوں پر گرین بیلٹس بنی ہوئی تھیں، جگہ جگہ آئی لینڈ تھے جو پھولوں سے لدے ہوئے تھے، موسم بھی بہت خوب صورت تھا، بادلوں کی چھاؤں نے پھولوں کے حسن کو نکھار دیا تھا اور سبزہ زار آنکھوں کو بھلے محسوس ہورہے تھے، میں نے ایک طویل سفر پیدل طے کیا اور تھک گیا تو ایک ریسٹوران میں آبیٹھا اور کیا ہی عمدہ تقدیر تھی کہ جیسے ہی ریسٹوران میں داخل ہوا اور ایک کرسی پر بیٹھا، کوئی میرے قریب پہنچ گیا، میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو مورے تھا، اسے دیکھ کر میں خوشی سے اچھل پڑا تھا۔

"مورے تم..."

"میں بہت سی چیزوں میں دعویٰ رکھتا ہوں اس وقت تم یقین کرلو میں دل میں یہ آخری فیصلہ کرکے نکلا تھا کہ تم مجھے ضرور مل جاؤ گے اور تم اس طرح یہاں کھنچے چلے آئے جیسے کسی نے تمہیں اس طرف دھکیل دیا ہو۔"

"تم خیریت سے تو ہونا مورے میں تو سمجھا تھا..."

"کہ میں مرگیا۔"

"صورت حال اتنی ہی خوفناک تھی۔"

"نہیں میں خود بھی زندہ تھا اور تمہاری زندگی کے بارے میں بھی مکمل معلومات حاصل کرلی تھیں۔"

"کہاں سے؟"

"بس تھوڑی سی جدوجہد کرکے پتا چلا لیا تھا۔"

"چلو چھوڑو، یہاں بیٹھو گے یا کہیں اور چلنا ہے؟"

"ہر جگہ یکساں ہے بیٹھنا چاہو تو بیٹھو اور چلنا ہے تو چلو۔"

"کیا تم نے کوئی اور ٹھکانہ دریافت کرلیا ہے؟"

"ہاں۔"

"اس عمارت کی کیا کیفیت ہے؟"

"اب ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، آؤ باہر نکلتے ہیں۔" اس نے کہا اور پھر اس نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا اس کا مطلب تھا کہ وہ دیر سے یہاں بیٹھا ہوا ہے، بات کچھ پراسرار نوعیت کی تھی، بہرحال وہ وکٹر گوم کا ساتھی تھا، باہر نکل کر اس نے جب ایک چھوٹی سی کار کا دروازہ کھولا تو میں نے کہا۔

"لگتا ہے تم تو یہاں مستحکم حیثیت گزار رہے ہو جبکہ میں بڑی خراب کیفیت میں پھر رہا ہوں۔"

"مجھے اندازہ ہے آؤ بیٹھو شاید اس کے بعد تمہاری کیفیت خراب نہ رہے مسٹر ہمو۔"

میں کار میں آبیٹھا اور اس نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی، میں نے کہا۔

"ویسے مورے، پتا چل سکا کہ ہمارے دشمن کون تھے؟"

"میرے علم میں تو خیر یہ بات نہیں آئی، لیکن مسٹر وکٹر گوم اچھی طرح یہ بات جانتے ہیں۔"

"ان کی طرف سے کوئی پیغام؟"

"ہاں پیغام کے طور پر وہ خود موصول ہوگئے ہیں۔" مورے نے مسخرے پن سے کہا اور میں چونک پڑا۔

"کیا مطلب؟"

"مسٹر وکٹر گوم آگئے ہیں۔"

"وہ تم ان سے مل لیے۔"

"ہاں تمہارے لیے وہ سخت تشویش کا شکار تھے بلکہ مجھے ڈانٹ بھی پڑی ہے ان الفاظ کے ساتھ کہ مجھے ہر قیمت پر تمہارے ساتھ ہی ہونا چاہیے تھا؟"

"ویری گڈ، مگر یہ نہیں بتایا انہوں نے بھی کہ آخر اس عمارت میں ہم پر حملہ آور کون تھے؟"

"ڈکٹر گوم کی شخصیت سے ابھی تک واقف نہیں ہوئے مسٹر ہیمو، وہ بہت بڑا آدمی ہی، اپنی مرضی سے کوئی بات بتادے تو بے شک بتادے، ورنہ کسی کی مجال ہے کہ اس سے کوئی سوال کر سکے، ہو سکتا ہے تمہیں اس بارے میں کچھ بتادے، بے چارہ مورے تو ایک معمولی سا آدمی ہے، کسی سے محبت کرے اور اس سے محبت کرنے کا اختیار اسے حاصل نہ ہو تو اس پر فرض ہوتا ہے کہ وہ اس سے محبت نہ کرے کیا بے بسی اور بے کسی کی زندگی ہوتی ہے، کیا تمہیں کبھی ایسی زندگی سے واسطہ پڑا ہے مائی ڈیئر ہیمو؟"

"کیا بات ہے کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟"

"یار کمال کرتے ہو، سوال سوال ہوتا ہے۔ جواب دے سکتے ہو تو دو ورنہ خاموش ہو جاؤ۔" مورے کسی قدر جھنجلا کر بولا، میں اس کی کیفیت سمجھ نہیں پایا تھا، اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کہاں تھے، یہ وقت کہاں گزارا؟"

"ایک ہوٹل میں اور اس وقت تمہیں تلاش کرنے کے لیے نکلا تھا۔" میں نے مورے کو تفصیل نہیں بتائی تھی۔ بہرحال میرا ایک اور رابطہ تھا جسے میں مورے پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کار ایک عمارت میں داخل ہو گئی اور مورے نے اسے روک دیا، میں ایک بار پھر ڈکٹر گوم تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا کیونکہ ڈکٹر گوم کے سامنے اپنے آپ کو ذہنی طور پر قابو میں رکھنا بے حد ضروری تھا۔

مورے مجھے ساتھ عمارت میں داخل ہو گیا اور پھر وہ ایک کمرے میں پہنچ کر بولا۔

"آرام کرو؟"

"کیا مسٹر ڈکٹر گوم یہاں موجود ہیں؟"

"نہیں تھے، اس وقت ہیں یا نہیں یہ معلوم کرتا ہوں۔"

"میرے سلسلے میں تم نے انہیں اطلاع دے دی تھی۔"

"ہاں انہیں معلوم ہو چکا ہے، اصل میں کچھ عجیب سی پراسرار کیفیت ہے، یہ بات شاید ان کے علم میں پہلے سے تھی کہ یہاں اس عمارت میں ہمیں کوئی خطرہ پیش آسکتا ہے، انہوں نے اس خطرے کو ذہن میں رکھا تھا اور وہاں سے روانہ کرتے ہوئے اس عمارت میں ہوشیار رہنے کی ہدایت کر دی تھی، اب باقی بات انہوں نے نہیں بتائی یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔"

"تم نے انہیں اطلاع دے دی کہ عمارت میں ہم پر حملہ ہوا تھا؟"

"ہاں۔"

"کچھ کہا تو نہیں۔"

"بس اپنے طور پر بھی انہوں نے معلومات کر کے مجھے بتایا کہ مسٹر ہیمو بھی زندہ سلامت ہیں انہیں تلاش کرو، چونکہ تماسرا میں ان کے پاس وقت گزارنے کے لیے کچھ نہیں ہے اور تمہیں یہاں کے بارے میں معلومات بھی حاصل نہیں ہیں، اچھا میں تھوڑی دیر کے بعد تمہارے پاس آتا ہوں۔"

میں ٹھنڈی سانس لے کر اس کمرے کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا تھا، پتا نہیں کیوں دل میں مایوسی اور بددلی کی لہریں اٹھ رہی تھیں، ابھی تک موہنی کا کوئی نشان نہیں ملا تھا، وہ مل جائے تو بس یہاں سے نکل جاؤں اور اس کے بعد کوئی بالکل ہی مختلف فیصلہ کروں، یعنی یہ کہ اس زندگی سے اپنا نام و نشان ہی مٹالوں اور موہنی کی خواہش کے مطابق ایک ایسے شخص کی زندگی بسر کروں جو بالکل معمولی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس طرح تو مجھے وہاں بھی جگہ مل سکتی ہے جہاں سے مجھے دودھ سے مکھی کی طرح نکال پھینکا گیا ہے، یعنی میرا وطن میری جنت، ان سے رابطے بھی ختم کر لوں جو شاید

اب مجھے بھول بھی گئے ہوں گے، کیا فائدہ لکیریں پیٹنے سے کیا حاصل، سب کچھ بے کار ہوتا ہے، رشتے ناتے بھلائے نہیں جا سکتے۔ نجانے کیا کیا سوچیں ذہن پر سوار رہیں پھر مورے آ گیا۔

"آؤ۔" اس نے کہا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں؟"

"مسٹر گوم تمہیں طلب کرتے ہیں۔"

"موجود ہیں۔"

"ہاں آجاؤ۔" اس نے کہا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا، دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں، لیکن میں نے اس دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھال لیا، ڈکٹر گوم ایک بہت ہی قیمتی صوفے پر بیٹھا ہوا تھا، بدشکل، بدنما اور ایسی مکروہ شخصیت کا مالک جسے دیکھ کر دل میں صرف نفرت کی لہریں ہی بے دار ہو سکتی ہیں، اس نے نرم لہجے میں مجھ سے کہا۔

"آؤ بیٹھو ڈیئر ہیمو۔" اور میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"مسٹر ہیمو، جب کوئی میرے سامنے آتا ہے تو مسلح نہیں ہوتا اور ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے کیونکہ اس سے دوسرے کی شخصیت متاثر ہوتی ہے۔"

میرے پورے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ بات یہ نہیں تھی کہ اس نے میرے پاس ریوالور کا اندازہ لگا لیا تھا بات یہ تھی کہ اس نے اس پر اعتراض کیا تھا، لیکن میں نے بھی دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"سوری سر، آپ جانتے ہیں کہ مجھے آپ کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔" میں نے بغلی ہولسٹر سے پستول نکال کر سامنے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا، مورے میرے ساتھ ہی موجود ہے ڈکٹر گوم نے مورے سے کہا۔

"اسے باہر لے جاؤ، امانت کے طور پر اپنے پاس رکھو۔ جب مسٹر ہیمو اس کمرے سے باہر نکلیں تو ان کی امانت انہیں واپس کر دی جائے۔"

مورے نے پستول اٹھایا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اندر دو افراد اور بھی موجود تھے جو خاموش صوفے کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے جس پر ڈکٹر گوم بیٹھا ہوا تھا، میں خاموشی سے ڈکٹر گوم کو دیکھتا رہا، پھر اس نے کہا۔

"بات اصل میں یہ ہے مائی ڈیئر ہیمو کہ میری آنکھیں کبھی کبھی کیمروں کا کام کرتی ہیں اور وہ چیزیں تلاش کر لیتی ہیں جن کی تلاش دوسروں کے لیے ناممکن ہو، خیر چھوڑو میں تمہیں ایک دلچسپ چیز دکھانا چاہتا ہوں۔"

نجانے کیوں مجھے ڈکٹر گوم کی باتوں سے مکاری محسوس ہو رہی تھی، لیکن کسی بھی طرح کی جلد بازی نقصان دہ ہو سکتی ہے، میں خود کو سنبھالے ہوئے تھے، اس نے ہاتھ اٹھایا اور پیچھے کھڑا ہوا ایک شخص اپنی جگہ سے متحرک ہو گیا، سامنے رکھے ہوئے ایک سائیڈ ریک سے اس نے ایک جدید طرز کا ٹیپ ریکارڈر نکالا اسے سامنے رکھ کر ریموٹ کنٹرول سے اس کا کیسٹ ریوائنڈ کرنے لگا اور پھر ریوائنڈ ہو جانے کے بعد اس نے یہ کیسٹ پلے کر دیا، چھوٹے سے ٹیپ ریکارڈر سے جو آواز ابھری تھی وہ انتہائی زبردست تھی، اتنی صاف کہ اس ریکارڈنگ پر حیرت ہوتی تھی، آواز نے جو ایک بھاری بھرکم مرد کی آواز تھی۔

"مسٹر ڈکٹر گوم۔"

"ہاں بول رہا ہوں۔"

"مسٹر ڈکٹر گوم، تماسرا میں آپ کی آمد میرے لیے بڑی حیرت کا باعث تھی، لیکن بعد میں کچھ تھوڑی سی صورت حال میرے علم میں آگئی اور میں حیران رہ گیا، مسٹر ڈکٹر گوم آپ جیسا زیرک آدمی بھی دھوکہ کھا سکتا ہے کسی سے، یہ بات بے شک باعث حیرت تھی، لیکن پھر جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ آپ کو دھوکہ دینے والی شخصیت کون ہے تو میں مطمئن ہو گیا کیونکہ یہ شخص جو کچھ ہے مسٹر ڈکٹر گوم، آپ شاید نہ سمجھ سکیں میں آپ کی معلومات کو چیلنج نہیں کر رہا، لیکن اس کے بارے میں....."

"دیکھو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں بے کار بیٹھا ہوا

ہوں مجھ سے ٹو دی پوائنٹ بات کرو۔"

جواب میں ہلکی سی ہنسی سنائی دی پھر اس نے کہا۔

"مسٹر وکٹر گوم اگر میں آپ کو اپنی شخصیت کے بارے میں بتا دوں تو آپ بخوشی مجھ سے نجانے کتنے وقت تک گفتگو کرنا پسند کریں' خیر چھوڑیئے' ہر جگہ شخصیتیں ہی کام نہیں آتیں' کہیں کہیں دوستی بھی کام آجاتی ہے' اس بات کا علم تو آپ کو ہو ہی گیا ہو گا کہ وہ لڑکی جسے آپ نے اپنے قبضے میں کیا ہوا تھا اور جس کا تعلق مسٹر شہزاد سے تھا آپ کے پاس سے غائب ہو گئی ہے۔"

"کیا مطلب' کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اب وہ میرے قبضے میں ہے۔"

"تم نے ایک مجرمانہ عمل نہیں کیا؟"

"نہیں مائی ڈیئر وکٹر' تمہیں اندازہ نہیں ہے میں نے معلومات حاصل کرنے کے بعد اس لڑکی کو اغوا کیا ہے' وہ بین الاقوامی نوعیت کی حامل ہے' شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو کہ اس وقت دنیا کے بہت سے ملکوں کو شہزاد کی تلاش ہے ان میں ایک قدر مشترک ہے وہ سب کسی نہ کسی طرح اسرائیلی مفادات سے منسلک ہیں' تم یہ سمجھو کہ ایک معمولی مقصد کے لیے تم ایک بہت بڑی چیز کو استعمال کر رہے تھے' اس لڑکی کو اگر تم سے حاصل کر لیا جاتا تو ایک عظیم نقصان اٹھانا پڑتا ہم لوگوں کو' تم نے کبھی میلان گروپ کے بارے میں سنا ہے؟"

"ہاں سنا ہے۔"

"دنیا میں صرف دو ہی بڑے آرگنائزیشن تھے' جن میں اب میلان گروپ ہی رہ گیا ہے اور اب اس وقت دنیا' میلان گروپ کے کاروباری اصولوں پر چل رہی ہے اور میلان گروپ کو اگر کسی شخص سے کوئی تباہ کن نقصان پہنچا ہے تو وہ مسٹر شہزاد ہے' سمجھ رہے ہو نا تم۔" ایک منٹ کے لیے خاموشی چھا گئی' آواز پھر ابھری۔

"مسٹر شہزاد جو ایک بہت ہی خوف ناک شخصیت کا نام ہے' اب میں اس کی تعریف میں اور زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا بس تم یہ سمجھ لو کہ شہزاد اس وقت نجانے کس حیثیت کا حامل ہے اور نجانے کس کس کو اس کی ضرورت ہے' مائی ڈیئر مسٹر وکٹر' شہزاد کے بارے میں اگر معلومات حاصل کرو تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ اس بھیانک شخصیت سے' بہت بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں اور یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ وہ موہنی سے بہت محبت کرتا ہے' برا مت ماننا ہم نے موہنی کو بے شک وہاں سے حاصل کر لیا ہے جہاں تم نے اسے پوشیدہ رکھا تھا' لیکن یہ ایک مجبوری ہے' تم اس مجبوری کا جو بھی معاوضہ مجھ سے طلب کرو گے میں تمہیں ادا کروں گا۔"

"کیا تم مجھ سے واقف نہیں ہو مائی ڈیئر نامعلوم؟"

"اچھی طرح واقف ہوں براہ کرم کوئی دھمکی مت دینا' بس اب میں تمہیں آخری معلومات فراہم کر رہا ہوں اور اس کے بعد تم خود فیصلہ کر لینا میرا یہ عمل کس حیثیت کا حامل ہے۔"

"کیسی معلومات؟"

"مسٹر شہزاد تمہاری شہہ رگ کے قریب ہے' وہ بڑی محنت اور چالاکی کے ساتھ تمہاری قربت حاصل کر چکا ہے اور تم اس بات پر یقینی طور پر حیران رہ جاؤ گے کہ تمہاری جیسی شخصیت کو شہزاد نے ٹریپ کر لیا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"مسٹر ہیمو کی حیثیت سے جو شخص تمہارے قریب آچکا ہے وہ ہیمو نہیں بلکہ مسٹر شہزاد ہے۔"

"اب غالباً" تم خود کو سامری جادوگر ثابت کرنا چاہتے ہو۔" وکٹر گوم کی آواز ابھری۔

"نہیں' سامری جادوگر نہیں۔ تمہارا دوست تمہارا ہمدرد' تمہارا ساتھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت اسرائیل کے سربراہان اس وقت جب تم مجھ سے منحرف ہو جاؤ تمہیں اس بات کی ہدایت کریں کہ مجھ سے تعاون کرو۔"

"تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہیمو اصل میں شہزاد ہے۔"

"ہاں۔۔۔ اگر وہ تمہاری دسترس میں آجاتا ہے تو اس بات کی تصدیق کر لینا اس کے چہرے پر میک اپ ہے' سنو۔۔۔ موہنی ہمارے پاس موجود ہے اور اگر شہزاد تمہارے پاس آجائے تو تم اسے ہمارے حوالے کر دو' نتیجے میں تم جو بھی چاہو گے وہ تمہیں حاصل ہو جائے گا' جب تم مسٹر ہیمو کی شکل میں شہزاد کو میرے حوالے کر دو گے تو میں تم پر ظاہر کر دوں گا کہ میں کون ہوں؟"

"بس میں فون بند کر رہا ہوں۔" اس کے بعد ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ کی آواز ابھری اور آواز بند ہو گئی' اس شخص نے ٹیپ ریکارڈ واپس اپنی جگہ رکھ دیا تھا۔

وکٹر گوم کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی تھی اور وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا' اب ایسے حالات میں میری جو کیفیت ہونی چاہیے تھی اگر آپ زندگی میں کبھی اس کے ایک فیصد سے بھی گزر چکے ہوں تو آپ کو میری اس کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے' میں دل ہی دل میں اپنے آپ پر ہنس رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ شہزاد میاں کسی انسان کی زندگی کے حالات اس سے زیادہ دلچسپ ہو سکتے ہیں' اب کیا کرنا چاہیے' دو خطرناک دشمن ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے' طاقت اور ذہانت دونوں کا مظاہرہ تھا' اس وقت طاقت وکٹر گوم کے پاس تھی کیونکہ میں اس کے گھر کی چار دیواری میں تھا اور اس کی شخصیت معمولی نہیں تھی' کم از کم ہر جگہ غلط حساب کتاب نہیں کرنا چاہیے' نقصان اٹھانا پڑ جاتا ہے' یہاں سے نکلنے کی کوشش اور اس کے بعد اس کے نتائج پر غور کرنے کی ضرورت نہیں تھی' فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔

وکٹر گوم نے بھی غالباً" یہ چند لحات سوچنے کے لیے دیے تھے' اس کے بعد اس نے مدہم لہجے میں کہا۔

"بڑی سادہ سی بات ہے اور میں نے ایک بہت ہی مختصر راستہ اختیار کیا ہے اس بارے میں' اگر میں تم سے یہ سوال کروں مائی ڈیئر مسٹر ہیمو کہ کیا یہ سچ ہے تو تمہارا جواب کیا ہو گا۔" مجھے ایک دم ہنسی آگئی' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دل تو یہی چاہتا ہے مسٹر وکٹر گوم کہ آپ سے جھوٹ بولوں اور یہ کہوں کہ جس نے بھی آپ کو یہ کہانی سنائی ہے وہ جھوٹ بول رہا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا جھوٹ کارگر نہیں ہو سکتا' ظاہر ہے اس دور میں بڑی آسانی سے کسی کے چہرے کی شناخت کی جا سکتی ہے۔ اگر آپ ایمونیا سے میرا چہرہ دھلوا لیں گے تو میک اپ اتر جائے گا اور اس کے نیچے سے شہزاد کا چہرہ برآمد ہو گا۔"

میرے ان الفاظ پر وکٹر گوم کے چہرے پر شدید سنسنی نظر آئی تھی' لیکن چالاک آدمی تھا اپنے آپ کو سنبھالنا جانتا تھا' البتہ اس کے مکروہ چہرے پر مدہم مسکراہٹ پھیل گئی پھر وہ آہستہ سے بولا۔

"بے حد خوب صورت اعتراف ہے' ویسے ڈیئر شہزاد' تم بذات خود بھی معیاری انسان ہو میں اس بات کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا تو گویا تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ تم شہزاد ہو۔"

"ہاں جن لوگوں نے یہ انکشاف کیا ہے وہ معمولی لوگ نہیں ہیں مائی ڈیئر وکٹر گوم' یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور میں بھی۔"

"ہاں میلان گروپ میں میرا خیال ہے سو فیصد افراد میرے ہم نسل ہی نہیں بلکہ میرے ہم وطن ہیں' بڑی دلچسپ بات ہے یہ' ویسے تم یقین کرو میں نے خود بھی تمہارے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے اور ایک بار میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی تھی کہ ذرا میں بھی تو تمہیں چھو کر دیکھوں آخر کیا چیز ہو تم۔ سنا یہ گیا ہے کہ تم نے اسرائیلی مفادات پر بے شمار حملے کیے ہیں اور جنگی محاذ پر نہیں بلکہ اندرونی محاذ پر زبردست نقصانات پہنچائے ہیں' بنیادی طور پر میری ذمے داریاں مختلف تھیں' لیکن کیا ہی دلچسپ بات ہے کہ تقدیر نے ہمیں اس طرح ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کیا ہے۔ بہرحال تمہارا یہ اعتراف اور اس کے پس منظر میں تمہاری کاوشیں یقین کرو میرے دل میں تمہارے لیے ایک عزت کا احساس پیدا کرتے ہیں' اگر مناسب سمجھو شہزاد تو اپنی زندگی سے مجھے تھوڑا سا روشناس کراؤ' دیکھو

تم جیسا ایک حقیقت پسند آدمی حقیقتوں سے کبھی روگردانی نہیں کرے گا' اس بات کا مجھے یقین ہے اس وقت اس عمارت میں تقریباً" پچاس افراد موجود ہیں' جن میں سے دس کی ذمے داریاں مختلف ہیں' لیکن چالیس افراد مسلح ہوتے ہیں اور عمارت کے چپے چپے پر اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں اور اس وقت بھی وہ غیر مستعد نہیں ہیں' ویسے تو سب چلتا ہے لیکن کوئی جسمانی کاریگری نہ کرو تو زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ اس سے تمہیں نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے' کیا خیال ہے؟"

"بالکل نہیں مسٹر وکٹر' جب آپ دو سنجیدہ آدمیوں کی بات کر چکے ہیں تو میں یہ غیر سنجیدگی نہیں کروں گا' میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

"اور میں اس وعدے پر بھرپور یقین رکھتا ہوں۔" وکٹر نے کہا اور میں اس کے اس پینترے پر غور کرنے لگا۔ خیر یہ تو سوچنا ہی غلط تھا کہ وہ ایک انتہائی شاطر آدمی نہیں ہے' کریلا اور نیم چڑھا ہوا تھا' یعنی پہلی بات تو یہ کہ تعلق اسرائیل سے تھا اور یہودی نسل تھا' دوسری بات یہ کہ ایک خطرناک محکمے کا سربراہ تھا' میں بھی مستی میں آگیا اور میں نے سوچا کہ اگر دماغ کا کھیل ہے تو آؤ وکٹر یہ کھیل بھی کھیل لیتے ہیں۔ چنانچہ دماغی کھیل جاری ہوگیا' میں نے چہرے پر ایسے تاثرات پیدا کیے جنہیں دوستانہ کہا جاسکتا تھا اور مسکرا کر بولا۔

"کچھ وقت کے لیے انسان اپنے آپ کو ماحول کو اور حالات کو بھول جاتا ہے' کبھی کسی کو دھوکہ دینے کے لیے کبھی کسی سے دھوکہ کھانے کے لیے اور کبھی ان دونوں میں سے کوئی مقصد نہیں ہوتا' بلکہ ذہن و دل کے راستے کھل جاتے ہیں اور ان پر ہلکی ہلکی چہل قدمی کرنے میں لطف آتا ہے۔"

"واہ۔ میں شاعری نہیں جانتا' نہ کبھی شاعری کی' انسانی فطرت کی عکاسی کو اگر شاعری کہا جاسکتا ہے تو اس وقت بہت ہی خوب صورت الفاظ میں تم نے اس کا تذکرہ کیا ہے' شہزاد تمہارے بارے میں میرے پاس ایک چھوٹا سا ریکارڈ ہے۔ اپنے وطن میں تم ایک سرمایہ دار کی حیثیت سے ابھرے' سنا گیا ہے کہ تمہارے والد ایک افریقی ملک میں تجارت اور کاروبار کرتے تھے اور وہاں سے تمہیں اپنے وطن آنے کی سوجھی اور تم نے وہاں اپنے اثاثے فروخت کرکے اپنے وطن کا رخ کیا اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کے دانت کھٹے کردیے۔"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی' میں نے کہا۔

"ڈیئر وکٹر گوم' یہ سب کچھ بالکل غلط ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اپنے وطن میں ایک عمارت میں آنکھ کھولی' ہماری جائیدادیں زمینیں تھیں' جن سے مجھے دستبردار کردیا گیا' پھر اپنے طور پر زندگی کا آغاز کیا' کاروباری طور پر سازشوں کا شکار ہوگیا یہاں تک کہ اپنے ہی وطن میں مجرم قرار پایا۔ ایک لڑکی سے محبت کی اس سے شادی کرلی' اپنی دولت سمیٹ کر لندن میں آکر آباد ہوگیا' دل میں یہی خیال تھا کہ اب بقیہ زندگی یہیں گزاروں گا' لیکن پھر ابدل شاہ آگیا' وہ ایک علاقے میں ٹرالروں کے درمیان جنگ و جدل میں مصروف تھا' ہم وطن ہونے کے رشتے سے اس کے ساتھ تعاون کیا' یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کسی اور کام میں ملوث ہے' یہ بعد میں ہی پتا چل سکا تھا' جب تم میرے راستے میں آئے تو ابدل شاہ فائل لے کر ڈور کے راستے نکل گیا اور میں تمہارے جال میں پھنس گیا' میری بیوی تمہارے ہاتھوں میں پہنچ گئی اور اس کے بعد اس کی تلاش میں سرگرداں ہو کر یہاں تک آگیا' یہاں میری ملاقات ایک جوڑے سے ہوئی اور اس نے مجھے مسٹر ہیمو کی حیثیت دے دی۔"

میں نے ایک ایک لفظ سچائی کے ساتھ وکٹر گوم کو بتایا تھا' سوائے ان اہم باتوں کے جو میں کسی کو بھی نہیں بتا سکتا تھا اور وکٹر گوم کے چہرے پر حیرت کے نقوش صاف دیکھے جاسکتے تھے' وہ گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لے رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ میری آنکھوں میں سچائی تلاش کررہا ہے اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ بے وقوف آدمی نہیں ہے' دنیا گزار چکا ہے اور کریلا اور نیم

چڑھا ہے۔ گویا وہ میری آنکھوں میں سچائی تلاش کررہا تھا اور میں نے یہ سچائی اپنی آنکھوں میں قائم رکھی تھی' تب اس کے منہ سے دکھ بھرے انداز میں نکلا۔

"ابدل شاہ پاکستان نکل گیا۔"

"بہت بری بات ہے۔"

"میں تسلیم نہیں کرتا۔"

"اس کے بعد میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں سچ نہیں بولوں گا۔" میں نے پتھریلے لہجے میں کہا وہ مجھے گھورتا رہا اور پھر ہنس پڑا' پھر بولا۔

"تمہیں چڑانے کے لیے یہ بات کہی تھی میں نے' تم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ ابدل شاہ نکل گیا۔"

"اور تم نہایت ناکارہ آدمی ہو کہ یہ چھوٹی سی بات معلوم نہیں کرسکتے۔" میں نے کہا اندازہ یہ تھا کہ وکٹر گوم میری اس بات پر ناراض ہوجائے گا' لیکن وہ مجھے دیکھتا رہا مسکراتا رہا پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"سارا کھیل پلٹ دیا تم نے تو' سنو ہم لوگ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ کہاں کامیاب ہوئے اور کہاں ناکام رہے' بات اصل میں یہ ہے کہ کامیابی کے ساتھ ناکامی کا تصور دن اور رات کے تصور جیسا ہی ہی' نہ ہی میں نے اپنے حلف نامے میں اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اسرائیل کے لیے ہر وہ ضرورت پوری کروں گا جو میرے بس میں ہو یا نہ ہو' بڑا اہم معاملہ تھا' بال دونوں طرف آجا رہی تھی' ہماری سائیڈ گول ہوگیا' ہوگیا اب اس کا کیا سوال ہے کہ اس کے لیے زندگی اور موت کی ذمے داری قبول کروں' لیکن میری جان تمہارے بارے میں سوچنا پڑے گا' اچھا خیر چھوڑو یہ بتاؤ اب تم کیا چاہتے ہو۔"

"دیکھو میں تمہیں ایک بات بتا دوں' لندن سے لے کر یہاں تک اور اب تماسرا تک ایک ہی مقصد کے تحت آیا تھا کہ موہنی کو حاصل کرلوں اگر یہ ٹیپ ریکارڈر اور اس پر ہونے والی گفتگو فریب نہیں ہے تو اتنا مجھے اندازہ ہے کہ موہنی غلط ہاتھوں میں چلی گئی' لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ میلان گروپ میں ستر فیصد یہودی ہوں یا نوے فیصد۔ موہنی کو اگر نقصان پہنچ گیا ان کے ہاتھوں تو اتنی تباہی نازل کروں گا ان کے مفادات پر اتنی ضربیں لگاؤں گا کہ شاید وہ خود اپنے کیے پر پچھتاتے رہیں گے۔ بہرحال اب اس وقت صورت حال تمہارے ہاتھ میں ہے' میں غیر مسلح ہوں اور تم پوری ایک مسلح فورس رکھتے ہو' مجھے ختم کردو' اس میں تمہارا اور تمہاری قوم کا بھلا ہے' میلان گروپ کا بھلا ہے۔"

وہ مسکراتی نگاہوں سے میرا چہرہ دیکھتا رہا پھر بولا۔

"میری ماں بہت عرصے پہلے مرچکی ہے' باپ ابھی زندہ ہے' بہت بوڑھا ہے اور یقین کرو بے حد خوب صورت آدمی ہے' میرے چہرے کے کسی نقش میں اس کا نشان نہیں ملتا' دو باتیں کہتا ہے وہ' پہلی بات تو وہ یہ کہتا ہے کہ ایک بہت بڑے نجومی نے اس کا ہاتھ دیکھ کر اسے بتایا تھا کہ اس کی تقدیر میں اولاد نہیں ہے' نجومی اتنا ماہر فن تھا کہ میرا باپ اس پر بے پناہ یقین رکھتا تھا' لیکن میں پیدا ہوگیا' میری پیدائش سے لے کر آج تک میرا باپ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے کہ میں اسی کی تقدیر میں تھا' وہ ہمیشہ میری ماں سے کہتا رہا کہ میں اس کا بیٹا نہیں ہوں' اس نے ہمیشہ اپنے آپ کو میرے نقوش میں تلاش کیا اور ناکام پایا' شاید یہی وجہ ہے کہ میں فطرتاً" خالص یہودی نہیں ہوں' کہیں کوئی ملاوٹ ہے مجھ میں' اگر میں خالص یہودی ہوتا تو اس وقت تمہیں میلان گروپ کے حوالے کر کے بہت سے مفادات حاصل کرتا لیکن کیا کروں ملاوٹ سے مجبور ہوں' ابھی کچھ وقت لگے گا' مجھے وقت چاہیے تمہاری داستان میں کچھ باتیں ہیں جو مجھے مجبور کررہی ہیں کہ میں میلان گروپ کے بجائے تمہارے ساتھ تعاون کروں' یہ زیادہ بہتر رہے گا اور میں یہ کرنا چاہتا ہوں۔"

میں دل ہی دل میں ہنس پڑا تھا' اپنے بارے میں اس سے زیادہ عمدہ تشریح شاید ہی میں نے کبھی سنی ہو' لیکن میں بچھو کے ڈنک سے اچھی طرح واقف تھا' اگر آپ کی گود میں بچھو بیٹھا ہوا ہو اور آپ اس کے ساتھ پیار

کا سلوک کررہے ہوں تب بھی ڈنک ضرور مارے گا اور آپ کو زخمی کردے گا'' لیکن وکٹر گوم نے میری یہ مشکل بھی حل کردی اور کہا۔

''اور یہ نہ سمجھنا کہ یہ ایثار یہ احسان میں تم پر بے مقصد کررہا ہوں' ہر انسان کا اپنا اپنا ایک شوق ہوتا ہے ایک عمل ہوتا ہے' ان تمام حالات کے بعد اگر کوئی احمق وطن کی محبت کی بات کرے تو دیوانے کے علاوہ ہم اسے اور کیا کہہ سکتے ہیں' ہاں انسان کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے ایک معیار ہوتا ہے' اس کے مطابق اسے عمل کرنا چاہیے ہوسکتا ہے میں موہنی کے حصول کے لیے تمہاری مدد کرسکوں۔ بات بے شک بڑی عجیب ہے لیکن میری جان میں تمہاری ان تمام باتوں کو سچ تسلیم کرچکا ہوں' ابدل شاہ نکل گیا' ٹھیک ہے ایک الگ ہی مسئلہ ہے اور اس کے بعد اب جو صورت حال ہے وہ یہ ہے کہ موہنی کو تمہارے حوالے کرکے ہوسکتا ہے میں تمہیں تمہارے وطن واپس بھیجوں' تمہارا دوست بن کر اور وہاں سے کچھ ایسے مفادات حاصل کروں جو میرے لیے ناکامی کا باعث ہوں اور یہ سب کچھ کہتے ہوئے میں ایک بار پھر یہ تم سے کہوں گا کہ بہتر ہوگا کہ اپنے آپ کو ابھی کچھ وقت کے لیے شہزاد سمجھنے کے بجائے مسٹر ہیمر ہی سمجھو۔ ہیمر زیادہ بہتر رہے گا تمہارے لیے' ہاں ایک سب سے اہم سوال تو رہ ہی گیا۔''

''وہ کیا مسٹر گوم؟''

''ڈیٹی مورسن کو تم نے کس طرح حاصل کیا اور مسٹر جیک مورسن کے حوالے کیوں کیا؟''

''بہت سیدھی سی بات ہے مسٹر وکٹر گوم؟''

''براہ کرم مجھے بتاؤ۔''

''آپ تک قربت اور رسائی حاصل کرنے کے لیے میں چاہتا تھا کہ آپ تک پہنچنے کے بعد موہنی کے حصول کی کوشش کروں۔''

''ویری گڈ' بہرحال شہزاد ایک وسیع مفاد کے لیے میں دوستانہ طور پر تم سے یہی کہتا ہوں کہ جس طرح بھی بن پڑے اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا' میں تمہارے ساتھ کوئی چالبازی کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں' میں نے اپنا موقف اسی طرح بیان کردیا ہے تمہارے سامنے جس طرح تم نے میرے سامنے سچائی سے سب کچھ کہہ دیا ہے' چنانچہ بہتر یہ ہوگا کہ کچھ وقت اطمینان سے آرام کرو اور اس کے بعد جو کچھ میں کہوں اس پر عمل کرتے رہو' میں جانتا ہوں کہ میلان گروپ اس بات سے واقف ہے کہ تم اس وقت میری تحویل میں ہو ٹیپ ریکارڈر پر ہونے والی گفتگو سے تم نے اس کے بارے میں اندازہ لگالیا ہے اور جب تم نے اس کی ساری سچائی کا اعتراف کرلیا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ لوگ انتہائی بااثر لوگ ہیں' ایسے حالات میں ہمیں چالاکی سے یہ کام کرنا پڑے گا' بلکہ عارضی طور پر تم ہیمر کا میک اپ بھی ختم کردو' میں تمہیں بالکل ہی ایک نیا روپ دیئے دیتا ہوں' ورنہ دوسری شکل میں تم یہ سمجھ لو کہ میلان گروپ کے کرتا دھرتا کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں اور وہ تم تک پہنچنے کی کوشش کریں گے' یہ الگ بات ہے کہ وہ مجھ سے کوئی جھگڑا مول لینا پسند نہیں کریں گے' لیکن وہ تمہیں تمہاری بیوی کے نام پر بے اختیار کرسکتے ہیں' جانتے ہو میں ان لوگوں سے کیا کہوں گا' میں ان سے کہوں گا کہ شہزاد میرے چنگل سے نکل گیا اس کے لیے میں ایک باقاعدہ ڈرامہ رچاؤں گا اور خود اپنے آدمیوں کے ساتھ تمہیں تلاش کروں گا' سمجھ رہے ہو نا' یہ سارا کام میں اس لیے کروں گا کہ ابدل ساہ جو فائل واپس لے گیا ہے وہ تمہارے ذریعے مجھ تک پہنچے اور میری جان میں ایسے کام کرلیا کرتا ہوں اور مجھے ان میں کوئی دقت نہیں ہوتی' ٹھیک ہے کیا خیال ہے' مجھ سے تعاون کروگے؟''

جواب میں' میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''مسٹر وکٹر گوم' میں جانتا ہوں کہ ابھی ہم دونوں کو ایک دوسرے پر اعتماد کرنے میں وقت لگے گا اور اس وقت آپ مجھ سے ہزار درجے بہتر پوزیشن میں ہیں۔ اس وقت تک جب تک میرے ذہن میں آپ کی پشت پر ڈنک مارنے کا خیال نہ آئے' بہتر ہوگا کہ آپ مجھ پر اعتماد کریں اور میں وہی کروں گا جو آپ کہہ رہے

ہیں۔'' وکٹر گوم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا' پھر اس نے کہا۔

''بہت ہی پیاری شخصیت کے مالک ہو تم' کاش میری نسل کے ہوتے تو میری اور تمہاری دوستی مثالی حیثیت اختیار کرلیتی' خیر تو اب تم فی الحال اپنے آپ کو وکٹر گوم کا ساتھی سمجھو' میں ایک ایسے شخص کو تمہارے پاس بھیجوں گا جو تمہارے چہرے پر میک اپ کردے گا اور اس کے بعد میرا دوسرا آدمی تمہیں وہ حالات بتائے گا جس کے تحت کچھ سمجھے بوجھے بغیر تم خود کو ان حالات میں ڈال لوگے' سمجھ لو میلان گروپ کے لیے کام کرنے میں ایک بہت عمدہ قدم ہوگا' تمہیں تھوڑا سا کام فلسطینی گوریلوں کے خلاف کرنا ہوگا' تم یہ سمجھ لو کہ کام بہت مختصر ہوگا لیکن اس سے تمہیں جو استحکام حاصل ہوگا وہ الگ حیثیت رکھتا ہے۔''

میں اس کے لیے تیار ہوگیا تھا اور پھر سارے کام اسی انداز میں ہونے لگے جس انداز میں وکٹر گوم نے کہا تھا' ہم جدا ہوگئے مجھے اس عمارت کے ایک دوسرے کمرے میں پہنچادیا گیا۔ کافی وقت آرام کرنے کے لیے ملا اور یہاں موجود لوگوں سے میری شناسائی ہوتی چلی گئی۔

پھر وہ شخص بھی آگیا جس نے میرے چہرے پر میک اپ کرنا تھا' اور پھر اس کے بعد مجھے اس سلسلے میں بتایا جانے لگا' میرا میک اپ ایک نوجوان اور خوب صورت آدمی کا تھا اور میں مسٹر ہیمر سے اسٹوارٹ بن گیا۔ اسٹوارٹ کی شخصیت کو بڑی انوکھی حیثیت حاصل تھی' مجھے اس کے بارے میں بتادیا گیا اور اس کے بعد میری رہنمائی ایک ایسی شخصیت کی طرف کی گئی جس کا نام شائنا تھا۔ ایک فرم میں ملازمت کرتی تھی اور اس کی رہائش گاہ کے بارے میں مجھے گائیڈ کردیا گیا اور ایک ایسی تفصیل بتائی گئی جو بہرحال غیر دلچسپ نہیں تھی۔

اسٹوارٹ کے میک اپ میں جب میں وہاں سے آگے بڑھا تو میرے ذہن میں بہت سے منصوبے تھے' میرا میک اپ ایک تصویر کے ذریعے کیا گیا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ میک اپ مین ایک باکمال آدمی تھا' اس نے ہو بہو مجھے تصویر کے مطابق بنادیا تھا' بہرحال تھوڑی دیر کے بعد میں ایک ٹیکسی لے کر مطلوبہ علاقے کی جانب چل پڑا' مطلوبہ علاقے کی ایک خوب صورت عمارت میں فلیٹ نمبر پندرہ تلاش کرنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی' میں نے بیل بجائی تو چند لمحات کے بعد دروازہ کھل گیا' اس دروازے میں مجھے وہ لڑکی نظر آئی جس کے بارے میں مجھے تفصیل بتادی گئی تھی' خوش شکل لڑکی تھی اور چہرے کے نقوش میں دو ایسی چیزیں تھیں جنہیں بے حد پرکشش کہا جاسکتا تھا' نچلے ہونٹ کے درمیان ایک ہلکا سا خم اور اسی خم کا دوسرا حصہ تھوڑی کے گڑھے میں' عمر تیئیس یا چوبیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی' مجھے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ ساکت رہ گئی تھی' پھر اس نے بڑی پھرتی سے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اندر کھینچ لیا' اس کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

''میرے خدا' میرے خدا' کیا واقعی یہ تم ہی ہو اسٹوارٹ؟''

''ہاں شائنا میں ہی ہوں۔'' میں نے کہا' اس نے جلدی سے دروازہ بند کردیا اور پھر پر اضطراب لہجے میں بولی۔

''آؤ اندر آؤ' میرے خدا اگر تم ایک دو دن اور نہ ملتے تو ہمیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا' تمہیں یہ جان کر ضرور دکھ ہوگا کہ جون کو شدید زخمی کردیا گیا ہے اور وہ اسپتال میں پہنچ چکا ہے' آہ بات اگر اسپتال تک ہی رہتی تو شاید ہم اس کی دیکھ بھال کرکے اسے درست کرلیتے' لیکن اسے اسپتال سے اغوا کرلیا گیا ہے' ان لوگوں نے آٹھ آدمیوں کو قتل کردیا ہے صرف جون کو اغوا کرنے کے چکر میں اور جن لوگوں نے انہیں دیکھا ہے وہ پورے اعتماد سے کہتے ہیں کہ وہ کمانڈوز ہی تھے۔''

''اوہ۔'' میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا' میرا انداز ایسا تھا جیسے جون پر پڑنے والی یہ بپتا میرے لیے بڑی پریشان کن ہو' شائنا نے آہستہ سے کہا۔

''آؤ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا ہے' لیکن تمہاری

گمشدگی میرے لیے بڑی خوفناک تھی۔" پھر وہ مجھے ایک ڈرائنگ روم میں لے گئی تھی، مجھے صوفے پر بٹھاتے ہوئے اس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"لیکن تم کہاں گم ہوگئے تھے، تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارے گم ہوجانے سے کیا صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔"

"ہاں شائنا، میں انتہائی خطرات میں گھر گیا ہوں، یوں سمجھ لو اس دوران مجھے اس طرح جان بچانے کے لیے چھپنا پڑا ہے جیسے شکاری کتوں سے خرگوش۔"

"ان کی دہشت گردیاں بے حد بڑھ گئی ہیں، شاید تمہیں یہ سن کر پریشانی ہو کہ اپنی فرم میں خود بھی محفوظ نہیں ہوں، میں نے اپنے اردگرد بے شمار افراد کو چکراتے ہوئے دیکھا ہے، وہ لوگ میرے بارے میں جگہ جگہ سے معلومات حاصل کررہے ہیں، تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ میں نے خفیہ طور پر یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اب میں سب کچھ چھوڑ کر یہاں سے کہیں اور روانہ ہوجاؤں، تمہارے بارے میں بہت غور کررہی تھی میں اور میری دلی آرزو تھی کہ کاش تم مجھ تک پہنچ جاؤ، دیکھو ڈیئر، تم مجھ سے انکار نہ کرنا، میں نے تم سے بڑی آس لگائی ہوئی ہے، میں چاہتی ہوں کہ ہم فوری طور پر یہاں سے نکل چلیں۔"

"کہاں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"میں نے اس کے لیے بھی جگہ منتخب کرلی ہے۔"

"کونسی جگہ؟"

"ہم ایروشائن چلیں گے۔"

"کیا دنیا سے روپوش ہوکر؟"

"نہیں بالکل نہیں۔"

"تو پھر ایروشائن ہی کیوں؟"

"وجہ ہے اس کی۔"

"کیا وجہ ہے مجھے بتاؤ تو سہی۔"

"ایسی ہی صورت حال پیدا ہوگئی ہے کہ ہمارا ایروشائن چلے جانا ضروری ہے، تمام سرا میں دہشت گردیاں بے انتہا عروج پر ہیں، تمہیں شاید اس کا اندازہ صحیح طور پر نہیں ہوسکا، تم نے یہ وقت کہاں گزارا ہے اس کے بارے میں نہیں جانتی لیکن تم یقین کرو میں نے یہ دن سولی پر گزارے ہیں اگر میرے دل میں تمہارے مل جانے کی امید نہ ہوتی تو میں کبھی کی یہاں سے فرار ہوچکی ہوتی۔"

"تم مجھے صرف ایک بات بتاؤ؟"

"کیا؟"

"کیا ہمارا ایروشائن چلنا ضروری ہے؟"

"دیکھو، میں نے کہا نا کہ اس وقت ہمارا ایروشائن پہنچ جانا بے حد ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے، مجھے اعتراض نہیں ہے، لیکن بہرحال وہاں جانے کے لیے ہمیں تو انتظامات کرنے ہی پڑیں گے۔"

"زندگی اور موت کے کھیل سے فی الحال بچنے کے لیے ہمیں یہ قدم اٹھانا پڑے گا۔"

"او کے، میں بھلا تم سے کیا انکار کرسکتا ہوں؟"

"تھینک یو ڈیئر، تھینک یو ویری مچ، لیکن تم یہ بات سمجھ لو کہ یہ عمل ہمارے لیے غیر مناسب نہیں ہوگا۔"

"میں سمجھتا ہوں، لیکن کیا تمہارے خیال میں ایروشائن تک کا سفر ہمارے لیے کسی مشکل کا باعث نہیں بنے گا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس وقت ایروشائن کے راستے بھی موت کے راستے بن چکے ہیں، لیکن ہم ایسے الجھے ہوئے راستے اختیار کریں گے جن پر سفر کرتے ہوئے ہمیں دقت نہیں ہوگی۔" شائنا نے کہا اور میں آنکھیں بند کرکے گردن ہلانے لگا۔ بہرحال اب چونکہ میں تمام تر تیاریوں کے ساتھ عارضی طور پر اپنے بدترین دشمن سے تعاون کرنے پر آمادہ ہوگیا تھا، حالانکہ میں جانتا تھا کہ وکٹرگوم کس نسل اور کس قوم کا باشندہ ہے، سانپ پر اعتبار کیا جاسکتا ہے لیکن اس قوم پر نہیں۔ لیکن اس کے بعد جو عمل ہوگا وہ وکٹرگوم کے تصور میں بھی نہیں ہوگا، بات یہاں اب جسمانی طور پر ایک دوسرے سے نمٹنے کی نہیں رہ گئی

تھی بلکہ اب ذہنوں کا مقابلہ تھا اور اس سلسلے میں اگر خوش فہمیوں کے ساتھ سوچا جائے تو میں وکٹر کو پہلی شکست دے چکا تھا، یعنی بدترین دشمن جسے جسمانی طور پر سب سے پہلے مجھے ختم کرنے کے انتظامات کرنے چاہیے تھے ویسے ایک بات ذہن میں آرہی تھی کہ کھلم کھلا ڈیشی مورسن کے بدلے موہنی کا مطالبہ کردیا جاتا تو بہتر تھا، یعنی وکٹرگوم سے کہا جاتا کہ اگر ڈیشی مورسن کو حاصل کرنا ہے تو پھر موہنی کو اس کے بدلے میں مجھے واپس دے دیا جائے، یہ تصور میرے ذہن میں آیا تھا، لیکن میں نے اس پر عمل نہیں کیا تھا اور اس کی وجہ جو تھی بہرحال میں نے اسے اپنے سینے میں محفوظ کرلیا تھا۔

غرضیکہ وکٹرگوم کے ساتھ ایک تفصیلی کام کرنے کے لیے آمادہ ہوگیا تھا اور اب ذرا محنت کے ساتھ مجھے اس کا اعتماد حاصل کرکے میلان گروپ پر ایک اور کاری ضرب لگانی تھی، یہ ذلیل لوگ صرف اس لیے میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ میں ایک وطن پرست انسان تھا اور اپنے وطن کے لیے مفادات قربان کردینے کا خواہش مند۔

بہرحال ایروشائن کے بارے میں مجھے مزید تفصیلات معلوم نہیں ہوسکتی تھیں اور اس کے لیے میں شائنا کو بھی کریدنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ اس سلسلے میں میرے لیے کارآمد نہیں ثابت ہوگی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد اس نے کہا۔

"اور ہمیں ہڈسن سے بھی ملنا ہوگا، شاید تمہیں اس بات کا علم نہ ہو کہ ہڈسن تمہارے بارے میں تشویش کا شکار تھا، وہ کہتا تھا کہ اگر مسٹر اسٹوارٹ کسی حادثے کا شکار ہوگئے تو یہ نقصان ناقابل برداشت ہوگا اور دہشت پسندوں کی خوش بختی ہوگی، بہرحال ہم اب سے کچھ دیر کے بعد اپنے کام کا آغاز کردیں گے۔"

میں نے اس کی بات پر گردن ہلادی تھی، تقدیر کے اس نئے کھیل میں میں نے خود کو حالات کے حوالے کردیا تھا، زندگی میں یہ پیچ و خم آہی گئے تھے تو اب ماضی کے مطابق ان سے بھی لطف اندوز ہونا ضروری تھا، بہرحال ہم تھوڑا وقت گزارتے رہے اور اس کے بعد شائنا کہنے لگی۔

"ڈیئر میں تمہیں تھکا تھکا محسوس کررہی ہوں۔"

"کیوں؟"

"نہیں میرا مطلب ہے کہ نجانے کیسی کیسی مشکلات سے گزرنے کے بعد تم یہاں تک پہنچے ہو، میں نے تم سے اس لیے اس بارے میں نہیں پوچھا کہ اپنی حد سے تجاوز کرنے والی بات ہوجائے گی تم لیکن بہرحال میں نے یہ پیشکش کردی ہے کیا تم اس وقت ایروشائن کے سفر کے لیے تیار ہو۔"

"ہاں کیوں نہیں، میں ہر طرح تمہارے ساتھ ہوں۔"

"او کے۔" پھر تمام تیاریاں مکمل ہوگئی تھیں، یہاں تک کہ میں شائنا کے ساتھ باہر نکل آیا اور شائنا سامنے کی عمارت کے نیچے بنے ہوئے گیراج میں سے ایک گیراج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی، میں باہر ہی اس کا انتظار کرنے لگا تھا۔ وہ اپنی کار ریورس کرکے باہر لائی تو اس نے ایک چابی میری طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

"یہ پرائیویٹ گیراج ہیں، پلیز اس کا دروازہ بند کردو۔"

میں نے گیراج کا تالا لگایا اور شائنا کے برابر آکر گاڑی میں بیٹھ گیا، اس نے گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی تھی۔

گاڑی گنجان راستوں سے گزرتی ہوئی مین شاہراہ پر آگئی۔ مین شاہراہ پر آنے کے بعد گاڑی نے بلندیوں سے نیچے کی جانب سفر شروع کردیا۔ بڑے ٹیڑھے میڑھے پرپیچ راستے تھے، لیکن شائنا بڑی مہارت سے گاڑی ڈرائیو کررہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ان علاقوں سے اچھی طرح واقف ہے، بہرحال اس سفر میں مزہ آرہا تھا، موسم بے حد خوشگوار ہوگیا تھا فضا میں ہلکی ہلکی خنکی اتر آئی تھی اور بارش کا سا موسم بن گیا تھا، پھر میں نے ایک جگہ کار رکوائی تھی۔

"شائنا، میرے خیال میں تم حد سے زیادہ خود

اعتمادی کا مظاہرہ کر رہی ہو آج۔" میں نے کہا۔

"ڈرائیونگ شائنا کے ہاتھ میں ہے۔"

"خود پر بہت ناز کرتی ہو۔"

"ڈرائیونگ کے سلسلے میں۔" اس نے کہا اور ہنس پڑی۔ پھر اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی تھی۔ ویسے یہ سفر جتنی برق رفتاری سے ہو رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ شائنا ان علاقوں سے بخوبی واقف ہے اور ان پر پیچ راستوں سے پورے اعتماد کے ساتھ سفر کر سکتی ہے۔ حالانکہ میرے اپنے اندازے کے مطابق یہ راستے بہت ہی خوفناک تھے۔

آخر کار سفر ختم ہوا میں واقعی ان جگہوں کے بارے میں بالکل نہیں جانتا تھا اور اپنی اس عدم معلومات سے خوف زدہ بھی تھا ہو سکتا ہے اسٹوراٹ ان علاقوں کے بارے میں بخوبی جانتا ہو' پھر مجھے ایک عظیم الشان عمارت نظر آئی جو قدیم دور کی بنی ہوئی تھی' عمارت دو حصوں میں تقسیم تھی' راستہ اس کے درمیان سے گزرتا تھا۔ جب ہم اس سڑک پر پہنچے تو وہاں اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بجھائی نہ دے' کار کی روشنیاں بھی نجانے کیوں زیادہ دور تک کے ماحول کو اجاگر نہیں کر پا رہی تھی' خاصی لمبی سڑک تھی' جو ان عظیم الشان پتھریلی دیواروں کے خاتمے کے بعد گہرائیوں میں اتر گئی تھی' میں نے شائنا سے کہا بھی تھا۔

"تم بہت تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کر رہیں۔"

"ایں۔ وہ چونک کر بولی۔"

"آگے بہت تاریکی ہے۔"

"ہاں۔" وہ بے خیالی میں بولی' نجانے کیا سوچ رہی تھی' بہرحال ان گہرائیوں کے نزدیک پہنچ گئی تھی' یہ گہرائیاں اچانک شروع ہو جاتی تھیں' شائنا کو ان سے واقف تھی' لیکن میں ان راستوں پر اجنبی تھا' جونہی کار ڈھلوان میں اتری تھی' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی پہاڑ سے نیچے گر پڑی ہو۔

"کیا تم مجھے ڈرائیونگ سے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟" میں نے پھر کہا۔

"تم مرعوب ہو گئے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"بالکل نہیں۔"

"تو پھر یقین کرو میں ایسی کوشش بھی نہیں کر رہی یہ میری عادت ہے۔" اس نے کہا اور اچانک کار ایک سمت روک کر بولی۔

"کیا ہوا؟ میں نے چونک کر پوچھا۔"

"بس۔"

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں؟"

"اس وقت مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔" وہ بولی تاریکی میں اس کا چہرہ تو نہیں نظر آ رہا تھا لیکن اس کی آواز میں مسکراہٹ نمایاں تھی۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہر قدم پر دوسروں کو ہدایات دینے والا اس وقت مجھ سے ایک ایک سوال پوچھ رہا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے مگر اب بتاؤ۔"

"کار یہیں چھوڑنی پڑے گی اور ہمیں ہڈسن کی بستی تک سفر پیدل کرنا ہوگا۔"

"کیا آگے سڑک نہیں ہے؟"

"صاف شفاف خوب صورت سڑک' لیکن بے حد خطرناک' رات کی تاریکیاں اس سڑک پر موت کی علامت ہوتی ہیں' یہ علاقہ خطرناک چھاپہ ماروں کی شکار گاہ ہے۔"

"مگر ہڈسن؟" میں نے سوال کیا اور وہ گہری سانس لے کر بولی۔

"ہڈسن بادشاہ ہے' عقل و دانش کا ہی نہیں بلکہ طاقت کا بھی بادشاہ۔"

"او کے۔" میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر باہر آ گیا' اس نے کار لاک کی اور پھر میرے ساتھ چل پڑی اور پھر خود ہی بولی۔

"حالانکہ بستی تک صاف شفاف سڑک جاتی ہے' اس سڑک کے بارے میں تمہیں بتا چکی ہوں ہمیں نا ہموار راستوں پر سفر کرنا ہوگا۔"

"فاصلہ کتنا ہے؟"

"زیادہ نہیں ہے آؤ۔" وہ بولی اور میں۔ اس کے ساتھ چلتا رہا پھر میں نے کہا۔

"یہاں تو دور دور تک کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی۔"

"تم نے غور نہیں کیا۔"

"کیا مطلب؟"

"ہم بلندیوں پر سفر کر رہے ہیں' آگے ڈھلان میں ہڈسن کی بستی ہے' اس نے ٹھیک کہا تھا زیادہ فاصلہ نہیں طے ہوا تھا کہ ڈھلوان نظر آنے لگی' ان ہی میں یہ بستی آباد تھی' مدہم مدہم روشنیاں جل رہی تھیں' شاید کوئی بہت ہی پسماندہ بستی تھی' بجلی بھی موجود نہیں تھی گھروں میں مٹی کے تیل کے لیمپ روشن تھے جن کی بو ہوا کے ساتھ فضا میں پھیل رہی تھی' میں نے زیادہ سوالات کرنے مناسب نہ سمجھے' ورنہ دل چاہتا تھا کہ ہڈسن کے بارے میں معلومات حاصل کروں' وہ اسی جگہ رہتا ہے۔

شائنا بستی عبور کرتی رہی' ویسے کس نے ہم پر غور نہیں کیا تھا' حالانکہ ملگجے اجالوں میں بہت سے لوگ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے' پھر تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے آخر کار ہم کچی مٹی سے ہوتے ہوئے ایک احاطے کے سائے میں پہنچ گئے' وہاں لکڑی کا ایک گیٹ لگا ہوا تھا' اندر گائیں بندھی ہوئی تھیں' جن کی غلاظت کی بدبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

"آئیڈیل جگہ ہے۔" شائنا ہنس کر بولی۔

"یہیں رہ جاؤ۔" میں نے جل کر کہا اور شائنا خوب ہنسی پھر ہم اس گیٹ کے پاس پہنچ گئے' گیٹ ہم نے خود ہی کھولا تھا لیکن تاریکی میں دو قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ اچانک شائنا کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور اس نے گرنے سے بچنے کے لیے میرا سہارا لیا' پھر جھک کر اس نے اس شے کو دیکھا اور اس کے حلق سے آواز نکل گئی۔ میں نے اس انسانی بدن کو دیکھ لیا تھا جس سے شائنا ٹکرائی تھی اور پھر سنبھل گئی تھی۔

"لل۔ لاش۔ سائنا کے منہ سے نکلا۔"

"کیا ہڈسن ہے؟"

"نہیں۔" وہ جھک کر لاش کو دیکھتی ہوئی بولی پھر سرسراتی آواز میں کانپنے لگی' "اس کا مطلب ہے کہ ہڈسن بھی خطرے میں ہے' آؤ' پھر ہم دونوں دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے' عمارت میں بھی مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

"ہوشیاری سے' قاتل اندر بھی ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا اور شائنا سنبھل گئی' وہ ایک دم مجھ سے آ لگی تھی' پھر اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"آؤ نجانے کیوں مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے کچھ آنکھیں ہماری نگرانی کر رہی ہیں۔" میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا' اور آگے بڑھ کر ایک کمرے میں داخل ہو گیا' اندازہ ٹھیک ہی نکلا تھا یہاں بھی کمرے کے وسط میں ایک انسانی لاش پڑی ہوئی تھی جس کی گردن کسی دھاردار آلے سے کاٹ دی گئی تھی۔ شائنا کے حلق سے پھر ایک خوف بھری آواز نکل گئی۔

"ہڈسن ہی ہے؟"

"آہ۔ اسے قتل کر دیا گیا' میرا خدا لگتا ہے یہاں سخت جدوجہد ہوئی ہے' انہوں نے بڑی بے دردی سے اسے قتل کیا ہے یہ دیکھو۔" ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ رات کے سناٹے میں کسی چیز کے گرنے کی زوردار آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں' اب یہ جگہ خطرناک تھی' کوئی فیصلہ کرنے سے قبل باہر نکل بھاگی تھی۔

"شائنا میں نے آواز لگائی' لیکن اس کے ساتھ ہی کئی فائر ہوئے اور شائنا کی بھیانک چیخ ابھری' گئی میں نے دل میں سوچا بات اب کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی' میں نے بڑے دروازے سے باہر نکلنے کے بجائے دوسرے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اور کئی کمروں سے گزرتا ہوا ایک راہداری میں آ گیا' راہداری میں احاطے کے دوسرے دروازے کی طرف کھلتی تھی' چنانچہ میں نے احاطے میں چھلانگ لگا دی' البتہ دوڑنے والوں کو میں مستقل اپنے پیچھے محسوس کر رہا تھا' پھر اچانک ہی ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"رکو رک جاؤ۔" لیکن اس کا کیا سوال تھا میں نے

چیتے کی طرح آگے چھلانگ لگائی چند گز کے فاصلے پر ایک چوڑی نہر نظر آرہی تھی' جو آبادی کے درمیان سے گزرتی تھی' میں نے ان لوگوں کو دیکھ لیا تھا جو خود بھی احاطہ کود کر دوسری طرف آگئے تھے' اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں نہر میں کود جاؤں' اب شائنا کے بارے میں سوچنا بے کار تھا' جس طرح اس کی آواز سنائی دی تھی اس سے صاف اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کی لاش بھی اسی عمارت میں کہیں پڑی ہوگی۔

میں نے نہر میں چھلانگ لگادی اور پھر دوسرے کنارے پر پہنچ کر پانی سے نکل آیا' میں یہاں نہیں رکا تھا' بلکہ بھاگ کر آگے نکل آیا تھا' مجھے احساس ہوا کہ نہر پار کی بستی اس کسمپرسی کا شکار نہیں ہے اور یہاں کے حالات دوسری طرف سے بہتر ہیں' ایک عمارت میں بجلی کی روشنی بھی نظر آرہی تھی' اس سے موسیقی کی مدہم مدہم آوازیں بھی ابھر رہی تھیں' غالباً" اندر اچھا خاصہ ہنگامہ برپا تھا' ہلکے ہلکے قہقہوں کی آوازیں بھی ابھر رہی تھیں۔ بہرحال اس کے لیے متجسس نہیں تھا کہ یہاں کون لوگ ہیں' یا نہر پار کا یہ علاقہ نہر کے دوسری جانب سے مختلف کیوں ہے' یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں تھا جو قابل توجہ ہوتا' میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ بھیگے ہوئے لباس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا کوئی انتظام ہو جائے تو بہتر ہے اور چونکہ یہی عمارت سب سے زیادہ روشن اور زندگی سے بھرپور تھی' اس لیے میں نے اس کا رخ کیا۔

اس وقت جس قدر مہذب انسان تھا اسے سامنے رکھتے ہوئے کسی قسم کی اخلاقیات کا مسئلہ تو باقی نہیں رہا تھا' بس کسی بھی شکل میں گزارا ہو جائے یہی کافی تھا' چنانچہ ایک بھیگا ہوا چور عمارت میں داخل ہوا اور اپنے تجربے کی بنیاد پر ایسے سنسان گوشے تلاش کیے جہاں لوگ کوئی قیمتی سامان رکھتے ہوں یا نہ بھی رکھتے ہوں لباس ضرور رکھتے ہوں۔ غرضیکہ واقعات کا یہ حصہ اس قدر اہمیت کا حامل نہیں کہ ان کا تذکرہ خصوصی طور پر کیا جائے تھوڑی سی تلاش کے بعد لباس ملا اور ہمیشہ کی طرح ایسا ملا کہ سارے دلدر دور ہو گئے' ایک قمیص' عمدہ قسم کی پتلون اور ایک ہینگر پر ٹنگی ہوئی چمڑے کی جیکٹ' جس میں دونوں طرف کی جیبوں میں رقم اس طرح موجود جیسے ڈاکہ ڈال کر جیبوں میں بھرلی گئی ہو' اسی عمارت کے ایک واش روم میں حلیہ سنوارا اور مطمئن ہو گیا کہ اگر وہ نہ سہی تو کم از کم یہاں زندگی گزارنے کا بندوبست ہو گیا ہے۔

تھوڑا سا سہارا تو لیا ہی جا سکتا ہے اس کے بعد اس عمارت کے مکینوں کا دل سے شکریہ ادا کیا کہ کم از کم زندگی سے بھرپور ہیں جو بھی کر رہے ہیں اچھا کر رہے ہیں' کیونکہ ان کی اس اچھائی سے میرا فائدہ ہو گیا تھا' اب اس کے بعد غم جاناں کا معاملہ تھا' عمارت سے باہر نکل کر تاریک راستوں پر چل پڑا' تاکہ فی الحال کسی صاحب نظر سے مقابلہ نہ ہو سکے اور تھوڑی سی بہتری ہو جائے' علاقے کے بارے میں البتہ تھوڑا سا اندازہ ہوتا جا رہا تھا۔ غالباً" جس سمت سے ہم لوگ ادھر داخل ہوئے تھے وہ اس علاقے کا پسماندہ حصہ تھا' زندگی کی سہولتوں سے محروم یا پھر کوئی ایسی جگہ جسے بس یونہی عارضی طور پر استعمال کر لیا جاتا ہو' میں یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ نہر کے اس طرف کا حصہ اصل میں اس علاقے کا صحیح حصہ ہے کہ یہاں عمارتیں بھی اچھی خاصی خوش شکل اور رونق بھی ٹھیک ٹھاک تھی' جبکہ نہر کے اس طرف کچھ بھی نہیں تھا' البتہ یہ سارا معاملہ ابھی تک ناقابل فہم تھا یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وکٹر گوم مجھ سے چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا ہو' سمجھائے بغیر مشکل حالات کے سپرد کر دیا گیا تھا مجھے۔

بات اصل میں کچھ بھی نہیں تھی۔ سوچنے کا مقام یہ تھا کہ اب میں کروں کیا' ظاہر ہے ایک بار پھر اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارے جانے کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا' لیکن ٹیپ ریکارڈر پر سنائی دینے والی گفتگو اس طرح میرے اپنے آپ تک پہنچ جانے کی امید تو نہ ہوگی اور اس نے ٹیپ ریکارڈ پر وہ کہانی خود ہی تو نہ گھڑی ہوگی' اس کا کوئی مفہوم ہوگا بہتر یہ ہے کہ وکٹر گوم کی قربت ہی رہے جب کوئی مشکل مرحلہ آئے گا تو دیکھا جائے لیکن اس وقت کی صورت حال کچھ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

ایک اور جگہ سے موسیقی کی مدہم مدہم آوازیں ابھریں تو میں نے سوچا ہو سکتا ہے وقت گزارنے کے لیے تھوڑا سا انتظام ہو جائے' اسی جانب چل پڑا' بڑی خوب صورت جگہ تھی' خوب صورت اس لیے کہ لکڑی کی عمارت بنائی گئی تھی اور اس پر رنگین کپڑوں کی ڈیکوریشن کی گئی تھی' کچھ نہ ہونے کے باوجود بہت اچھی جگہ تھی' لوگ اندر سے باہر آ جا رہے تھے' میں بھی اندر داخل ہوا تو مجھے یہ سب کچھ لکڑی کا گھر محسوس ہوا' کلب ٹائپ کی چیز تھی' ریکارڈ لگا ہوا تھا' لوگ مختلف مشروبات سے شغل کر رہے تھے' بہت سی میزیں پڑی ہوئی تھیں' ویٹر ان کے درمیان گردش کر رہے تھے' گرم اور سرد مشروبات ہر میز پر نظر آرہے تھے' میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا تو ایک سانولے رنگ کی حسینہ میرے قریب پہنچ گئی' بھدے بدن کی مالک' موٹے موٹے ہونٹ' عجیب سا چہرہ' آنکھیں البتہ خوب صورت تھیں۔

"اس طرف آجائیے جناب' زندگی اس قدر بے کیف بھی نہیں ہے کہ انسان اپنے چہرے پر اتنی بے زاری پیدا کر لے۔" میں نے غور سے اسے دیکھا اتنی دیر کے ذہنی بحران میں اگر کسی سے تھوڑی سی گفتگو کرنے کا موقع مل جائے تو ایک شریفانہ گفتگو کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بشرطیکہ خاتون شریفانہ گفتگو کرنے اور سمجھنے کی عادی ہوں" میں نے بڑے پر احترام انداز میں گردن خم کی اور اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ گیا' لکڑی کی یہ عمارت باہر سے اتنی وسیع نظر نہیں آتی تھی' لیکن جب ہم ایک راہداری سے گزرے تو میں نے تعجب سے اسے دیکھا' عمارت کی کئی شاخیں تھیں جو مختلف سمتوں میں نکل گئی تھیں' نیلی مدہم روشنی ماحول کو بے حد خوفناک بنا رہی تھی' خصوصاً" مقامی لڑکیاں کافی تعداد میں یہاں موجود تھیں' وہ میرے ساتھ آگے بڑھتی رہی اور پھر راہداری عبور کرنے کے بعد سیڑھیاں نظر آئیں جن پر قالین بچھا ہوا تھا اور وہ انہی پر اتر رہی تھی۔

"اے اے میڈم سنیے۔" میں نے کہا اور وہ رک گئی۔

"جی کیا بات ہے؟"

"زمین کی گہرائیوں میں پہنچنے کا وقت آگیا ہے کیا؟"

"مطلب؟"

"مطلب یہ ہے قبر سے اوپر بھی بہت کچھ ہے۔" وہ مسکرائی اور بولی۔

"قبر کے نیچے جو کچھ ہے وہ تمہارے لیے پسندیدہ ہوگا" آجاؤ۔" بڑا اعتماد تھا ان الفاظ میں' میں نے سیڑھیاں عبور کیں اور ہم دونوں ایک راہداری میں پہنچ گئے' جس کے دونوں طرف دروازے بنے ہوئے تھے' اس نے ایک دروازہ کھولا اور مجھے راستہ دینے کے لیے ایک طرف کھڑی ہو گئی' میں ایک گہری سانس لے کر اندر داخل ہو گیا' لیکن اندر داخل ہونے کے بعد وہی ہوا جس کی توقع تھی' دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا' اندر تین آدمی نظر آرہے تھے جنہوں نے کراٹے کا لباس پہنا ہوا تھا اور ان کی کمر سے کالی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں' میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی اور مدہم لہجے میں بولا۔

"کیا تم مجسمہ ساز ہو؟"

"کیا مطلب؟" وہ بات نہ سمجھ کر بولی۔

"یہ مجسمے تم نے تراشے ہیں۔" میں نے ان تینوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ساکت و جامد کھڑے ہوئے تھے۔

"یہ تمہیں مجسمے نظر آرہے ہیں؟"

"تو پھر یہ روبوٹ ہوں گے؟"

"ہو سکتا ہے آؤ اس طرف آجاؤ۔" اس نے کہا اور دروازے سے ہٹ کر ایک جانب بڑھ گئی اب جب یہاں تک آہی گیا تھا تو یہاں کے حالات سے پوری طرح نمٹنا ضروری تھا' ویسے بھی وکٹر گوم جیسی بھیانک شخصیت نے جو بھی عمل کر رکھا ہوگا وہ اس قدر کمزور اور ناپائیدار نہیں ہوگا کہ اس کا کوئی صحیح انداز سامنے نہ آسکے' دیکھنا تو چاہیے کہ قصہ کیا ہے' میں اس

دروازے سے اندر داخل ہوگیا' وہ تینوں پھتریلے مجسّمے جن کے بارے میں مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجسّمے نہیں ہیں اپنی جگہ ہی کھڑے ہوئے تھے' دروازے کے دوسری جانب تیز روشنی ہورہی تھی اور کمرے کی ڈیکوریشن بہت خوب صورت تھی' سامنے ہی ایک کرسی پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جو مقامی نہیں تھا' بلکہ اس کی رنگت تانبے کی طرح سرخ تھی' غالباً اسپینش نسل کا ہوگا' لیکن چھوٹی چھوٹی بدنما آنکھیں اسے اسپینی بھی ظاہر نہیں کرتی تھیں' بہرحال ہم اندر داخل ہوگئے تو میرے ساتھ آنے والی لڑکی نے گردن خم کرکے کہا۔

"سر یہی اسٹوارٹ ہے۔"

"تشریف لائیے مسٹر اسٹوارٹ آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔" تانبے کی رنگت والے شخص نے کہا۔

"شکریہ میں آپ کو کس نام سے مخاطب کروں مسٹر؟" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"تم مجھے نوڈک کہہ سکتے ہو؟"

"چلیے ٹھیک ہے میں آپ کو وہی کہہ سکتا ہوں جو آپ کہیں گے مسٹر نوڈک۔"

"سنو۔" نوڈک لڑکی طرف رخ کرکے بولا۔

"یس سر۔" لڑکی نے کہا۔

"باہر جاؤ اور سنو' کسی قسم کی مداخلت یہاں نہ کی جائے سارے معاملات میری ذمے داری پر چھوڑ دو۔"

"یس سر۔" لڑکی نے گردن خم کرکے کہا اور باہر نکل گئی۔ تب نوڈک گہری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔

"مجھے تعجب ہے کہ تم مجھے زندہ نظر آرہے ہو۔"

"اس کے جواب میں مجھے کیا کہنا چاہیے مسٹر نوڈک۔" میں نے کہا۔

"نہیں میری جانب سے نئی زندگی کی مبارک باد قبول کرو۔"

"شکریہ جناب۔"

"غیر مقامی لوگ اگر ہمارے راستوں میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں تو ہمیں زیادہ افسوس ہوتا ہے' تم کرائے کے لوگ دوسروں کے معاملات میں مداخلت کرنے والے قابل نفرت ہوتے ہیں' ہمیں تم سے بے پناہ نفرت ہے' بے پناہ۔"

"بڑی خوشی ہوئی سن کر جناب۔" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"تم میں سے کسی ایک کی موت ہمارے لیے خوشی کا باعث ہوتی ہے میں تمہیں اس موت کی مبارک باد بھی دیتا ہوں۔" اس نے کہا اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھادیے' اسی وقت دروازے سے وہی تینوں افراد دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور انہوں نے ایک مخصوص انداز میں مجھ پر چھلانگ لگائی' بڑی آسان سی بات تھی' میں زمین پر بیٹھ گیا اور وہ پرواز کرتے ہوئے میرے اوپر سے نکل گئے' لیکن زبردست پھرتیلے لوگ تھے' تینوں آگے جاکر اس طرح منتشر ہوگئے لیکن میں نے نوڈک کو معاف نہیں کیا تھا میں نے برق رفتاری سے چھلانگ لگائی اور نوڈک پر جاگرا' نوڈک کرسی سمیت ہی الٹ گیا تھا' لیکن افسوس اس کی گردن میری گرفت میں نہ آسکی' البتہ میں نے نیچے گرتے ہی ایک زوردار لات اس کے پیٹ کے رسید کردی تھی' اسی وقت اندھیرا پھیل گیا اور ڈز کی ایک آواز کے ساتھ ایک ننھا سا چمکدار نقطہ میرے قریب سے گزر گیا' میں نے تاریکی میں نوڈک کو دبوچنے کی کوشش کی تھی' لیکن اب وہ اتنا چوہا بھی نہیں ہوگا' چوہا ہوتا تو ایسے کسی مسئلے میں شریک ہونے کے لیے تیار نہ ہوتا' وہ کسی چکنی مچھلی کی طرح میری گرفت سے نکل کر دور جاگرا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک وحشیانہ چیخ نکلی تھی۔

"روشنی کرو' کتے کے بچو۔" البتہ کسی کتے کے بچے نے روشنی تو نہیں کی تھی لیکن مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ نوڈگ کی کھوپڑی کس طرف ہے' میں نے پھرتی سے اس کی جانب ٹانگیں چلائیں خیال یہ تھا کہ اس کے سر پر لات ماروں اور اسے قابو میں کرلوں' لیکن وہ کم بخت شاید اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا یا پھر اسے احساس ہوگیا تھا کہ میں اسے اتنی آسانی سے نہیں چھوڑ دوں گا' چنانچہ مجھے اپنی اس کوشش سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پھر میں پھرتی سے کھڑا ہوگیا تھا' لیکن کھڑے ہوتے ہی مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ دو چنگاریاں ڈز ڈز کی آواز کے ساتھ میرے دونوں سمت سے گزر گئی تھیں' ایک لمحے کے لیے میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ لڑائی صرف ہاتھوں سے نہیں ہورہی بلکہ پستول بھی استعمال کیے جارہے ہیں اور پستولوں پر سائیلنسر لگا ہوا ہے' میں زمین پر لیٹا اور لڑھکتا ہوا دور تک نکل گیا۔

اصل میں یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ مسئلہ کیا ہے اور وہ لوگ کیا چاہتے ہیں' لیکن بہرحال کچھ نہ کچھ تو اب کرنا ہی تھا' مجھے وہ دروازہ یاد آیا جو اس کمرے کے عقبی حصے میں تھا اور لوٹتا ہوا میں اس دروازے تک پہنچ گیا' لیکن ابھی میں دروازے میں تھا کہ کسی کا بدن میرے بدن سے ٹکرایا اور میں نے انتہائی برق رفتاری سے عمل کیا میں نے فوراً اس کی گردن دبوچ کر منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا' لیکن گردن دبوچے ہوئے مجھے جس طرح کے احساسات ہوئے ان سے پتا چلا کہ میری گرفت میں آنے والا جسم کسی لڑکی کا ہے' اس نے ہاتھ خالی ہونے کے باوجود جدوجہد نہیں کی تھی بلکہ خالی ہاتھ سے اس نے میرا لباس پکڑ کر ایک طرف کھینچنے کی تھی غالباً کوئی اشارہ کرنا چاہ رہی تھی' میں ایک لمحے سوچنے کے بعد ایک فیصلہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

(جاری ہے)

✡ ✡

مشہور مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گردپوش

کتاب کا نام		قیمت
آوارہ گرد کی ڈائری	سفرنامہ	450/-
دنیا گول ہے	سفرنامہ	450/-
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	سفرنامہ	450/-
چلتے ہو تو چین کو چلیے	سفرنامہ	275/-
نگری نگری پھرا مسافر	سفرنامہ	225/-
خمار گندم	طنز و مزاح	225/-
اُردو کی آخری کتاب	طنز و مزاح	225/-
اس بستی کے کوچے میں	مجموعہ کلام	300/-
چاند نگر	مجموعہ کلام	225/-
دل وحشی	مجموعہ کلام	225/-
اندھا کنواں	ایڈگر ایلن پو/ابن انشاء	200/-
لاکھوں کا شہر	او ہنری/ابن انشاء	120/-
باتیں انشاء جی کی	طنز و مزاح	400/-
آپ سے کیا پردہ	طنز و مزاح	400/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

چراغ جلتا رہا

مصنف بورس پولیوائے

مترجم انور عظیم

کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں سب سے زیادہ تباہ کن جنگ عظیم دوئم تھی، جس میں معاشی تباہی کے علاوہ پچپن ملین انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔

روس سے برآمد ایک بہادر فوجی کی روداد جو متعدد دن موت سے لڑتا رہا

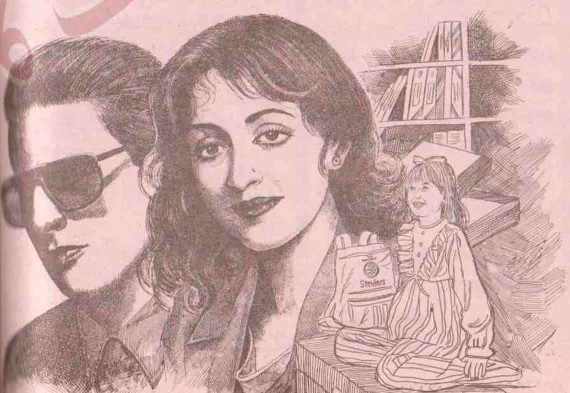

ہواباز الکسی میہسف' کے جہاز کی تمام گولیاں ختم ہو چکی تھیں کہ چار جرمن ہوائی جہازوں نے اس کو گھیر لیا اور اس کو اپنے اڈے کی طرف اڑنے پر مجبور کرنے لگے۔ الکسی میہسف نے دانت زور سے بھینچ لیے اور اپنے بچاؤ کے لیے اس نے انجن کی رفتار پوری کی پوری کھول دی اور عمودی پوزیشن اختیار کرتے ہوئے اس نے اس جرمن ہوائی جہاز کے نیچے غوطہ لگانے کی کوشش کی جو اس کو نیچے اترنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس طرح وہ دشمن ہوائی جہاز کے نیچے سے نکل جانے میں تو کامیاب ہو گیا لیکن جرمن ہواباز نے بڑے وقت سے اپنا گھوڑا دبایا... الکسی کے انجن کا آہنگ غائب ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد اس کی سانس رکنے لگی۔ سارا ہوائی جہاز سر سے پیر تک کانپنے لگا جیسے مہلک بخار میں تڑپ رہا ہو۔

الکسی سفید بادلوں کی ایک گھپا میں غولہ لگا کر اپنے پیچھا کرنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہو گیا، لیکن اب کیا کیا جائے؟ وہ زخمی ہوائی جہاز کی لرزش اپنے پورے جسم میں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ اس کے زخمی انجن کی نزع کا کرب نہ ہو بلکہ اس کے اپنے بخار کا کرب ہو، جو اس کے جسم میں کپکپی پیدا کر رہا تھا۔

انجن کو کہاں نقصان پہنچا ہے؟ کتنی دیر اور ہوائی جہاز ہوا میں تیر سکتا ہے؟ کیا پٹرول کا خزانہ پھٹ جائے گا؟ الکسی ان سوالوں کے بارے میں جتنا سوچ رہا تھا اس سے زیادہ محسوس کر رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک بارود کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا ہے جس کا فلیتہ جل رہا ہے... اس نے ہوائی جہاز موڑا اور خود اپنے محاذ کی طرف اڑنے لگا تاکہ اگر مرنا ہی ہے تو کم از کم اپنے لوگوں کے ہاتھوں دفن تو ہو۔

اچانک پورا واقعہ اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ انجن رک گیا۔ ہوائی جہاز زمین کی طرف گرنے لگا جیسے ایک سیدھے کھڑے ڈھلان پر لڑھک رہا ہو۔ اس کے نیچے جنگل ایک بیکراں سرمئی اور نیلے سمندر کی طرف سانس لے رہا تھا... "خیر میں قیدی تو نہیں ہوں گا" یہ خیال ہواباز کے دماغ میں کوند گیا۔ قریب ترین درخت جو ایک پھیلی ہوئی پٹی بن گئے تھے اس کے ہوائی جہاز کے پروں کے نیچے دوڑنے لگے جب جنگل اس پر ایک درندے کی طرح جھپٹا تو اس نے بے اختیار جھٹکے سے انجن بند کر دیا۔ ایک زبردست دھماکے کی آواز گونج گئی اور آن کی آن میں ہر چیز آنکھوں سے اوجھل ہو گئی جیسے وہ اور اس کا ہوائی جہاز دونوں سیاہ اور گہرے سمندر میں کود پڑے ہوں۔

ہوائی جہاز نیچے گرتے ہوئے صنوبروں کے سروں سے ٹکرایا۔ اس کی وجہ سے اس کے گرنے کی تیزی کچھ کم ہوئی کئی درختوں کو توڑتے ہوئے خود ہوائی جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ لیکن الکسی اس سے چند ہی لمحے پہلے کاک پٹ سے کود چکا تھا وہ صدیوں پرانے فر کے درخت پر گرا اور اس کی شاخوں سے پھسلتا ہوا برف کے اس ڈھیر میں دھنس گیا جو تیز ہواؤں نے درخت کے تنے کے پاس جمع کر دیا تھا۔ برف نے اس کی جان بچالی۔

الکسی کو بالکل یاد نہ تھا کہ وہ کتنی دیر وہاں بے ہوش اور بے حس و حرکت پڑا رہا ہے۔ دھندلے دھندلے سے انسانی سائے، عمارتوں کے نقوش اور عجیب و غریب مشینوں کی پرچھائیاں، اس کے پاس سے گزرتی چلی گئیں اور وہ جس طوفانی تیزی سے بھاگ رہی تھیں، اس نے اس کے پورے بدن میں ٹیس مارتے ہوئے بوجھل درد کا احساس جگا دیا۔ پھر کوئی بڑی اور گرم سی چیز جس کے خط و خال بڑے مبہم سے تھے، اس طوفانی ہنگامے سے ابھری اور اس کے چہرے پر گرم اور بدبودار پھونکیں مارنے لگی۔ اس نے کروٹ لے کر اس سے دور ہونا چاہا لیکن اسے محسوس ہوا کہ وہ برف میں جکڑ کر رہ گیا ہے۔ ایک ان جانی دہشت سے مجبور ہو کر جو اس کے گرد منڈلا رہی تھی اس نے اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ کوشش کی اور فوراً" اپنے پھیپھڑوں میں ٹھنڈی ہوا کی سرسراہٹ، اپنے گالوں کو چھوتی ہوئی برف کا لمس اور ایک زبردست ٹیس محسوس کی۔ اب یہ ٹیس اس کے پورے جسم میں نہیں بلکہ اس کے پیروں میں تھی۔

"زندہ ہوں!" یہ خیال اس کے دماغ میں کوند گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کو قریب ہی کسی کے پیروں کی آہٹ اور بھاری سانس کی آواز سنائی دی "جرمن" فوراً" اس کو خیال آیا اور اس نے آنکھ کھولنے اور اچھل کر اپنی حفاظت کرنے کی فوری خواہش کو دبا دیا۔ "آخر کار قیدی ہو ہی گیا! اب میں کیا کروں؟"

اس کو یاد آیا کہ اس کا پستول فلائنگ سوٹ کی ران والی جیب میں تھا۔ اس کو نکالنے کے لیے اس وقت اسے کروٹ بدلنا پڑتا لیکن وہ دشمن کو اپنی طرف متوجہ کیے بغیر ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ منہ کے بل پڑا ہوا تھا۔ اس نے پستول کے تیز کناروں کو اپنی ران میں چبھتے ہوئے محسوس کیا لیکن وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ شاید دشمن اس کو مردہ سمجھ کر یوں ہی چھوڑ کر چلا جائے۔

جرمن اس کے قریب چل رہا تھا اور کچھ عجیب انداز سے سانس لے رہا تھا۔ پھر وہ برف کو چرمراتے ہوئے اس کے پاس آیا۔ الکسی نے پھر اس کے منہ سے نکلتی ہوئی بساند محسوس کی۔ اب وہ سمجھ گیا کہ وہاں ایک ہی جرمن تھا اور اس چیز نے اس کے بچنے کا امکان بڑھا دیا۔ اگر وہ اس کی گھات میں رہے، یکایک اچھلے اور اس پر ٹوٹ پڑے۔ اور اس کو ہتھیار تک ہاتھ لے جانے کا موقع دیے بغیر اس کا گلا گھونٹ دے تو... لیکن یہ بڑی احتیاط اور انتہائی چابک دستی سے کرنا ہو گا۔

پہلو بدلے بغیر الکسی نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں لیکن اس کو جرمن کی جگہ ایک بھورا جھبرا ڈھیر نظر آیا۔ اس نے آنکھیں اور زیادہ کھولیں اور فوراً" کس کر بند کر لیں۔ وہاں تو اس کے سامنے ایک بڑا سا بھالو اپنے پنجوں پر بیٹھا تھا۔

ریچھ انتہائی خاموشی سے اس بے حس و حرکت انسانی ہیولے کے سامنے بیٹھا تھا جو دھوپ میں چمکتی ہوئی نیلگوں برف سے جھانک رہا تھا۔

ریچھ کے گندے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اس کے نیم وا مونہہ سے پرانے اور پیلے دانت جو اب تک کرارے تھے جھانک رہے تھے اور گاڑھی رال کا ایک تار ہوا میں لہرا رہا تھا۔

جنگ نے اس کی جاڑے کی نیند حرام کر دی تھی اور وہ بھوکا اور غصے میں تھا لیکن بھالو مردار نہیں کھاتے اس نے اس بے حس و حرکت جسم کو سونگھا جس سے پٹرول کی تیز بو آ رہی تھی اور میدان کے چکر لگائے جہاں اسی قسم کے اور بہت سے انسانی ڈھانچے چرمراتی ہوئی برف میں اکڑے پڑے تھے لیکن ایک کراہ اور سرسراہٹ کی آواز اسے پھر الکسی کے پاس کھینچ لائی۔

اب وہ الکسی کے پہلو میں آسن جمائے بیٹھا تھا۔ بھوک کی چبھن کی اس کے مردار بےزاری سے لڑ رہی تھی۔ بھوک اس پر غالب آنے لگی تھی۔ درندے نے ایک بھاری سانس لی، ہواباز کے جسم کو اپنے پنجوں سے الٹا پلٹا اور اس کی وردی کو ناخنوں سے نوچا لیکن فلائنگ سوٹ اپنی جگہ پر جما رہا۔ ریچھ آہستہ سے غرایا۔ الکسی نے آنکھ کھولنے، لڑھک کر ایک طرف ہٹ جانے اور اپنے سینے پر سوار اس بھاری بھرکم ہیولے کو اٹھا پھینکنے کی خواہش کو بڑی مشکل سے دبایا۔ ایک ایسے لمحے میں جب اس کا پورا وجود اسے پوری بے جگری سے اور جان ہتھیلی پر لے کر لڑنے پر ابھار رہا تھا۔ اس نے خود کو مجبور کیا اور آہستہ آہستہ، اتنا آہستہ کہ ذرا پتا نہ چلے اس نے ہاتھ جیب میں ڈالا پستول کا دستہ چھوا اور بڑی احتیاط سے اس طرح اس کا گھوڑا چڑھایا کہ آواز نہ پیدا ہو اور چپکے سے اسے نکال لیا۔

درندہ بپھر کر اس پر ٹوٹ پڑا اور اس کے فلائنگ سوٹ کو نوچنے لگا۔ مضبوط چمڑا چرچرایا مگر اس نے جواب اب بھی نہ دیا۔ ریچھ مارے غصے کے دھاڑا، اس نے دانت اس کے فلائنگ سوٹ میں گاڑ دیے اور سمور اور روئی کی تہوں کو چیر کر اس کے بدن میں دانت چبھونے لگا لیکن الکسی نے آخری قوت ارادی سے کام لے کر، درد بھری چیخ کو گلے میں دبا دیا اور ٹھیک اس آن جبکہ ریچھ نے اس کو برف کے ڈھیر سے اوپر اٹھایا اس نے پستول اٹھایا اور لبلبی دبا دی۔

گولی دہانے سے چلی اور ایک تیز آواز دھڑکتی گونجتی تیرتی چلی گئی۔

کسی پرندے نے پر پھڑپھڑائے اور تیزی سے اڑ گیا۔ خشک برف جھنجوڑی ہوئی شاخ سے ناچتی ہوئی گری۔ ریچھ نے آہستہ آہستہ اپنے شکار کو چھوڑ دیا۔ الکسی پھر برف میں گر گیا اور اپنی آنکھیں ریچھ پر جمائے رہا۔ ریچھ پچھلے پنجوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی کالی پیپ بھری آنکھوں کے عجیب حیرانی جھلک رہی تھی۔ بجھے بجھے سے رنگ کے کالے خون کی دھار اس کے نکیلے دانتوں کے درمیان تیرتی ہوئی برف پر ٹپکنے لگی۔ وہ ایک بھاری اور خوف ناک آواز کے ساتھ گرجا اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوا اور اس سے پہلے کہ الکسی دوبارہ گولی چلائے ڈھیر ہو گیا۔ نیلگوں برف آہستہ آہستہ ارغوانی ہو گئی اور ریچھ کے سر کے پاس پگھلتی ہوئی برف سے بھاپ سی اٹھنے لگی درندہ مر چکا تھا۔

الکسی جس جذباتی اور جسمانی تناؤ کے ساتھ یہ سب کچھ کر رہا تھا وہ اب جاتا رہا۔ اس نے پھر اپنے پیروں میں وہی تیز جلتی ہوئی ٹیس محسوس کی۔ وہ برف پر دوبارہ گرا اور بے ہوش ہو گیا جب اسے دوبارہ ہوش آیا تو سورج چڑھ آیا تھا اس کی کرنیں چیڑ کے گھنے درختوں کو چیرتی ہوئی برف کو اپنی روشنی سے جگمگا رہی تھیں۔

"میں زندہ ہوں، زندہ ہوں، زندہ ہوں!" الکسی نے آپ ہی آپ دہرایا۔ اس نے زوردار احساس کے تحت وہ اچھل پڑا اور کھڑا ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چیخ کر ریچھ کے ڈھانچے پر گر پڑا اس کے پیروں کی ٹیس آگ کی طرح پورے جسم میں دوڑ گئی۔ اس کا سر ایک بوجھل گھنگھناہٹ کے شور سے بھر گیا جیسے چکی کے دو پاٹ گھوم رہے ہوں اور اس کے دماغ میں زلزلہ سا پیدا کر رہے ہوں۔ اس کی آنکھوں کو جیسے کوئی انگلیوں سے دبا رہا تھا ابھی اسے لگتا کہ اس کے چاروں طرف ہر چیز روشن اور صاف ہے اور سورج کی ٹھنڈی اور زرد کرنوں میں نہا رہی ہے۔ پھر دوسرے ہی لمحے سب کچھ ایک سرمئی پردے کے پیچھے غائب ہو جاتا جس سے چنگاریاں اڑنے لگتیں۔

"بہت برا ہوا۔ گرتے وقت دھچکا لگا ہو گا اور لگتا ہے پیروں میں بھی کچھ خرابی آ گئی ہے۔" الکسی نے سوچا۔

اس نے کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے حیرت بھری نظروں سے جنگل کے کنارے سے آگے وسیع میدان کو دیکھا جو دور کے جنگل کے سرمئی رنگ کے دائرہ نما حلقے کے پیچھے افق تک پھیلتا چلا گیا تھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ شروع جاڑے میں اس جنگل کے دامن ایک دفاعی مورچہ رہا تھا۔ برف کی آندھیوں نے روئی جیسے برفیلے اون کی چادر بچھا دی تھی، لیکن آنکھیں ان تہوں کے نیچے بھی خندقیں، ٹوٹی پھوٹی مشین گنوں کے اڈوں کے پہاڑی نما ڈھیر، چھوٹے بڑے شیلوں کے دھماکوں سے بننے والے گڑھوں کا لامتناہی سلسلہ دیکھ سکتی تھیں جو جنگل کے کنارے تباہ شدہ، جلے جھلسے اور سر کٹے درختوں تک چلا گیا تھا۔ اس تباہ و برباد میدان میں کہیں کہیں ٹینک بھی جھانکتے نظر آ رہے تھے، وہ برف میں جمے پڑے تھے اور سب کے سب عجیب قسم کے جنوں بھوتوں کے ڈھانچے معلوم ہوتے تھے۔ خاص طور پر ان میں سے ایک ٹینک، دستی بم یا زمین پر رکھے ہوئے کسی بم سے ٹکرا کر کچھ اس طرح الٹ گیا تھا کہ اس کی لمبی نال زمین پر لٹکی ہوئی تھی اور منہ سے جھانکتی ہوئی زبان کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ پورے میدان میں ٹینکوں کے پاس اتھلی خندقوں کے کناروں پر اور جنگل کے کنارے سوویت اور جرمن سپاہیوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ بعض جگہ لاشیں ایک کے اوپر ایک ڈھیر کی طرح رکھی تھیں۔ سپاہی اس طرح برف میں اکڑے پڑے تھے جس طرح جاڑے کے شروع شروع چند مہینے قبل موت نے ان کو آلیا تھا۔

اور بھی آگے، جنگل والی سڑک کے ساتھ ساتھ ٹینکوں کے پاس، گڑھوں کے کناروں پر، بعض پرانے درختوں کے تنوں کے قریب، خندقوں کے اندر، ہر جگہ

لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ لاشیں روئی دار جیکٹ اور پتلونیں پہنے، ہری وردیوں میں ملبوس، کان چھپانے والی ٹوپیاں پہنے، مڑے ہوئے گھٹنوں اوپر کو اٹھی ہوئی ٹھوڑیوں اور موم جیسے چہروں کے ساتھ برف کے ڈھیروں سے جھانک رہی تھیں جن کو لومڑیوں نے نوچا تھا اور کوؤں نے چونچ مار مار کر چیر پھاڑ دیا تھا۔

کئی کوے میدان کے اوپر ہوا میں آہستہ آہستہ چکر لگا رہے تھے۔ اس منظر سے الکسی کے ذہن میں جنگ کی الم ناک تصویر گھوم گئی۔ "ان ہی کی طرح میں بھی شاید یہاں پڑا ہوتا۔" اس نے سوچا اور پھر اس کی رگ رگ میں زندگی کے نشاط کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے خود کو جھنجوڑا۔ چکی کے کھردرے پاٹ اب تک اس کے دماغ میں گھو رہے تھے۔ وہ ریچھ کے ڈھانچے پر بیٹھ گیا اور اب ٹھنڈا ٹھنڈا تھا اس نے سوچنا شروع کیا "کیا کروں، کہاں جاؤں، کیوں کر اپنے محاذ تک پہنچوں۔"

جب وہ ہوائی جہاز سے گرا تھا تو اس کے نقشے کا بکس کھو گیا تھا لیکن اس کو جس راستے پر چلنا تھا اس کے دماغ میں اس کا نقشہ بالکل روشن تھا۔

وہ ریچھ کے ڈھانچے پر سے آہستہ آہستہ اٹھا اس نے پھر وہی درد محسوس کیا جو پیروں سے شروع ہو کر پورے جسم میں اوپر دوڑ جاتا تھا۔ مارے کرب کے اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ پھر بیٹھ گیا۔ اس نے سمور کے بوٹ اتارنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ہر جھٹکے کے ساتھ اس کے منہ سے ایک کراہ نکل جاتی۔ پھر دانت بھینچ کر اور آنکھوں کو زور سے بند کرتے ہوئے اس نے زور لگایا اور اپنے دونوں ہاتھ سے ایک بوٹ کھینچ لیا اور فوراً بے ہوش ہو گیا۔ جب دوبارہ اسے ہوش آیا تو اس نے بڑی احتیاط سے پیر کی پٹی کھولی اس کا پیر سوج گیا تھا اور چوٹ کی وجہ سے پورا کا پورا نیلا پڑ گیا تھا۔ اس کے جوڑ جوڑ میں ٹیس اور جلن ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا پیر برف پر رکھ دیا اور اس طرح اس کا درد کچھ کم ہو گیا۔ اسی طرح ایک بار پھر دانت بھینچ کر جیسے وہ خود اپنا دانت کھینچ رہا ہو، اس نے دوسرا بوٹ بھی اتار ہی لیا۔

اس کے دونوں پیر بے کار ہو چکے تھے۔ ظاہر تھا کہ جب وہ اپنی ہوائی جہاز کے کاک پٹ سے گرا تو کسی چیز میں اس کے پیر الجھے ہوں گے اور اس کے پیروں اور پنجوں کی ہڈیاں ٹوٹ کر رہ گئیں۔ ظاہر ہے معمولی حالت میں اس خوف ناک چوٹ کے بعد اس نے کھڑا ہونے کا خواب بھی نہ دیکھا ہوتا لیکن وہ تو ایک ویران و بیابان جنگل میں اکیلا تھا۔ وہ دشمنوں کے محاذ کے عقب میں تھا جہاں کسی آدمی سے مڈبھیڑ کا مطلب آرام و سکون نہیں بلکہ موت تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ جنگلوں کے اندر ہی اندر پورب کی طرف بڑھتا رہے اور کسی آسان راستے یا انسانی آبادی کی تلاش نہ کرے ہر قیمت پر آگے بڑھتا رہے۔

پکے عزم کے ساتھ وہ ریچھ کے ڈھانچے پر سے اٹھا، کراہتے ہوئے دانت جکڑے اور پہلا قدم اٹھایا وہ ایک لمحے اسی طرح کھڑا رہا پہلا پیر برف میں سے کھینچا اور دوسرا قدم اٹھایا اس کے سر میں ایک گھنگھناہٹ سی اٹھنے لگی اور اس کی آنکھوں کے سامنے میدان ناچتے تیرتا ہوا غائب ہو گیا۔ الکسی مارے تھکن اور درد کے نڈھال ہونے لگا۔ وہ ہونٹ کاٹتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور ایک جنگلی راستے پر پہنچ گیا جو ایک برباد ٹینک اور ہاتھ میں بم پکڑے ہوئے مردہ سپاہی کے پاس سے ہوتا ہوا پورب کی طرف جنگل کی گہرائیوں میں کھو گیا تھا۔ نرم برف پر اس طرح بھٹک بھٹک کر چلنا اتنا برا نہ تھا لیکن جیسے ہی اس کا پیر ہوا سے سخت ہو جانے والی برف سے ڈھکی ہوئی سڑک کے کوہان جیسے اٹھے ہوئے حصے سے چھو جاتا اس کا درد اتنا جان لیوا ہو جاتا کہ دوسرا قدم اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی اور وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی دونوں ٹانگیں کچھ عجیب بے ڈھنگے پن سے دور دور تھیں اس کا جسم جھوم رہا تھا جیسے ہوا کے جھونکوں میں لہرا رہا ہو۔

اس نے چلنا نہیں بلکہ آگے کھسکنا شروع کیا، وہ بڑی احتیاط سے پیر خوب اٹھا اٹھا کر ایڑیوں کے بل آگے بڑھنے لگا جس طرح آدمی دلدل میں چلتا ہے۔ ہر چند قدم کے بعد تھکن اور درد سے نڈھال ہو کر اس کا

سر گھومنے لگتا اور ہر بار وہ رکنے پر مجبور ہو جاتا وہ آنکھیں موند لیتا کسی درخت کے تنے کے سہارے یا برف کے کسی ڈھیر پر آرام کرنے کے لیے بیٹھ جاتا اور اس وقت اس کو اپنی رگوں میں خون کے ہیجان کا احساس ہوتا۔

اسی طرح وہ کئی گھنٹے تک آگے بڑھتا رہا لیکن جب اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کو اب بھی جنگل کا کنارا نظر آیا جو سڑک کے دھوپ میں چمکتے ہوئے اس موڑ کو کاٹ رہا تھا جہاں مردہ سپاہی برف پر ایک چھوٹے سے سیاہ دھبے کی طرح پڑا ہوا تھا۔ الکسی کو بہت زیادہ مایوسی ہوئی۔ وہ مایوس ضرور ہوا مگر ہراساں نہ ہوا۔ اس چیز نے اس میں اور تیزی سے آگے بڑھنے کی خواہش بیدار کی وہ برف کے ڈھیر پر سے اٹھا اس نے دانت بھینچ لیے اور آگے بڑھا اور تمام تر توجہ کسی قریب کی منزل پر مرکوز کرتے ہوئے چلنے لگا۔ ایک چیڑ کے درخت سے دوسرے درخت تک ایک تنے سے دوسرے تنے تک' برف کے ایک ڈھیر سے دوسرے ڈھیر تک۔ آگے بڑھتے ہوئے وہ اپنے پیچھے ویران جنگل کی سڑک کے پاک برف پر ناہموار اور پیچ و خم کھاتے ہوئے نشان چھوڑے جا رہا تھا' جیسے یہ کسی زخمی جانور کے چھوڑے ہوئے نشان ہوں۔

☼ ☼ ☼

اور اسی طرح وہ شام تک چلتا رہا۔ جب سورج نے اس کے پیچھے کہیں دور غروب ہوتے ہوئے اپنی ٹھنڈی اور لال شفق سے درختوں کے سروں کو جگمگا دیا اور سرمئی پرچھائیاں جنگل میں گہری ہونے لگیں تو وہ ایک چھوٹی سی گھاٹی میں جا نکلا' جو سدا بہار صنوبری جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہاں اسے جو منظر نظر آیا اسے دیکھ کر محسوس ہوا جیسے اس کی پیٹھ پر بھیگا ہوا ٹھنڈا تولیہ پھسل رہا ہے۔ خود کے نیچے اس کے بال کھڑے ہو گئے۔

معلوم ہوتا تھا جب اس میدان میں لڑائی ہو رہی تھی تو اس وقت کوئی میڈیکل کمپنی اس گھاٹی پر تعینات کی گئی تھی یہاں زخمی لا کر چیڑ کی سوئیوں جیسی چبھتی ہوئی شاخوں پر لٹائے جاتے ہوں گے یہاں وہ اب تک ان جھاڑیوں کی پناہ میں پڑے ہوئے تھے۔ بعض برف میں نیم دفن تھے اور بعض بالکل دب گئے تھے۔ یہ بالکل صاف تھا کہ وہ اپنے زخموں کی وجہ سے نہیں مرے تھے۔ کسی نے بڑی صفائی کے ساتھ چاقو سے ان کی گردنیں اڑا دی تھیں۔ وہ سب کے سب ایک ہی انداز میں پڑے تھے۔ ان کے سر پیچھے کی طرف ڈھلکے ہوئے تھے جیسے وہ دیکھنا چاہ رہے ہوں کہ ان کے پیچھے کیا کچھ ہو رہا ہے اور یہاں بھی اس بھیانک منظر پر سے پردہ سا ہٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا چیڑ کے ایک پیڑ تلے سوویت فوجی کے برف سے ڈھکے ہوئے جسم کے پاس ایک نرس بیٹھی تھی جو کمر تک برف میں دھنسی ہوئی تھی۔ سپاہی کا سر اس کی گود میں تھا وہ بوٹے سے قد کی بڑی دبلی پتلی نازک سی لڑکی تھی۔ وہ سمور کی ٹوپی پہنے ہوئے تھی جس کے کان ڈھکنے والے فیتے اس کی تھوڑی کے نیچے بندھے ہوئے تھے اس کے شانوں کے درمیان ایک خنجر کا چمک دار دستہ جگمگا رہا تھا۔ قریب ہی ایک جرمن کی لاش پڑی تھی جو SS والی سیاہ وردی میں لپٹی ہوئی تھی۔ پاس ہی ایک سوویت سپاہی کی لاش تھی جس کے سر پر خون میں لتھڑی ہوئی پٹی بندھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی گردن کو موت کی آخری گرفت میں جکڑے پڑے تھے۔ الکسی فوراً بھانپ گیا کہ کالی وردی والے سپاہی نے زخمیوں کو قتل کیا تھا اور سوویت سپاہی نے جو ابھی زندہ ہو گا' جھپٹ کر اسی لمحے اسے آلیا تھا جبکہ وہ نرس پر خنجر کا وار کر رہا تھا اس نے اپنی انگلیوں کی رہی سہی طاقت سے کام لیتے ہوئے دشمن کو جکڑ لیا تھا۔

اس طرح برف کے طوفان نے اس سب کو دفن کر دیا تھا سمور کی ٹوپی پہنے ہوئے پتلی دبلی لڑکی کو اور ان دونوں قاتل اور اس سے انتقام لینے والے سوویت سپاہی کو جو ایک دوسرے کی گردن کو جکڑے ہوئے نرس کے چوڑے فوجی بوٹوں میں چھپے ہوئے قدموں میں پڑے تھے۔

الکسی وہاں چند لمحے بالکل مبہوت کھڑا رہا۔ پھر نرس کی طرف بڑھا اور اس کی پشت سے خنجر کھینچ لیا۔ یہ ایک نازی خنجر تھا۔ یہ پرانی جرمن تلوار کے طرز کا خنجر تھا اور اس کے دستے کے مٹھ پر SS کا روپہلا نشان بنا ہوا تھا۔ خنجر کے زنگ آلود پھل پر اب یہ الفاظ بھی پڑھے جاسکتے تھے۔ Alles for Deutschland (سب کچھ جرمنی کے لیے)۔ الکسی نے جرمن کے جسم سے خنجر کے چمڑے کا خول الگ کیا۔ اسے راستے میں خنجر کی ضرورت ہو گی۔ اس نے برف ہٹا کر برف سے جما ہوا لبادہ کھودا اور نرس کی لاش کو بڑی محبت کے ساتھ لبادے سے ڈھک دیا اور اس کے اوپر چیڑ کی چند ڈالیاں رکھ دیں۔

جیسے ہی صبح کی پہلی کرنیں پھوٹیں وہ چونک کر اٹھ بیٹھا' جیسے کسی نے اس کو جھنجوڑ دیا ہو۔ جاگنے پر اسے یاد آیا کہ اس پر کیا بیتی تھی اور وہ کہاں تھا اور اس نے جس بے پروائی سے جنگل میں یہ رات کاٹی تھی اس کے خیال نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ تیز ٹھنڈک اس کے سمور کے فلائنگ سوٹ کو چیر کر اندر گھس رہی تھی اور اس کا کلیجہ چھلنی کیے دے رہی تھی۔ وہ کانپ رہا تھا۔ لیکن سب سے برا حال تو اس کے پیروں کا تھا۔ اب بھی جب کہ وہ آرام کر رہا تھا اس کا درد پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا تھا۔ کھڑے ہونے کے خیال سے ہی اس کا دم نکلا جا رہا تھا۔ لیکن وہ پورے عزم کے ساتھ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا جس طرح کل اس نے دانت بھینچ کر اپنے سمور کے بوٹ اتارے تھے۔

الکسی کو جو مصیبتیں ستا رہی تھیں ان میں اب بھوک کا اضافہ ہو گیا تھا۔ پچھلے دن جب اس نے نرس کی لاش لبادے سے ڈھکی تھی تو اس نے اس کے پاس پڑا ہوا تھیلا دیکھا تھا جس پر ریڈ کراس کا نشان تھا کسی چھوٹے سے جانور نے اس تھیلے کو کترنا شروع کر دیا تھا اور اس میں جانور کے بنائے ہوئے سوراخوں کے پاس چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ الکسی نے پچھلے دن جب ان کو دیکھا تھا تو کوئی خاص توجہ نہ دی تھی لیکن اب اس نے تھیلا اٹھایا اس میں اسے میدان جنگ میں مرہم پٹی کے سامان کے ساتھ گوشت کا ایک ٹین ' خطوں کا ایک پیکٹ اور ایک چھوٹا سا آئینہ ملا جس کی پشت پر پتلے منہ کی ایک بوڑھی عورت کی تصویر تھی جیسا کہ ظاہر تھا اس تھیلے میں روٹی بھی تھی لیکن چڑیوں اور جانوروں نے اس کا صفایا کر دیا تھا۔ الکسی نے اپنے فلائنگ سوٹ کی جیبوں میں ٹین اور پٹیاں رکھ لیں اور آپ ہی آپ بولا ''شکریہ۔'' اس نے جوان لڑکی کے پیروں کو لبادے سے ڈھک دیا جس کو ہوا نے ہٹا دیا تھا اور آہستہ آہستہ پورب کی طرف چل پڑا جو درختوں کی شاخوں کی جالیوں کے پیچھے نارنجی رنگ کے شعلے سے دہک رہے تھے۔

اب اس کے پاس ایک کلو گرام گوشت تھا اور اس نے طے کیا کہ روزانہ ایک بار دوپہر کو کھایا کرے گا۔

☼ ☼ ☼

درد سے اپنا دھیان بٹانے کے لیے الکسی نے اپنے راستے کے بارے میں سوچنا اور اس کا حساب لگانا شروع کیا۔ اگر اس نے روزانہ دس بارہ کلو میٹر کا فیصلہ طے کیا وہ زیادہ سے زیادہ تین دن میں اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔

''یہ ٹھیک ہے! اچھا' دس بارہ کلو میٹر کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ ایک کلو میٹر دو ہزار قدموں کے برابر ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دس کلو میٹر میں بیس ہزار قدم ہوں گے۔ لیکن یہ تو بہت ہوتے ہیں کیوں کہ مجھے ہر پانچ چھ سو قدم کے بعد آرام کرنا پڑے گا....''

پچھلے دن سفر کو آسان بنانے کے لیے الکسی نے بعض منزلیں مقرر کر لی تھیں۔ چیڑ کا ایک درخت' درخت کا کوئی تنا یا سڑک کا کوئی گڑھا اور وہ ان میں سے ہر ایک کی طرف یہ سوچ کر بڑھتا کہ وہاں پہنچ کر اسے ستانا ہے۔ اب اس نے اسے عددوں میں بدل دیا کہ اتنے قدموں کے بعد ستانے کی منزل آئے گی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ہر دوڑ ایک ہزار قدموں کی ہو گی یعنی آدھا کلو میٹر اور گھڑی دیکھ کر آرام کیا جائے گا۔ پانچ

منٹ اور بس! اس نے یہ اندازہ قائم کیا کہ وہ سورج کے طلوع ہونے سے غروب ہونے تک بڑی مشکل سے دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر سکتا ہے۔

لیکن پہلے ایک ہزار قدم کتنے کٹھن تھے۔ اس نے درد کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لیے اپنے قدم گننے شروع کیے۔ لیکن پانچ سو کے بعد وہ گننا بھول گیا اور اس کے بعد اپنے جلتے اور ٹیس مارتے ہوئے درد کے سوا اور کچھ نہ سوچ سکا ہاں پھر بھی اس نے ایک ہزار قدم پورے کر کے ہی دم لیا۔ اس میں بیٹھنے کی سکت نہ تھی۔ وہ منہ کے بل برف میں گر گیا اور بڑے ندیدے پن سے برف چاٹنے لگا اس نے اپنی پیشانی اور جلتی ہوئی کنپٹیاں برف پر رکھ دیں اور اس برفیلے لمس میں ایک ناقابل بیان راحت محسوس کی۔

وہ کانپ گیا اور گھڑی دیکھی سیکنڈ کی سوئی ٹک ٹک کرتی ہوئی مقررہ پانچ منٹ کے آخری سیکنڈ ختم کر رہی تھی۔ اس نے بڑی سراسیمگی کے ساتھ اس کھسکتی ہوئی سوئی کو دیکھا جیسے اس چکر کے خاتمے پر کوئی بڑی خوف ناک بات ہونے والی ہو۔ لیکن جیسے ہی سوئی ساٹھ پر پہنچی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور کراہتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

دوپہر تک جب جنگل کی نیم تاریکی چیڑ کی گھنی شاخوں سے چھنتی ہوئی سورج کی باریک کرنوں سے جگمگانے لگی اور اور جب سارا جنگل درختوں کی رال اور پگھلتی ہوئی برف کی خوشبو سے بس گیا تو اس نے ابھی ان منزلوں میں سے صرف چار منزلیں طے کی تھیں۔ آخری منزل پر وہ برف میں گر گیا کیوں کہ اب اس میں اس برچ کے درخت کے تنے تک رینگنے کی بھی سکت باقی نہیں رہی تھی جو مشکل سے ہاتھ بھر کی دوری پر تھا۔ وہاں وہ بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ اس کا سر سینے پر ڈھلک آیا تھا۔ وہاں وہ بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ اس کا سر سینے پر ڈھلک آیا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ سوچ رہا تھا، وہ نہ کچھ دیکھ رہا تھا اور نہ سن رہا تھا، اب تو بھوک کا احساس بھی مٹ گیا تھا۔

اس نے گہری سانس لی، کئی بار چٹکیوں سے برف منہ میں ڈالی اور اپنی بے حسی اور غفلت پر قابو پاتے ہوئے جس نے اس کے جسم کو جکڑ رکھا تھا اپنی جیب سے زنگ آلود ٹین نکال کر اسے جرمن خنجر سے کھولا۔ اس نے برف کی طرح شل بے مزہ چربی کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھا اور اسے نگلنا چاہتا تھا کہ وہ پگھل گیا۔ لیکن دفعتاً اسے ایسی زبردست بھوک نے آدبوچا کہ وہ ٹین کو لاکھ ہٹائے نہ ہٹا سکا آخر اس نے برف پھانکنا شروع کیا تاکہ کچھ تو ہو کھانے کو کچھ تو گلے سے اترتا رہے۔

لیکن آگے بڑھنے سے پہلے اس نے صنوبری جھاڑی سے اپنے لیے دو چھڑیاں کاٹیں۔ وہ ان چھڑیوں کے سہارے کھڑا ہوا اور چلنے لگا لیکن ہر تازہ قدم کے ساتھ اس کے لیے اگلا قدم اٹھانا دوبھر ہوتا گیا۔

☼ ☼ ☼

اس گھنے جنگل میں الکسی کے دردناک سفر کا تیسرا دن تھا۔ اب تک اسے آدم یا آدم زاد کا دور دور کوئی نشان نظر نہ آیا تھا لیکن تیسرے دن ایک غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔

وہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اٹھا تو مارے ٹھنڈ اور اندرونی بخار کے لرز رہا تھا۔ اپنے فلائنگ سوٹ کی ایک جیب میں اسے ایک لائٹر ملا جو اس کے مستری نے رائفل کے ایک خالی کارتوس سے بنایا تھا اور اس کو بطور یادگار دیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں بالکل بھول گیا تھا اور یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ آگ روشن کر سکتا تھا اور اسے آگ روشن کرنا چاہیے تھا۔ اس نے فر کے درخت کی کچھ سوکھی اور کائی سے ڈھکی ہوئی شاخیں توڑیں ان پر چیڑ کی ٹہنیاں ڈال کر ان کو جلایا۔ سرمئی دھوئیں کے نیچے سے تیز اور پیلے شعلے بھڑکنے لگے۔ آگ بڑھکتی چٹختی رہی اور اس سے خشک اور آرام دہ گرمی نکلتی رہی۔ الکسی کو آرام و سکون کا احساس ہوا۔ اس نے فلائنگ سوٹ کی زنجیر کھینچی اور وردی کی جیب سے کچھ مڑے تڑے خط نکالے۔ ان سب کی لکھائی ایک ہی جیسی تھی۔ ان میں سے ایک خط میں باریک سے کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک تصویر ملی۔ یہ ایک نازک سی لڑکی کی تصویر تھی۔ اس نے کچھ دیر تک تصویر کو غور سے دیکھا اور پھر اس کو باریک کاغذ میں لپیٹ دیا اور واپس لفافے میں رکھ دیا، ایک لمحے کے لیے کچھ سوچتے ہوئے اسے اپنے ہاتھ میں تھامے رہا اور دوبارہ لفافہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"کوئی پروا نہیں، سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔" اس نے یہ بات لڑکی سے کہی یا اپنے آپ سے یہ بتانا مشکل ہے۔ اس نے سوچتے ہوئے دوہرایا "کوئی بات نہیں!"

الکسی نے ٹھنڈی سانس لی اور بجھتی ہوئی آگ پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ سخت برف پر اس کی چھڑیاں چرمراہٹ کی آواز پیدا کر رہی تھیں وہ ہونٹ چباتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ کبھی کبھی تو وہ نیم بے ہوش ہو جاتا۔ دفعتاً جنگل کے عام شور کے درمیان ایک نئی آواز سنائی دی۔ اس کے کان جنگل کی آواز کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ وہ مشکل سے نئی آواز سن سکتا تھا۔ اب اس نے دور سے موٹر کی گھنگھناہٹ سنی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ تھکن کی وجہ سے اسے وہم ہو رہا ہے لیکن آواز تیز ہوتی گئی۔ صاف تھا کہ یہ جرمن تھے اور اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ الکسی کو فوراً اپنے پیٹ میں ایک عجیب سی ٹھنڈک محسوس ہوئی۔

ڈر نے اس کے اندر طاقت پیدا کر دی۔ وہ اپنی تھکن اور پیروں کا درد بھول گیا اور سڑک سے ہٹ کر برف کی ہموار سطح پر بھٹکتا ہوا فر کے درختوں کے ایک جھنڈ تک پہنچا اور اس کی گہرائیوں میں گھس کر وہ برف پر گر گیا۔ سڑک سے اس کو دیکھنا مشکل تھا لیکن خود وہ سڑک کو صاف طور سے دیکھ سکتا تھا جو دوپہر کی دھوپ میں جھلملا رہی تھی۔

آواز اور قریب آ گئی۔ الکسی کو یاد آیا کہ اس نے جو سڑک چھوڑی تھی اس پر وہ اپنے قدموں کے نمایاں نشان چھوڑ آیا تھا۔ لیکن اب اور دور بھاگنے کا وقت نکل چکا تھا۔ موٹر کی آواز بہت قریب آ رہی تھی۔ الکسی اور بھی زیادہ برف میں دھنس گیا۔ اس نے شاخوں کی جالیوں میں سے ایک چپٹی سفید رنگ کی بکتر بند موٹر دیکھی۔ موٹر ہچکولے کھاتی اور اپنی زنجیریں بجاتی ہوئی اس جگہ پر پہنچ گئی جہاں سے الکسی کے قدموں کے نشان سڑک سے ایک طرف کو مڑ گئے تھے۔ الکسی نے سانس روک لی۔ بکتر بند موٹر آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد ایک کھلی ہوئی گاڑی آئی جو ہر جگہ دوڑ بھاگ سکتی ہے۔ ایک آدمی جو اونچی ٹوپی پہنے ہوئے تھا اور جس کی ناک سمور کے کالر میں کھوئی ہوئی تھی، ڈرائیور کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے مشین گن چلانے والے کئی سپاہی بھورے رنگ کے کوٹ اور فولاد کے خود پہنے، اونچی بنچوں پر بیٹھے اور گاڑی کے ساتھ ساتھ ہچکولے کھا رہے تھے۔ ایک اور بڑی کھلی گاڑی سب سے پیچھے پیچھے آ رہی تھی اس کا انجن گرج رہا تھا اور زنجیریں بج رہی تھیں۔ اس میں قطار اندر قطار کوئی پندرہ جرمن بیٹھے تھے۔

الکسی برف میں اور بھی دھنس گیا۔ موٹریں اتنے قریب آ گئیں کہ جلے ہوئے پیٹرول کا دھواں اس کے چہرے تک تیرتا چلا آیا۔ لیکن موٹریں آگے بڑھتی چلی گئیں۔ پیٹرول کے دھوئیں کی جلی ہوئی بو دور ہوتی گئی اور جلد ہی انجنوں کی آواز دور، بہت دور سے سنائی دینے لگی۔

جب ہر طرف خاموشی چھا گئی تو الکسی سڑک پر نکل آیا سڑک پر گزری ہوئی موٹروں کے نشان صاف نمایاں تھے۔ وہ ان ہی نشانوں پر چلتا ہوا یورپ کی طرف بڑھتا رہا۔ وہ اسی حساب سے منزل بہ منزل بڑھتا رہا اور آدھے دن کا راستہ طے کرنے کے بعد اس نے اسی طرح آرام کیا اور کھانا کھایا۔ لیکن اب وہ ایک جنگلی جانور کی طرح بڑھ رہا تھا اور انتہائی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ ہلکی سے ہلکی سرسراہٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے، اس کی نگاہیں کسی طرف سے دوسری طرف تیرتی چلی جاتیں جیسے اسے معلوم ہو کہ ایک بہت بڑا خطرناک درندہ آس پاس منڈلا رہا ہے۔

ہواباز ہونے کی وجہ سے وہ ہوا کی بلندیوں میں لڑنے کا عادی تھا اور اس نے پہلی بار دشمن کو زمین پر دیکھا تھا۔ اور اب وہ ان کے ابھارے ہوئے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ وہ انتقاماً'' ہنسا۔

شام کا دھندلکا پھیلنے تک اس نے صرف پانچ منزلیں طے کی تھیں۔ رات کے وقت اس نے زمین پر پڑے ہوئے برچ کے ایک بڑے تقریباً'' گلے سڑے تنے پر چیڑ کی ٹہنیاں اور سوکھی ہوئی لکڑیاں جمع کر کے سو گیا۔

آدھی رات کو برف کا طوفان آیا۔ لیکن اس طوفان نے الکسی کو نہ چھیڑا۔ وہ گہری نیند میں کھویا ہوا تھا اور آگ کی گرمی اس کی نگہبانی کر رہی تھی۔

الکسی نے صبح کے وقت ٹین میں بچا کھچا گوشت کھانے کا فیصلہ کیا۔ گوشت کیا گوشت کے چند ریشے رہ گئے تھے جو لذیز چربی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کے اندر اٹھنے کی سکت بھی پیدا نہ ہو سکے گی۔ اس نے انگلیوں سے خوب اچھی طرح ٹین کو صاف کیا' دانتوں کی طرح نکلے ہوئے تیز کناروں سے اس کی انگلیاں کٹ کٹ گئیں لیکن اس کو محسوس ہوا کہ اب بھی ٹین کے اندر چربی کے چند ٹکڑے چپکے ہوئے ہیں۔ اس نے ٹین کو برف سے بھر دیا' بجھتی ہوئی آگ پر سے سرمئی راکھ ہٹائی اور ٹین کو دہکتے ہوئے انگاروں پر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ گرم پانی کو چسکیاں لے لے کر بڑے ذوق و شوق سے پی گیا جس میں سے گوشت کی ہلکی ہلکی بو آ رہی تھی۔ پانی پی چکنے کے بعد اس نے ٹین کو جیب میں ڈال لیا۔ اس کا ارادہ تھا اس میں کبھی کبھی چائے گرم کرے گا اور گرم چائے پئے گا۔ گرم چائے! یہ ایک خوش گوار انکشاف تھا اور جب وہ دوبارہ اپنی راہ پر روانہ ہوا تو اس خیال سے اس کے دل میں خوشی کی ایک کرن پھوٹ گئی۔

لیکن یہاں اسے ایک بڑی مایوسی سے دوچار ہونا تھا۔ برف کے طوفان نے راستہ مٹا دیا تھا اور برف کے ڈھلواں اور مخروطی ڈھیروں نے جابجا راستے کو روک دیا تھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی نیلگوں چمک اس کی آنکھوں میں نشتر کی طرح چبھنے لگی۔ اس کے پیر پھولے پھولے برف کے ڈھیروں میں دھنسنے لگے جو اب تک سخت نہیں ہوئے تھے۔ وہ ان ڈھیروں میں سے اپنے پیر بڑی مشکل سے کھینچ سکتا تھا۔ اس کی چھڑیاں بھی بہت کم اس کی مدد کر سکتی تھیں کیونکہ کہ ہر بار وہ بھی برف میں دھنس جاتی تھیں۔

دوپہر تک' جب درخت کے نیچے سائے سیاہ ہوئے اور سورج درختوں کے اوپر سے جھانکنے لگا' الکسی نے صرف پندرہ سو قدم کا فاصلہ طے کیا تھا۔ وہ تھک کر اتنا چور ہو گیا تھا کہ ہر تازہ قدم اٹھانے کے لیے اس کو بے پناہ قوت ارادی کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کا سر چکرانے لگا' اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکنے لگی۔ ہر تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ گر جاتا' برف کے ڈھیر پر بے حس و حرکت ایک لمحے کو پڑا رہتا اور چرمرائی ہوئی برف پر اپنی پیشانی کو دباتا' پھر اٹھتا اور چند قدم آگے چلتا۔ اس کو سونے' لیٹ جانے اور ہر چیز کو بھلا دینے اور بے حس و حرکت ہو کر پڑ رہنے کی ناقابل تسخیر خواہش نے آن دبوچا۔ اب چاہے جو بھی ہو! وہ رک گیا۔ بالکل سن کھڑا ہوا جھومتا رہا۔ اس نے پھر اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے اپنی ساری طاقت اکٹھی کی اور مشکل سے اپنے پیروں کو گھسیٹتے ہوئے چند قدم اٹھائے

آخر اسے محسوس ہوا کہ اب وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ کوئی طاقت بھی اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی' اگر اس وقت وہ بیٹھ گیا تو پھر کبھی نہ اٹھ سکے گا۔ اس نے اپنے چاروں طرف حسرت بھری نظریں دوڑائیں سڑک کے کنارے گھنگریالے سر والا ایک نیا چیڑ کھڑا تھا۔ اپنی طاقت کا آخری قطرہ استعمال کرتے ہوئے الکسی اس کی طرف بڑھا اور خود کو اس پر گرا دیا۔ اس کی ٹھوڑی دوشاخے پر رکھی ہوئی تھی۔ اس چیڑ نے اس کے ٹوٹے ہوئے پیروں کا بوجھ کچھ ہلکا کر دیا اور اس کو کچھ آرام محسوس ہوا۔ وہ پر پیچ شاخوں کے سہارے لیٹ گیا اور آرام کا لطف اٹھانے لگا۔ اور زیادہ آرام کرنے کے ارادے سے اس نے اپنا ایک پر گھسیٹا اور

اس کے بعد دوسرا۔ اب تک اس کی ٹھوڑی شاخ کے دوشاخے پر رکھی ہوئی تھی اور اس کے پیر جن پر سے جسم کا بوجھ بالکل ہٹ گیا تھا اب آسانی کے ساتھ برف کے ڈھیر میں سے نکل آئے۔ اسے ایک شاندار تدبیر سوجھی۔

''ارے واقعی! اس چھوٹے سے پودے کو کاٹنا آسان ہو گا۔ اس کی شاخیں کاٹ کر الگ کر دی جائیں اور یہ دوشاخا باقی رہ جائے' ڈنڈے کو آگے پھینکا جائے اور ٹھوڑی اس دوشاخے پر اس طرح رکھی جائے کہ جسم کا سارا بوجھ اس پر پڑے اور تب میں اپنے پیر آگے بڑھاؤں' جس طرح میں اس وقت کر رہا ہوں۔ اس طرح رفتار بہت سست ہو جائے گی ہاں سست تو ہو جائے گی لیکن میں اتنا زیادہ نہیں تھکوں گا' اور اس وقت تک برابر آگے بڑھتا رہوں گا جب تک کہ برف کے ڈھیر سخت نہ پڑ جائیں۔''

وہ گھٹنوں کے بل گر گیا اور اپنے خنجر سے چھوٹے سے درخت کو کاٹ گرایا' شاخوں کو چھانٹ کر الگ کیا۔ اس نے اپنا رومال نکالا' پٹیاں لیں اور انہیں چھڑی کے اوپر لپیٹ کو فوراً'' اپنے راستے پر چل پڑا۔ اس نے چھڑی کو آگے بڑھایا' اپنے ہاتھوں اور ٹھوڑی کو اس کے دوشاخے پر ٹکایا' ایک پیر آگے رکھا اور پھر دوسرا اور پھر چھڑی کو آگے بڑھایا اور دو قدم آگے بڑھائے۔ اور اسی طرح وہ چلتا رہا اور اپنے قدم گنتا اور اپنی رفتار اور منزلیں مقرر کرتا رہا۔

☆ ☆ ☆

اس طرح وہ دو دن تک برف پوش راستے پر لنگڑاتا ہوا چلتا رہا۔ وہ اپنی چھڑی کو آگے پھینکتا' اس کے سہارے آرام کرتا اور پھر پیر گھسیٹتا۔ اس وقت تک اس کے پیر سن ہو گئے تھے اور ان میں کوئی حس باقی نہیں رہی تھی لیکن اس کا جسم ہر قدم پر مارے درد کے کانپ جاتا تھا۔ اب بھوک کی ٹیس باقی نہیں تھی اب اس کے پیٹ میں چبھن اور کاٹتی ہوئی ٹیس ایک مستقل اور بوجھل درد میں بدل گئی تھی جیسے اس کا خالی پیٹ سخت ہو کر پلٹ گیا ہو اور اندر سے اس کے معدے اور آنتوں کو دبا رہا ہو۔

الکسی کا کھانا چیڑ کے درختوں کی چھالیں تھیں جو وہ آرام کے لمحوں میں اپنے خنجر سے اتارتا تھا اور ساتھ ہی برچ اور لائیم کی کلیاں اور نرم اور ہری کائی بھی جن کو وہ برف کی تہ کھود کر نکالتا تھا اور اپنے رات کے آرام کے دوران میں پانی میں ڈال کر ابالتا تھا۔ پگھلی ہوئی برف کے نیچے سے جھانکتی ہوئی گوندنیوں کا ''جوشاندہ'' ابال کر پیتا تو اس کا جی باغ باغ ہو جاتا تھا۔ یہ گرم ''جوشاندہ'' اس کے پورے جسم میں ایک روشنی کی لہر سی دوڑا دیتا اور اس میں آرام و آسودگی کا ایک دل فریب احساس پیدا کر دیتا۔ دھوئیں اور پتوں کی بو میں بسا ہوا ''جوشاندہ'' پیتے ہوئے اسے بڑے سکون کا احساس ہوتا اور اس کا سفر اتنا بے منزل اور ہول ناک نہ معلوم ہوتا۔

یہ اس کی چھٹی رات کا پڑاؤ تھا اور وہ پھر فر کے ایک پیڑ کے تلے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے رال نکالتے ہوئے ایک تنے کے چاروں طرف آگ روشن کر رکھی تھی۔ ابھی رات کا اندھیرا نہیں چھایا تھا۔ اوپر فر کے پیڑ پر ایک گلہری نظر سے اوجھل اپنی دھن میں محو تھی۔ وہ فر کے پھل کو کھٹ کھٹ کر اس کے ٹوٹے ہوئے چھلکوں کو زمین پر گرا رہی تھی۔ الکسی کا دماغ اب مستقل کھانے کے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ آخر گلہری کو ان پھلوں میں کیا ملتا ہو گا۔ اس نے ایک پھل اٹھایا اور اس کا چھلکا اتار کر دیکھا تو اندر باجرے جتنا بڑا ایک بیج نظر آیا۔ دیکھنے میں وہ صنوبر کی چھوٹی چھوٹی پھلیوں جیسا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بیج کو منہ میں رکھا اور دانتوں سے دبا کر توڑ دیا اور اسے صنوبر کے مزے دار تیل کا ذائقہ محسوس ہوا۔

پھر اس نے چند پھل جمع کیے جو اس کے آس پاس بکھرے ہوئے تھے' ان کو آگ کے پاس ڈالا اور جب گرمی سے پھل پھوٹنے لگے تو اس نے ان کو اپنی مٹھیوں میں لے کر ملا اور ہتھیلیوں کے درمیان دبا کر ان کے اندر سے بیج نکال لئے اور پھونک پھونک کر ان

کی پردار بھوسی اڑائی اور چھوٹے چھوٹے دانے پھانک لئے۔

ساتویں دن الکسی کو معلوم ہوگیا کہ برفانی طوفان والی رات کو دور سے سنائی دینے والی جنگ کی آواز کہاں سے آرہی تھی۔

وہ تھک کر بالکل چور ہو چکا تھا۔ وہ ہر ہر قدم پر ستانے کے لیے رکتا، لیکن پھر بھی خود کو جنگل کی سڑک پر گھسیٹتا رہا جس پر برف پگھل رہی تھی۔

یکایک ایک نقطے پر پہنچ کر جہاں جنگلی سڑک اچانک بائیں ہاتھ کو مڑ گئی تھی، وہ رک گیا اور اس کے پیر زمین میں جکڑ کر رہ گئے۔ اس جگہ پر جہاں سڑک بہت زیادہ تنگ ہوگئی تھی اور دونوں طرف چیڑ کے نوخیز درختوں کے جھنڈ ایک دوسرے کی طرف جھکتے اور بڑھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، اس کو جرمن موٹریں نظر آئیں جو چند دن قبل اس کے پاس سے گزری تھیں۔ ان کا راستہ چیڑ کے دو تناور درختوں سے رکا ہوا تھا۔ ان درختوں کے بالکل پاس بکتر بند موٹر کھڑی تھی۔ اس کا ریڈی ایٹر تنے سے اٹکا ہوا تھا، اب اس کا رنگ دھبہ دار سفیدی مائل نہیں رہا تھا۔ اب وہ زنگ جیسا لال ہوگیا تھا۔ موٹر اپنے پہیوں کے فریم پر کھڑی تھی کیونکہ اس کے پہیوں کے ٹائر جل گئے تھے اب اس کا مشین گن والا مینار ایک درخت کے نیچے سانپ کی دیو نما چھتری کی طرح پڑا تھا۔ بکتر بند موٹر کے پاس تین لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ کالی، چکٹ وردیوں اور کپڑے کے خود میں ملبوس۔ یہ تھے اس کے چلانے والے۔

دو کھلی گاڑیاں، جن کا رنگ بھی مٹیالا لال تھا اور جو جل کر برباد ہو چکی تھیں، بکتر بند گاڑی کے بالکل پیچھے پگھلتی ہوئی برف میں کھڑی تھیں۔ برف دھوئیں، راکھ اور جلی ہوئی لکڑی سے سیاہ پڑ گئی تھی۔ سڑک کے کنارے، جھاڑیوں کے اندر اور گڑھوں میں، چاروں طرف جرمن سپاہیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ دہشت کھا کر بھاگے اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ ہر درخت، ہر جھاڑی کے پیچھے چھپی ہوئی موت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ برفانی طوفان نے موت کو اپنی چادر میں چھپا لیا تھا۔

افسر کا جسم جو پتلون سے محروم تھا، ایک درخت سے بندھا ہوا تھا۔ کی سبز وردی کے سیاہ کالر میں کاغذ کا ایک ٹکڑا چپکا ہوا تھا، لکھا تھا۔ ”چلو تمہاری مراد بر آئی۔!“ اور اس عبارت کے نیچے دوسری لکھائی میں پنسل سے لکھا تھا۔ ”رذیل کتے۔“

الکسی نے جنگ کے اس منظر کا جائزہ لیا اور کھانے کی کسی چیز کے لیے نظر دوڑائی اسے ایک باسی پھپھوند بھرے بسکٹ کے سوا اور کچھ نہ ملا۔ بسکٹ برف میں دھنسا پڑا تھا اور چڑیوں نے چونچ مار مار کر اسے جگہ جگہ سے نوچ دیا تھا۔ وہ فوراً اسے اٹھا کر مونہہ کے قریب لایا۔ لیکن اس نے اپنی اس خواہش کو دبا دیا اور بسکٹ کے تین ٹکڑے کر دیے۔ دو ٹکڑے تو اس نے اپنی ران والی جیب کے اندر چھپا دیے اور تیسرا ٹکڑا لے کر اس کے چھوٹے چھوٹے ریزے بنانے لگا۔ وہ ایک ایک ریزہ منہ میں لیتا اور چوستا جیسے وہ کوئی مٹھائی ہو وہ اس کا لطف زیادہ سے زیادہ دیر تک اٹھانا چاہتا ہو۔

ایک بار پھر اس نے جنگ کے منظر کا جائزہ لیا اور اب کے ایک خیال اس کے ذہن میں کوند گیا۔ ”یہاں قریب ہی کہیں چھاپہ مار ساتھی ضرور ہوں گے! جھاڑیوں اور درختوں کے ارد گرد کیچڑ بھری برف کو ان کے ہی قدموں نے روندا ہوگا۔“ شاید انہوں نے پہلے ہی اس کو ان لاشوں کے درمیان منڈلاتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا اور اب شاید فر کے کسی درخت کے اوپر سے، جھاڑیوں کے پیچھے سے کوئی چھاپہ مار اسکاوٹ اس کو گھور رہا ہوگا؟ اس نے اپنی ہتھیلیوں کو منہ پر رکھ کر بھونپو سا بنایا اور اپنی پوری طاقت سے چلایا۔“

”او ہو! چھاپہ مارو! چھاپہ مارو۔“

وہ حیران رہ گیا اس کی آواز کتنی مدھم اور کمزور تھی۔ یہاں تک کہ صدائے بازگشت بھی جو جنگل کی پہنائیوں سے ٹکرا کر گونجتی ہوئی آئی اور درخت کے تنوں سے ٹکرا کر دوبارہ گونجی، اس کی آواز سے زیادہ زور دار تھی۔

”چھاپہ مارو! چھا۔ چھاپہ مارو! او ہو!“ تیل سے سیاہ اور داغ دار برف میں جرمن سپاہیوں کی خاموش لاشوں کے درمیان بیٹھا ہوا الکسی بار بار پکار تا رہا۔

اس نے پورے زور سے اپنی چھڑی آگے کو بڑھائی، ٹھوڑی اس پر رکھی اور چھڑی پر اپنے جسم کا پورا بوجھ ڈالتے ہوئے برف پر ایک پیر آگے بڑھایا اور پھر دوسرا اور سڑک سے ہٹتے ہوئے جان جوکھوں میں ڈال کر مگر بڑے عزم و استقلال کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

اس دن تو وہ برف پر ایک سو قدم بھی نہ چل سکا۔ شام کے جھٹپٹے نے اس کو رکنے پر مجبور کر دیا۔ پھر اس نے درخت کا ایک ٹھنٹھ چنا اور اس کے گرد سوکھی ہوئی جھاڑیوں کا ڈھیر جمع کیا، اپنا کارتوس والا سگریٹ لائٹر کھولا، اس کے چھوٹے سے لوہے کے پہیے کو گھمایا، اس کو دوبارہ جھٹکا دیا اس کو پسینہ آگیا۔ لائٹر خالی ہو چکا تھا۔

اس رات اس کی ہمت جواب دے دیتی لیکن اس سوئے سوئے سے جنگل میں توپوں کی گھن گرج اور بھی زیادہ صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کو محسوس ہوا کہ وہ گولیوں کی تیز تیز تڑتڑاہٹ اور بموں کے لمبے لمبے دھماکوں کو الگ الگ پہچان سکتا ہے۔

صبح کے وقت وہ ایک ناقابل بیان تشویش اور دکھ کے احساس کے ساتھ اٹھا۔ لیکن جیسے ہی اس نے درخت تک اپنی ٹانگوں کو بڑھانے کی کوشش کی، کمزوری اور پیروں میں ایک خوف ناک اور نئی چبھتی ہوئی ٹیس سے نڈھال ہو کر گر گیا۔

کیا یہ چل چلاؤ ہے، کیا میں یہیں، چیڑ کے پیڑوں کے سائے میں دم توڑ دوں گا؟ یہاں تو جنگلی درندے میری لاش کو نوچ کر کھا جائیں گے۔ صرف چھوڑی ہوئی ہڈیاں رہ جائیں گی اور شاید کوئی بھی میری لاش نہ پا سکے گا، کوئی بھی اسے دفن نہ کر سکے گا۔

توپوں کی گھن گرج نے اس کے اندر ایک نیا حوصلہ پیدا کیا، اسے بار بار للکارا اور آخر وہ لبیک کہہ کر اٹھا۔ وہ اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل جھک گیا اور جانور کی طرح آگے چلنے لگا، پہلے تو جبلی طور پر اور بعد میں شعوری اور ارادی طور پر۔ اس نے سمجھ لیا کہ جنگل میں اس طرح چلنا چھڑی کی مدد سے چلنے کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔ پیروں پر سے بوجھ ہٹ گیا تھا اس لیے ان میں کم تکلیف ہو رہی تھی اور وہ اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل زیادہ تیز چل سکتا تھا۔

ایک مقررہ منزل طے کرنے کے بعد الکسی نے اپنے ہاتھوں کو بغلوں میں دبا کر گرم کیا، پھر رینگتا ہوا نوخیز فر کے ایک پیڑ کے پاس گیا اور اس میں سے دو مربع ٹکڑے چھال کے نکالے۔ چھال نکالنے میں اس کے ہاتھوں کے ناخن بھی ٹوٹ گئے۔ اس نے تنے سے کئی لمبے لمبے ریشے نکالے۔ اس نے سمور کے بوٹوں سے اپنے اونی اسکارف کے ٹکڑے نکالے اور ان کو ہاتھوں پر لپیٹ لیا۔ ہتھیلی کی الٹی طرف اس نے چھال کے ٹکڑے رکھے، ان کو ریشوں سے باندھا اور پھر پورے حصے کو پٹی سے لپیٹا۔ اس طرح دایاں ہاتھ تو بڑا گدیلا گدیلا ہو گیا مگر بایاں ہاتھ اتنا آرام نہیں پا سکا کیوں کہ وہ دانت کی مدد سے باندھا گیا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اب اس نے ہاتھوں میں ”جوتے“ پہن لیے تھے۔ اب پھر الکسی اپنے سفر پر روانہ ہوا اور اب اسے چلنا زیادہ آسان معلوم ہوا۔ اگلی منزل پر اس نے اپنے گھٹنوں پر بھی چھال کے ٹکڑے باندھ لیے۔

دوپہر تک جب خاصی گرمی پڑنے لگی تو وہ اپنے ہاتھوں کی مدد سے کافی راستہ طے کر چکا تھا۔ آواز زیادہ تیز ضرور سنائی دے رہی تھی شاید وہ اس جگہ کے قریب آرہا تھا جہاں سے توپوں کی گھن گرج سنائی دے رہی تھی یا شاید اس کے کان بج رہے تھے۔ اس وقت اتنی گرمی ہو گئی تھی کہ الکسی نے اپنے فلائنگ سوٹ کی زنجیر کھول دی۔

رات کو اس نے رینگ کر فر کے ایک بوڑھے درخت کے سائے تلے پناہ لی، گوندیاں کھائیں اور چھال اور فر کے پھل کی گٹھلیاں چبائیں اور لیٹ گیا۔ لیکن اس کی نیند ایک بے قرار پہرے دار کی نیند کی طرح تھی۔ کئی بار اس کو لگا کہ کوئی دبے پاؤں اندھیرے میں اس کی طرف رینگ رہا ہے۔ وہ آنکھوں پھاڑ کر

دیکھتا اور کانوں پر اتنا زور دیتا کہ وہ بجنے لگتے، وہ اپنا پستول نکالتا اور چوکس ہو کر بے حس و حرکت بیٹھ جاتا۔

وہ صرف پو پھٹتے سو سکا وہ اٹھا تو اجالا پھیل چکا تھا اور اس درخت کے چاروں طرف جس کے نیچے وہ سویا تھا اس نے لومڑی کے پنجوں کے پر پیچ نشان ابھرے ہوئے دیکھے۔ ان نشانوں کے درمیان اس کی گھسٹتی ہوئی دم کا لمبا نشان تیرتا چلا گیا تھا۔

اچھا، اسی وجہ سے نیند میں گڑبڑ ہو رہی تھی! نشان ہے صاف ظاہر تھا کہ لومڑی اس کے چاروں طرف منڈلائی تھی، بیٹھی تھی اور پھر منڈلائی تھی۔ ایک پریشان کن خیال الکسی کے دماغ میں کوند گیا۔ شکاریوں کا کہنا ہے کہ یہ عیار جانور انسان کے قریب آتی ہوئی موت کو بھانپ لیتا ہے اور اس کا پیچھا کرنے لگتا ہے۔ کیا یہی پیش آگہی اس ذلیل درندے کو اس کے پاس کھینچ لاتی ہے؟۔

اس دن اس کی قسمت کا ستارہ ایک بار پھر چمکا۔ سدا بہار خوشبودار صنوبری جھاڑی میں، جھڑ کر گرے ہوئے پتوں کا اک ڈھیر نظر آیا۔ اس نے ہاتھ سے اس ڈھیر کو چھوا۔ لیکن اس کی انگلیاں کسی ٹھوس چیز سے ٹکرائیں۔ اس نے پتوں کو ہٹانا شروع کیا اور یکایک کوئی چیز اس کی انگلیوں میں چبھ گئی۔ وہ فوراً تاڑ گیا کہ یہ ساہی ہے۔ یہ ایک بڑا سا بوڑھا ساہی تھا جو اس جھاڑی میں محض جاڑے کی نیند کا لطف اٹھانے کے لیے آ گیا تھا اور خود کو گرم کرنے کے لیے موسم خزاں کے ٹپکے ہوئے پتوں کے ڈھیر میں چھپ گیا تھا۔ الکسی کو ایک دیوانگی بھری خوشی نے آ لیا۔ اپنے پورے سفر میں وہ کوئی جانور یا چڑیا مارنے کا خواب دیکھتا آیا تھا۔ کتنی بار اس نے اپنا پستول نکالا تھا اور سرو کا، سوئیکا یا خرگوش پر نشانہ باندھا تھا اور ہر بار اس نے کتنی مشکل سے گولی چلانے کی خواہش کو دبایا تھا۔ کیوں کہ اس کے پاس صرف تین گولیاں بچ رہی تھیں۔ دو دشمن کے لیے اور ضرورت پڑی تو ایک اپنے لیے۔ اس نے بڑی مشکل سے پستول کو الگ کیا۔ وہ کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

اور یہاں واقعی اسے گوشت کا ایک ٹکڑا ہاتھ آ گیا۔ ایک لمحہ بھی اس نے نہ سوچا کہ عام عقیدے کے مطابق ساہی ایک ناپاک جانور ہے۔ جانور، سمٹا سمٹایا سویا رہا۔ وہ کچھ عجیب سا بڑے سے لوبھیے کی طرح نظر آ رہا تھا جس پر کانٹے اگے ہوئے ہوں۔ الکسی نے خنجر سے اس جانور کو ہلاک کیا، اس کی کھال ادھیڑی، بے ڈھنگے پن سے اس کی نسوں کو کاٹا اور اندر سے پیلی کھال اتاری، دھڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کیے، اور ندیدوں کی طرح دانتوں سے بھورے رنگ کے گرم اور نسیلے گوشت کو نوچنے لگا جو ہڈی پر بری طرح چپکا ہوا تھا۔ وہ جانور کی بوٹی بوٹی چٹ کر گیا۔ الکسی نے تمام چھوٹی چھوٹی ہڈیاں چبائیں اور ان کو نگل گیا اور تب جا کر اسے کتے کے گوشت جیسے گھناؤنے مزے کا احساس ہوا۔ لیکن پورے جسم میں تیرتی ہوئی آسودگی، گرمی اور غنودگی کے احساس کے سامنے اس بو کی کیا حقیقت تھی؟

اس نے پھر ہر ہر ہڈی کو دیکھا بھالا، چوسا اور برف میں لیٹ کر گرمی اور آرام دہ سکون کا لطف اٹھانے لگا۔ وہ پڑ کر سو گیا ہوتا مگر اسے قریب کی جھاڑی سے ایک لومڑی کی غراہٹ سنائی دی۔ الکسی کے کان کھڑے ہو گئے اور یکایک اسے پورب سے آتی ہوئی مستقل گھن گرج کے اوپر تیرتی ہوئی تڑتڑ کی گرجدار آواز سنائی دی۔ اس نے پہچان لیا کہ یہ مشین گنوں کی آواز ہے۔

اس نے ساری تھکن کو جھٹک ڈالا اور لومڑی اور آرام کی ضرورت کو بالکل بھلا دیا اور پھر جنگل کی گھنی پہنائیوں میں رینگنے لگا۔

٭ ٭ ٭

وہ جس دلدل میں رینگتا ہوا گزرا تھا اس کے آگے ایک میدان تھا جس میں کائی سے سیاہ کھمبوں کا ایک احاطہ تھا۔ اس میں دوہرے تار درخت کے ریشوں اور گھاس کے ریشوں سے کھونٹوں میں بندھے ہوئے تھے اور کھمبے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔

کھمبوں کی قطاروں کے درمیان جہاں تہاں برف کے اندر سے ایک سنسان اور ویران سڑک کا نشان جھانک رہا تھا۔ قریب ہی کہیں ضرور انسانی آبادی ہو گی! الکسی کا دل بلیوں اچھل پڑا۔ یہ قریب قیاس نہ تھا کہ جرمن اس دور افتادہ مقام تک پہنچ گئے ہوں گے۔ اور اگر وہ پہنچ بھی گئے ہوں تو کیا ہوا، قریب ہی کہیں اس کے اپنے لوگ بھی ہوں گے اور یقینی وہ ایک زخمی انسان کو پناہ دیں گے اور اس کی ہر طرح مدد کریں گے۔

اپنی صحرا نوردی کی منزل قریب محسوس کرتے ہوئے الکسی نے آرام کیے بغیر تیز تیز آگے کی طرف رینگنا شروع کیا۔ وہ رینگتا رہا، رینگتے رینگتے ہانپنے لگتا، مونہہ کے بل برف پر گر جاتا اور مارے تھکن کے بے ہوش ہو جاتا۔ وہ ٹیلے پر پہنچنے کے لیے تیز تیز رینگنے لگا جہاں سے اسے یقین تھا کہ وہ اس گاؤں کو دیکھ سکے گا جو اس کی جنت، اس کی پناہ گاہ بننے والا تھا۔ اس نے اپنی ایک ایک رگ کی طاقت کو کام میں لاتے ہوئے آبادی تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن اس احاطے اور سڑک کے نشان کے سوا جو اب زیادہ سے زیادہ صاف طور پر برف سے ابھرتی جا رہی تھی اسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس سے معلوم ہوتا کہ قرب و جوار میں انسانی آبادی ہے۔

آخر کار ہانپتے اور لرزتے ہوئے وہ ٹیلے پر پہنچا۔ اس نے آنکھیں اٹھائیں۔ اور فوراً جھکا لیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے کتنا بھیانک منظر تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ کچھ دنوں پہلے تک یہ ایک چھوٹا سا جنگلی گاؤں رہا ہو گا۔ اس کا ابھرے ہوئے نقوش نمایاں تھے اور آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا کہ یہ چمنیوں کی دو ناہموار قطاریں ہیں جو جلے ہوئے برف پوش مکانوں کے اوپر سربلند ہیں۔ اسے صرف چند باغ کے احاطے اور جنگلے، ریبی نا کے درخت نظر آ رہے تھے جو کبھی کھڑکیوں کے پاس جھومتے ہوں گے۔ اب یہ سب کچھ برف سے جھانک رہے تھے۔ بے جان اور جل کر کوئلہ۔ یہ ایک ویران اور برف سے ڈھکا ہوا میدان تھا جس میں چمنیاں گردن اٹھائے جھانک رہی تھیں جیسے جنگل کے کٹے ہوئے درختوں کے ٹھنٹھ نظر آتے ہیں اور ان کے درمیان ایک کنویں کی گردن اٹھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس فضا میں یہ کنواں کچھ عجیب بے جوڑ سا معلوم ہوتا تھا جس میں لوہے سے منڈھی ہوئی لکڑی کی بالٹی زنگ آلود زنجیر میں لٹکی ہوئی ہوا میں آہستہ آہستہ جھول رہی تھی۔ گاؤں کے اندر داخل ہونے کے راستے پر سبز احاطے کے پاس ایک خوب صورت محراب تھی جس کے نیچے ایک پھاٹک اپنی زنگ آلود چولوں پر آہستہ آہستہ چیختا ہوا ہل رہا تھا۔

ایک آدم یا آدم زاد نہیں، دھوئیں کا ایک تار نہیں، ویرانہ ہے ویرانہ لگتا ہے جیسے یہاں کبھی کسی انسان کی جھلک نہ دکھائی دی ہو گی۔ ایک خرگوش، الکسی سے ڈر کر تڑپتا پھدکتا بھاگا اپنی پچھلی ٹانگوں کو بڑے مضحکہ خیز انداز میں پھینکتے ہوئے سیدھا گاؤں کی طرف چل دیا۔

وہ جا کر پھاٹک کے پاس رکا، اگلے پنجے اٹھائے اور کان کھڑے کر کے سننے لگا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ یہ بڑا سا عجیب و غریب جانور اس کے نقش قدم پر رینگتا چلا ہی آ رہا ہے تو وہ پھر جلے ہوئے ویران باغوں کی طرف تڑپتا ہوا بھاگ گیا۔

الکسی میکانکی طور پر آگے بڑھتا رہا۔ اس کی داڑھی اور مونچھوں سے ڈھکے ہوئے گالوں پر آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے ڈھلکے اور گر کر برف میں جذب ہو گئے۔ وہ اس پھاٹک پر رک گیا۔ جہاں چند لمحے پہلے خرگوش کھڑا تھا۔ پھاٹک پر ایک تختی کا بچا کھچا حصہ لٹک رہا تھا جس پر حروف دکھائی دے رہے تھے "م اسکول۔" یہ جاننا مشکل نہ تھا کہ اس سبز احاطے کے اندر کبھی اسکول آباد تھا۔

سورج درختوں کے سرمئی سروں کو چھو رہا تھا۔

الکسی اس راستے پر رینگنے لگا جو کبھی گاؤں کی سڑک رہا ہو گا۔ راکھ کے ڈھیروں میں سے لاشوں کی بو آ رہی تھی۔ گاؤں جنگل سے بھی زیادہ ویران معلوم ہو رہا تھا۔ دفعتاً ایک عجیب و غریب آواز سنائی دی اور وہ چونک گیا۔ سڑک کے آخری نکڑ پر راکھ کے ڈھیر کے

قریب اسے ایک کتا نظر آیا۔ کتے نے اچانک غرانا شروع کردیا۔ اس کی آنکھیں اتنی شدت سے جلنے لگیں کہ الکسی کو محسوس ہوا کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے ہیں۔ اس نے "جوتے" اتار دیے اور پستول کی طرف ہاتھ بڑھایا چند لمحے دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے' پھر کتے نے دم ہلاتے ہوئے گوشت کی بوٹی اٹھائی اور دم دبا کر راکھ کے ڈھیر کے پیچھے غائب ہوگیا۔

الکسی کوئی راستہ ڈھونڈے بنا برف کو پار کرتے ہوئے رینگتے ہوئے جنگل میں گھس گیا اور بغیر کسی خاص خیال اور ارادے کے بڑھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

الکسی آئندہ دو تین دن تک رینگتا رہا۔ وہ وقت کا اندازہ بالکل بھول چکا تھا۔ ہر چیز ایک بے اختیار جدوجہد کی زنجیر میں جکڑ کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی نیند اسے آلیتی تھی یا شاید وہ بے ہوش ہوجاتا تھا۔

اپنے راستے پر وہ اس امید میں ہر جھاڑی کو دیکھتا چلتا کہ شاید پھر کوئی ساہی مل جائے برف اور کائی کے نیچے جو گوندنیاں ملتیں وہی اس کی غذا تھیں۔ ایک بار اس کے راستے میں چیونٹیوں سے بھرا ایک بہت بڑا گڑھا ملا۔ چیونٹیاں اب تک سو رہی تھیں الکسی نے ہاتھ اس ڈھیر کے اندر گھسا دیا اور جب نکالا تو اس پر چیونٹیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ وہ ان کیڑوں کو بڑے شوق سے کھانے لگا اور اس کو اپنے خشک اور پھٹے ہوئے منہ میں چیونٹیوں کے اندر سے نکلنے والے رقیق مادے کا تیز اور میٹھا میٹھا سا مزہ محسوس ہوا۔ اس نے اس ڈھیر کے اندر دوبارہ ہاتھ ڈالا اور بار بار ڈالا یہاں تک کہ اس حملے نے پوری آبادی میں ایک ہنگامہ اور کھلبلی مچادی۔

ان چھوٹے چھوٹے کیڑوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انہوں نے الکسی کے ہاتھ' ہونٹ اور زبان کو کاٹنا شروع کیا وہ اس کی وردی کے اندر گھس گئے اور اس کے جسم کو کاٹنے لگے لیکن اس جلن کا احساس اسے خوش گوار لگا اور رقیق مادے کی چبھن نے ماءاللحم کا کام کیا اسے پیاس محسوس ہوئی اس کو گھاس کے چھپوں کے درمیان بھورے رنگ کے پانی کا ایک جوہڑ نظر آیا۔ وہ پانی پینے کے لیے لیٹ گیا مگر فوراً ہی دور ہٹ گیا۔ سیاہ پانی میں سے آسمان کے نیلے عکس میں اسے ایک بھیانک چہرہ اپنی طرف جھانکتا ہوا نظر آیا یہ ہڈیوں کے ڈھانچے کا چہرہ تھا جس کو سیاہ کھال نے چھپا رکھا تھا اور جو میلے اور کانٹوں جیسے گھنگھریالے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گہرے گڑھوں میں سے بڑی بڑی' گول گول' وحشت سے چمکتی ہوئی آنکھیں جھانک رہی تھیں اور الجھے ہوئے چکٹ بال' جٹوں کی طرح اس کی پیشانی پر جھول رہے تھے۔

"کیا یہ میں ہوں؟" الکسی نے اپنے آپ سے پوچھا اور خود کو دوبارہ دیکھنے کے ڈر سے اس نے پانی نہ پیا بلکہ منہ میں پانی کے بجائے برف رکھ لی اور پھر پورب کی طرف رینگنے لگا۔

اس رات کو اس نے اپنے پڑاؤ کے لیے بم کا بنایا ہوا ایک بڑا گڑھا چنا بم نے ریت اڑا کر اس کے دہانے کے کنارے کنارے منڈیر سی بنادی تھی۔ اس گڑھے کا پیٹ اسے پرسکون اور آرام دہ معلوم ہوا۔

الکسی کو یاد نہ تھا کہ اس نے وہ رات کس طرح گزاری تھی یا اگلی صبح اس نے کتنی منزلیں سر کی تھیں۔ اچانک ایک غیر معمولی آواز نے اسے اپنی خود فراموشی کی حالت سے چونکا کر نکال لیا۔ اس کو ہوش آگیا۔ وہ بیٹھ گیا اور اپنے ارد گرد دیکھنے لگا۔ وہ جنگل کے ایک کھلے ہوئے حصے میں درخت اور لکڑی کے کندے بکھرے پڑے تھے۔ دور ایک طرف جلانے والی لکڑیوں کے صاف ستھرے ڈھیر لگے تھے۔

ایک ناقابل بیان خطرے کے احساس سے الکسی نے جنگل کے اس کھلے قطعے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس حصے میں زندہ انسان موجود تھے۔ ممکن ہے کہ جرمن یہاں اپنے مورچوں اور خندقوں کے لیے لکڑی کے کندے جمع کررہے ہوں؟ اس صورت میں تو اسی میں خیر ہے کہ وہ جلد از جلد یہاں سے رفوچکر ہوجائے۔ اس لیے کہ

لکڑہارے کسی آن بھی وہاں آسکتے تھے لیکن اس نے اپنے جسم کو بے جان اور بوجھل اور سخت درد سے جکڑا ہوا محسوس کیا۔ اس میں ہلنے کی سکت بھی باقی نہ رہی۔

کیا میں اسی طرح آگے رینگتا ہوں؟ جنگل میں زندگی گزارنے کے دوران میں اس کے اندر جو ایک خاص حس جاگ گئی تھی اس نے اسے چوکس کردیا۔ وہ دیکھ نہ سکتا تھا مگر محسوس کررہا تھا کہ قریب ہی کوئی ہے اور برابر اس کی نگرانی کررہا ہے۔

اس نے جلدی سے اپنی وردی کے گریبان والی جیب سے پستول نکال لیا۔ پستول پر زنگ لگ چکا تھا اور اس کا گھوڑا چڑھانے کے لیے اسے دونوں ہاتھوں سے کام لینا پڑا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے پستول کے گھوڑے کی آواز سن کر چیڑوں کے پیچھے کوئی چونک گیا ہو۔ کئی درختوں کے سر زور سے جھوم گئے۔ جیسے کوئی ان سے ٹکرا گیا ہو۔ لیکن پھر جلد ہی سکون چھا گیا۔

"یہ ہے کیا' آدمی یا جانور؟" الکسی نے اپنے آپ سے پوچھا اور اس کو محسوس ہوا کہ اس نے درختوں کے جھنڈ میں بھی کسی کو یہ پوچھتے ہوئے سنا "کیا یہ آدمی ہے؟" کیا یہ اس کا محض وہم تھا یا واقعی اس نے اس جھنڈ کے پیچھے کسی کو روسی زبان میں بولتے ہوئے سنا تھا؟ ہاں واقعی روسی! دفعتاً وہ خوشی سے پاگل ہوگیا اور ایک لمحہ یہ سوچے بغیر کہ یہ دوست ہے یا دشمن اس کے منہ سے بے اختیار خوشی کی چیخ نکل گئی وہ اچھلا اور اس جگہ کی طرف لپکا جہاں سے آواز آئی تھی مگر فوراً ڈھیر ہوگیا جیسے کسی نے اسے دھکیل کر گرادیا ہو اور اس کا پستول برف میں گر گیا۔۔۔

☼ ☼ ☼

الکسی اٹھنے کی ایک ناکام کوشش کے بعد گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ لیکن خطرے کا احساس اسے فوراً دوبارہ ہوش میں لے آیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ کچھ لوگ چیڑ کے درختوں میں چھپے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے اور سرگوشی کررہے تھے۔

وہ اپنے بازوؤں پر اٹھا اس نے برف پر سے اپنا پستول اٹھایا اس کو چھپا کر زمین سے قریب رکھا اور ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا خطرے نے اس کی خود فراموشی بالکل ختم کردی تھی۔ اس کا دماغ بالکل ٹھیک ٹھیک ناپ تول کر کام کررہا تھا۔ کون لوگ تھے یہ؟ شاید یہ لکڑہارے تھے جن کو جرمنوں نے یہاں آکر لکڑیاں کاٹنے پر مجبور کردیا ہوگا؟ شاید وہ روسی ہوں جو اسی کی طرح یہاں گھر گئے ہوں گے اور اب وہ جرمن مورچے سے گزر کر اپنے لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کررہے ہوں؟ یا شاید آس پاس رہنے والے کسان ہوں؟ آخر اس نے کسی کو یہ کہتے ہوئے صاف سنا "آدمی!"

رینگتے رینگتے سن پڑے ہوئے ہاتھ میں پستول لرز رہا تھا لیکن وہ مرنے مارنے اور آخری تین گولیوں کا اچھا استعمال کرنے کے لیے تیار تھا۔

ٹھیک اسی وقت درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے ہانپتی ہوئی بچکانی آواز سنائی دی۔

"اے! کون ہو تم؟"

ان اجنبی الفاظ نے الکسی کو ہوشیار کردیا لیکن بلاشبہ پکارنے والا روسی تھا اور بچہ۔

"کیا کررہے ہو تم یہاں؟" ایک اور بچکانی آواز نے پوچھا۔

"اور تم کون ہو؟" الکسی نے پوچھا اور رک گیا اور اپنی مدھم آواز کی کمزوری پر حیران رہ گیا۔

اس آواز نے درختوں میں ضرور ہیجان پیدا کردیا ہوگا' کیوں کہ وہاں جو لوگ بھی تھے ان میں سرگوشی میں بات چیت کا لمبا سلسلہ شروع ہوگیا وہ بڑے ہیجان اور جوش و خروش سے بول رہے تھے کیوں کہ شاخیں زوروں پر جھوم رہی تھیں۔

"بنو مت! تم ہمیں جل نہیں دے سکتے! میں کوسوں دور سے جرمن کو پہچان سکتا ہوں کیا تم جرمن ہو؟"

"اور تم کون ہو؟"

"یہ تم کیوں جاننا چاہتے ہو؟"

"میں روسی ہوں۔"

"تم غلط کہہ رہے ہو۔"

"میں روسی ہوں، روسی! ہواباز جرمنوں نے مجھے مار گرایا۔"

الکسی نے اب ساری احتیاط کو خیرباد کہا۔ اس کو یقین آگیا کہ ان درختوں کے پیچھے اس کے اپنے لوگ تھے ان کو اس پر یقین نہیں آرہا تھا۔ یہ قدرتی بات تھی جنگ احتیاط کا سبق پڑھاتی ہے اور جب سے وہ اس سفر پر روانہ ہوا تھا اس کے بعد سے پہلی بار وہ اتنی بری طرح نڈھال ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے ہاتھ پیر بھی نہیں ہلا سکتا، نہ تو وہ ہل سکتا ہے اور نہ اپنی حفاظت کر سکتا ہے۔ اس کے رخساروں کے سیاہ گڈھوں میں آنسو دوڑنے لگے۔

"ذرا دیکھنا وہ تو رو رہا ہے۔" درختوں کے پیچھے سے ایک آواز آئی۔ "اے سنتے ہو! رو کیوں رہے ہو؟"

"میں روسی ہوں تمہاری طرح روسی، ہواباز...."

"کس ہوائی اڈے کے ہو؟"

"لیکن تم کون ہو؟"

"تم یہ کیوں جاننا چاہتے ہو؟ جواب دو۔"

"مونچالوفسکی ہوائی اڈے کا ہوں۔ تم میری مدد کیوں نہیں کرتے؟ باہر نکل آؤ! لعنت ہو" آخر تم...."

درختوں کے پیچھے اور بھی زیادہ زور شور اور جوش و خروش کے ساتھ پھر صلاح ہوئی۔ الکسی نے صاف صاف یہ جملے سنے۔

"سنا تم نے؟ وہ کہتا ہے کہ وہ مونچالوفسکی ہوائی اڈے سے آیا ہے.... شاید وہ سچ ہی کہہ رہا ہے.... اور وہ رو رہا ہے...." پھر ایک پکار سنائی دی "اپنا پستول پھینک دو! میں کہتا ہوں گرا دو اسے ہاتھ سے ورنہ ہم باہر نہیں آئیں گے۔"

الکسی نے اپنا پستول پھینک دیا۔ درختوں کی شاخیں الگ ہوئیں اور دو لڑکے چوکنا چوکس بڑی ہوشیاری سے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے الکسی کے پاس آئے۔

بڑے لڑکے نے اپنے بھاری بھرکم فلیٹ بوٹ سے پستول کو ٹھوکر مار کر اور بھی دور کر دیا اور بولا۔

"تم کہتے ہو ہواباز ہو؟ کیا تمہارے پاس کاغذ ہے؟ ذرا دیکھیں۔"

الکسی کے سامنے اور کوئی چارہ نہ تھا اس نے اپنی وردی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا شناختی کارڈ نکالا۔ افسر کے لال کارڈ نے جس کے اوپر ستارہ ابھرا ہوا تھا لڑکوں پر جادو کا کام کیا۔

لڑکوں کو کچھ کرنے کی دھن ہوئی انہوں نے بتایا کہ وہ پانچ کلومیٹر کی دوری پر رہتے ہیں لڑکے برف پر چلنے والی گاڑی سے لکڑی لاد کر لے جانے کے لیے لائے تھے یہ گاڑی الکسی کے لیے بہت چھوٹی تھی اور دوسرے وہ ان لڑکوں کے لیے بہت زیادہ بھاری ثابت ہوتا۔ وہ اس کو جمی ہوئی برف پر گھسیٹ کر نہیں لے جاسکتے تھے۔ بڑے لڑکے نے جس کا نام سیریونکا تھا اپنے بھائی فیدکا سے کہا تم سرپٹ دوڑتے ہوئے گاؤں جاؤ اور میں یہاں رہ کر جرمنوں سے الکسی کی حفاظت کروں گا۔ اس نے کہا تو سہی مگر وہ دل میں اس پر پورا اعتماد نہیں کر پا رہا تھا۔ "کون جانے" اس نے اپنے آپ سے کہا "یہ جرمن بڑے چالاک ہیں۔ یہ تو مزے میں مردے کا سوانگ بھی رچا لیں اور سوویت کاغذات بھی اڑا لائیں...." رفتہ رفتہ اس کے اندیشے مٹ گئے اور وہ بڑے دھڑلے سے کھل کر بات کرنے لگا۔

الکسی چیڑ کی ٹہنیوں پر لیٹا اونگھ رہا تھا اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ کھویا کھویا لڑکے کی ٹرٹر سن رہا تھا۔ صرف چند بے ربط الفاظ آرام وہ سکون اور غنودگی کی دھند کو چیر کر اس کے دماغ تک پہنچ سکے۔ جو اس کے پورے جسم پر فوراً ہی چھا گئی تھی۔

کچھ دیر بعد فیدکا آگیا۔ اس کے ساتھ گول شانوں والا لمبا بڈھا تھا وہ گھر کا بنا ہوا بھورے رنگ کا چیتھڑے چیتھڑے کوٹ پہنے ہوئے تھا جو کمر پر ایک رسی سے کسا ہوا تھا اس کے سر پر جرمن افسروں والی اونچی ٹوپی تھی۔

لڑکوں کے قول کے مطابق یہ تھے نانا میخائل۔ اس نے الکسی کو بھیڑ کی کھال کے ایک پرانے کوٹ میں لپیٹا جو رنگ برنگے پیوندوں سے پٹا ہوا تھا اور جب اس نے اس کا ہلکا اور مضمحل جسم اٹھایا اور لپیٹا تو بھولپن بھرے

تعجب کے ساتھ بڑبڑایا۔

"بے چارا بے چارا لڑکا ارے تم تو گھل کر کانٹا ہو گئے ہو! خدا کی پناہ، تم تو ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے ہو اور بس! اوہ یہ لڑائی لوگوں پر کیا کیا ستم توڑ رہی ہے کیسا عذاب ہے یہ۔"

اس نے بڑی احتیاط اور نرمی سے الکسی کو برف والی گاڑی میں ڈالا جیسے وہ کوئی نوزائیدہ بچہ ہو۔ اس کو ایک رسی سے باندھا، ایک لمحے کو سوچا اپنا کوٹ اتارا اس کو لپیٹا اور الکسی کے سر کے نیچے رکھ دیا۔ تب وہ گاڑی کے آگے گیا اور ٹاٹ سے بنا ہوا جوا اپنی گردن پر رکھا اور دونوں لڑکوں کو ایک ایک رسہ پکڑایا۔ ان تینوں نے پگھلتی ہوئی برف پر گاڑی کو کھینچنا شروع کیا۔ برف، گاڑی کی نچلی پڑیوں سے چمٹ جاتی چرمراتی اور ان کے پیروں تلے دھنس دھنس جاتی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دو تین دن تک الکسی کو محسوس ہوا جیسے وہ ایک گہری اور گرم دھند میں لپٹا ہوا ہو جس میں سے اسے اپنے ارد گرد ہونے والی باتوں کی دھندلی دھندلی تصویر نظر آرہی تھی۔ حقیقت ہذیانی وہم و خیال میں مدغم ہو رہی تھی اور کہیں بہت دیر بعد اسے اتنا ہوش آیا کہ وہ حقیقی واقعات کو الگ الگ کر کے دیکھ سکے۔

سب ہی لوگ زیادہ تر عورتیں اور بچے اور چند بوڑھے جب انہوں نے سنا کہ میخائل ایک سوویت ہواباز کو یہاں لانے والا ہے جو یہاں نہ جانے کس طرح چلا آیا تھا اور جو بقول فیدکا "بس ہڈیوں کا ڈھانچہ" معلوم ہوتا تھا تو سب کے سب اس کا سواگت کرنے کو دوڑ پڑے۔

میخائل گاڑی کو کھینچتے ہوئے اپنی خندق کے پاس گیا جو اس "زمین دوز" گاؤں کے بیچ میں تھی۔

الکسی پیال کے ایک دھاری دار گدے پر پڑا ہوا تھا۔ وہ اب تک بھیڑ کھال کے رنگا رنگ پیوندوں والے کوٹ سے ڈھکا ہوا تھا اگرچہ اس کا بدن ٹوٹ اور دکھ رہا تھا جیسے اسے سنگسار کیا گیا ہو اور پیر جل رہے تھے جیسے ان پر گرم اینٹیں رکھ دی گئی ہوں پھر بھی اس طرح پڑے رہنا اور یہ محسوس کرنا کہ وہ محفوظ ہے اس کے لیے بہت خوش گوار تھا۔ اس احساس میں بڑی راحت تھی کہ اسے اب اپنی جگہ سے ہلنے کی ضرورت نہیں یا سوچنے یا ہر وقت چوکس اور چوکنا رہنے کی ضرورت نہیں۔

کوئی پیالے میں جمائی ہوئی ٹھنڈی مچھلی لے آیا کوئی چولہے کے پتھر پر سینکی ہوئی نان لایا اور اس طرح پوری خندق تازہ روٹی کی ترش اور گرم خوشبو سے بس گئی۔

میز پر نانا میخائل کی بے زبان بہو بیٹھی کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی۔ شروع میں تو الکسی بوڑھی عورت سمجھ بیٹھا تھا شاید نانا میخائل کی بیوی بعد میں اس نے دیکھا کہ وہ بیس بائیس برس سے زیادہ کی نہیں ہو سکتی اس کی چال بڑی سبک تھی وہ من موہنی اور سندر تھی اور اس نے دیکھا کہ جب بھی وہ اپنی خوف زدہ اور تردد بھری نگاہوں سے اس کو دیکھتی تھی تو ہمیشہ لرز جاتی اور ٹھنڈی سانس لیتی جیسے آنسو پینے کی کوشش کر رہی ہو۔

☼ ☼ ☼

نانا میخائل کے ساتھ الکسی کے قیام کے تیسرے دن صبح کے وقت بڈھے نے اس سے بڑی قطعیت کے ساتھ کہا۔

"الکسی تمہارے جسم پر تو جوئیں دوڑتی پھرتی ہیں تمہیں بڑی مشکل ہوتی ہے گرم گرم اشنان۔ بڑا مزہ آئے گا! میں تمہارا بدن دھووں گا۔ بھاپ سے تمہاری ہڈیوں میں ذرا گرمی پہنچے گی تم جتنی مصیبتیں جھیل چکے ہو اس کے بعد تمہیں اس سے آرام ہو گا۔"

اور اس نے نہلانے کا انتظام کرنا شروع کر دیا اس نے کونے کے چولہے میں آگ اتنی تیز کر دی کہ چولہے کے پتھر زور زور سے چٹخنے لگے۔ خندق کے باہر ایک زوردار الاؤ جلایا گیا اور ایک بڑے سے پتھر کو گرم کیا گیا۔

بڑی احتیاط اور مستعدی سے اس نے الکسی کا بدن

پانی سے دھونا شروع کیا جیسے وہ کوئی دودھ پیتا بچہ ہو۔ اس کو ایک کروٹ سے دوسری کروٹ کیا اس کے اوپر پانی ڈالا اور اتنے زوروں سے اسے ملنا شروع کیا کہ اس کی ابھری ابھری پسلیاں چیخنے لگیں۔

واریا خاموشی سے اس کا ہاتھ بٹاتی رہی۔

الکسی جاگ بھی رہا تھا اور سو بھی رہا تھا وہ بھیڑ کی کھال کے نیچے پڑا ہوا تھا اور اسے اپنی انگلی ہلانے میں بھی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اس کو محسوس ہوا جیسے اس کا جسم بغیر ہڈیوں کا ہو جس میں گرم روئی بھر دی گئی تھی اور اس کے اندر خون دوڑ اور دھڑک رہا تھا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے اور سوجے ہوئے پیروں میں بھنبھوڑتے ہوئے شدید درد سے جلن ہو رہی تھی لیکن اس میں کروٹ لینے یا ذرا سا ہلنے کی بھی سکت نہ تھی۔

کئی روز الکسی یوں ہی پڑا رہا۔ گاؤں کے لوگ اس کے لیے مرغی کا شوربہ اور انڈے لاتے رہے۔

ایک رات الکسی کی حالت زیادہ نازک ہو گئی۔ اسے انتہائی تھکن اور خستگی کا احساس اور ٹانگوں کا درد بڑی شدت کے ساتھ ستانے لگا وہ بخار میں اپنے گدے پر، کروٹیں بدلتا، کراہتا، دانت پیستا، کسی کو پکارتا، کسی پر جھپٹتا اور طرح طرح کے مطالبے کرتا رہا۔

پو پھٹتے ہی بڈھا میخائل اٹھ گیا اس نے الکسی پر ایک نطر ڈالی۔ اس نے واریا سے سرگوشی میں کچھ کہتے ہوئے سفر کی تیاری شروع کر دی اور الکسی سے ایک لفظ بھی کہے بغیر باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

کئی روز اسی طرح گزر گئے نانا میخائل ابھی تک نہیں آئے تھے ایک روز اچانک اس کے کانوں میں ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ آئی۔

بڑی کوشش کر کے الکسی اٹھ بیٹھا۔ اس کے دل کی دھڑکن، کنپٹیوں میں دھڑکتے ہوئے خون اور زخمی پیروں کے درد نے اس کے پورے جسم میں زلزلہ سا پیدا کر دیا۔ وہ گننے لگا کہ ہوائی جہاز کتنے چکر لگا رہا ہے۔ ایک، دو، تین اور مارے جوش کے کچھ ایسا بے قابو ہوا کہ گدے پر گر گیا اور پھر تیزی سے اسی ناقابل تسخیر گہری صحت بخش نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

ایک جوان خوش آہنگ گرج دار بھاری آواز نے اس کو جگا دیا وہ اس آواز کو نقار خانے میں بھی پہچان سکتا تھا پورے لڑاکو رجمنٹ میں اس آواز کا واحد آدمی اسکواڈرن کمانڈر اندرئی دیگتیارینکو تھا۔

الکسی نے آنکھیں کھولیں لیکن سوچا کہ اب تک خواب دیکھ رہا ہے اور وہ محض خواب میں اپنے دوست کی آواز سن رہا ہے۔

"اب نانا ذرا اپنا مال غنیمت دکھاؤ۔" دیگتیارینکو نمایاں یوکرینی لہجے میں دھاڑا۔

اس کا خواب مٹا نہیں واقعی یہ تو دیگتیارینکو ہی تھا اگرچہ یہ بات ناقابل یقین معلوم ہوتی تھی کہ اس کا دوست یہاں ہو سکتا ہے۔

دیگتیارینکو کے پیچھے اسپتال کی ایک نرس کھڑی تھی اس کی بغل میں کینوس کا تھیلا تھا جس پر ریڈ کراس بنا ہوا تھا وہ عجیب و غریب قسم کے پھولوں کا گچھا سینے سے لگائے ہوئے تھی۔

ہر شخص خاموش تھا۔ دیگتیارینکو غالباً اندھیرے کی وجہ سے گھبرایا گھبرایا چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ایک دو بار اس کی نگاہیں الکسی کے چہرے پر سے بے نیازی کے ساتھ پھسلتی چلی گئیں۔

"خدا کی پناہ کیا تم اس کو دیکھ بھی نہیں سکتے؟ یہ رہا وہ۔" بھیڑ کی کھال کا کوٹ کھینچتے ہوئے نرس بولی۔

پھر دیگتیارینکو نے الکسی پر حیرت بھری نظر دوڑائی۔

"الکسی کیا تم ہو؟" جذبات سے اس کی آواز بھاری ہو گئی اور اس کی لمبی لمبی بے رنگ پلکیں بھیگ گئیں۔ اس نے بہت ہولے ہولے اس کمزور جسم کو بستر سے اٹھایا جیسے وہ کوئی دودھ پیتا بچہ ہو اس کو اپنے کلیجے سے لگایا۔

اس نے الکسی کو ایک لمحہ اپنے سینے سے الگ کر کے غور سے دیکھا جیسے وہ خود کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ یہ واقعی اس کا دوست ہے اور پھر دوبارہ اس کو کلیجے سے لگا لیا۔

واریا اور نرس نے اس کے جسم کو اندرئی کی ریچھ جیسی مضبوط گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔

لیکن اندرئی نے جب یقین کر لیا کہ یہ سیاہ سکڑا ہوا بے وزن جسم واقعی الکسی کا ہے۔ اس کے اپنے ساتھی کا، اپنے فوجی دوست کا، جس کو پورے رجمنٹ نے مردہ سمجھ لیا تھا تو اس نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ اپنا سر پکڑا اور فاتحانہ نعرہ لگایا پھر اس نے الکسی کے شانوں کو پکڑا اور اس کی سیاہ آنکھوں میں گھور کر دیکھا جو اپنے گہرے گڈھوں میں مارے مسرت کے چمک رہی تھیں اور چلایا۔

"کہاں رہے اتنے دنوں؟ کیا ہوا تھا تمہیں؟"

نانا میخائل نے پھٹی پھٹی سی پاٹ دار آواز میں پوری داستان سنانی شروع کی۔ "ہاں ہمارے چھوکروں کو وہ جنگل میں ملا۔ جرمنوں نے اپنی خندقوں کے لیے درخت کاٹ گرائے تھے اور ان لڑکوں کی ماں نے یعنی میری بیٹی نے ان کو لکڑی کی چھپٹیاں جمع کرنے کے لیے بھیجا تھا وہاں ان کو الکسی مل گیا۔ ہا! وہاں وہ کیا عجیب سی چیز پڑی ہے؟ پہلے تو وہ سمجھے کہ یہ کوئی زخمی ریچھ ہے جو لوٹ لگا رہا ہے اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ لیکن انہیں ٹوہ لگانے کی سوجھی اور وہ پلٹ کر گئے۔ دیکھیں کیسا ریچھ ہے یہ؟ یہ لڑھک کیوں رہا ہے؟ یہ عجیب بے تکا سا معلوم ہوتا ہے وہ لوٹ کر گئے اور انہوں نے اس بار بار لڑھکتے ہوئے دیکھا وہ کراہ رہا تھا۔"

بڈھا، دیگتیارینکو کے کان پر جھک گیا اور اپنی نرم آواز میں بولا "لیکن مجھے امید ہے مرے گا نہیں کیا خیال ہے تمہارا؟ وہ جرمنوں کے چنگل سے بچ نکلا لیکن کیا آدمی ملک الموت سے بچ کر نکل سکتا ہے؟ کھال اور ہڈیاں اور بس۔ وہ کس طرح رینگتا رہا میں تو

پیارے بچوں کے لئے

پیاری پیاری کہانیاں

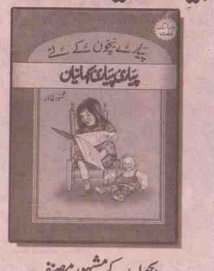

بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 2 ماسک مفت

قیمت -/300 روپے
ڈاک خرچ -/50 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہء عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

تصور بھی نہیں کر سکتا اس کا جی بے حد چاہتا ہو گا اپنے لوگوں کے پاس پہنچنے کو۔۔۔ ایں؟ اپنی بے ہوشی میں وہ برابر بکتا رہا ہوائی اڈہ! ہوائی اڈہ! اور بھی کچھ الفاظ تھے۔ ہاں اس نے اولگا کا نام بھی لیا تھا۔ کیا تمہارے ہاں کوئی لڑکی ہے اس نام کی؟ شاید وہ اس کی بیوی ہو کیا تم میری بات سن رہے ہو؟ سنا تم نے میں نے کیا کہا؟ اے ہواباز۔"

"تمہیں یہ ملا کب؟"

"پورا ایک ہفتہ ہوا۔"

دگتیارینکو نے دل ہی دل میں تاریخیں گنیں اور اس نے حساب لگایا کہ الکسی اٹھارہ دن تک رینگتا رہا تھا۔ ایک زخمی آدمی اتنے دنوں رینگتا رہے اور وہ بھی بغیر کھائے پیے۔ یہ بات ناقابل یقین معلوم ہوتی تھی۔

"اچھا' نانا ابا' بہت بہت شکریہ۔" ہواباز نے زور سے بڈھے کو گلے سے لگایا۔

یکایک اس نے اپنے دوست کے گال تھپتھپائے تو اس نے ایک کمی سی محسوس کی۔ "اسٹریچر کہاں ہے؟ اس نے پوچھا۔ "آؤ ہم اس کو باہر لے چلیں وقت برباد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

بڈھے کی مدد سے انہوں نے الکسی کو احتیاط سے اٹھایا جو کمبلوں میں لپٹا ہوا تھا اور اسے اسٹریچر پر ڈال دیا۔

اسٹریچر ہلتا ہوا بڑی مشکل سے خندق کے تنگ دروازے سے نکل سکا۔

پلاونی کی پوری آبادی الوداع کہنے کے لیے جمع ہو گئی۔ ہوائی جہاز جنگل کے پیچھے ایک چھوٹی سی لمبوتری جھیل پر کھڑا ہوا تھا۔

اسٹریچر کے پیچھے پیچھے یہ قافلہ کائی سے ڈھکی روندی ہوئی سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

کھلی ہوا میں الکسی کو پہلے تو فطری مسرت کا احساس ہوا لیکن پھر ایک شیریں اور خاموش اداسی نے اس کی جگہ لے لی۔

نرس نے ایک چھوٹے سے رومال سے اس کے آنسو پونچھے اور ان آنسوؤں کا مطلب کچھ اور سمجھتے ہوئے اس نے لوگوں سے کہا کہ اسٹریچر آہستہ آہستہ لے چلو۔

"نہیں، نہیں! تیز! تیز چلو!" الکسی نے ان کو للکارتے ہوئے کہا۔

اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ حد سے زیادہ آہستہ آہستہ چل رہے ہیں اس کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ وہ یہاں سے نہیں نکل سکے گا ہوائی جہاز اس کا انتظار کیے بغیر اڑ جائے گا اور وہ کبھی بھی اسپتال نہیں پہنچ سکے گا اسٹریچر لے جانے والوں کے تیز قدموں سے اس کے درد کی ٹیس بڑھ گئی اور وہ دھیرے سے کراہ اٹھا لیکن وہ بار بار یہی دہراتا رہا۔ "مہربانی سے تیز اور تیز!" وہ ان کو آگے بڑھنے کے لیے للکارتا رہا حالاں کہ اسے نانا میخائل کے ہانپنے کی آواز سنائی دے رہی تھی وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ بار بار پھسل رہا ہے اور ٹھوکر کھا رہا ہے۔

جب اسٹریچر اٹھا کر ہوائی جہاز میں ڈالا گیا اور ہوائی جہاز کے تیل کی تیز بو الکسی کو اپنی ناک میں گھستی ہوئی محسوس ہوئی تو مسرت کے ایک اور طوفان نے اسے آلیا۔

الکسی جب ماسکو پہنچا تو کسی ڈاکٹر کو یقین نہیں آیا کہ کوئی ایسے حالات میں اتنے دن کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔

ماسکو کے اسپتال میں ڈاکٹروں نے الکسی کے دونوں پیر کاٹ ڈالے۔ یہ انسان جس نے اتنی شدید تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کی تھیں پھر نئی طاقت اور ہمت پیدا کر لیتا ہے اپنی ساری قوت ارادی جمع کر کے وہ اپنے اپاہج جسم کو پھر تربیت دیتا ہے اور از سر نو ہواباز بن کر محاذ جنگ پر چلا جاتا ہے اس بہادرانہ کارنامہ کے لیے الکسی کو سوویت یونین کے ہیرو کا اعزاز دیا گیا۔

☼ ☼

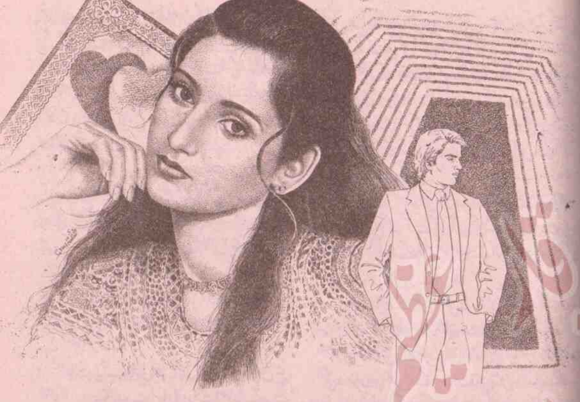

سیاہ رات

شہناز بانو

شیطان جب دماغ پر قبضہ کر لیتا ہے تو انسان جزا و سزا کو بھول جاتا ہے، دنیا کی عدالت میں تو بری ہو جاتا ہے لیکن اللہ جب رسی کھینچتا ہے تو انسان منہ کے بل زمین پر گرتا ہے۔ ایک ایسے شخص کا فسانہ جس نے اپنی شیطانی خواہش کی تکمیل کے لیے معصوم کلی کو روند ڈالا۔

معاشرے کے ناسور کی عکاسی کرتی ہوئی ایک سچی کہانی

فون کی بیل مسلسل شور مچا رہی تھی اور میں کچن میں دوپہر کا کھانا بنانے میں مصروف تھی' بیل کی یہ بے قراری دیکھ کر میرا جی چاہا کہ اس سے کہوں بھئی ذرا صبر کرو' ابھی آتے ہیں خیر میں چولہا بند کر کے ٹی وی لاؤنج میں آگئی اور دوپٹے سے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے فین آن کیا اور فون اٹھا لیا۔

دوسری جانب میری دیورانی مینا کا فون تھا۔

"ہیلو مینا کیسی ہو؟" میں نے نہایت خوش اخلاقی سے کہا۔

"خیریت نہیں ہے بھابی! ویسے آپ لوگ تو خیریت سے ہیں ناں۔" اس نے کہا۔

"ہیں! کیا ہوا بھئی جلدی بتاؤ ناں تمہیں تو پتا ہے کہ ۔۔۔"

"نہیں پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ کے ہاں تو سب

خیریت ہے ناں؟" اس نے اصرار کیا۔

"ہاں ہاں بھئی سب خیریت ہے۔ تم اپنی سناؤ۔" مارے گھبراہٹ کے میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ میں جو ذرا ذرا سی باتوں پر زمانے بھر کی ٹینشن اپنے اوپر سوار کرلیتی تھی اور عاصم میری اسی عادت سے بے زار رہتے تھے۔

"شکر خدا کا آپ لوگ خیریت سے ہیں' ورنہ کل آپ جمیل بھائی کے ہاں نظر نہیں آئیں میں تو پریشان ہوگئی تھی کہ پتا نہیں کیا بات ہوگئی ہے۔ میرے خیال میں آپ کو ابھی اس واقعہ کی اطلاع ہی نہیں ملی ہے۔" مینا نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"جمیل بھائی کے ہاں کیا ہوا؟ کون سا واقعہ ہوگیا؟ تم پہیلیاں مت بوجھواؤ اور مجھے پوری بات بتاؤ۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"بات یہ ہے بھابی کہ جمیل بھائی کی چھوٹی بیٹی عشو کل سے غائب ہے' ساری رات ڈھونڈتے رہے' آج کا بھی آدھا دن گزر گیا مگر اس کا کہیں پتا نہیں چلا۔"

"کیا۔۔۔! کل کا ہے یہ واقعہ اور تم اب مجھے بتا رہی ہو۔" میں نے شاک کی کیفیت سے نکل کر قدرے ناراضی سے کہا۔

"ارے ناراض نہ ہوں۔ مجھے تو یہ علم بھی نہیں تھا کہ آپ کو معلوم نہیں ہے۔ بلکہ جب آپ مجھے نظر نہیں آئیں تو میں تو تشویش میں مبتلا ہوگئی کہ نہ آپ اور نہ عاصم بھائی' کوئی نہیں آیا' کہیں خدانخواستہ کوئی بیمار وغیرہ نہ ہو۔ اس لیے ابھی میں گھر آئی تو سوچا فون کر کے خیریت معلوم کروں۔" مینا نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے' میں بچوں کو کھانا وغیرہ کھلا کر فارغ ہو کر بس چار بجے تک جمیل بھائی کے ہاں پہنچ رہی ہوں۔" میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔

میرے شوہر عاصم کے چار بھائی ہیں۔ سب سے بڑے جمیل بھائی' پھر عاصم اور عاصم سے چھوٹے عقیل اور کلیم ہیں۔ سسر کا انتقال ہوچکا ہے۔ ساس جمیل بھائی کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ میں بیاہ کر تو جمیل بھائی کے گھر ہی گئی تھی مگر بچوں کی پیدائش کے بعد جگہ کی تنگی کے سبب عاصم نے علیحدہ گھر خرید لیا تھا۔ اس لیے کہ نزدیک رہنے سے مسائل زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور آسانیاں کم' ویسے ہر خوشی کے موقع پر سب جمیل بھائی کے گھر اکٹھے ہوتے تھے۔ اس لیے کہ ساس وہیں رہتی تھیں۔

میں نے عاصم کو فون کر کے ساری بات بتادی اور انہیں جلدی گھر آنے کی تاکید کی۔ عاصم بھی میری بات سن کر گھبرا گئے اور انہوں نے کہا کہ بس وہ ابھی پانچ منٹ میں نکل رہے ہیں۔

میرا کھانا پکانے میں قطعی دل نہیں لگ رہا تھا۔ رہ رہ کر مجھے جمیل بھائی اور شاہینہ بھابی کا خیال آرہا تھا کہ عشو کی گمشدگی کے سبب ان دونوں پر کیا گزر رہی ہو گی۔ ہزاروں طرح کے وسوسے ذہن میں آرہے تھے۔ اللہ جانے کن لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ کون اسے اغوا کر کے لے گیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے تاوان کے لیے اغوا کیا ہو۔ اس لیے کہ جمیل بھائی کا بہت بڑا کاروبار تھا اور مالی حالات کافی اچھے تھے۔

عاصم آفس سے آگئے تو ہم لوگ جمیل بھائی کے ہاں پہنچ گئے۔ جمیل بھائی کی حالت کافی ابتر تھی اور شاہینہ بھابی کی بھی رو رو کر آنکھیں سوج گئی تھیں مجھے دیکھا تو شاہینہ بھابی میرے گلے لگ کر سسک پڑیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کن الفاظ میں انہیں تسلی دوں۔

"پولیس میں رپورٹ لکھوائی؟" عاصم نے جمیل بھائی سے پوچھا۔

"ہاں رپورٹ لکھوا تو دی ہے۔ پولیس آئی تھی اور ابھی ابتدائی تفتیش کر کے گئی ہے۔" جمیل بھائی نے بتایا۔

"عشو کہاں گئی تھی بھابھی؟" میں نے شاہینہ بھابی سے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں۔ کل شام بچے باہر کرکٹ کھیل رہے تھے۔ وہ بھی باہر ہی تھی اور ان لوگوں کا کھیل دیکھ

رہی تھی۔ مغرب کے بعد سب بچے تو گھر واپس آگئے مگر عشو ان کے ساتھ نہیں تھی۔ میں نے پوچھا تو بچوں نے کہا کہ ہمیں نہیں پتا عشو ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ کسی نے اسے کسی کے ساتھ جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ پوری رات اور آج کا پورا دن گزر گیا مگر عشو کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اللہ جانے کون ظالم میری بچی کو اٹھا کر لے گیا۔ اللہ اس کا ستیاناس کرے۔" کہہ کر شاہینہ بھابی نے پھر زار و قطار رونا شروع کردیا۔

میری بھی آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے بڑی مشکل سے انہیں تسلی دی کہ اللہ سے دعا کریں ان شاء اللہ جلد ہی مل جائے گی۔

"گھر میں بہت سارے رشتے دار جمع تھے۔ سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ خیال آرائیاں کررہے تھے۔ سب کی باتیں سن کر میری طبیعت بے زار ہونے لگی۔ تو میں نے ان سے کہا کہ آپ سب بے کار کی باتوں کے بجائے کوئی ورد شروع کریں اور اللہ سے دعا کریں ورنہ یہاں اپنا وقت ضائع اور ہماری پریشانی میں اضافہ مت کریں۔ بعض نے ناک بھوں چڑھائیں بعض کی سمجھ میں میری بات آگئی اور سب سورۂ یٰسین کا ختم کرنے بیٹھ گئیں۔

میں شاہینہ بھابی کو لے کر ان کے بیڈ روم میں آگئی اور انہیں پرسکون رہنے کی ٹیبلٹ دے کر بیڈ پر لٹا دیا۔

ابھی بھابی لیٹی ہی تھیں کہ اتنے میں کمال کمرے میں آگیا۔

کمال ہمارے رشتے کے چچا کا لڑکا تھا۔ چچا کی مقامی مارکیٹ میں بہت بڑی جیولر شاپ تھی اور وہ ان کا اکلوتا لڑکا تھا۔ بہت اچھا اور نیک لڑکا تھا۔ جمیل بھائی کے قریب ہی گھر تھا۔ جمیل بھائی کے بچوں سے بہت پیار کرتا تھا۔

کمال کو دیکھ کر بھابی اٹھ کر بیٹھ گئیں اور بے تابی سے پوچھا۔ "کچھ پتا چلا میری عشو کا۔"

"نہیں بھابی ابھی تک تو کچھ پتا نہیں چلا مگر ان شاء اللہ جلد ہی پتا چل جائے گا۔ ہم نے رپورٹ بھی لکھوادی ہے۔ پولیس یقیناً اسے ڈھونڈ نکالے گی۔ آپ پریشان نہ ہوں اور دعا کریں۔" اس نے نرم لہجے میں بھابی کو سمجھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"اللہ اس کا بھلا کرے۔ کل رات سے یہ مسلسل جمیل کے ساتھ ہے ہر جگہ جمیل کے ساتھ عشو کو ڈھونڈتا رہا ہے۔ بہت ساتھ دے رہا ہے ہمارا۔" بھابی نے احسان مندی سے کہا۔

"ہاں واقعی بھابی کمال بہت اچھا لڑکا ہے۔ ہمدرد ہے' نیک ہے۔ وہ آپ کے بچوں سے مانوس بھی تو بہت ہے۔" میں نے کہا۔

اسی رات مقامی تھانے کا انسپکٹر کیانی دوبارہ تفتیش کے لیے آگیا۔ وہ باری باری سب لوگوں سے مختلف سوالات کرتا رہا پھر اس نے شاہینہ بھابی سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

"آپ اس سے کیا پوچھیں گے وہ تو گھر کے اندر ہی تھی۔ اسے کیا پتا کہ بچی کو کون لے گیا ہے۔" جمیل بھائی نے اس کے سوالات سے اکتا کر کہا۔

تھانے دار ایک عمر رسیدہ اور جہاندیدہ آدمی تھا اور چہرے سے شریف بھی نظر آرہا تھا۔ اس نے کہا۔ "دیکھیں جناب تفتیش کا ہمارا اپنا ایک انداز ہوتا ہے اور بعض باتوں اور واقعات کا واردات سے کس طرح تعلق نکلتا ہے۔ آپ لوگ اس کو محسوس نہیں کر سکتے۔ برائے مہربانی ہم جو کررہے ہیں ہمیں کرنے دیا جائے۔" تب جمیل بھائی خاموشی سے اسے اندر لے گئے۔

شاہینہ بھابی اندر بیڈ روم میں تھیں اور سب سے چھوٹے چھ سالہ دانش کو سلا رہی تھیں۔ جمیل بھائی نے کہا کہ میں انہیں بلا کر لاتا ہوں مگر انسپکٹر نے کہا۔ "نہیں انہیں تکلیف مت دیں بلکہ مجھے وہیں پہنچا دیں۔ میں وہیں ان سے کچھ سوالات کرلوں گا۔" جمیل بھائی انسپکٹر کو اندر لے آئے۔

میں بھابی کے پاس بیٹھی تھی۔ انسپکٹر نے ایک نگاہ میرے اوپر ڈالی اور کچھ کہنا چاہا پھر خاموش رہا۔ میں نے بھی خاموشی سے بیٹھی بھابی اور انسپکٹر کے سوال جواب

سنتی رہی۔
انسپکٹر بھابی سے کسی خاندانی تنازعہ اور لڑائی جھگڑے کے متعلق سوالات کر رہا تھا۔ بھابی نے ان تمام سوالات کے جواب میں بتایا کہ ہمارا کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہے بلکہ ہماری برادری اور خاندان کے لوگ زیادہ تر ہمارے قریب ہی رہتے ہیں اور ہم سب میں بہت اتفاق اور محبت ہے۔ سبھی ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساجھی ہیں۔ ابھی بھابی انسپکٹر سے بات کر رہی تھیں کہ اچانک کمال کمرے میں داخل ہوا مگر انسپکٹر کو بھابی کے پاس بیٹھا دیکھ کر ایک دم ٹھٹک گیا اور ایک گہرا سیاہ رنگ اس کے چہرے پر آکر ٹھہر گیا۔ پھر وہ فوراً ہی پلٹ گیا۔

کمال کے اندر داخل ہونے پر ہم سب کی نگاہیں اس پر آکر ٹھہر گئیں مگر جب وہ واپس پلٹ گیا تو بھابی دوبارہ انسپکٹر کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"ایک گلاس پانی ملے گا۔" انسپکٹر نے میری جانب دیکھ کر کہا۔

"ایک منٹ!" کہہ کر میں اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور فرج سے پانی لینے کے لیے کچن کی جانب جانے لگی کچن کی طرف جاتے ہوئے میری نگاہ سامنے والے کمرے پر پڑی اس کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔

میں نے کمال کو دیکھا وہ بے چینی کے ساتھ کمرے میں ٹہل رہا تھا اور سگریٹ کے تیز تیز کش لے رہا تھا۔ میں لمحہ بھر کو رک کر اسے دیکھنے لگی۔ سگریٹ ختم ہونے پر اس نے فوراً ہی دوسری سگریٹ سلگائی اور اسے بھی تیز تیز کشوں سے پینے لگا۔ اس کی یہ کیفیت اس کے شدید اضطراب کا پتا دے رہی تھی۔

میں اس کی یہ کیفیت دیکھ کر قدرے حیران تو ہوئی مگر پھر پانی کا خیال آتے ہی تیزی سے کچن کی جانب بڑھ گئی۔

میں نے پانی لیا اور بھابی کے کمرے میں آگئی اور انسپکٹر کو پانی کا گلاس دے دیا۔ جو اس نے شکریہ کے ساتھ تھام لیا۔

بھابی کے زانو پر سر رکھے عشو سے چھوٹا بھائی لیٹا تھا اور بھابی باتوں کے ساتھ ساتھ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے سلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کچی نیند میں ہوتے ہوئے بھی جیسے اچانک اسے کوئی بات یاد آئی اور بند آنکھوں کے ساتھ ہی تھوڑا سا سر اٹھا کر ماں کا چہرہ چھو کر اپنی جانب کرتے ہوئے کہا۔

"امی، آپی کو کمال چاچا اپنے ساتھ لے گئے تھے۔۔۔ آپی گر گئی تھی ناں تو کمال چاچا نے کہا آؤ تمہیں ٹافیاں دلواؤں۔۔۔ مگر ابھی تک آپی کو لائے نہیں۔۔۔" اتنا کہہ کر وہ پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیا کہا تم نے بیٹا؟ کون ہے یہ کمال؟" انسپکٹر کیانی ایک دم کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

"ارے نہیں وہ میرا رشتے کا دیور ہے، کل سے مسلسل جمیل کے ساتھ پریشان ہو رہا ہے۔ ویسے بھی وہ تو خود میرے بچوں سے بے حد پیار کرتا ہے، عموماً بچوں کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ان کے ساتھ کھیلتا ہے۔" بھابی نے کہا۔

"نہیں، نہیں پلیز آپ اس بچے کو جگائیں، مجھے اس سے کچھ اور پوچھنا ہے۔" انسپکٹر نے بے قراری سے کہا اور بچے کا شانہ پکڑ کر خود ہی اسے جگانے لگا۔

شکیل کسمساتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر انسپکٹر نے اچھی طرح اس سے تمام باتیں پوچھیں۔ پھر بھابی سے کہا۔

"کہاں رہتا ہے یہ کمال؟"

"آپ خوامخواہ اس معاملے میں کمال کو ملوث کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کمال یہ کام کر ہی نہیں سکتا اور کیوں کرے گا اس کی کوئی وجہ بھی تو ہو؟" بھابی نے کہا۔

"آپ خاموش رہیں اور مجھے کمال کا پتا بتائیں۔" انسپکٹر نے خاصے سخت لہجے میں کہا۔

تب مجھے کمال کا انسپکٹر کو دیکھ کر ٹھٹک جانا اور دوسرے کمرے میں بے تابی سے ٹہلنا اور سگریٹ پینا یاد آگیا۔ میں جھٹ بولی۔ "گھر تو اس کا پچھلی گلی میں ہے مگر وہ اس وقت گھر میں ہی موجود ہے۔ ابھی جو آپ

کے سامنے کمرے میں آیا تھا اور چلا گیا تھا۔"

"اس وقت کہاں ہے وہ؟" انسپکٹر نے چلتے ہوئے پوچھا۔

"وہ برابر والے کمرے میں ہے۔" میں انسپکٹر کے ساتھ ساتھ کمرے سے نکل آئی اور دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر تیزی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے وہ کمال کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔

"ارے ارے، مجھے کہاں لے جا رہے ہیں آپ؟ میں نے کیا کیا ہے۔۔۔" کمال نے آگے نہ بڑھتے ہوئے احتجاج کیا۔

"تمہارے سسرال اور کہاں!" انسپکٹر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تھانے چلو بچو جی سب پتا لگ جائے گا کہ کیوں لے جا رہے ہیں۔" انسپکٹر نے غراتے ہوئے کہا اور اس کو گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔

بھابی اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی آئیں اور چلا کر کہنے لگیں۔ "آپ کمال کو غلط فہمی میں لے جا رہے ہیں۔ میں یقین سے کہہ رہی ہوں کہ کمال ایسا نہیں کر سکتا۔" مگر انسپکٹر نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

باہر جمیل، عاصم اور بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ سب حیران ہو کر دیکھنے لگے۔

باہر آکر انسپکٹر کیانی نے کمال کو موبائل میں بیٹھے سپاہیوں کی جانب دھکیلتے ہوئے کہا۔ "ہتھکڑی ڈالو اس کے ہاتھوں میں اور موبائل میں بٹھاؤ۔" سپاہی جلدی جلدی موبائل سے کود کر باہر آئے۔ کمال کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنائیں اور اسے دھکے مارتے ہوئے موبائل میں بٹھانے لگے۔

لوگوں کا رش لگ گیا۔ جمیل بھائی ہکا بکا یہ سب دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ انسپکٹر کیانی سے کوئی سوال کرتے وہ موبائل میں بیٹھ چکا تھا اور موبائل اسٹارٹ ہو چکی تھی۔

کمال کی گرفتاری کی خبر ذرا دیر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس کی امی بھی چیختی چلاتی ہوئی آگئیں۔

تب جمیل بھائی نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "چچی آپ فکر نہ کریں۔ ابھی میں اور عاصم تھانے جا کر بات کرتے ہیں اور کمال کو لے کر آتے ہیں۔"

"لو بتاؤ ایک پریشانی ختم نہیں ہوئی تھی کہ یہ دوسری شروع ہو گئی۔ اب پولیس ہمارے ہی ایک بندے کو پکڑ کر لے گئی۔ اب ان لوگوں کا کیا بھروسا۔ ان کے تشدد پر تو ہاتھی بھی یہ قبول کر لے کہ میں ہی دہشت گرد چوہا ہوں۔" عاصم نے فکر سے اپنی پیشانی دباتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمیل، عاصم اور کمال کے والد تھانے گئے اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ کمال کو اس شبہے سے بالاتر سمجھا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ کمال نے یہ جرم نہیں کیا ہے اور آخر ایسا کرنے کی کوئی تو وجہ ہو گی مگر انسپکٹر کیانی نے ان لوگوں کی ایک نہیں سنی اور کمال کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ کمال کے والد کا غیظ و غضب کے مارے برا حال تھا۔ وہ انسپکٹر کیانی کو بڑی بڑی دھمکیاں دینے لگے مگر اس پر ان کی دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے سب کو ناکام و نامراد واپس بھیج دیا۔

وہ تمام رات بھی اس دوسری پریشانی کے سبب آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔ میں اور عاصم نے گھر جانا مناسب نہیں سمجھا۔ بس میں نے فون کر کے بچوں کی خیریت معلوم کی اور انہیں سختی سے ہدایت کی کہ گھر کو اچھی طرح سے بند کر لیں اور رات میں کسی کے آنے پر بھی دروازہ نہ کھولیں۔

دوسرے دن یہ فیصلہ کیا گیا کہ کچھ خواتین تھانے جائیں اور انسپکٹر کیانی کو سمجھانے کی کوشش کریں۔ غرض کمال کی امی فیروزہ چچی، شاہینہ بھابی اور دوسری عورتیں تھانے گئیں۔ عورتوں نے تو تھانے میں شور شرابہ مچا دیا۔

تب انسپکٹر کیانی نے سب کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ ابھی تک ہم نے کمال پر کوئی تشدد نہیں کیا ہے۔ ہم تفتیش کر رہے ہیں اور جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ

کمال بے گناہ ہے تو ہم اسے چھوڑ دیں گے۔ ویسے آپ اور آپ' اس نے کمال کی امی اور شاہینہ بھائی کی جانب اشارہ کر کے کہا کہ آپ لوگ اس سے ملاقات کر کے تسلی کر سکتی ہیں کہ ہم نے ابھی تک اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا ہے۔ شاہینہ بھائی اور فیروزہ چچی اندر گئیں اور انہوں نے دیکھا کہ کمال کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ پولیس والے کمال کو جب سے تھانے لائے تھے بیٹھنے یا لیٹنے اور سونے نہیں دیا تھا۔ یعنی مسلسل کھڑا کر کے رکھا ہوا تھا۔

کمال نے اپنی ماں کو دیکھا تو رو پڑا اور بولا۔ ''امی میں نے عشو کو اغوا نہیں کیا ہے۔ انہوں نے تو مجھے یونہی پکڑ لیا ہے۔''

تو فکر نہ کر میرے بچے انسپکٹر کہہ رہا تھا کہ وہ اپنا اطمینان کر کے تجھے چھوڑ دے گا۔'' فیروزہ چچی نے روتے ہوئے کہا۔ ابھی وہ مزید بات بھی نہ کر پائی تھیں کہ ایک سپاہی نے آکر انہیں وہاں سے ہٹا دیا۔

لہٰذا تمام خواتین پھر ناکام تھانے سے واپس آ گئیں۔ پھر سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ آیت کریمہ کا ورد کرنا چاہیے تاکہ اس کے فیض اور برکت سے ایسا ہو کہ اصل مجرم خود تھانے آکر اپنے جرم کا اقرار کر لے اور بے گناہ کمال رہا ہو جائے۔

ذرا دیر میں ڈھیروں خواتین اکٹھی ہو گئیں۔ سب جانتی تھیں کہ کمال اس قماش کا لڑکا نہیں کہ ایسا بھیانک جرم کرے۔ سب نے مل کر آیت کریمہ کا ورد شروع کر دیا اور ایک بوتل پانی دم کر کے رکھ لیا۔

آج کمال کو تھانے میں بند ہوئے تیسرا دن شروع ہو گیا تھا۔ کمال نے ابھی تک اپنے جرم کا اقرار نہیں کیا تھا۔ وہ مسلسل انکاری تھا۔

ایک بار پھر فیروزہ چچی دم کیا ہوا پانی لے کر تھانے گئیں اور انسپکٹر کیانی سے کہا کہ وہ آیت کریمہ سے ختم کا دم کیا ہوا پانی کمال کو پلانا چاہتی ہیں کہ اصل مجرم آپ کو مل جائے اور آپ ہمارے بچے کو چھوڑ دیں۔''

فیروزہ چچی کی بات سن کر انسپکٹر کیانی کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بولا۔ ''ضرور 'ضرور' ضرور' پلایئے یہ پانی کمال کو تاکہ ہمارا کام بھی آسان ہو جائے۔'' فیروزہ چچی نے بوتل کا تمام پانی کمال کو پلایا اور تسلیاں دے کر آ گئیں۔ اب ہم سب گھر میں بیٹھے اللہ کی طرف سے کسی معجزے کا انتظار کرنے لگے۔

ادھر کمال نے پانی پیا اور اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ جسم میں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے آگ بھر دی ہو' دماغ کی رگیں پھٹنے کو تھیں اور اسے کوئی غیبی طاقت زور دینے لگی کہ وہ اپنے جرم کا اقرار کر لے۔

اچانک لاک اپ میں کھڑے کھڑے کمال نے بری طرح چیختا چلانا شروع کر دیا۔ وہ بری طرح اپنے سر کے بالوں کو بھی نوچ رہا تھا۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ ''ہاں ہاں میں نے ہی عشو کو اغوا کیا ہے۔ میں نے ہی یہ بھیانک جرم کیا ہے۔'' اس کی چیخ و پکار سن کر سپاہی دوڑے دوڑے انسپکٹر کیانی کے پاس آئے اور انہیں بتایا کہ کمال چیخ چیخ کر کیا کہہ رہا ہے۔

انسپکٹر کیانی نے یہ سن کر ایک اطمینان بخش سانس لی اور کہا۔ ''ٹھیک ہے اسے میرے پاس لے کر آؤ۔''

تھوڑی دیر بعد کمال انسپکٹر کیانی کے سامنے بیٹھا اپنے جرم کا اقرار کر رہا تھا۔ ایک سپاہی بیٹھا اس کی واردات کی ساری باتیں نوٹ کر رہا تھا۔ ٹیپ ریکارڈ بھی آن تھا۔

''کیا واقعی تم نے ہی عشو کو اغوا کیا ہے؟'' انسپکٹر کیانی نے غور سے کمال کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' کمال نے نگاہیں جھکا کر کہا۔

''مگر کس لیے؟'' انسپکٹر کیانی نے زور سے میز پر ہاتھ مارا اور تیز لہجے میں پوچھا۔

''میں تو ایسا کوئی کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر ایک شیطانی خیال نے مجھ سے یہ کام کروایا میں اپنے کیے پر بہت نادم اور شرمندہ ہوں۔ اب تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔'' کمال نے اتنا کہا اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر بلک بلک کر رونے لگا۔

پھر انسپکٹر کیانی کے اشارے پر ایک سپاہی نے کمال

کو پانی پلایا۔

''اب تم مجھے شروع سے ساری بات بتاؤ۔'' انسپکٹر کیانی نے کہا۔

''ہاں یہ سب کس طرح ہوا؟ میں آپ کو بتاتا ہوں۔'' اور کمال یوں گویا ہوا۔

''جمیل بھائی میرے رشتے کے چچا زاد بھائی ہیں۔ میرا ان کے گھر کافی آنا جانا ہے۔ ہمارے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ کیونکہ میرا کوئی اور بہن بھائی تو ہے نہیں اس لیے میں جمیل بھائی کے بچوں سے بے حد پیار کرتا ہوں اور سب بچے بھی مجھ سے مانوس ہیں۔ میں بی ایس سی فائنل میں پڑھ رہا ہوں۔ کچھ دن ہوئے کالج میں میری کچھ نئے لڑکوں سے دوستی ہو گئی۔ وہ سب لڑکے بھی میری طرح امیر والدین کے بگڑے ہوئے لڑکے ہیں۔ ان لوگوں نے مجھے کچھ ایسی چیزوں سے روشناس کرایا کہ جن کے بارے میں 'میں نے صرف سنا ہی تھا' دیکھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا کیونکہ میرے پرانے سب دوست پڑھنے پڑھانے والے تھے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ مارکیٹ میں بلیو فلموں کی بھرمار ہے۔ میں بھی جانتا تھا کہ یہ فلمیں کیسی ہوتی ہیں مگر میں نے کبھی انہیں دیکھا نہیں تھا۔ میرے نئے دوستوں نے جب مجھ سے ان کے بارے میں پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ میں نے کبھی یہ فلمیں نہیں دیکھی ہیں۔ ''ارے تو اپنے یار کو ہم یہ مزے کروا دیتے ہیں۔'' قمر نے پیار سے میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''نہیں بابا مجھے تو معاف ہی رکھو۔'' میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ تو وہ سب میرا مذاق اڑانے لگے۔ مجھے اس وقت ہتکی محسوس ہوئی اور پھر میں ان کے ساتھ یہ فلمیں دیکھنے کے لیے راضی ہو گیا۔

وہ فلمیں دیکھنے کے بعد گویا میں ایک نئی دنیا سے روشناس ہوا اور مجھے بے حد لطف محسوس ہوا۔ پھر میں نے بھی بازار جا کر ایسی کئی فلمیں خرید لیں کیونکہ مجھے ان کا چسکا پڑ چکا تھا اور پڑھائی کی طرف سے میرا دھیان بالکل ہٹ گیا۔ میرے دوست مجھے مسلسل اس بات کا احساس دلاتے رہتے تھے کہ مجھے ڈگریاں لے کر کون سی نوکری تلاش کرنی ہے کیونکہ اپنے والد کے کاروبار کا میں تنہا وارث ہوں۔

ایک دن دوپہر میں امی نے مجھ سے کہا کہ وہ چھوٹی خالہ کے ہاں گارڈن کے علاقے میں جا رہی ہیں۔ امی نے مجھے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا مگر میں نے انکار کر دیا۔ میں نے امی سے کہا کہ مجھے پڑھنا ہے حالانکہ مجھے پڑھائی وغیرہ تو قطعی نہیں کرنی تھی بلکہ میرا پروگرام آرام سے اور آزادی کے ساتھ نئی لائی ہوئی بلیو فلمیں دیکھنا تھا۔ امی کے جانے کے بعد میں نے اطمینان سے گھر اندر سے بند کر کے تمام دوپہر نئی لائی ہوئی فلمیں دیکھیں۔ جب میں نے ٹی وی بند کیا تو جسم و دماغ کی بڑی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ میری جسمانی طلب چیخ چیخ کر مجھ سے بہت کچھ طلب کر رہی تھی۔ حواس تھے کہ کسی طرح قابو میں ہی نہیں آ رہے تھے۔ اسی شیطانی خیال میں جکڑے جکڑے اس خیال سے گھر سے باہر آ گیا کہ شاید میں اپنی اس کیفیت سے باہر نکل سکوں۔ شاید باہر کی گہما گہمی میں 'میں اپنے آپ کو کنٹرول کر سکوں اور بے خیالی میں چلتے چلتے میں جمیل بھائی کے گھر کی جانب آ گیا۔ یہاں آ کر میں نے دیکھا کہ بچے کرکٹ کھیل رہے ہیں۔ عشو بھی ایک طرف بیٹھی ان کو کھیلتا دیکھ رہی ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تو بھاگ کر میرے پاس آئی مگر نزدیک آتے آتے اسے ایک زور کی ٹھوکر لگی اور وہ نیچے گر پڑی۔ میں تیزی سے اسے اٹھانے کے لیے جھکا مگر نیچے گرنے سے سات سالہ عشو کی فراک اوپر کی جانب اٹھ گئی اور.....

اور جس عفریت سے میں نجات حاصل کرنے کے لیے گھر سے باہر نکلا تھا اس نازک لمحے میں اس نے پوری طرح میرے اعصاب پر اپنا پنجہ گاڑ دیا۔ اپنی شیطانی خواہش کی تکمیل مجھے عشو کے ذریعے پوری ہوتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے چمکارتے ہوئے عشو کو گود میں اٹھا لیا اور خاموشی کے ساتھ لوگوں کی نگاہوں میں آئے بغیر اسے دلاسا دیتے ہوئے وہاں سے چلا آیا کہ آؤ میں تمہیں ٹافیاں دلواؤں۔ میں اسے اپنی بائیک پر

بنھاتے گویا ہواؤں میں اڑتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کہاں جاؤں گا اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں آبادی سے باہر آگیا ہوں اور میری بائیک آبادی کے پرانے قبرستان کی دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ ہر جانب سناٹے کا راج تھا۔ آبادی کا یہ قبرستان جو اب بند ہو چکا تھا اور اس میں جگہ نہ ہونے کے سبب مردوں کی تدفین نہیں ہوتی تھی۔ میں نے عشو کو گود میں اٹھایا اور اس چار دیواری کے اندر چلا گیا۔ یہ شہر خموشاں کے باسی میرے کام میں مداخلت نہیں کر سکتے تھے۔ معصوم عشو میرا چہرہ چھو چھو کر مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ کمال چاچا ہم کہاں جا رہے ہیں مگر اندرونی شیطانی جذبات نے میرے ہوش و حواس معطل کر دیے تھے۔ میں نے ایک دیوار کی سائیڈ میں اسے لٹایا۔ عشو کچھ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ لیٹتے ہی وہ اٹھ کر چاچا چاچا کہہ کر میرے سینے سے لپٹ گئی مگر میں نے جیسے اسے پچھاڑ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بولتی میں نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ سختی سے بند کر دیا اور.....

میں اپنے قبیح فعل میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جب ذرا ہوش بہتر ہوئے تو میں نے دیکھا کہ عشو بے حس و حرکت پڑی تھی۔ پتا نہیں وہ بے ہوش تھی کہ مر چکی تھی..... میں نے سوچا کہ اگر عشو زندہ بچ گئی تو میں زندہ نہیں بچوں گا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو ایک بڑے سے پتھر پر نگاہ پڑی۔ اس نے وہ پتھر اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر عشو کا سر کچل دیا اور اس کی لاش ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں پھینک کر گھر آگیا اور نہا کر سونے لیٹ گیا۔ مگر ابھی نیند بھی نہیں آئی تھی کہ امی آ گئیں۔ رات تک سب طرف عشو کی گمشدگی کا شور مچ گیا تھا۔ میں بھی امی کے ساتھ جمیل بھائی کے گھر چلا گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں تمام دن کمرے میں بند اسٹڈی میں مصروف تھا۔ اس دوران میں نے اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ اپنے ساتھ عشو کو لے جاتے مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس لیے کہ اریب قریب سے اچھی طرح پوچھ گچھ ہو چکی تھی اگر کسی نے مجھے دیکھا ہوتا تو سب لوگ کب کے میرے گھر پر دھاوا بول چکے ہوتے۔ میں مطمئن تھا اور جمیل بھائی کے ساتھ مل کر جگہ جگہ عشو کو ڈھونڈنے کی اداکاری کرتا رہا حالانکہ یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ انہیں نہیں مل سکتی اور اگر مردہ عشو مل بھی گئی تو وہ اس قابل نہیں کہ میرا نام لے سکے۔ میں بار بار جمیل بھائی کا ذہن اس طرف لا رہا تھا کہ عشو کو کسی نے تاوان کے لیے اغوا کیا ہو گا۔ اس لیے کہ آج کل ایسے کیس بہت ہو رہے ہیں۔ جمیل بھائی اور شاہینہ بھابی کی حالت دیکھ کر مجھے اپنے اوپر بے حد ندامت ہو رہی تھی مگر میرے اندر چھپا ہوا شیطان مجھے تسلی دے رہا تھا کہ اپنا منہ سختی سے بند رکھو کچھ نہیں ہو گا۔ آپ نے مجھے شبہے میں پکڑ لیا تھا۔ جب بھی میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جرم کا اقرار نہیں کروں گا۔ اسی میں بچت ہے مگر امی نے آیت کریمہ کا پانی مجھے کیا پلایا میں اپنا جرم نہیں چھپا سکا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں نے اپنے جرم کا اقرار نہیں کیا تو اپنے جلتے ہوئے جسم اور دماغ کے ساتھ میں زندہ نہیں بچوں گا۔ میرے دماغ کی ساری نسیں پھٹنے لگی تھیں۔" اتنا کہہ کر ایک مرتبہ پھر کمال پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

کمال کا بیان ختم ہوتے ہی انسپکٹر کیانی اپنی کرسی سے اٹھا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے بید سے کمال کو بری طرح دھنک کر رکھ دیا مگر وہ مارتے مارتے ہانپنے لگا تو سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے یہاں سے لے جاؤ۔

پھر سپاہیوں کی ایک پارٹی لے کر وہ پرانے قبرستان کی جانب روانہ ہو گیا۔ قبرستان کی ایک جھاڑی میں اٹکی ہوئی بد نصیب عشو کی چڈی مل گئی اور ایک قبر سے عشو کی لاش بھی مل گئی اس کا چہرہ پوری طرح ناقابل شناخت تھا کیونکہ پتھر کی شدید ضرب سے وہ بری طرح کچل گیا تھا۔

جس وقت انسپکٹر کیانی نے گھر پر آ کر جمیل بھائی وغیرہ کو کمال کے بارے میں بتایا تو گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ شاہینہ بھائی فرط غم سے بے ہوش ہو چکی تھیں اور جمیل بھائی اور عاصم وغیرہ غم و غصے سے پاگل ہوئے

جا رہے تھے۔ جمیل بھائی غصے سے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ کمال کو میرے حوالے کر دو۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ اس نے نہ صرف میری معصوم بچی کی جان لی بلکہ اس کی بے حرمتی بھی کی ہے۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر انہیں کنٹرول کیا گیا۔ شام تک عاصم، عقیل وغیرہ اسپتال جا کر عشو کی ڈیڈ باڈی لے آئے۔ کمال کے والد کو دیکھ کر جمیل بھائی بے قابو ہو گئے اور ان کا گریبان پکڑ کر انہیں بری طرح مارا۔ سب نے بڑی مشکلوں سے انہیں جمیل بھائی کی گرفت سے چھڑایا اور انہیں ان کے گھر بھیج دیا۔

عشو کی تدفین کے موقع پر لوگوں کا ایک اژدحام تھا۔ اس اندوہناک واقعے کے بارے میں جو سن رہا تھا دوڑا چلا آ رہا تھا۔ ہر کوئی کمال کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ رات گئے تدفین کا عمل مکمل ہوا۔

انسپکٹر نے کمال کا چالان بنا کر عدالت میں پیش کیا اور اس پر عدالت میں کیس چلنا شروع ہو گیا۔

اس واقعے کے بعد سے کمال کے والدین نے وہ علاقہ چھوڑ دیا اور کہیں اور گھر لے لیا۔ انہوں نے وکیلوں کو خوب پیسہ کھلایا تاکہ ان کا اکلوتا بیٹا کمال موت کے منہ سے بچ جائے پیسے کی ویسے بھی ان کے پاس کمی نہیں تھی۔

تاریخوں پر تاریخیں پڑتی گئیں بالاخر وہی ہوا جو کمال کے والدین چاہتے تھے عدم ثبوت کی بنا پر کمال بے گناہ ثابت ہوا اور عدالت نے اسے بری کر دیا۔

اس واقعے نے گویا ہم سب زخموں پر نمک مرچ کا کام کیا۔ دونوں گھرانوں میں نفرت کی ایک وسیع دیوار حائل ہو گئی تھی۔ ویسے بھی زیادہ تر رشتہ داروں نے ان لوگوں سے قطع تعلق کر لیا۔

بعد میں سننے میں آیا کہ فیروزہ چچی کمال کی شادی کرنے کے لیے اس کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں۔

مگر چونکہ کمال کی اس واردات کے بارے میں اخبارات میں کئی دن تک چرچا ہوتا رہا تھا اس لیے اپنے پرائے سب ہی اس سے واقف تھے اور کوئی انہیں اپنی بیٹی دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تب فیروزہ چچی لاہور شفٹ ہو گئیں اور کاروبار بھی وہیں منتقل کر لیا یہاں انہیں کمال کے لیے ایک گھر میں رشتہ مل گیا۔ فیروزہ چچی خوش تھیں بالاخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھیں مگر قدرت نے یہاں بھی ان سے بدلہ لے لیا۔ شادی کے بعد پتا چلا کہ کمال کی بیوی نفسیاتی مریض ہے اور اسے پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔ کہتے ہیں نا خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ وہ عدالت کی سزا سے تو بچ گیا اللہ نے آخرت میں تو اس کے لیے جو سزا رکھی ہو وہ تو ضرور ملے گی مگر دنیا میں بھی اس کے لیے سزاؤں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور یہ اللہ تعالیٰ اس لیے کرتا ہے تاکہ دوسروں کو اس سے عبرت حاصل ہو۔ کمال کے ہاں پہلی بچی کی پیدائش ہوئی جس کے پاؤں پیدائشی طور پر مڑے ہوئے تھے اور اوپر کا ہونٹ آدھا کٹا ہوا تھا۔ بچی کی پیدائش کے بعد کمال کی بیوی کے دوروں میں شدت آگئی اور وہ رفتہ رفتہ پوری طرح پاگل ہو گئی۔ بالاخر ڈاکٹروں کے مشورے سے اسے پاگل خانے میں داخل کروانا پڑا۔ اب معذور بچی کی تمام ذمے داری فیروزہ چچی پر آن پڑی۔ وہ دن رات روتی تھیں اور پریشان ہوتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی کمال کو جوڑوں کے درد کی بیماری لگ گئی۔ جس کی وجہ سے وہ دن رات بستر پر پڑا رہتا تھا۔ ذرا سا بھی ہلنے جلنے پر شدید درد کی ٹیسیں اس کی چیخیں بلند کر دیتی تھیں۔

آج اس واقعے کو پورے بیس سال گزر گئے ہیں۔ سوچنے بیٹھو تو کل کی سی بات لگتی ہے۔ جمیل بھائی اور شاہینہ بھابی آج تک عشو کا دکھ نہیں بھولے ہیں۔

کمال آج بھی بستر پر پڑا اپنے لیے موت کی دعائیں مانگ رہا ہے۔ اس کی لڑکی چلنے پھرنے سے معذور ہے اور چہرہ بھی نہایت بد وضع ہے۔ فیروزہ چچی اور جمال چچا کا انتقال ہو چکا ہے۔ انہوں نے کمال کے لیے روپے پیسے سے خوشیاں خریدنی چاہی تھیں مگر وہ اسے ایک ایسے عذاب سے دوچار کر گئے ہیں۔ جس کا مداوا کوئی نہیں ہے۔ شاید اگر وہ عدالت سے اپنے جرم کی سزا پاتیں تو اللہ تعالیٰ اسے ان عذابوں میں گرفتار نہ کرتا اور وہ سزا یقیناً "ان سزاؤں کے مقابلہ میں ہلکی ہی ہوتی۔

☼ ☼

سزا

فرحان رضوی

اس کار جہاں میں اب بھی ایسے خاندان موجود ہیں جو غرور و تکبر میں مبتلا ہیں جن کے اندر خودغرضی اور ریاکاری بدرجہ اتم موجود ہے۔ مکرو فریب اور تنگ نظری کے سانئے ازل سے محبت کرنے والوں کے دشمن رہے ہیں۔

ایک ایسے مریض کا احوال جو علم نفسیات کو نہیں مانتا تھا

لوگ ہماری اہمیت کو تسلیم کریں یا نہ کریں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن نفسیاتی بیماری بھی جسمانی بیماریوں کی طرح علاج کی متقاضی ہے بلکہ اب تو ہمارے ملک میں بھی اس علاج کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کرلیا گیا ہے اور بڑے شہروں میں نفسیات کے کلینک کھل گئے ہیں۔ فرق صرف اتنا سا ہے کہ بہت زیادہ پڑھے لکھے لوگ ہی اس علاج کو سمجھتے ہیں بلکہ کبھی کبھی وہ بھی نہیں سمجھتے۔ قاضی فرمان علی سے میری ملاقات ایک انسٹی ٹیوٹ کی تقریب میں ہوئی تھی۔ اچھی شخصیت کے مالک لیکن کچھ خود پرست اور زیادہ چرب زبان سے تھے۔

"یہ ڈاکٹر انیلا عباسی ہیں۔ ہمارے ملک کی ایک مایہ ناز ماہر نفسیات۔" میرے ایک واقف کار نے فرمان صاحب سے میرا تعارف کروایا۔

"ماہر نفسیات۔" قاضی فرمان چونک پڑے۔

"جی ماہر نفسیات لیکن آپ چونکے کیوں؟"

"نہیں بھائی انہیں دیکھ کر تو کسی پر بھی نفسیاتی حملہ ہو سکتا ہے۔" جن صاحب نے میرا تعارف کرایا تھا۔ وہ تو کچھ بوکھلا سے گئے۔ مگر میرے لیے یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ میں نے ان کی بات کا برا منائے بغیر اطمینان سے کہا۔

"جناب عالی! نفسیات میرا مضمون ہے اور میں اپنے مخصوص انداز میں ذہنی امراض کا علاج کرتی ہوں۔"

"یہی تو عرض کر رہا ہوں۔ اصولی طور پر تو آپ ذہنی توازن بگاڑ سکتی ہیں۔ آپ جیسا حسین مسیحا مل جائے تو کیا کہنے۔ معافی چاہتا ہوں جو دل میں آیا وہ کہہ دیا ویسے آپ کے پاس کس قسم کے نفسیاتی مسائل آتے ہیں؟"

"ہر طرح کے مسائل بہت سی اقسام ہوتی ہیں ان کی۔" میں نے جواب دیا۔

"جی جی میں سمجھ رہا ہوں۔ جیسے آج میرا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا۔ بتایئے میں کیا کروں یا پھر میرے میاں روٹھ کر کلب چلے گئے ہیں یا میرے بچے کی آنکھیں سبز کیسے ہو سکتی ہیں۔ میرا شوہر کیسا ہے اور میرا فرمانبردار کیسے ہو سکتا ہے۔ میرا بچہ میری مرضی سے نہیں پیدا ہوا۔ کیوں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ ویسے ایک پیش گوئی کردوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"جی جی ارشاد.... ارشاد۔"

"یہ میرا کارڈ رکھ لیجیے۔ میں دعوے سے کہتی ہوں کہ بہت جلد آپ کو بھی میری ضرورت پیش آجائے

گی۔" انہوں نے خوش دلی سے میرا کارڈ لیتے ہوئے کہا۔

"بخدا میں تو ابھی مریض بننے کے لیے تیار ہوں۔"

"ویسے فرمان صاحب جو لوگ نفسیات کا اس قدر مذاق اڑاتے ہیں۔ آپ یقین کریں خود ان کے دل میں نفسیاتی چور ہوتا ہے۔"

"بھئی واہ میرا خیال اس سے بالکل مختلف ہے۔ میرے اعصاب تو خدا کے فضل سے بالکل مضبوط ہیں لیکن خاتون، ماہر نفسیات خود مریض ہوتے ہیں۔ آپ برا تو ضرور مانیں گی میری باتوں کا لیکن سچ تو زبان سے نکل ہی جاتا ہے۔ آپ بھی ڈاکٹر ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ بے وقوف بنانے کی ڈگری میڈیکل کی کون سی ڈگری سے مطابقت رکھتی ہے۔ اچھا آپ ایسا کریں کہ مجھے بھی بے وقوف بنا کر دیکھیں۔ آپ نے چیلنج تو کر ہی دیا ہے۔ ایسا کیجئے آپ مجھے ہپناٹائز کر دیجئے اور اگر آپ مجھے متاثر یا قائل کر سکیں تو میں آپ کو ایک بہت بڑا پلیٹ فارم دلوادوں گا۔ کیا خیال ہے آپ کا ہماری دوسری ملاقات کب ہو رہی ہے۔"

"جب آپ پر نفسیاتی دورے پڑنے لگیں گے۔" میں نے بے پروائی سے ہنس کر کہا اور دوسری جانب متوجہ ہو گئی۔

بعض اوقات وہ ہو جاتا ہے جس کا تصور بھی انسانی ذہن میں نہ ہو۔ اس وقت میں کلینک سے فارغ ہو کر اپنے گھر میں ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ دفعتاً ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے آواز ابھری۔ "ڈاکٹر انیلا

عباسی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"
"جی میں بول رہی ہوں۔"
"مسیحائی کے دعوے کرتی ہیں آپ لیکن آپ مجھے بتائیے کہ آپ کیا خود کو منہ دکھانے کے قابل سمجھتی ہیں۔" میں ایک لمحے کے لیے سٹپٹا سی گئی لیکن پھر میں نے فون بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد دوبارہ گھنٹی بجی اور فون کرنے والے نے دس بیس گالیاں مجھے دے ڈالیں اور پھر بولا۔ "گالیاں سننے کا حوصلہ نہیں ہے تو دکھی دل کی بات کیا سنو گی۔"

"میں نے آپ سے کب کہا ہے جناب کہ آپ اپنا دکھڑا مجھے اتنے خوب صورت انداز میں سنائیں۔"

ایک موٹی سی گالی پھر میرے کانوں میں ابھری اور کہا گیا۔ "پھولوں میں گھری رہتی ہو کبھی پتھروں کی مار بھی سہو۔ وہ کمینی جو مجھے برباد کر گئی ہے جو میرا گھر لوٹ کر لے گئی ہے وہ تمہاری نسل سے ہے سمجھیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔"

"قاضی فرمان علی میرا نام ہے۔ سمجھیں قاضی فرمان علی اور اب میری قوت برداشت جواب دے رہی ہے۔ زہر کھا رہا ہوں میں۔ تم بھی یہی کہو گی کہ کھالو۔ وہ حرافہ زہر دے کر گئی ہے مجھے اور وہ دوسری مجھے تڑپا تڑپا کر مار رہی ہے اور تم اس بدذات کی نسل سے نہ ہوتیں تو میں کہتا خدا کے لیے اس وقت میں تنہا ہوں۔ شعلوں میں گھرا ہوا ہوں میرے اردگرد اس وقت آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ آجاؤ مجھے تمہاری ضرورت ہے ایک بار تم نے مجھ سے کہا بھی تھا۔ آجاؤ۔" اور اس کے بعد آواز اس طرح آنسوؤں میں ڈوب گئی کہ میرے دل کی شمع موم کی طرح پگھلنے لگی میں نے ایک بار پھر کہا۔

"فرمان صاحب! فرمان صاحب۔" لیکن جواب میں کچھ سسکیاں اور ہچکیاں سنائی دیں اور اس کے بعد فون کا ریسیور رکھ دیا گیا۔

میں ایک دم پریشان ہو گئی۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ اس کا کارڈ میرے پاس موجود تھا۔ فرمان علی نے اسی تقریب میں کارڈ کا تبادلہ کیا تھا لیکن میں نے اس کارڈ کو ایسے ہی پھینکنے کے سے انداز میں ڈال دیا تھا لیکن اس وقت مجھے ایک دم سے احساس ہوا کہ وہ کارڈ میری اہم ضرورت ہے۔ میں نے کارڈ تلاش کیا۔ دل بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ اس شخص کو کچھ ہو گیا ہے اور اسے میری فوری ضرورت ہے میرا شعور یہ تسلیم کر رہا تھا کہ اس شخص کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ وہ یقینی طور پر کسی ایسی مشکل کا شکار ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اسے میری ضرورت ہے۔ میں نے فوراً گاڑی نکالی اور خاصی تیز ڈرائیو کرتے ہوئے اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کا گھر ڈیفنس میں تھا۔ گیٹ پر چوکیدار نے مجھے روک لیا۔

"آپ کون ہیں؟"

"ڈاکٹر۔" میں نے اوور آل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"چوکیدار نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "لیکن صاحب تو بیمار نہیں ہیں وہ تو...." وہ کچھ کہتے کہتے ہچکچا گیا۔

"ہاں صاحب نے مجھے خود فون کر کے بلایا ہے۔" میں نے چوکیدار کو مطمئن کرتے ہوئے کہا اور ملازم کے ہمراہ اندر چلی گئی۔ صاحب کا کمرہ بے ترتیب تھا کئی اقسام کی قیمتی سجاوٹ کی چیزیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور میز الٹی پڑی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کمرے میں مہابھارت ہوئی ہو اور وہ آنکھیں بند کیے گہرے گہرے سانس لے رہے تھے۔ کوٹھی میں کوئی دوسرا شخص نہیں تھا سوائے ملازم اور چوکیدار کے۔

"بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟" میں نے ملازم سے پوچھا۔

"وہ گھر چھوڑ کر چلی گئیں ہیں۔"

"ان کے درمیان جھگڑا کب اور کیسے ہوا؟"

"ان کے درمیان پہلا جھگڑا رات کو دو بجے ہوا جس میں بیگم کے چیخنے چلانے اور صاحب کے بھی چیخنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر صبح کے وقت دونوں نے ناشتہ نہیں کیا۔ میں ٹرالی لیے پیچھے کھڑا تھا کہ پھر دونوں میں

کچھ تیزی پیدا ہوئی اور بیگم صاحبہ نے کہا۔ "اب تم میرا بدلہ اور انتظام دیکھنا۔ میں تمہاری کمزور بیویوں کی طرح نہیں ہوں۔ میں تو تمہارا دماغ ٹھکانے لگا دوں گی۔"

"کیا صاحب کی اور بھی کوئی بیوی ہے؟"

"صاحب کی پہلی بیگم صاحبہ کا کچھ پتا نہیں دوسری کا انتقال ہو گیا اور یہ تیسری شازیہ بیگم، صاحب کے ساتھ چار سال سے ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ ہمارے صاحب بہت اچھے ہیں لیکن نصیب ان کے بہت خراب ہیں۔ انہیں کسی بیوی سے سکون نہیں ملا۔"

"صاحب کے بچے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"بچے کہاں، بچہ ہی تو اس سارے فساد کی جڑ ہے۔ صاحب کی پہلی بیوی کا کچھ پتا نہیں، دوسری بیگم کا انتقال ہو گیا اور یہ تیسری بیگم بیوہ تھیں۔ ایک بچی ان کے ساتھ تھی رفیعہ بی بی لیکن صاحب سے ان کی بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔" وہ رک رک کر بتاتا رہا۔ "ایک سال سے صاحب کچھ پریشان ہیں۔ بیگم صاحبہ کے ساتھ کلب بھی نہیں جاتے تھے۔ دونوں الگ الگ رہتے تھے ایک دو ماہ سے صاحب بہت زیادہ پریشان رہنے لگے تھے اور جب سے شازیہ بیگم صاحبہ گئی ہیں صاحب پر جیسے دیوانگی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں فون پر نجانے کس کو گالیاں دے رہے تھے اور ابھی ابھی تھک کر نڈھال ہو کر ایسے پڑ گئے ہیں۔"

میں نے انہیں گلوکوز پلوائی پنکھا تیز کروایا۔ کمرے کے پردے کھنچوائے۔ کمرے کی بے ترتیبی کو ٹھیک کروایا۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر الجھن سی پیدا ہو گئی تھی ایسی الجھن جس میں شناسائی تو تھی لیکن شعوری طور پر وہ مجھے نہیں پہچان رہے تھے اقراء.... اقراء۔" انہوں نے پکارا۔

"اقراء کون ہے؟" میں نے ملازم سے پوچھا۔

"میں نے یہ نام کبھی نہیں سنا۔ صاحب کی بیگم کا نام تو شازیہ تھا اور بچی کا نام رفیعہ۔"

"آپ شازیہ کو پوچھ رہے ہیں۔" میں نے ان سے کہا۔

"شازیہ! کون شازیہ" وہ ذہن پر زور دے کر بولے۔

"شاید ہماری کوئی واقف کار ہیں۔"

"وہ آپ کی بیوی ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ گھاس کھا گئی ہیں۔ اقراء سے پوچھو میری تو شادی بھی نہیں ہوئی۔"

یہ دوہری شخصیت کا کیس تو نہیں ہے۔ میں نے پر تفکر انداز میں سوچا۔ پھر کہا۔ "قاضی فرمان صاحب آپ کچھ یاد کریں۔"

"قاضی فرمان۔" وہ قہقہہ لگا کر بولے۔ "آپ مذاق کر رہی ہیں میں قاضی فرمان نہیں بلکہ قاضی عدنان ہوں قاضی فرمان میرا چھوٹا بھائی ہے۔"

"اچھا!" میں نے کچھ سوچ کر سر کھجایا۔ "قاضی عدنان صاحب آپ میرے کلینک چلیے وہاں چل کر آرام سے باتیں کریں گے۔" میں انہیں کلینک لے آئی۔

قاضی فرمان کی بڑی عجیب سی کہانی تھی۔ جب میں ملازم کی مدد سے انہیں اپنے کلینک لے آئی تو وہ نڈھال ہو گئے تھے۔ وہ برابر کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ ان کی بڑبڑاہٹ میں کسی اقرا کا ذکر نمایاں تھا۔

قاضی فرمان کا نروس بریک ڈاؤن اتنا شدید تھا کہ نہ صرف ان کی یادداشت مجروح ہو رہی تھی بلکہ وہ خود کو فرمان کے بجائے عدنان سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی شخصیت کو ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ فرمان کی باتیں اس طرح کرتے تھے جیسے وہ ان کا چھوٹا بھائی ہو۔ شازیہ بیگم غائب ہو گئی تھیں، رفیعہ بھی ان کے ہمراہ تھی۔ گھر کا ملازم قاسم صرف اتنا بتا سکا تھا کہ صاحب کی پہلی بیوی لاپتا ہیں اور دوسری بیگم کا انتقال ہو چکا ہے جب کہ تیسری بیوی انہیں چھوڑ کر جا چکی ہے۔

ایک جاسوس کی سی باریک بینی سے میں نے سب سے پہلے انکل مجید سے رابطہ کیا انہیں پوری صورت حال سمجھائی۔ کوٹھی کے اطراف پہرہ لگوایا اور خود ان کی کوٹھی کا تفصیلی جائزہ لینے پہنچ گئی۔

وہ کوٹھی بڑی تو نہ تھی لیکن کچھ مختلف وضع کی بنی ہوئی تھی۔ قاضی فرمان کا کمرہ خاصا بے ترتیب تھا۔ ان کی رائٹنگ ٹیبل پر کچھ ادھورے مسودے پڑے تھے اور اس کی نچلی دراز میں ایک بجلی کا بل تھا جس کی ادائیگی نہیں ہوئی تھی۔ ایک طرف ایک چیک بک تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ گزشتہ ہفتے انہوں نے بینک سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ نکالا تھا۔

قاضی فرمان کا کمرہ کباڑ خانہ معلوم ہو رہا تھا جو ان کی ذہنی پراگندگی کی علامت تھی۔ ان کے کمرے کی الماری بند تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے کھولا۔ وہاں ان کے کچھ سوٹ ٹنگے تھے اور ایک طرف چھوٹا سا خانہ تھا جس میں ان کی اہم دستاویز رکھی تھیں۔ الماری کی سیف نمبروں والی تھی جو بڑی مشکل سے ملی۔ وہ خالی تھی صرف اس میں ایک سیاہ کور کی ڈائری رکھی تھی۔ مزید تلاشی کے دوران ایک لڑکے کی تصویر ملی جس کی عمر اندازاً سترہ اٹھارہ سال ہوگی۔ اسی تصویر کی دوسری کاپی سیاہ ڈائری میں موجود تھی۔ میں نے ڈائری اور تصویر احتیاط سے اپنے پاس رکھی اور الماری و بیڈ روم مقفل کر کے اپنے گھر لوٹ آئی۔

ڈائری، اس میں موجود چند خطوط اور کچھ تصاویر نے ان کی زندگی کے سارے گوشے وا کر دیئے جس سے مجھے قاضی فرمان کی زندگی کے حالات جاننے اور ان کی موجودہ کیفیت کو سمجھنے میں مدد ملی۔

ڈائری کے پہلے صفحے پر ایک خوب صورت بچے کی تصویر تھی جس کے نیچے لکھا تھا رومان قاضی فرمان۔ فرمان نے اس کے عقب میں لکھا تھا۔ "میں ہر روز اسے دیکھتا ہوں اور جیتا ہوں۔" بچے کا نام رومان تھا مگر قاضی نے اسے گڈو لکھا تھا۔

ڈائری کے مطالعے سے مجھے علم ہوا کہ فرمان کی پہلی بیوی فرحانہ ان کے خاندان کی ملازمہ کی بیٹی تھی۔ قاضی ان دنوں لندن سے پڑھ کر آئے تھے اور بے حد ترقی پسند خیالات کے مالک تھے۔ والدین کے دباؤ سے اگرچہ وہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھ گئے اور کامیاب ہو کر سرکاری افسر بھی بن گئے لیکن ان کی سوچ وہی تھی اور انہی خیالات کے زیر اثر انہوں نے مخالفتوں کی پروا کیے بغیر فرحانہ کو اپنی شریک حیات بنا لیا۔

فرحانہ بے حد حسین تھی۔ میدہ شہاب رنگت والی لڑکی شروع سے ان کے گھر میں پلی بڑھی تھی اور آٹھ جماعتیں بھی پڑھ لی تھیں۔ لندن جانے سے پہلے قاضی فرمان، فرحانہ کو ترقی پسند ادب سنایا کرتے تھے۔ فرحانہ چھوٹی تھی کچھ اس کی سمجھ میں آتا تھا کچھ نہیں۔

انہیں اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ اگر وہ فرحانہ سے شادی کے فیصلے سے والدین کو آگاہ کریں گے تو وہ قطعی ان کے اس فیصلے کی حمایت نہیں کریں گے لہٰذا وہ فرحانہ کو ہوٹل لے گئے اور وہیں انہوں نے اس سے سول میرج کر لی پھر اپنے والدین کو فون پر اطلاع دی۔ والدین کو ان سے اتنا بڑا قدم اٹھانے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ انہوں نے انہیں سخت سست کہا لیکن جوان اور اکلوتی اولاد مدمقابل آجائے تو شکست مان لینے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ بڑھاپا اپنے ہتھیار نہیں رکھتا بلکہ اپنے تجربے سے اس کے اہداف بدل جاتے ہیں اگر والدین کی جوانی میں یہ قدم اٹھایا گیا ہوتا تو مسئلہ دوسرا تھا لیکن اب نہ طاقت تھی نہ ہمت۔ صرف تجربہ تھا اور ہوش سے کام لینے کی ضرورت تھی۔

باپ نے فرحانہ اور فرمان کو گھر آنے کی اجازت دے دی۔ فرمان کی والدہ، بہو کو ناپسند کرتی تھیں اور اسے اپنی خاندانی بہو تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھی لیکن خاموش رہیں اور بظاہر فرحانہ سے انتہائی خوش اخلاقی سے پیش آتیں لیکن انہوں نے ذرا مختلف انداز میں فرمان کو یہ باور کرانا شروع کر دیا کہ جوانی میں اس طرح کی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ دوسری جانب انہوں نے فرحانہ کو سختی سے تاکید کی کہ وہ اولاد پیدا کرنے کی جرات نہ کرے ورنہ اسے اس جرات کی شدید سزا مل سکتی ہے۔ ان کے خاندان میں کھوٹ نہیں ہے۔ کھرا اور سچا خاندان ہے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر ہر تیسرے ماہ اس کا معائنہ کرتی اور اسے بے اولاد بنانے کی کوششیں کرتی۔ فرحانہ ڈر گئی وہ اپنی بے عزتی تو برداشت کر سکتی تھی مگر یہ صورت حال اس کی برداشت سے باہر تھی۔ ہر عورت ماں بننا چاہتی ہے۔ ماں بننا عورت کی معراج ہے اور اس کی تکمیل ہے۔ ممتا کا جذبہ اس کے لہو میں ہمیشہ گردش کرتا ہے۔ وہ شادی شدہ ہے لیکن ماں نہیں بن سکتی۔

اس بار اس نے حالات سے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب کچھ دن گزر گئے اور اس کو شک ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ تو وہ سخت متفکر ہوئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اب فرمان میں بھی وہ پہلی سی گرم جوشی نہیں رہی اور اب وہ اس سے شادی کرنے کے فیصلے پر پچھتا رہے ہیں۔

اس کے سامنے فرمان کی امبر سے شادی کے انتظامات ہو رہے تھے۔ امبر جو فرمان کے سگے چچا کی بیٹی تھی اور ان کی مانگ تھی۔ قاضی نے تنہائی میں فرحانہ سے کہا اول تو وہ فکر نہ کرے اس کا کیا بگڑتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ لیڈی ڈاکٹر مجھے بتا چکی ہے کہ تم ماں نہیں بن سکتی ہو اور میرے ماں باپ کو بچے کی آرزو ہے لہٰذا امبر سے شادی کر کے میں انہیں خوش بھی کر دوں گا اور اس طرح ان کی دلی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔

قاضی نے بڑی بے دردی سے یہ بات فرحانہ سے کہہ دی اور فرحانہ اس سے یہ تو نہ کہہ سکی کہ وہ ماں بننے والی ہے کیونکہ یہ بات کہنا خود کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ اس بات کے افشا ہونے پر پہلے دو دفعہ کی طرح اس بار بھی بچہ اس سے چھین لیا جائے گا۔ لہٰذا وہ اندر ہی اندر گھٹتی رہی۔

کئی روز کی سوچ بچار کے بعد اس نے اس ننھی سی جان کی حفاظت کرنے کے لیے گھر سے بھاگنے کا اٹل فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ایک دن وہ موقع دیکھ کر گھر سے غائب ہو گئی۔

خط قاضی کی ڈائری میں ہی تھا جس میں اس نے تفصیل سے لکھا تھا کہ یہاں اس کی جان خطرے میں ہے اور یوں بھی قاضی نے اب نظریں بدل لی ہیں۔ لہٰذا اس کے پاس گھر چھوڑنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا کیونکہ وہ قاضی کے بچے کی ماں بننے والی ہے اور اس کے لیے آنے والے بچے کی حفاظت سب سے مقدم ہے لہٰذا اسے تلاش نہ کیا جائے۔ وہ ہمیشہ کے لیے اس گھر اور قاضی کی دنیا سے دور جا رہی ہے۔ اس نے قاضی کو مخاطب کر کے لکھا تھا کہ اسے ہرگز تلاش نہ کیا جائے اور وہ چھ ماہ بعد اسے خط ضرور لکھے گی۔

امبر سے شادی تازہ تازہ واقعہ تھا۔ قاضی نے خط پڑھا اور اسے فرحانہ کا تنگ کرنے کا طریقہ خیال کرتے ہوئے اس خط کو ڈائری میں رکھ دیا۔ چھ ماہ گزر گئے۔ امبر دلہن بن کر گھر آچکی تھی۔ قاضی کے لیے فرحانہ اب خواب و خیال تھی۔ فرحانہ کی ماں ان کی نمک خوار تھی اس نے اس واقعے پر کوئی واویلا نہیں کیا لیکن اس صدمے کو دل پر رکھ کر دو ماہ میں اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ البتہ فرحانہ کی ساس نے اس واقعے پر خاک ڈالی اور امبر کو خاندانی زیورات اور نوادرات کا مالک بنا دیا کیونکہ وہ اصل خاندانی بہو تھی جو ساس بیاہ کر لائی تھی۔

ایک دن قاضی کو فرحانہ کا خط ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ قاضی تم ایک بیٹے کے باپ بن گئے ہو۔ میں نے بیٹے کا نام رومان رکھا ہے۔ تمہاری بدنصیبی یہ ہے کہ ساری زندگی میں تمہارے بیٹے کو تمہاری صورت نہیں دیکھنے دوں گی اور نہ تمہیں اس کی صورت۔ تم اس کی یاد میں ساری عمر تڑپتے رہو گے۔ کیونکہ تمہارے گھر میں میرے دو بچوں کا قتل ہوا ہے۔ میں نے رومان کو قاتلوں کے حصار سے نکالا ہے۔ میں اسے تمہارے خاندان کے بھیڑیوں سے چھپا کر ہمیشہ تم سے الگ رکھ کر پالوں گی۔ ہمیں تمہاری جائیداد کی کوئی ضرورت نہیں۔

سال بھر بعد اسے پھر ایک خط موصول ہوا جس میں ایک سالہ بچے کی تصویر تھی۔ جس پر لکھا تھا رومان ایک سال کا ہو گیا ہے اور مجھے ماں کہنے لگا ہے۔ میں نے اس کی سالگرہ منائی ہے۔ جب وہ چار سال بعد

اسکول جانا شروع کرے گا تب میں تمہیں اس کی تصویر بھیجوں گی۔ اچھا اب یہ تو بتاؤ کہ تمہاری جائیداد کا ولی عہد بھی پیدا ہوا یا نہیں لیکن تم مجھے کیا بتاؤ گے میں خود ہی معلوم کرلوں گی۔

جب یہ خط قاضی کو ملا تو وہ سکتے میں آگیا اسے رومان کو دیکھنے کی تڑپ پیدا ہوئی اور یہ تڑپ اس لیے بھی شدید ہو گئی کہ امبر کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ شاید خدا سزا دے رہا تھا۔

چار برس بعد امبر کڑھ کڑھ کر ہارٹ فیل ہو جانے کی سبب چل بسی۔ امبر کی موت کے ٹھیک دو ماہ بعد قاضی کو پھر ایک خط ملا جو فرحانہ نے لکھا تھا جس میں امبر کی موت پر افسوس کیا گیا تھا اور اس کی بدنصیبی پر ترس کھاتے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ قاضی تم پریشان مت ہو لڑکیوں کی کمی امیر زادوں کو ہرگز نہیں ہوتی۔ تم پہلی فرصت میں شادی کرلو۔ تمہیں ولی عہد کی بھی سخت ضرورت ہے۔ ایک تصویر اس خط کے ساتھ بھی تھی جس میں رومان کے گلے میں کتابوں کا بستہ تھا اور اسے اسکول جاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ قاضی نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔ انٹیلی جنس تک کی مدد لے لی اپنے طور پر بھی بہت تلاش کیا لیکن فرحانہ کا کچھ پتا نہ چلا اور وقت گزرتا چلا گیا۔

چند سال یونہی گزر گئے۔ اس کے ماں باپ بھی فرحانہ کو یاد کر کے روتے تھے اور بیٹے کی حالت پر کڑھتے تھے۔ جب وہ خط اور تصاویر دیکھتے تو آسمان کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیتے۔ غرور کا سر کس قدر نیچا ہو چکا تھا وہ فرحانہ کو پالینے اور بچے کو دیکھنے کا ارمان لیے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ قاضی کے اردگرد خواتین کا جمگھٹا بڑھنے لگا۔ اب قاضی ایک بار پھر خود کو اہمیت دینے لگا۔ اسے ماضی کا زخم بھولنے لگا۔ خوب صورت اور حسین لڑکیوں کی محبت نے اسے پھر سے ہشاش بشاش اور اسمارٹ بنا دیا تھا۔ وہ کلب وغیرہ پابندی سے جانے لگا۔

جانے کس طرح شازیہ بیگم نے اس بے قابو امیر زادے کو اپنے دام میں گرفتار کیا۔ شازیہ بیوہ تھی مگر تھی بہت حسین اور پرکشش ان کی ایک دو برس کی بچی تھی اور اپنے شوہر کے ساتھ انہیں صرف چار سال کی ازدواجی زندگی میسر آئی تھی۔ لہٰذا قاضی نے یہ سوچ کر کہ شازیہ ماں بننے کی صلاحیت رکھتی ہے شازیہ کو شادی کی پیش کش کردی۔ شازیہ بیگم کے دل کی مراد پوری ہو رہی تھی۔ انہوں نے دکھی عورت کا کردار کامیابی سے ادا کیا اور قاضی کے سامنے یہ شرط رکھ دی کہ وہ اس کا حق مہر بیس لاکھ روپے رکھے اور ساتھ ہی کچھ جائیداد بھی اس کے نام کردے۔ وہ یہ سب تحفظ صرف اپنی بیٹی کے لیے چاہتی ہے کیونکہ اسے خدشہ ہے کہ قاضی کی اپنی اولاد ہو جائے گی تو اسے میری بیٹی رفیعہ بوجھ محسوس ہو گی لہٰذا وہ اس کے تحفظ کے خاطر یہ سب کچھ چاہتی تھی قاضی نے اس کے خدشے کی تائید کی اور اس کی شرائط پوری کرتے ہوئے اسے دلہن بنا کر گھر لے آئے۔

قاضی کو رفیعہ سے جلد ہی انسیت ہو گئی۔ وہ فرصت کے اوقات میں اس کے ساتھ کھیلا کرتے۔ جب دو برس گزر گئے تو انہیں تشویش لاحق ہوئی کہ آخر وہ صاحب اولاد کیوں نہیں ہوتے۔ انہی دنوں تقریباً" چار پانچ برس بعد انہیں فرحانہ کا پھر خط موصول ہوا۔ جس میں نئی شادی کی مبارک باد کے ساتھ پوچھا گیا تھا کہ ولی عہد آگئے یا نہیں اور آگئے تو میری طرف سے دلی مبارک باد۔

یہ خط خنجر بن کر قاضی کے دل میں اتر گیا۔ "شازیہ بیگم! مجھے ایک بچہ چاہیے۔" شازیہ تیز طراز عورت تھی۔ اسے اپنے حسن و جوانی سے بے حد محبت تھی۔ وہ بچہ پیدا کر کے اپنے جسمانی خدوخال کو بے ڈول کرنے کے ہرگز حق میں نہیں تھی۔ انہوں نے رفیعہ کی پیدائش کے بعد ہی اپنا آپریشن کروا کر اس سلسلے کو بند کروا دیا تھا اور اس راز کو سینے میں رکھ کر قاضی سے شادی کرلی تھی۔

فرحانہ کا خط ملنے کے بعد قاضی نے ایک بار پھر اپنا میڈیکل چیک اپ کروایا اور ساتھ ہی اپنی خاندانی ڈاکٹر سے شازیہ بیگم کا بھی۔ تب ہی یہ راز کھلا کہ شازیہ نے

ان کے ساتھ کیا کھیل کھیلا ہے۔ اس موقع پر ان کا نروس بریک ڈاؤن ہوا۔ انہوں نے شازیہ سے شدید جھگڑا کیا۔ چیخ چلا کر دیوانگی کے جوش میں انہوں نے یہ بھی کہہ ڈالا کہ وہ رفیعہ کو بھی اس سے چھین لیں گے یا اسے جان سے مار ڈالیں گے تاکہ شازیہ بھی ان کی طرح عذاب اٹھائے۔

شازیہ جلد از جلد اپنے حصے کی تمام جائیداد کے کاغذات اور بیس لاکھ روپے جو قاضی نے بطور حق مہر ان کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیے تھے لے کر ملک سے ہی فرار ہو گئی۔ یہی مرحلہ تھا جب قاضی شدید نروس بریک ڈاؤن کی حالت میں مجھ سے ٹکرائے۔

فرحانہ کہاں ہے اسے کیسے تلاش کیا جائے۔ قاضی کی ذہنی حالت اس درجے خراب ہے کہ وہ خود کو قاضی فرمان تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود کو اپنا بڑا بھائی قاضی عدنان تصور کر رہا ہے اور اقراء کو پکار رہا ہے جو قاضی عدنان کی محبوبہ تھی۔ شاید قاضی کے لاشعور میں اس کے بھائی اور اقراء کا کوئی مشترک واقعہ ہے جو اسے تنگ کرتا ہے اور وہ اقراء کو پکارتا ہے۔

میں اس کے سامنے ایک سترہ برس کے لڑکے کو لے آئی۔ "فرمان اسے پہچانو۔"

"میں فرمان نہیں عدنان ہوں۔"

"اچھا عدنان! تمہیں پتا ہے یہ تمہارے بھائی کی اولاد ہے؟"

"فرمان کی اولاد۔" اس نے حیرت سے پوچھا پھر جیسے کسی سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں فرمان کی اولاد۔ تمہیں اس کی ماں کا نام یاد ہے۔" وہ سوچتا رہا اور میں اس کی تحلیل نفسی کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کا نام اسے یاد آگیا۔ نکتہ یہ تھا کہ قاضی عدنان مر چکا تھا۔ مجھے کچھ کچھ کامیابی ہو رہی تھی۔

"قاضی عدنان! تم فرحانہ کو جانتے ہو؟"

"نہیں میں نے نہیں دیکھا مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔" وہ الجھتے ہوئے بولا۔ میں بھی ارادے کی پکی تھی۔ میں نے فرحانہ کی تصویر اسے دکھائی وہ عجیب سی حالت میں اسے دیکھتے رہے۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ان کا ذہن شدید کشمکش کا شکار ہے۔ آخر کار انہیں فرحانہ یاد آگئی۔

میں نے دوبارہ قاضی کی ڈائری بڑی توجہ سے پڑھی اور فرحانہ کے خط اور لفافے دیکھے۔ لفافے پر کراچی کی مہر تھی۔ وہ اس شہر میں کہیں روپوش ہے لیکن اتنے بڑے شہر میں اسے تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ جانے خود قاضی نے کتنی بھاگ دوڑ کی ہو گی اس کی تلاش میں۔ آخر میں نے انکل مجید سے مدد لی۔

لفافوں پر جس پوسٹ آفس کی مہر لگی تھی ہم اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے وہ مضافات کا پوسٹ آفس تھا لیکن یہ کوئی حل نہیں تھا مضافات میں لاکھوں کی آبادی تھی۔ ہم نے مضافات میں بار بار اعلان کروایا۔ ملیر کے علاقے میں ہر اسکول چھان مارا کوئی رومان قاضی مل جائے لیکن اس نام کا کوئی لڑکا نہیں ملا۔ آخر کار ایک نواحی اسکول میں قاضی رومان نامی ایک بچے کا پتا چلا۔ ہزاروں بچے قاضی رومان ہو سکتے تھے۔ بہت عام سا نام تھا لیکن نجانے کیوں میں نے پرنسپل سے کہا کہ اس بچے کی ہسٹری مجھے بتائیں۔ معلوم ہوا کہ اس کا باپ مر چکا ہے اور ماں ایک سلائی کڑھائی کے ادارے میں کام کرتی ہے۔ میں نے اس کی ماں سے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔

میں اس ادارے میں پہنچی اور ایک ہی نظر میں پہچان گئی کہ وہ فرحانہ ہے۔ تکلیف دہ حالات کے سبب قاضی کے پاس موجود اس کی تصویر سے اس کے خدوخال تبدیل ہو گئے تھے۔ فرحانہ کو میں نے بہت جلد اپنا دوست بنا لیا۔ یہاں فرحانہ نے اپنا نام بدل لیا تھا اور پروین کہلاتی تھی۔ وہ جس طبقے میں رہ رہی تھی قاضی زندگی بھر اسے ڈھونڈ نہیں سکتا تھا۔ یہ تو میں عورت تھی اور ماہر نفسیات بھی دوسرے میرے دماغ میں اس خاندان کی فلاح کا سودا سمایا ہوا تھا۔ میں ایک تجربہ کرنا چاہتی تھی۔ میں قدرت کی اس کڑی سزا پر اور قاضی کی ابتر حالت سے بہت متاثر تھی۔ اس کو بہت سزا مل چکی تھی اپنی جوانی کے بہترین ایام اس نے

سلگ سلگ کر گزار دیے تھے۔ وہ فرحانہ اور رومان کے لیے کیسے کیسے نہیں تڑپا تھا۔ سیاہ ڈائری میں موجود رومان کی تصویر پر اس کے بے شمار بوسوں کے نشان ثبت تھے وہ اس تصویر کی پرستش کیا کرتا تھا۔

فرحانہ نے اسے بہلانے کے لیے جو سامان کیا تھا رومان کی تصویر بھیج کر وہی اس کی تلاش کا اہم ذریعہ بن گیا تھا۔ آخر کار میں نے فرحانہ کا اعتماد حاصل کر لیا اور اسے اپنے کلینک میں لے آئی۔ میرے کلینک کے ڈارک روم میں اس کی وہ تصویر انلارج کی ہوئی لگی ہوئی تھی جس میں وہ دلہن کے روپ میں قاضی فرمان کے ساتھ تھی۔ دوسری جانب وہ تصاویر بھی بڑی بڑی لگی تھیں جو اس نے قاضی کو بھیجی تھیں۔ میں نے ایک ماہر نفسیات کی سوچ کے مطابق یہ انتظام پہلے ہی کر لیا تھا۔ میں نے اسے کچھ نہیں کہا بلکہ باتیں کرتے کرتے اسے اپنے ڈارک روم میں لے آئی۔

"یہ... یہ کیا ہے؟ کس کی تصویر ہے یہ۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا اور سانس کی رفتار معمول سے کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔ میں نے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے دیکھے۔ میں نے نارمل انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"پروین! اس دلہن کی شکل تم سے کس قدر ملتی ہے۔"

"ہاں مگر یہ تصویر آپ کے پاس کہاں سے آئی ہے؟ کس نے دی ہے؟"

"ارے یہ میرے ایک مریض نے دی ہے۔ بے چارہ پاگل ہو گیا ہے حواس کھو بیٹھا ہے۔"

"کون ہے وہ؟" اس نے تجسس اور اشتیاق سے پوچھا۔

"کیا کرو گی اس کی کہانی سن کر۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "بڑی درد بھری کہانی ہے یہ جو کم بخت عورت ہے اس نے اسے پاگل کر دیا ہے۔"

"کون کہتا ہے۔" وہ جوش سے بولی۔ لیکن اپنی غلطی کا احساس کرتے ہی فوراً خاموش ہو گئی۔

"تم تو اس عورت کی ایسے طرف داری کر رہی ہو جیسے یہ واقعی تمہارا شوہر ہو۔" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ وہ چپ رہی۔ مگر اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔ میں دوسرے موضوعات پر اس سے بات کرنے لگی۔ اپنی اندرونی کشمکش کے باعث وہ بار بار پہلو بدلتی رہی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ میں داستان خود فرحانہ کی زبانی سننا چاہتی تھی۔

"پروین کیا تمہیں اس بات پر حیرت نہیں ہو رہی ہے کہ یہ تصویر واقعی تمہاری لگ رہی ہے مگر تم تو پروین ہو اور یہ تصویر تو فرحانہ کی ہے۔"

"فرحانہ۔" وہ یہ نام سن کر حیرت سے اچھل پڑی۔

"کیوں تم فرحانہ کو جانتی ہو؟"

"ہاں وہ آنکھوں میں آنسو لا کر بولی اور پھر ایک دم مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

"مجھے بتائیے آپ کا مریض کہاں ہے۔ کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں۔ میں ہی فرحانہ ہوں۔ میں ہی فرحانہ ہوں۔" وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔

"مگر وہ تو بالکل پاگل ہو چکے ہیں کسی کو نہیں پہچانتے، وہ اس حد تک پاگل ہیں کہ اپنا نام اور اپنی شخصیت تک بھول گئے ہیں وہ کسی قاضی عدنان کو اپنی پہچان سمجھتے ہیں۔ یہ قاضی عدنان شاید ان کا بھائی تھا اور وہ کسی اقراء کو پکارتے ہیں۔"

"تو تم قاضی فرمان کی بیوی ہو۔"

"ہاں میری کہانی سن لیجیے۔" اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور اپنی پوری داستان جو مجھے پہلے سے معلوم تھی سنا ڈالی۔

"آپ ایک عورت ہیں جانتی ہوں گی کہ آخری چارے کے طور پر عورت ہوتے ہوئے میں کیا کر سکتی تھی۔ اس نے میری طرف بے چارگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا فرحانہ! تمہارا انتقام تو پورا ہو گیا۔ فرمان نے برسوں اس کی سزا بھگتی ہے۔ تمہارے سسرال والوں نے تم پر ظلم کر کے بڑا عذاب اٹھایا ہے لیکن تم یہ سوچو کہ تم نے اپنے بچے پر بھی ظلم کیا ہے اسے اپنے باپ سے محروم رکھا ہے۔ جو بچہ باپ کے زیر سایہ نہیں پلتا وہ بھٹک جاتا ہے۔ اس کی شخصیت محرومی کا شکار ہو جاتی ہے۔"

"لیکن میرا بچہ بڑی مضبوط شخصیت کا مالک ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن باپ کے ہوتے ہوئے وہ باپ کی شفقت سے محروم ہے۔"

"اب کیا کروں فرمان کسی کو نہیں پہچان رہے ہیں۔ میرا انتقام تو بے کار ہو گیا ہے۔" وہ رنجیدہ سی ہو کر بولی۔

"ہم فرمان کا علاج کر رہے ہیں۔ تم اپنی ضد چھوڑ دو اور ہماری مدد کرو۔ تمہیں بھی گھنے سائے کی ضرورت ہے اور رومان کو بھی۔ فرمان کو ان کے کیے کی بڑی سزا مل چکی ہے۔ خدا بھی توبہ کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہے۔ لو یہ ڈائری۔" میں نے اسے قاضی کی ڈائری دیتے ہوئے کہا۔ "اسے سکون سے پڑھنا اور مجھے اپنا فیصلہ بتا دینا۔

فرمان نے فرحانہ کو نہیں پہچانا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ پرانی باتیں دہرائے۔ وہ عجیب جذبے سے فرمان کے سامنے گئے دنوں کی ایک ایک بات دہراتی رہی۔ یہاں تک کہ شادی کے بعد کے تلخ دن آ گئے۔ فرمان اس کی باتیں بے دھیانی سے سن رہے تھے کہ اچانک میں رومان کو لے کر کمرے میں آ گئی۔ رومان کو بتا دیا گیا تھا کہ تمہارا باپ زندہ ہے۔ وہ ابو ابو کہتا ہوا فرمان سے لپٹ گیا۔ فرمان کے حواس ٹھیک کام کر رہے تھے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں یہی حالت فرحانہ کی تھی۔ میں انہیں کمرے میں تنہا چھوڑ کر باہر نکل آئی۔

قاضی فرمان اب بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں اور نفسیات کے قائل ہو چکے ہیں۔ انہیں ان کی زندگی بھر کا سرمایہ مل چکا ہے۔ کیا اس باب میں یہ بتانا ضروری ہے کہ قاضی نے دوہری شخصیت اختیار نہیں کی تھی۔ بلکہ وقتی طور پر نروس بریک ڈاؤن کی حالت میں انہوں نے قاضی عدنان اور اقراء کا تذکرہ کیا تھا۔ میں نے بعد میں اس بات کو فرحانہ کو فرمان کی غلطی معاف کرنے کے لیے استعمال کیا اور قاضی تو پہلے ہی ٹریٹمنٹ میں ٹھیک ہو گئے تھے۔ البتہ جو کچھ کیا گیا وہ فرحانہ کے لیے تھا اور آج فرحانہ، فرمان اور رومان دنیا کے خوش قسمت خاندان کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔

✲ ✲

غور و فکر

حکمت

حکیم لقمان سے کسی نے پوچھا۔
"حکمت کس سے سیکھی؟"

جواب ملا: "اندھوں سے...... وہ پہلے زمین کو اچھی طرح ٹٹول لیتے ہیں تب آگے بڑھتے ہیں۔"

توبہ

جو انسان جتنا مؤثر ہوگا اس کا گناہ اتنا ہی بڑا ہوگا۔ ہم اپنے گناہوں کو حلقۂ تاثیر میں سند بنا دیتے ہیں اور یوں ہم زیادہ مستحق ہو جاتے ہیں۔ اگر توبہ برملا نہ ہو تو برملا گناہ معاف نہیں ہوتا۔ جتنے بڑے ہجوم میں جھوٹ بولا گیا ہو اتنا ہی بڑا جھوٹ ہوتا ہے اور اس کے لیے اتنی ہی بڑی سزا ہے۔ اس سے نجات کا واحد راستہ یہ ہے کہ اتنے ہی بڑے ہجوم میں توبہ کی جائے یا آئندہ ہجوم کے سامنے آنے سے توبہ کی جائے۔

(اقتباس۔ قطرہ قطرہ قلزم)

کرب

عاطر شاہین

عورت کو عموماً ہمارے معاشرے میں کمزور اور بزدل سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اسے صنف نازک بھی کہتے ہیں، جو اپنے ساتھ ہونے والے مظالم پر سوائے صبر اور آنسو بہانے کے کچھ نہیں کرتی۔ یہ کہانی اس ساچ اور نظریے کا جواب ہے۔

اس شمارے کی حساس و جذباتی و دل گداز کہانی

کار کے ہارن کی آواز سنتے ہی عروج کمرے سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے دروازہ کھول کر جیسے ہی عدنان اور اس کے ساتھ کھڑے نوجوان کو دیکھا تو ایک لمحے کے لیے اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اگر فوراً" دروازہ نہ پکڑ لیا ہوتا تو وہ یقیناً" حواس باختہ ہو کر گر جاتی۔ اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"جہانگیر... تمہاری بھابھی تو تمہارے استقبال کے لیے پہلے سے دروازے پر موجود ہے۔" عدنان نے مسکراتے ہوئے اس نوجوان سے کہا۔ جہانگیر کے بشرے پر خفیف سی مسکراہٹ رینگ گئی۔

"السلام علیکم بھابھی...!" جہانگیر نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

"وعلیکم السلام...!" عروج کے منہ سے بامشکل نکلا پھر وہ دروازے سے ہٹ گئی۔ عدنان، جہانگیر کو اندر لے آیا۔ عروج، جہانگیر کو اپنے گھر میں دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ یہاں تک آجائے گا۔"

"عروج... اس سے ملو۔" عدنان نے کہا۔ "یہ میرا بچپن کا دوست جہانگیر ہے۔ موصوف پچھلے دو دنوں سے اس شہر میں آئے ہوئے ہیں اور ہوٹل میں رہ رہے ہیں۔" پھر وہ جہانگیر سے بولا۔ "جہانگیر... تم منہ ہاتھ دھولو... کھانا تیار ہے۔ تمہاری بھابھی کھانا بہت اچھا بناتی ہیں... کھاؤ گے تو انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے۔"

"واقعی..." جہانگیر نے کہا۔ "اوکے۔ میں ابھی منہ ہاتھ دھو کر آیا..."

جہانگیر باتھ روم میں گھس گیا جبکہ کھانا لگانے کے لیے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

عدنان سے اس کی شادی کو ابھی چار ماہ ہی ہوئے تھے۔ عدنان ایک اچھا، انتہائی خوش مزاج اور عروج سے بے حد محبت کرنے والا انسان تھا۔ عدنان ایک فوٹو گرافر تھا، اس کا اپنا بزنس تھا۔ عروج، عدنان کے ساتھ آسودہ حال زندگی گزار رہی تھی۔ عدنان کا اس دنیا میں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی ایک دو کمرے کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ عدنان ایک قبول صورت نوجوان تھا، اس میں ایسی کوئی کشش نہ تھی کہ لڑکیاں اس کی طرف دیکھتیں مگر وہ عروج کو بہت پسند تھا۔

عروج کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا، اس کے والد صابن بنانے والی فیکٹری میں ملازم تھے۔ اس کی

ماں مر چکی تھی۔ جہانگیر کو دیکھ کر اس کے چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ جہانگیر کو جانتی تھی۔ جہانگیر اسی کے محلے میں رہتا تھا۔ وہ اس وقت بی اے کی طالبہ تھی، جب اس نے جہانگیر کو دیکھا تھا۔ وہ جب بھی کالج جانے کے لیے گھر سے نکلتی تو جہانگیر دوسری گلی میں موجود ہوتا تھا۔ پھر ایک دن اس نے عروج کو خط لکھ دیا، جس میں جہانگیر نے اظہار محبت کیا تھا، اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ عروج بھی جہانگیر کو خطوط لکھنے لگی۔ جہانگیر نے عروج کے لیے اپنا رشتہ بھیجا تھا مگر عروج کے والد نے انکار کر دیا تھا کیوں کہ جہانگیر ایک آوارہ اور اوباش نوجوان تھا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا اچھے لوگوں میں نہیں تھا۔ وہ کوئی بھی کام نہ کرتا تھا۔ عروج نے دبے دبے انداز میں احتجاج بھی کیا تھا مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر وہ دن بھی آگیا، جب عروج کی عدنان کے ساتھ شادی ہو گئی۔ عروج کے لیے رشتے تو بہت آئے تھے اور یہ اس کی خوش بختی ہی تھی کہ سبھی اونچے اور متمول گھرانوں کے رشتے تھے۔ جو رشتہ عروج کے والد کو پسند آیا تھا، وہ عدنان کا تھا۔ عروج، جہانگیر کو بھول کر اپنے شوہر عدنان کے ساتھ خوش رہنے لگی، اسے خود پر ناز بھی تھا کہ وہ ایک متمول آدمی کی بیوی تھی اور شوہر بھی ایسا ملا تھا، جو اسے بہت چاہتا تھا۔

عروج خواب ناک زندگی میں مگن تھی کہ یکایک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ طوفان میں گھر گئی ہو۔ کیوں کہ جہانگیر کا یہاں آنا کسی بھی لحاظ سے درست نہ تھا۔ شادی کے بعد عروج اپنے شوہر عدنان کی ساتھ فیصل آباد سے لاہور آگئی تھی۔

کھانے کھانے کے بعد جہانگیر نے عدنان سے کہا۔ یار عدنان... واقعی بھابھی نے کھانا تو بہت مزے دار بنایا

ہے۔۔۔ تم خوش نصیب ہو۔"

"ہاں واقعی۔۔۔" عدنان نے ستائشی نظروں سے عروج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ عروج کے چہرے پر کسی بھی قسم کا کوئی تاثر نہ تھا۔ وہ اٹھی اور برتن سمیٹنے لگی۔ برتن سمیٹنے کے بعد وہ جب اپنے کمرے میں جانے لگی تو عدنان نے پوچھا۔

"عروج۔۔۔ کہاں جارہی ہو۔۔۔ ارے بیٹھو ناں۔"

"میں اپنے کمرے میں جارہی ہوں۔"

"خیریت تو ہے ناں؟"

"میری طبیعت خراب ہے۔" اتنا کہہ کر عروج اپنے کمرے میں آگئی۔

☼ ☼ ☼

دوسری صبح جب عدنان اپنے دفتر چلا گیا تو تھوڑی دیر کے بعد جہانگیر اس کے کمرے میں آگیا۔

"تم۔۔۔" عروج غصے سے بولی۔ "تمہیں میرے کمرے میں آنے کی جرات کیوں ہوئی ہے؟"

"عروج۔۔۔ فکر مت کرو۔ عدنان دفتر جاچکا ہے۔"

"پھر تم کس لیے آئے ہو؟"

جہانگیر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں شادی کی مبارک باد دینے آیا ہوں۔۔۔ تم مجھے بھول چکی ہو عروج مگر میں تمہیں نہیں بھلا سکا۔۔۔ میں آج بھی تمہارے فراق میں جل رہا ہوں۔"

عروج کے حسین چہرے پر غصے کے تاثرات چھا گئے۔ وہ برانگیختگی سے بولی۔ "بکواس مت کرو اور میرے کمرے سے نکل جاؤ۔ ورنہ تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔"

"تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی ہو عروج۔" جہانگیر قہقہہ مار کر بولا۔ "تمہیں وہ اپنے پیار بھرے خطوط تو یاد ہوں گے، جو تم نے کالج کے زمانے میں مجھے لکھے تھے۔"

"کیا مطلب؟" وہ لرزیدہ لہجے میں بولی، اس کا دماغ سن ہونے لگا۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئی تھیں۔ ان جانے اندیشے اس کے دل میں کسمسانے لگے۔

"اگر میں وہ خطوط تمہارے شوہر عدنان کے حوالے کردوں تو جانتی ہو کیا ہوگا۔۔۔؟" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

عروج نے کوئی جواب نہ دیا، اس کا جسم سنسنا گیا تھا، ایک سرد سی لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی، جس سے اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی۔

"تم چاہتے کیا ہو؟ کیوں میری ازدواجی زندگی برباد کرنے پر تل گئے ہو؟"

"عروج اگر تم چاہتی ہو کہ میں وہ خطوط عدنان کے حوالے نہ کروں تو تم مجھے ہر مہینے دس ہزار روپے دیتی رہو۔"

"کیا۔۔۔ دس ہزار۔۔۔" عروج سٹپٹا گئی۔ "مگر میرے لیے تو یہ ناممکن ہے۔"

"کیسے ناممکن ہے؟ تمہارا شوہر بہت امیر ہے، تم ہر مہینے باآسانی دس ہزار دے سکتی ہو۔"

"جہانگیر، میرا شوہر انتہائی شریف آدمی ہے، میں اسے دھوکہ نہیں دے سکتی۔"

"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"ہاں۔۔۔"

"تو پھر میں وہ خطوط جلد ہی عدنان کے حوالے کردوں گا۔"

یہ سن کر عروج کا دل دہل گیا تاہم اس نے دھیرے سے کہا۔ "وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا جہانگیر۔"

"زیادہ جذباتی مت ہو عروج۔" جہانگیر اٹھتے ہوئے بولا۔ "تم اچھی طرح سوچ لو، پھر اپنے فیصلے سے مجھے آگاہ کرنا۔"

عروج نے کوئی جواب نہ دیا۔ جہانگیر چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر عروج کے کمرے سے نکل گیا۔ عروج کے جسم پر ہلکا ہلکا لرزہ طاری تھا۔ وہ متوحش ہو رہی تھی، اسے یہ قلق تھا کہ کہیں جہانگیر اس کے لکھے ہوئے خطوط عدنان کے حوالے نہ کردے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اپنی پر آسائش زندگی کو کیسے بچائے۔ اب اس کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو خودکشی کرلے یا جہانگیر

کو قتل کردے لیکن دونوں کام اس کے لیے آسان نہ تھے۔ وہ اس منحوس لمحے کو کوس رہی تھی، جب اس کی ملاقات جہانگیر سے ہوئی تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے جہانگیر کے خطوط کے جواب کیوں دیئے تھے۔ وہ یہ نہ جانتی تھی کہ جہانگیر اس قدر گھٹیا شخص نکلے گا کہ اسے بلیک میل کرنے پر تل جائے گا۔

☼ ☼ ☼

عروج کو کیا معلوم تھا کہ جہانگیر اس کے شوہر عدنان کا دوست ہوگا۔ یہ بات تو اس دن ہی اس پر عیاں ہوئی تھی، جب جہانگیر ان کے گھر آیا تھا۔ دو دن ہوگئے تھے، جہانگیر ان کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ یہاں سے جانے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ عدنان نے بھی محسوس کیا تھا کہ عروج کچھ پریشان اور کھوئی سی ہے۔ وہ انگشت بدنداں تھا کہ یکدم عروج کو کیا ہوگیا ہے۔ ایک دو بار عدنان نے عروج سے پوچھنے کی کوشش بھی کی تھی مگر عروج ہر بار ٹال دیتی تھی۔ اس دن جہانگیر کسی کام کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا، اس لیے دفتر سے آتے ہی عدنان نے عروج سے محبت سے پوچھا۔

"عروج۔۔۔ کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

"یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" عروج حیرانی سے بولی۔

"اس لیے کہ میں گزشتہ دو دن سے تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے تمہیں کوئی فکر لاحق ہو گئی ہو۔ تم بیٹھے بیٹھے کہیں کھو جاتی ہو۔ مجھ سے تمہاری یہ پریشانی دیکھی نہیں جارہی۔ آخر بات کیا ہے جس نے تمہیں بہت پریشان کر رکھا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ہے۔" عروج نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "شاید آپ کو وہم ہوگیا ہے۔"

"تمہارا یہ جواب میرے لیے باعث اطمینان نہیں ہے۔" عدنان نے کہا۔ "بتاؤ کیا بات ہے؟"

"دراصل۔۔۔ مجھے ابو کی بہت یاد آرہی ہے۔" اس نے بہانہ بنایا۔

"تو پھر اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے؟" عدنان نے متبسم لہجے میں کہا۔ "عنقریب ہم فیصل آباد چلیں گے۔"

عروج نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا۔

☼ ☼ ☼

جہانگیر زخمی سانپ کی مانند اپنے کمرے میں بستر پر لوٹ رہا تھا۔ اسے عروج پر بے حد غصہ آرہا تھا۔ اس نے عروج سے خطوط کے بدلے ہر مہینے دس ہزار کی بات کی تھی مگر عروج نے اس کا مطالبہ ماننے سے انکار کردیا تھا۔ اب اس کے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ عروج کے لکھے ہوئے خطوط عدنان کے حوالے کردے مگر اس کا کچھ بھی فائدہ نہ تھا کیوں کہ وہ اسے خودکشی کی دھمکی دے چکی تھی اور اپنی اس دھمکی پر عمل بھی کر سکتی تھی۔ جہانگیر ایسا نہ چاہتا تھا کیوں کہ عروج کی خودکشی کرنے کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔ اس کا مقصد کچھ اور تھا۔

شام کی چائے پینے کے دوران عدنان نے جہانگیر سے کہا۔

"جہانگیر۔۔۔ میں کل اسلام آباد فوٹوگرافی کے لیے جارہا ہوں، تم بھی چلو۔"

"کیا بھابھی نہیں جارہی ہیں؟" اس نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

"تمہاری بھابھی بھی جارہی ہے۔" عدنان نے عروج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھر تو میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔"

"کیوں؟"

"میں نہیں چاہتا کہ تم دونوں کی تفریح میں مخل ہوں۔"

"ارے یار۔ ایسی کوئی بات بھی نہیں ہے۔" عدنان نے ہنس کر کہا۔ پھر اس نے عروج کی طرف دیکھا۔ "تم کہو ناں، جہانگیر سے۔ یہ ہمارے ساتھ اسلام آباد چلے تمہاری بات ضرور مانے گا۔"

عروج ایکاایکی گھبرا گئی۔ اس کی زبان گنگ ہوگئی تھی، تاہم اس نے بامشکل تمام کہا۔

"او کے۔ اب انکار نہیں کیا جا سکتا۔" جہانگیر نے ہتھیار ڈال دیے۔ اگلے ہی لمحے عدنان نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ عروج سے اب بیٹھنا دشوار ہو رہا تھا' اس لیے وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آگئی' اسے جہانگیر کا اسلام آباد ساتھ جانا بالکل بھی پسند نہ تھا مگر وہ اپنے شوہر کے آگے مجبور تھی' وہ تو جہانگیر سے بات تک نہ کرنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن وہ اسلام آباد چلے گئے۔ عدنان نے اسلام آباد میں فوٹو گرافی کرنا تھی۔ اسلام آباد میں ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی اور اس نے **عکسبندی** کے دوران تصاویر بنانی تھیں' اسے بہت ہی معقول معاوضہ ملنا تھا۔ مختلف رسائل والے بھی اس سے ماڈلنگ کے دوران تصاویر بنوانے کے لیے رابطہ کرتے رہتے تھے۔ اس کی مانگ بہت تھی کیوں کہ وہ فوٹو گرافی بہت اچھی کرتا تھا۔ اسلام آباد میں بھی عدنان کا ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا' وہ جب بھی اسلام آباد آتا تھا' تو اسی فلیٹ میں ٹھہرتا تھا۔ جہانگیر کا ان کے ساتھ ہونا عروج کو عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ جہاں بھی تفریح کے لیے جاتے تھے' جہانگیر ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ انہیں اسلام آباد آئے دو دن ہی ہوئے تھے' ابھی عدنان کا کام شروع نہیں ہوا تھا' پھر جب عدنان کا کام شروع ہوا تو جہانگیر دانستہ عدنان کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ وہ کوئی بھی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ پھر اس کے دماغ میں جو منصوبہ پرورش پا رہا تھا' اس کے مطابق اس کا عدنان کے ساتھ ہر لمحہ ہونا ضروری تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا' موقع ملتے ہی وہ اپنے منصوبے پر عمل در آمد کر دے گا۔

انہیں اسلام آباد میں آئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ فلم کی شوٹنگ بھی ختم ہو چکی تھی۔ عدنان اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اس دن دوپہر کے دو بج رہے تھے' وہ تینوں سیر کے لیے پہاڑی مقام کی طرف نکل پڑے' مسلسل دو گھنٹے وہ پہاڑی علاقے میں گھومتے رہے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ بلند و بالا پہاڑ انتہائی خوب صورت اور قدرت کا حسین شاہکار لگ رہے تھے' عدنان نے چند ایک مناظر اپنے کیمرے میں قید کر لیے تھے۔ چلتے چلتے عروج بہت تھک چکی تھی اس لیے وہ نڈھال ہو کر ایک جگہ بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا عروج...؟" عدنان اس کے قریب آیا۔

"میں بہت تھک چکی ہوں۔" عروج نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے مزید نہیں چلا جا رہا۔"

"بس تھوڑے سے قدرتی مناظر کیمرے میں قید کرتے ہیں۔" عدنان نے کہا۔

"پلیز عدنان۔ آپ تصویریں بنا لیں۔" عروج لجاجت سے بولی۔ "میں یہاں بیٹھی ہوں۔"

"او کے... کہیں جانا نہیں۔"

پھر وہ جہانگیر کے ہمراہ قرب و جوار کے مناظر کیمرے میں قید کرنے لگا۔ تصویریں بناتے بناتے وہ دونوں بہت دور نکل آئے۔

"جہانگیر۔ دیکھو' کتنی حسین اور دلکش جگہ ہے۔" عدنان نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں ذرا اس جگہ کی تصویر بنا لوں۔"

پھر عدنان تصویر بنانے لگا۔ جس جگہ عدنان کھڑا تھا' اس سے آگے بہت ہی گہری کھائی تھی جس میں سنگلاخ چٹانیں منہ کھولے کھڑی تھیں اور یہی وہ لمحہ تھا' جب جہانگیر اپنے منصوبے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اچانک جہانگیر نے عدنان کو دھکا دے دیا۔ عدنان چیختا ہوا اس گہری کھائی میں گرتا چلا گیا۔ آہستہ آہستہ اس کی چیخیں معدوم ہوتی چلی گئیں۔ جہانگیر چند ثانیے وہاں کھڑا رہا' اس کے بشرے پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ عدنان کو قتل کرنے کے بعد وہ عروج سے شادی کر کے اس کی دولت ہتھیانا چاہتا تھا۔ عدنان کی موت کے بعد اس کی ساری دولت کی وارث عروج ہی تھی۔ وہ واپس پلٹا اور اس طرف دوڑنے لگا' جس طرف عروج بیٹھی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

عروج کو وہاں بیٹھے کافی دیر ہو گئی تھی مگر عدنان واپس نہ آیا تھا۔ انہیں آج رات واپس لاہور جانا تھا۔ ابھی اسے سامان بھی پیک کرنا تھا۔ کافی دیر بیٹھنے کے بعد وہ اکتا گئی اور اٹھ کر اس طرف چل پڑی' جس طرف عدنان' جہانگیر کے ساتھ گیا تھا۔ ابھی وہ تھوڑے ہی فاصلے پر گئی تھی کہ اسے دور سے جہانگیر دوڑتا ہوا نظر آیا۔ ایکا ایکی عروج گھبرا گئی۔ ایک انجان سا واہمہ اس کے دل میں آیا کیوں کہ جہانگیر کے دوڑنے کا انداز ایسا تھا' جیسے کچھ ہو گیا ہو۔ وہ مختل حواس ہو رہا تھا۔ قریب پہنچتے ہی جہانگیر نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"عروج... وہ... وہ عدنان۔"

"کیا ہوا عدنان کو... کہاں ہے عدنان..." عروج متوحش لہجے میں بولی' اس کے حواس بگڑ رہے تھے۔

"وہ... وہ تصویریں بناتے ہوئے پہاڑ سے گر گیا ہے۔"

"کیا..."

عروج کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آنے لگا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس طرف دوڑ پڑی' جس طرف جہانگیر نے اشارہ کیا تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس جگہ پہنچ کر عروج نے کھائی میں جھانکا' پھر وہ دائیں ہاتھ پر بنی سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ نیچے پہنچ کر جیسے ہی اس کی نظر عدنان کی لاش پر پڑی تو ایک دل خراش سی چیخ اس کے حلق سے نکل گئی۔ عدنان خون میں لت پت اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ عروج چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ یہ صدمہ عروج کے لیے جانکاہ تھا' عدنان کا کیمرہ بھی اس کے قریب پڑا ہوا تھا۔ عروج نے وہ کیمرہ اٹھا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہاں پولیس آئی اور عدنان کی لاش لے گئی۔ عروج غم سے نڈھال تھی' جہانگیر اسے فلیٹ میں لے آیا۔

"میں نے عدنان کو منع بھی کیا تھا کہ وہ چوٹی پر کھڑا ہو کر تصویریں نہ بنائے۔" جہانگیر افسردہ لہجے میں بولا۔ "مگر اس نے میری بات نہیں مانی۔ کاش وہ میری بات مان جاتا۔"

عروج خاموش رہی' یہ اندوہناک صدمہ اس کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پولیس نے بھی اسے ایک حادثہ قرار دے دیا تھا۔ وہ عدنان کی میت لے کر لاہور آگئی تھی۔ اس دوران جہانگیر نے اس کے قریب ہونے کی کوشش کی تھی مگر عروج نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کیوں کہ اب عدنان زندہ نہ تھا لہٰذا اب اسے اپنے ان خطوط کی پروا نہیں تھی' جس کے بل بوتے پر وہ اسے بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ ایک مہینہ وہ عدنان کی موت کے غم میں نڈھال رہی' پھر جب وہ سنبھلی تو اس نے دفتر جانا شروع کر دیا۔ اب وہ عدنان کی موت کے بعد اس کی دولت کی حق دار تھی ایک دن اسے وہ کیمرہ یاد آگیا جس سے اس کے شوہر نے آخری تصویریں بنائی تھیں' اس نے اس کیمرے سے فلم نکالی اور لیبارٹری میں تصویریں دھونے لگی وہ کل بارہ تصویریں تھیں۔ جب وہ تصویریں دھو چکی تو وہ ان تصویروں کو دیکھنے لگی' جو اس کے مرحوم شوہر کی آخری نشانی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے' تصویریں نہایت خوب صورتی کے ساتھ بنائی گئی تھیں۔ اچانک ایک تصویر دیکھتے ہی وہ اچھل پڑی۔ وہ تصویر جہانگیر کی تھی' جس میں جہانگیر جھک کر نیچے دیکھ رہا تھا۔ تصویر بالکل فوکس تھی' اس نے تصویر میں وہی کپڑے پہنے ہوئے تھے' جس دن اسلام آباد میں اس کا شوہر عدنان پہاڑ سے کھائی میں گر گیا تھا۔ اس دن بھی جہانگیر نے تصویر والے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اگلے ہی لمحے یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ کہیں جہانگیر نے تو اس کے شوہر عدنان کو دھکا نہیں دیا تھا کیوں کہ تصویر ایسے زاویے سے بنی ہوئی تھی کہ ایسا لگتا تھا کہ جیسے تصویر بنانے والا نیچے موجود ہو۔ تصویر میں جہانگیر کے چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی' اس کا چہرہ چٹان کی مانند سخت ہو رہا تھا۔ ساری بات اس کی سمجھ میں آچکی تھی مگر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو چکی تھی کہ جہانگیر نے اسے دھکا جان بوجھ کر دیا تھا یا عدنان اتفاقی طور پر گر گیا تھا۔ پولیس اسے اتفاقی حادثہ قرار دے چکی تھی مگر جہانگیر کی تصویر دیکھنے کے بعد

اسے قطعی یقین ہو گیا تھا کہ جہانگیر نے کسی مقصد کے تحت ہی عدنان کو مارا تھا۔ جہانگیر کے خلاف ایک نفرت کی چنگاری اس کے وجود میں بھڑکی' اس کے دماغ میں لاوا ابل رہا تھا' اسے جہانگیر پر تاؤ آ رہا تھا۔ شام کو وہ تصویر اور نیگیٹو لے کر اپنے فلیٹ پہنچی ہی تھی کہ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ عروج نے ریسیور اٹھا کر گمبھیر لہجے میں کہا۔ "ہیلو۔"

دوسری طرف جہانگیر تھا۔ "عروج... کیسی ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ کیا تم اس وقت میرے فلیٹ میں آسکتے ہو؟"

"خیریت!" جہانگیر نے حیران کن لہجے میں پوچھا۔

"تم سے مشورہ کرنا ہے۔"

"کیسا مشورہ؟"

"آؤ گے تو بات ہو گی۔" عروج نے کہا۔ "عدنان نے جو جائیداد چھوڑی ہے' اس کے بارے میں مشورہ کرنا ہے۔"

"او کے... میں ابھی آ رہا ہوں۔"

ریسیور رکھ کر عروج کے چہرے پر ایک گمبھیر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اپنے مرحوم شوہر کی المناک موت کا جہانگیر سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور یہ تب ممکن تھا جب جہانگیر کو وہ اپنی محبت بھری باتوں سے پھنسائے' آدھے گھنٹے کے بعد ہی جہانگیر اس کے فلیٹ میں پہنچ گیا۔ عروج نے اس کا خوش گوار موڈ میں استقبال کیا۔ جہانگیر سرشار ہوتا جا رہا تھا۔ عروج اسے اپنے بیڈ روم میں لے گئی۔

"عروج... میں حیرت زدہ ہوں کہ تمہارے اندر یکدم تبدیلی..." وہ سٹپٹا کر بولا۔

"جہانگیر۔ میں اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئی ہوں۔" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ "آخر کب تک میں تنہا رہ سکتی ہوں' کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت تو مجھے ضرور پڑے گی۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اب تم سے شادی کر لوں۔"

"کیا واقعی..." جہانگیر جھوم اٹھا۔ "کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔" عروج نے لجاجت سے کہا۔

"آخر اتنی ساری دولت کا میں اکیلے کیا کروں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ میں یہ ساری دولت تمہارے حوالے کر دوں... مگر۔"

"مگر کیا...؟" جہانگیر نے پہلو بدلا' اس کی خوشی دیدنی تھی۔

"مگر..." عروج ایک لمحے کے لیے رکی' پھر پھنکارتے ہوئے بولی۔ "تمہاری موت کے بعد..."

اگلے ہی لمحے عروج نے پلک جھپکنے سے پہلے پہلو سے ریوالور نکال کر جہانگیر پر تان لیا۔ جہانگیر حواس باختہ ہو گیا' اس کا چہرہ متغیر ہونے لگا۔ آنکھوں میں موت کے سائے لہرانے لگے۔ وہ شوریدگی سے بولا۔

"یہ... یہ کیا ہے عروج۔ اسے ہٹالو۔"

"یہ تصویر دیکھو۔" عروج ناگن کی مانند پھنکاری' اس نے میز پر سے اس کی تصویر اٹھا کر اس کے منہ پر دے ماری۔ جب جہانگیر نے تصویر دیکھی تو اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

"یہ تصویر تو مم... مم... میری ہے۔"

"تم نے ہی میرے شوہر عدنان کو مارا ہے' تم ہی اس کے قاتل ہو۔" عروج پھنکاری۔ "میں آج تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی خبیث انسان... تم نے میری ہستی زندہ تباہ کر دی ہے۔"

"عروج... مم... میری... بب... بات تو سنو۔"

"شٹ اپ۔" عروج دہاڑی۔ "میں تمہاری کوئی بات بھی سننا نہیں چاہتی۔"

اس سے پیشتر کہ عروج ٹرائیگر دباتی اسی وقت جہانگیر نے عقاب کی مانند اس کے ریوالور والے ہاتھ پر جھپٹا مارا تو ریوالور عروج کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ عروج کے حلق سے چیخ نکل گئی' جہانگیر نے عروج کو پکڑ لیا اور وحشت بھرے لہجے میں بولا۔

"مجھے پہلے ہی خدشہ تھا کہ تم یقیناً" چال چل رہی ہو۔ ہاں عروج۔ میں نے ہی عدنان کو پہاڑ سے دھکا دیا تھا۔ میں نے ہی اسے مارا ہے کیوں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تاکہ میں تمہاری دولت حاصل کر سکوں۔"

عروج کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی' اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ پھر جہانگیر نے اسے چھوڑ کر اپنی تصویر اٹھائی اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگا۔ اچانک حواس باختہ عروج کا ہاتھ گلدان سے ٹکرا گیا اور اس نے وہ گلدان اٹھا لیا۔ جہانگیر اس کے قریب آنے لگا' عروج سخت متوحش تھی۔

"تمہارا زندہ رہنا اب میرے لیے خطرناک ہے عروج۔ اس لیے اب تمہیں بھی مرنا ہو گا۔"

اس نے عروج کی گردن پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھائے ہی تھی کہ عروج نے پشت کی طرف چھپائے گلدان کو اس کے سر پر دے مارا۔ جہانگیر کے حلق سے دلدوز چیخ نکلی اور وہ سر پکڑ کر نیچے بیٹھ گیا' اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ عروج اپنا ریوالور تلاش کرنے لگی مگر نہ جانے اس کا ریوالور کہاں گم ہو گیا تھا۔ جہانگیر بے ہوش ہو چکا تھا' اس کا اس کمرے میں دم گھٹ رہا تھا۔ عروج کمرے سے نکل کر بالکونی میں آگئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی' اس کا خیال تھا کہ جہانگیر مر چکا ہے مگر اچانک اس نے جہانگیر کو دیکھا جو برانگیختگی سے چیختا ہوا اس کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔ اسی وقت عروج خوف زدہ انداز میں ایک طرف ہو گئی اور جہانگیر اپنی ہی شست میں دوڑتا ہوا بالکونی میں لگے جنگلے سے ٹکرایا اور اگلے ہی لمحے وہ اچھلتا ہوا دوسری طرف تین منزلہ عمارت سے نیچے سڑک پر جا گرا' اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی اور وہ مر چکا تھا۔

عروج مضمحل ہو کر بالکونی میں ہی بیٹھ گئی اور بے اختیار رونے لگی۔ عروج کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بوجھ اس کے دماغ سے اتر گیا ہو۔ وہ بالآخر اپنے شوہر کی موت کا انتقام جہانگیر سے لینے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی اور جہانگیر بے نیل و مرام ہی اپنے اندوہناک انجام کو پہنچ گیا تھا مگر عروج کرب میں مبتلا ہو گئی تھی' اسے اپنے مرحوم شوہر عدنان کی بہت زیادہ کمی محسوس ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

❀ گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
❀ نئے بال اگاتا ہے۔
❀ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
❀ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
❀ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت 120/- روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف 120/- روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- 300/- روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- 400/- روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- 800/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

ہمارے معاشرے کی عکاس......ایک دلگداز...... سچی کہانی

غریب شہر

نازش شاہین

میں اس کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا۔ منیر اپنے کام میں مصروف تھا۔ کافی دیر لوگوں کا رش رہا۔ پھر رفتہ رفتہ رش کم ہونے لگا تو منیر مسکراتا ہوا میری طرف آیا۔ مجھے اس کے بدلے ہوئے رویے پر بڑی حیرت ہوئی۔ منیر اور مسکراہٹ! ایک انہونی سی بات تھی۔ وہ بار بار اپنی آنکھیں صاف کررہا تھا جن سے پانی بہ رہا تھا۔

اس شمارے کے لیے ایک حساس وجذباتی ودل گداز سچی کہانی

میری آنکھ کھلی تو گھڑی پر نظر پڑی۔ یہ گھڑی میرے گھر میں نہیں تھی بلکہ میرے گھر کے سامنے حافظ جی کی مٹھائی کی دکان پر لگی ہوئی تھی۔ اس کے ہندسے اور سوئیاں اتنی بڑی تھیں کہ دور سے نظر آتی تھیں۔ میں نے اپنے کیبن نما کمرے میں سے اس گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح کے آٹھ بج چکے تھے۔

''اوہ میرے خدا! اتنی دیر ہوگئی۔'' میں بڑبڑایا۔ ''چوہدری تو مجھے جان سے مار دے گا۔''

چوہدری کا 'دی مال' پر برگر اور فاسٹ فوڈ کا کیب تھا۔ یہ کیبن دوپہر اور رات میں چلتا تھا۔ دوپہر کو مال' کے اطراف دفتروں اور دکانوں میں کام کرنے والے ملازمین چوہدری کے فاسٹ فوڈ کیبن پر لنچ کرنے آتے تھے اور رات میں آؤٹنگ کے لیے نکلنے والے یا لمبی ڈرائیو پر جانے والے وہاں سے برگر' بن کباب اور دوسری اشیا خریدتے تھے۔

میں پہلے اپنا تعارف کرادوں کہ میں کون ہوں اور لاہور کے اس گھٹیا سے علاقے میں ایک کیبن نما گھر میں کیوں رہتا تھا۔ میرے والدین کراچی میں رہتے تھے۔ میرے والد کی ایک سرمایہ کار کمپنی تھی۔ وہ شیئرز کی خرید وفروخت کا کاروبار بھی کرتے تھے اور لوگوں کو چھوٹے بڑے قرض بھی فراہم کرتے تھے۔

اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ میں نے کراچی کے ایک اچھے کالج سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اسلامیہ کالج نام کی یہ درس گاہ کراچی میں بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کے مزار کے قریب واقع ہے۔

میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا مگر اس وقت لاہور میں صرف اس لیے موجود تھا کہ میرے والد نے کئی مرتبہ اس بات کا طعنہ دیا تھا کہ میں ان کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں' اگر وہ میری سرپرستی نہ کریں تو میں بھوکا مر جاؤں۔ مجھے ان کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ آخر کو میں اکیسویں صدی کا نوجوان تھا۔ ایک ایسا نوجوان جو کوئی طعنہ نہیں سن سکتا تھا' چیلنج قبول کرلیتا تھا۔

میرے والد اپنی دانست میں میری اصلاح کرنا چاہتے تھے' اسی لیے انہوں نے میری تربیت کے سلسلے میں تھوڑی بہت سختی کی تھی جو میں برداشت نہ کرسکا اور اسے اپنی عزت کا مسئلہ بنالیا۔ میں نے عہد کرلیا تھا کہ ان کے بغیر رہ کر اور کما کر دکھاؤں گا چنانچہ ایک روز میں نے چپکے سے کراچی چھوڑ دیا اور سیدھا لاہور پہنچا۔ پاکستان میں کراچی کے بعد لاہور ہی دوسرا بڑا' اہم اور صنعتی شہر تھا۔ اسے غریب پرور شہر کہا جاتا تھا۔ یہاں داتا کی نگری تھی۔

لاہور آنے کے بعد میں نے اس شہر میں رہائش کے لیے لاری اڈے کے قریب بادامی باغ نامی علاقے کا ایک ایسا حصہ منتخب کیا جہاں زیادہ تر غریب غربا رہتے تھے۔ انہی کے بے رنگ اور کچے پکے مکانوں میں مجھے کیبن نما ایک کوٹھری مل گئی تھی جس کا کرایہ تین سو روپے ماہوار طے ہوا تھا۔ مجھے چوہدری کے فاسٹ فوڈ سینٹر سے ایک ہزار روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور دو وقت کا کھانا۔ تین سو روپے کرایہ دینے کے بعد میرے پاس سات سو روپے بچتے تھے جس میں روز کا ویگن کا کرایہ بھی ادا کرنا ہوتا تھا۔ چائے پانی سگریٹ میں یہ رقم جلد ختم ہوجاتی تھی اور ہر بار مجھے قرض لینا پڑتا تھا۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ اس اجنبی شہر میں مجھے کون قرض دیتا تھا۔ بات یہ ہے کہ ہر جگہ اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی کو انسان کا ہمدرد اور دوست بنا دیتا ہے۔ جس جگہ میں رہتا تھا' اس کے قریب ہی ماسی سرداراں بھی رہتی تھی۔ جسے مجھ سے بڑی ہمدردی ہوگئی تھی۔ اس دنیا میں اس کا سوائے ایک بیٹی کے اور کوئی نہ تھا۔ فرزانہ باپ کی شفقت سے محروم ہوگئی تھی۔ بھائی کوئی تھا نہیں۔ غرض ماں بیٹی کسی مرد کی عدم موجودگی میں بڑی مشکل زندگی گزار رہی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں بہت جلد ان کے قریب ہوگیا۔ ایک مرد کا ساتھ میسر آنے کے بعد انہیں کچھ حوصلہ سا ہوگیا اور مجھے ان سے بہت سے چھوٹے موٹے فوائد حاصل ہونے لگے۔

فرزانہ کے لیے میرے دل میں پہلے ہی دن سے لطیف جذبات پیدا ہوگئے تھے۔ وہ بھی مجھے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتی تھی۔ وہ لڑکی یہ جانے بغیر کہ میں کون ہوں' کس شہر سے آیا ہوں' کہیں پہلے سے منسوب تو نہیں ہوں' میری طرف بڑھتی چلی گئی۔ وہ یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ وہ میری زندگی میں اہم مقام حاصل کرچکی ہے اور آئندہ میری زندگی کی مستقل ساتھی بنے گی۔ میرے جذبات بھی اس سے مختلف نہ تھے۔ مگر مجھے اس بات کی فکر تھی کہ میرے والدین شادی پر راضی نہ ہوں گے مگر فی الحال کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میرے والدین کراچی میں تھے اور وہ میری اور فرزانہ کی اس محبت سے ناواقف تھے۔ میں ان اپنائیت رکھنے والوں کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔

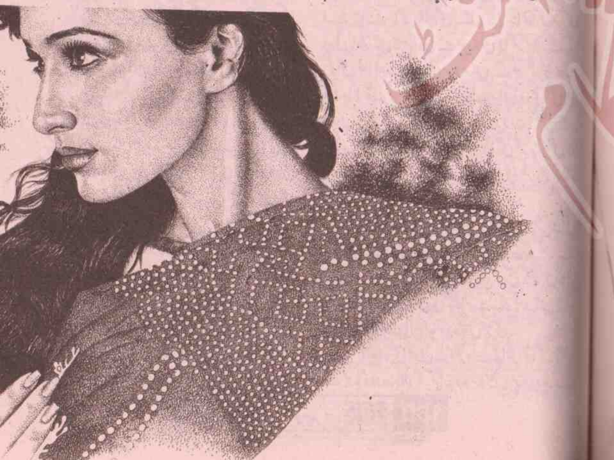

آنکھ کھلتے ہی میں نے جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھپکے مارے اور جلدی سے اپنا پرانا مسلا ہوا شلوار قمیض پہن کر باہر نکل آیا۔ میں نے جیب ٹٹولی' اس میں چار پانچ ہی روپے بچے تھے جبکہ ابھی ناشتا بھی کرنا تھا اور مال تک جانے آنے کا کرایہ بھی دینا تھا۔ میں کچھ سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ فرزانہ پر نظر پڑی۔ وہ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی پردے کی آڑ میں سے گلی میں جھانک رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔

"ماسی گھر میں ہیں۔" میں نے اس سے سوال کیا۔

"پڑوسن خالہ کے ساتھ گئی ہیں۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ انہیں اسپتال لے گئی ہیں۔" فرزانہ نے جواب دیا پھر اس نے مجھ سے سوال کیا۔ "تم کیسے ہو۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے ابھی سو کر اٹھے ہو۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں' دیر میں آنکھ کھلی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر بھاگا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "پہلے ہوٹل پر چائے پیوں گا' پھر مال روڈ جاؤں گا۔"

"چائے ہوٹل میں کیوں پیتے ہو' اندر آجاؤ۔ میں پلا دوں گی۔" فرزانہ نے کہا تو میں خوش ہو گیا۔ ویسے بھی جیب میں صرف چار پانچ روپے ہی باقی رہ گئے تھے۔ مگر میں نے تکلف کی تھوڑی سی اداکاری کرتے ہوئے انکار کیا اور فرزانہ کے اصرار پر آخر اندر چلا ہی گیا۔

اس نے مجھے اندر والے کمرے میں بٹھایا اور خود چائے بنانے اپنے باورچی خانے میں چلی گئی۔ میں چارپائی پر بیٹھا اپنی زندگی کے نشیب و فراز پر غور کرنے لگا۔ میں کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ کہاں تو میری ڈائننگ ٹیبل پر اتنا ناشتا ہوتا تھا کہ ایک بار ڈٹ کر کر لیا جائے تو سارا دن کچھ کھانے کی ضرورت نہ رہے اور کہاں اب نوبت یہ آ گئی تھی کہ میں ایک غریب گھر کی لڑکی کے پاس صرف چائے کی ایک پیالی پینے آیا تھا۔ گھر کی نعمتوں کو ٹھکرا کر نکلا تھا' جس کی سزا ابھی بھگت رہا تھا۔ دوسروں کی چاکری کر رہا تھا اور چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لیے محتاج تھا۔

"اوہ جمال! ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔" اچانک فرزانہ نے کہا تو میں اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ وہ باورچی خانے سے آ گئی تھی مگر اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں شرمندگی تھی۔

"کیا ہوا' خیریت تو ہے۔" میں نے پوچھا۔

"وہ...... دراصل دودھ پھٹ گیا ہے۔" فرزانہ نے کہا۔ "مگر میں ابھی ثمر کے گھر سے دودھ لاتی ہوں' تم بیٹھو بس ابھی آئی۔"

"ارے...... تم کیوں جاتی ہو۔ میں دودھ لے آتا ہوں۔" میں نے کہا اور اٹھ کر باہر کی طرف چل دیا۔

میں نے ثمر کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو دروازہ اسی نے کھولا۔ ثمر تیس بتیس سال کی عورت تھی۔ وہ اپنے چچا کے ساتھ رہتی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ ثمر کسی بیوٹی پارلر میں کام کرتی ہے اور وہی کما کر بوڑھے چچا کو بھی کھلاتی ہے۔ ماسی سرداراں کے گھر ثمر کا بہت آنا جانا تھا۔ ثمر اور فرزانہ کے درمیان دوستی تھی مگر دونوں کی عمروں میں کافی فرق تھا۔ فرزانہ بمشکل بیس سال کی تھی اور ثمر سے بہت چھوٹی تھی مگر پھر بھی وہ دونوں ایک دوسرے سے سہیلیوں کی طرح برتاؤ کرتی تھیں۔

"چچا کہاں ہیں۔" میں نے قدرے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے براہ راست دودھ مانگنے کے بجائے ثمر سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ صبح صبح کسی کام سے گئے ہیں۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد میں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو وہ ہنس پڑی۔

"اچھا دیتی ہوں۔" اس نے کہا ہی تھا کہ پیچھے سے بوبا دودھ والا آ گیا۔ وہ سائیکل پر دودھ کے

برتن لٹکائے آیا تھا۔ اس نے سائیکل روکی اور جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر ثمر کی طرف بڑھا دیا۔

"باجی! یہ اس ماہ کا بل ہے۔" اس نے کہا۔

"کتنے کا ہے۔" ثمر نے دودھ والے سے پوچھا۔

"چار سو ستر روپے۔" دودھ والے نے جواب دیا تو ثمر نے اپنا پرس کھولا۔ پھر وہ میری طرف مڑ کر بولی۔ "جمال! میں بوبے کا حساب کر رہی ہوں۔ تم اندر چل کر بیٹھو' میں ابھی آتی ہوں۔"

میں اندر چلا گیا اور صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ نیچے کسی چیز کی چبھن کا احساس ہوا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا وہ ایک بال پین تھا۔ جس پر میں بیٹھ گیا تھا۔ میں نے بال پین اٹھایا اور اس کا جائزہ لینے لگا' وہ عام سا بال پین تھا۔

"ارے! تم ابھی تک کھڑے ہو' آرام سے بیٹھو۔ میں ابھی دودھ لے کر آتی ہوں۔" ثمر نے کہا۔

"یہ...... یہ...... بال پین یہاں پڑا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے وہ بال پین ثمر کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اسے تم رکھ لو۔ میرے لیے بیکار ہے۔ دراصل تم سے پہلے میرے چچا کے ایک دوست امیر خاں آئے تھے۔ شاید وہی بھول گئے ہیں۔ عام سا پین ہے' تم لے لو۔ تمہارے کام آ جائے گا۔ اتنا قیمتی نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے پریشان ہوں اور دوبارہ آئیں۔"

میں جانتا تھا کہ ثمر اور اس کے چچا کے ہاں بہت سے ملنے والے آتے رہتے تھے۔ نہ جانے وہ ان کے رشتے دار تھے یا دوست...... جو کوئی بھی تھے' ایسا محسوس ہوتا جیسے ان لوگوں سے ان کے کاروباری روابط ہیں۔ محلے والوں کا خیال تھا کہ ثمر اور اس کے چچا اسمگلنگ کے کام میں ملوث ہیں۔ ثمر دکھاوے کے لیے بیوٹی پارلر میں کام کرتی ہے۔ اس کی آنکھیں ہر وقت سوجی سوجی سی نظر آتی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نشہ کرتی ہے۔ غالباً وہ ہیروئن کی عادی تھی۔

محلے کے ایک دو افراد کے منہ سے میں نے یہ بھی سنا تھا کہ ان دونوں چچا بھتیجی کے ہیروئن فروشوں سے مراسم ہیں۔ میں نے دو ایک مرتبہ دبے لفظوں میں ماسی سرداراں اور فرزانہ کو ثمر اور اس کے چچا سے دور رہنے کے لیے کہا تھا مگر انہوں نے یا تو میری بات سمجھی نہیں تھی یا پھر جان بوجھ کر ان سنی کر دی تھی۔ میں بھی خاموش ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کا پرانا تعلق تھا۔ یہ لوگ طویل عرصے سے ساتھ رہ رہے تھے۔ میں کیوں خواہ مخواہ ان کے درمیان دیوار کھڑی کرتا۔

"میں دودھ لاتی ہوں' تم بیٹھو۔" ثمر نے دوبارہ کہا تو میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دودھ کا برتن لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ وہ بال پین ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔

ثمر نے بال پین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کل رات کی بات ہے' چچا کے ایک دوست ہمارے گھر آئے۔ وہ اس سے پہلے بھی آ چکے تھے۔ کل آتے ہی بولے' گھر کی لائٹس مت جلانا' میری آنکھوں میں تکلیف ہو رہی ہے' میں حیران تھی کہ ابھی یہ باہر سے آئے ہیں' وہاں بھی تو روشنی تھی۔ اس سے انہیں پریشانی نہیں ہوئی پھر گھر میں گھبرائے گھبرائے سے گھومتے رہے۔ چچا بھی انہیں دیکھ کر حیران تھے۔ ان سے بیٹھنے کو کہا تو نہیں بیٹھے' کھانے کو پوچھا تو منع کر دیا اور پھر اچانک ہی چلے گئے۔ یہ بال پین انہی کا ہے۔ امیر خان نام ہے ان کا......"

پھر وہ بلاوجہ ہنس پڑی۔

میں نے دودھ کا برتن اٹھایا' ثمر کا شکریہ ادا کیا اور واپس چل دیا۔

"جمال! کہاں تھے۔" میں نے دودھ کا برتن اسے دے دیا۔

"ثمر دودھ والے کا حساب کر رہی تھی' اس لیے اس کے جانے کے بعد اس نے دودھ دیا۔" میں نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد گرما گرم چائے تیار تھی۔ اس کے ساتھ فرزانہ نے بسکٹ بھی لا کر دیے۔ "اب

کہاں جاؤ گے۔" فرزانہ نے مجھ سے پوچھا۔

"وہیں مال روڈ۔ چوہدری کے فاسٹ فوڈ سینٹر!" میں نے بے زاری سے جواب دیا، پھر سوال کیا۔ "ماسی کب تک آئیں گی۔"

"وہ دوپہر تک ہی آئیں گی۔ اسپتال میں بہت رش ہوتا ہے۔ اس وقت تک میں شمشاد سے مل آؤں گی۔ وہ اگلی گلی میں رہتی ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ تمہیں ساتھ لے کر کہیں گھومنے پھرنے جاؤں۔ شالامار باغ میں تمہارے ساتھ گھوموں پھروں۔ محبت کرنے والے ان بادشاہوں کی بنائی ان عمارتوں کو دیکھ کر میرا بھی دل تڑپ اٹھتا ہے مگر کیا کروں۔ چوہدری کی نوکری نہ کچھ کرنے دیتی ہے اور نہ کچھ سوچنے دیتی ہے۔ سارا دن وہاں کا کام کر کے میرے بازو شل ہو جاتے ہیں۔ ٹانگیں دکھنے لگتی ہیں۔ کسی دن کی چھٹی کرلو تو اس روز کی مزدوری بھی نہیں دیتا۔ بڑا ظالم انسان ہے، اسے ذرا بھی خوف خدا نہیں ہے۔" میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"جمال! ایسا کرتے ہیں، آج ہم دونوں گھومنے چلتے ہیں۔ میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔" فرزانہ نے کہا۔

"نہیں فرزانہ! ماسی آئیں گی اور تمہیں یہاں نہیں پائیں گی تو پریشان ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"ان کے پاس گھر کی دوسری چابی ہے۔ وہ سمجھ جائیں گی کہ میں کسی کام سے گئی ہوں گی، پہلے بھی کئی بار جا چکی ہوں۔"

فرزانہ نے میری طرف امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو میرا دل چاہا کہ اس کی بات مان لوں مگر میری غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے جاؤں تو رقم بھی اس کی خرچ کراؤں۔ میرے منہ سے چند جذباتی جملے نکل گئے تو ان کا اور بھی الٹا اثر ہوا۔ اس نے نہ صرف اپنی جمع پونجی نکال لی بلکہ میرے ساتھ جانے کے لیے پہلے سے زیادہ ضد کرنے لگی اور تیار بھی ہوگئی۔

اس سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس کے دل میں میرے لیے کس قدر جگہ ہے اور شادی کے بعد وہ میرے گھر کے لیے کس قدر مفید ثابت ہوگی۔ وہ فرمائشیں کرنے والی لڑکی نہیں تھی بلکہ فرمائشیں پوری کرنے والی لڑکی تھی۔ باوفا، پرخلوص، سمجھ دار، ذہین...... اس میں کون سی خوبی نہیں تھی۔

"نہیں فرزانہ! آج نہیں پھر کبھی......" میں نے بڑی مشکل سے اسے ٹالا۔ آخر وہ مسکرا دی۔ اس نے مزید اصرار نہیں کیا۔ غالباً سمجھ گئی تھی کہ میں اس سے رقم خرچ کراتے ہوئے ہچکچا رہا ہوں۔

"ایک بات تو بتاؤ فرزانہ!" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "یہ ثمر...... کیا یہ نشہ کرتی ہے۔ اس کی آنکھیں ہر وقت گلابی اور سوجی سوجی سی رہتی ہیں۔"

"کیا تمہیں نہیں معلوم۔" فرزانہ نے میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "ثمر افیون استعمال کرتی ہے۔ آج سے نہیں، کافی عرصے سے۔ میں نے اس کی آنکھیں ہر وقت سوجی ہوئی دیکھی ہیں۔ اس کی افیون کی لت کے بارے میں سب لوگوں کو سارے محلے کو پتا ہے۔"

"اچھا! حیرت کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "مردوں کے بارے میں تو سنا بھی تھا اور دیکھا بھی...... کہ وہ دنیا بھر کے نشے کرتے ہیں مگر ایک عورت بھی نشہ کر سکتی ہے، اور وہ بھی افیون کا...... یہ بات حیرت انگیز...... بلکہ افسوس ناک ہے۔"

کچھ دیر رکنے کے بعد میں نے کہا۔ "چوہدری کے برگر اور فاسٹ فوڈ سینٹر پر خود چوہدری بھی ہیروئن کا عادی ہے اور اس کا خانساماں منیر بھی۔"

"جمال! تم نشے کی لعنت کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھنا۔ یہ بہت بری چیز ہے۔ گھر کے گھر برباد کر دیتی ہے۔ انسان کی رگوں میں خون سکھا کر اسے زندگی سے محروم کر دیتی ہے۔" فرزانہ بڑی سمجھ داری کی باتیں کر رہی تھی اور مجھے اس طرح سمجھا رہی تھی جیسے میں کوئی ننھا منا سا بچہ ہوں۔ اس کے لیے میں واقعی بچہ تھا۔ اپنے گھر اور گھر والوں سے دور، ماں

باپ کی شفقت سے محروم۔ وہ مجھے اس لعنت سے دور، ماں باپ کی شفقت سے محروم۔ وہ مجھے اس لعنت سے دور رکھنے کے لیے اپنے حساب سے جتن کر رہی تھی۔

"فکر نہ کرو فرزانہ! میں ایسے نشے کے قریب بھی نہیں پھٹکوں گا جو انسان کا دشمن ہو۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

☆☆

میں پونے بارہ بجے چوہدری کے فاسٹ فوڈ سینٹر پہنچا۔ وہاں پہنچنے کا میرا مقررہ وقت گیارہ بجے کا تھا۔ اس طرح میں لگ بھگ ایک گھنٹا لیٹ ہوگیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ چوہدری اب مجھ پر خوب ناراض ہوگا۔ میری تنخواہ کاٹنے کی دھمکی دے گا اور یہ بھی کہے گا کہ میں کہیں اور ملازمت تلاش کرلوں۔ میں روز کی طرح چپ چاپ کھڑا رہوں گا۔ چوہدری کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو وہ نہ صرف مجھے دوبارہ کام کرنے کی اجازت دے دے گا بلکہ تنخواہ بھی نہیں کاٹے گا، اوپر سے جاتے وقت پانچ روپے انعام بھی دے گا۔

اس وقت چوہدری چولہوں کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے سامنے ایک بڑے توے کے اوپر بن کباب، برگر اور ڈبل روٹی کے ٹکڑے سنک رہے تھے۔ چوہدری خود اس کام میں بارہ ساڑھے بارہ بجے تک منیر بھی آجاتا تھا، وہ آتے ہی کام سنبھال لیتا اور لنچ کے وقفے کے دوران میں جمع ہو جانے والوں کو تیزی سے نمٹاتا تھا۔ چوہدری پیسے وصول کرتا، آرڈر دیتا اور منیر بن کباب وغیرہ سینکتا۔

میرا کام شاپ میں جمع ہونے والے برتنوں کو تیزی سے دھوتا تھا۔ چار بجے تک میری مصروفیت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ مجھے سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی تھی۔ گاہک پر گاہک آتے، وہ برتنوں میں فاسٹ فوڈ کھاتے، جھوٹی پلیٹیں میرے پاس پہنچ جاتیں۔ میں انہیں دھوتا اور یہ برتن دوبارہ منیر اور چوہدری کے پاس پہنچ جاتے۔

چوہدری فاسٹ فوڈ سینٹر پہنچتے ہی میں نے آستینیں چڑھائیں اور برتنوں کی دھلائی میں لگ گیا۔ میں پوری توجہ اپنے کام پر مرکوز کیے ہوئے تھا کہ منیر آگیا۔ اس کی پیشانی پر ایک تازہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ بھی چاقو سے لگنے والا زخم کا نشان ہوگا کیونکہ اس سے پہلے بھی اس کی پیشانی پر چاقو سے لگے ہوئے زخم کے دو پرانے نشان تھے۔ اس کے علاوہ زخم کا ایک نشان اس کی تھوڑی پر اور دوسرا رخسار پر تھا۔ آئے دن اس کا کسی نہ کسی سے جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ وہ اس وقت غصے کے عالم میں تھا۔ میں نے اس سے دور رہنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ ویسے بھی بہت غصیلا آدمی تھا۔ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا تھا۔

میں اس کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا۔ منیر اپنے کام میں مصروف تھا۔ کافی دیر لوگوں کا رش رہا۔ پھر رفتہ رفتہ رش کم ہونے لگا تو منیر مسکراتا ہوا میری طرف آیا۔ مجھے اس کے بدلے ہوئے رویے پر بڑی حیرت ہوئی۔ منیر اور مسکراہٹ! ایک انہونی سی بات تھی۔ وہ بار بار اپنی آنکھیں صاف کر رہا تھا جن سے پانی بہ رہا تھا۔

"جمال! مجھے پندرہ منٹ کے لیے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" منیر نے مجھ سے عاجزی سے کہا تو میں سمجھ گیا کہ آج اس کا مطلب پڑ گیا ہے اسی لیے عاجزی دکھا رہا ہے۔ "چوہدری کو پتا نہ چلے۔ میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔ اس وقت رش بھی نہیں ہے۔ تم میری جگہ تھوڑی دیر کام کرلو۔ اگر چوہدری پوچھے تو اس سے کہنا کہ میں سامنے تک گیا ہوں، ابھی آرہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔" میں نے منیر سے کہا۔ "توے پر اس وقت کیا ہے۔"

"دو برگر سینک رہے ہیں۔" منیر نے بتایا۔ "دو تین منٹ میں تیار ہو جائیں گے۔ گاہک باہر تپائی پر بیٹھے ہیں، انہیں دے دینا۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔ اگر چوہدری نے پوچھا تو میں اس سے کچھ بھی کہہ دوں گا۔ تم فکر مت کرو۔"

منیر پچھلے دروازے سے باہر نکلا تو میں

اس، کی جگہ جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دونوں برگر تیار کر کے پلیٹ میں رکھ کر میٹھی چٹنی پلیٹ میں ڈالی اور دونوا ، پلیٹیں گاہکوں کی طرف بڑھا دیں۔ چوہدری نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر پلٹ کر منیر کو ڈھونڈنے لگا۔ وہ منیر کے بارے میں پوچھنا ہی چاہ رہا تھا کہ کوئی گاہک آ گیا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور میں توے پر دوسرے گاہک کا آرڈر تیار کرنے لگا۔ اس دوران میں چند پلیٹوں کی ضرورت پڑی تو وہ بھی، میں نے ساتھ ہی دھولیں۔

تھوڑی دیر بعد منیر واپس آ گیا۔ اس وقت وہ کچھ بدلا بدلا سا لگا۔ میری طرف دیکھ کر وہ کھسیانے انداز...... میں مسکرایا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔

''منیر بھائی! یہ کیا۔'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔

''رکھ لے یار! تیرے لیے لایا ہوں۔ تو نے اتنی دیر میری جگہ ڈیوٹی کی ہے۔ دوست کا تحفہ سمجھ کر قبول کر لے۔'' منیر نے بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ آج واقعی بدل چکا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سگریٹ کا پیکٹ لے لیا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔

اس کے بعد میں دوبارہ اپنے کام میں لگ گیا۔ اس دوران میں اچھے خاصے برتن جمع ہو چکے تھے۔ میں نے برتن دھونے شروع کر دیے۔ ساتھ ہی منیر کے اس بدلے ہوئے رویے پر بھی غور کرنے لگا۔ برتن دھوتے دھوتے ساڑھے تین بج گئے۔ اب رش خاصا کم...... بلکہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ دفتروں والے لنچ کے بعد واپس جا چکے تھے۔ اب چوہدری فاسٹ فوڈ سینٹر میں اکادکا راہ چلتے لوگ آ رہے تھے۔ میرا لنچ ٹائم ساڑھے تین سے چار بجے تک ہوتا تھا۔ آدھے گھنٹے کے اس وقفے میں، میں چوہدری کی مہربانی سے اسی سینٹر میں دو برگر کھاتا تھا۔ اس کے بعد سامنے چاچا یعقوب کے ہوٹل پر جا کر چائے پیتا تھا۔ اس دوران میں آدھا گھنٹہ گزر جاتا تھا اور میں اپنی ڈیوٹی پر واپس آ جاتا تھا۔

منیر نے دو گرما گرم برگر اسپیشل، ڈھیر سارے سلاد اور میٹھی چٹنی کے ساتھ پلیٹ میں رکھ کر میری طرف بڑھائے اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''جمال بادشاہ! جاؤ عیش کرو۔ مزے سے کھاؤ اور یہ لو......'' یہ کہہ کر اس نے دس کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آج میری طرف سے چاچا یعقوب کے ہوٹل سے زبردست والی دودھ پتی پینا۔''

میں نے دس کا نوٹ لے کر جیب میں رکھ لیا اور برگر کی پلیٹ اٹھا کر عقبی حصے میں چلا گیا جہاں ایک پرانی ٹوٹی ہوئی کرسی اور ایک میز رکھی تھی، یہ میری ڈائننگ ٹیبل تھی۔ اسی پر میں دوپہر کو لنچ کرتا تھا۔ اس وقت برگر بہت مزے دار لگے۔ منیر نے بڑے دل سے تیار کیے تھے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں سیدھا چاچا یعقوب کے ہوٹل پر پہنچا۔ وہاں ایک زبردست دودھ پتی پی، اس کے بعد سگریٹ کا وہ پیکٹ نکالا جو منیر نے مجھے دیا تھا۔

ابھی میں اس سے ایک سگریٹ نکال ہی رہا تھا کہ میری نظر فرزانہ پر پڑی۔ وہ سر سے پیر تک سلیقے سے چادر اوڑھے چوہدری کے فاسٹ فوڈ سینٹر کی طرف جا رہی تھی۔ پھر وہ اس سینٹر سے کچھ پہلے رک گئی اور پریشان نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں رہا تھا کہ فرزانہ اس وقت وہاں کیوں آئی ہے۔ اس کی ماں صبح پڑوسن خالہ کے ساتھ اسپتال گئی تھیں۔ پتا نہیں وہ گھر پہنچیں یا نہیں۔ وہ اس قدر پریشان کیوں ہے۔ یہ سوچ کر میں چاچا یعقوب کے ہوٹل سے نکلا اور سیدھا فرزانہ کے سامنے پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بے تابی سے میری طرف بڑھی۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ وہ بے حد گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''فرزانہ! بات کیا ہے، تم اس وقت یہاں۔ ماسی کہاں ہیں۔'' میں نے اس سے پوچھا۔

''وہ...... جمال......! تم صبح ثمر...... کے گھر گئے تھے۔'' وہ پھولے ہوئے سانسوں کے دوران میں

بڑی مشکل سے بولی مگر بات مکمل نہ کر سکی۔

''ہاں، میں دودھ لینے گیا تھا۔ تم نے ہی تو بھیجا تھا مجھے۔'' میں نے اس سے کہا۔

''تو تم نے اسے قتل کیوں کر دیا۔'' فرزانہ نے کہا۔ اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا۔

''تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میں اس کے گھر گیا، اس سے دودھ لیا اور واپس آ گیا۔ میری واپسی تک وہ زندہ تھی۔''

''اگر تم سے یہ غلطی ہو گئی ہے تو ...... میرا مطلب ہے کیا واقعی تم نے ...... کہہ دو جمال، یہ جھوٹ ہے۔ تم اسے نہیں مار سکتے ...... تمہاری اس سے کون سی دشمنی تھی۔''

وہ بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی اور میں اسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے مجھے اس کی دماغی حالت پر شک ہے۔

''فرزانہ! میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''نہ میں نے ثمر کو قتل کیا ہے ورنہ مجھے اس واقعے کا پتا ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ ہوا کیا ہے...... میں واقعی کچھ نہیں جانتا۔''

''جمال! ثمر قتل ہو چکی ہے۔ اسے کسی نے ہلاک کر دیا ہے۔ اس کی موت کا وہی وقت بتایا جا رہا ہے جس وقت تم اس کے پاس گئے تھے۔'' فرزانہ نے کہا۔ ''پولیس کا کہنا ہے کہ اسے مرے ہوئے چار گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اچھا، تم فوراً میرے ساتھ چلو۔ کہیں چل کر بیٹھتے ہیں پھر میں تمہیں پوری بات بتاؤں گی۔''

''میں چوہدری سے تو کہہ دوں۔'' میں نے کہا۔ ''اور میں نے چچا یعقوب کو دودھ پتی کے پیسے بھی نہیں دیے ہیں۔''

''ارے، کیا کر رہی ہو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔'' میں نے بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھا مگر ایک آدھ آدمی کے علاوہ کوئی اور ہماری طرف متوجہ نہ تھا۔

عجائب گھر کے سامنے زمزمہ کے قریب پارک میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ وہ فوارے سے کھیل رہے تھے۔ ایک دوسرے پر پانی اچھال رہے تھے۔ ہم دونوں وہیں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔

''تم نے یہ سو کا نوٹ مجھے کیوں دیا ہے۔'' میں نے فرزانہ سے پوچھا۔ ''مجھ پر پہلے ہی تمہارا کافی قرض چڑھ چکا ہے۔''

''میں تم سے کون سا مانگ رہی ہوں۔'' فرزانہ نے کہا۔ ''میرے پاس تھے، اس لیے دے دیے۔ جب تمہارے پاس ہوں تو واپس دے دینا۔''

''اچھا تم ثمر کے قتل کے بارے میں، بتاؤ......'' میں نے کہا۔

''جب تم ہمارے گھر سے نکلے تھے تو میں نے تم سے کہا تھا کہ شمشاد سے ملنے جا رہی ہوں۔ میں اس کی طرف جا رہی تھی کہ یاد آیا کہ شمشاد کو ایک کتاب واپس کرنی ہے۔ میں واپس گھر آ گئی۔ شمشاد کی کتاب لی اور اس کے گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ اس کے گھر میں تالا لگا ہوا ہے۔ میں واپس ہو گئی۔ اس طرح سمجھ لو کہ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ جب میں واپس آئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ہمارے گلی میں پولیس موبائل کھڑی ہے اور بہت سے لوگ جمع ہیں۔ یہ دیکھ کر میں ڈر گئی۔ میں نے چچا شبراتی سے پوچھا کہ وہاں کیا ہو گیا ہے تو انہوں نے بتایا کہ ثمر قتل ہو گئی ہے۔ یہ خبر میرے لیے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ واپس چلی جاؤں مگر پھر یہ سوچ کر واپس نہ ہوئی کہ اگر پولیس نے مجھے اس طرح واپس جاتے دیکھا تو مجھ پر شک کرے گی لہٰذا میں آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، اماں واپس آ چکی تھیں۔ میں نے اپنے کھلے ہوئے دروازے پر دستک دی تو ایک پولیس والا میری طرف متوجہ ہو گیا اور مجھے مشکوک انداز سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اپنے افسر کو اشارہ کیا تو وہ موبائل سے اتر کر میری طرف آیا۔ اس نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا۔ میں نے اپنا نام اور اماں کا نام بتایا۔ اس دوران میں اماں بھی باہر آ گئی تھیں۔ وہ بھی ثمر کے قتل کی خبر سن کر پریشان

تھیں۔ پولیس والوں نے مجھ سے اور اماں سے ثمر کے بارے میں کچھ سوال کیے جس کے ہم نے جواب دے دیے۔ میں نے ایسی کوئی بات نہ کی جس سے پولیس کو یہ اندازہ ہوتا کہ ہمارے اور ثمر کے تعلقات تھے۔ وہ نشے باز عورت تھی' اسے پولیس والے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اگر میں کسی تعلق کا اظہار کرتی تو وہ مجھے پر بھی نشہ باز ہونے کا شک کرتے۔"

"فرزانہ! تم نے پولیس والوں کو یہ بات بتائی کہ میں اس کے گھر دودھ لینے گیا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"کیا میں تمہیں اتنی بے وقوف نظر آرہی ہوں۔" فرزانہ نے گویا برا مانتے ہوئے کہا۔ "اس دوران میں تمہارا تو کہیں بھی ذکر نہیں آیا۔ نہ میں نے یہ اقرار کیا کہ تم میرے گھر آئے تھے اور نہ ایسی کوئی بات کی جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ آج صبح ثمر کے گھر کوئی نوجوان گیا تھا۔"

"اب پولیس کیا کر رہی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"پولیس اس کیس کی تفتیش کر رہی ہے۔" فرزانہ نے کہا۔ "وہ محلے والوں سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ میرے پاس وہ لوگ دوبارہ نہیں آئے۔"

"فرزانہ! تم ثمر کے گھر کے سامنے رہتی ہو۔" میں نے کہا۔ "محلے والوں نے پولیس کو اس کے اور تمہارے تعلقات کے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ اس حساب سے پولیس تم پر نظر رکھ رہی ہوگی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" فرزانہ نے جواب دیا۔ "مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے جمال۔"

"سنا ہے ثمر جس بیوٹی پارلر میں کام کرتی تھی اس کے مالک کا نام فرحان ہے اور وہ منشیات کے کاروبار سے کوئی تعلق رکھتا ہے۔ اس حوالے سے پولیس ثمر کے قتل کا شک فرحان پر بھی کر سکتی ہے۔"

"ہاں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"ارے یاد آیا' فرزانہ! ایک بات تو میں بھول ہی گیا۔" میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا جمال! جلدی بتاؤ نا' میرا دل ہول رہا ہے۔ پتا نہیں یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"جب میں دودھ لینے ثمر کے گھر گیا تھا تو اس وقت وہ بوبے دودھ والے کا حساب کر رہی تھی۔ اس لیے مجھے وہاں دیر بھی لگی تھی۔ بوبے نے اپنے دودھ کے حساب کا بل ثمر کو دیا تھا...... اس نے مجھے ثمر کے گھر کے اندر جاتے دیکھا تھا۔"

"اوہ' میرے خدا!" یہ بات سن کر فرزانہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اس کی پریشانی میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ "اس دوران میں ثمر نے تمہیں کہیں تمہارے نام سے تو نہیں پکارا تھا۔" فرزانہ نے سوال کیا۔

"مجھے صحیح طرح یاد نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر میرا خیال ہے کہ ثمر نے اس دوران میں مجھے میرا نام لے کر مخاطب نہیں کیا تھا۔"

"بوبے دودھ والے کو تو سارا محلہ جانتا ہے۔" فرزانہ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ "وہ تمہیں پہچانتا ہے۔"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور پولیس اس دودھ والے کو کیوں ڈھونڈے گی۔ اس سے کوئی بات کیوں پوچھے گی۔"

"پتا نہیں کیا ہوگا......" فرزانہ نے کہا۔

"ثمر کس طرح ہلاک ہوئی ہے۔" میں نے سوال کیا۔

"مجھے صحیح معلوم نہیں۔" فرزانہ نے جواب دیا۔ "مگر کوئی کہہ رہا تھا کہ اس کے سینے میں چاقو گھونپا گیا ہے......"

"میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں' تم ہی کچھ بتاؤ نا۔" میں نے بے چارگی کے عالم میں اپنا سر پکڑ لیا۔

"تم اپنے محلے سے دور رہو۔" فرزانہ نے کہا۔ "اگر بوبا دودھ والا مل گیا تو وہ تمہارے بارے میں بتا دے گا۔ بوبا تمہیں جانتا تو نہیں لیکن اس نے تمہیں دیکھا ہے۔ وہ تمہارا حلیہ پولیس کو بتا دے گا۔"

"لیکن اس وقت کیا کروں۔" میں نے

پریشان ہو کر سوال کیا۔

"اس وقت تم واپس فاسٹ فوڈ سینٹر جاؤ۔" فرزانہ نے کہا۔ "رات کو محلے میں پیچھے والی سڑک سے آنا اور اپنے گھر میں بھی پچھلے دروازے سے جانا۔ کوشش کرنا کہ کسی کی نظر تم پر نہ پڑے۔ میں حالات کا جائزہ لیتی رہوں گی۔ کوئی اہم بات ہوگی تو تمہیں بتانے خود تمہارے پاس آجاؤں گی۔"

فرزانہ چلی گئی تو میں واپس چوہدری فاسٹ فوڈ سینٹر پہنچا۔ چوہدری نے مجھے دیکھ کر برا سا منہ بنایا کیونکہ میں آدھا گھنٹا لیٹ ہو چکا تھا مگر حسب معمول زبان سے کچھ نہ کہا۔ میں پوری تندہی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ شام چھ بجے کچھ سکون ملا مگر سات بجے سے پھر رش شروع ہو گیا۔ اس بار گھومنے پھرنے' سیر و تفریح اور آؤٹنگ کے لیے آنے والے لوگوں کا ہجوم تھا جو گھر سے باہر کھانے کے لیے فاسٹ فوڈ کو ترجیح دیتے تھے۔

رات گیارہ بجے کے بعد میری جان چھوٹی تو چوہدری نے شاید میری آج کی خصوصی کارکردگی سے متاثر ہو کر سو روپے انعام میں دیے۔ فرزانہ نے بھی دوپہر کو سو روپے دے دیے تھے۔ لہٰذا اس وقت میں گویا سیٹھ تھا۔ کھانے میں برگر میں نے کھا ہی لیے تھے چنانچہ خوشی خوشی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا مگر جیسے ہی مجھے ثمر کے قتل کا واقعہ یاد آیا' میری ساری خوشی کافور ہو گئی۔ ڈرتے ڈرتے میں پچھلی سڑک سے اپنے گھر کے پچھلی طرف پہنچا اور وہاں سے اپنے کیبن نما کمرے میں چلا گیا۔ بستر پر لیٹا تو اس قدر تھکا ہوا تھا کہ لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

☆☆

مجھے کوئی بہت بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا۔ آنکھ کھلی تو میں بوکھلا گیا۔ تھوڑی دیر تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔ پھر فرزانہ کا دھندلا سا چہرہ نظر آیا جو آہستہ آہستہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بری طرح خوفزدہ تھی اور "جمال' جمال" کہہ کر مجھے آواز بھی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت نمایاں تھی۔ میں [illegible] فرزانہ میری چارپائی کے قریب کھڑی تھی۔

"جمال! تم خطرے میں ہو۔" اس نے سرگوشی کی۔ "اس جگہ سے فوراً بھاگ جاؤ۔ میں جس طرح پچھلے راستے سے آئی ہوں اسی راستے سے تم بھی نکل جاؤ۔"

"اوہ!" میں نے جلدی سے کہا۔ "کیا وقت ہوا ہے۔"

"تین بجے ہیں۔" فرزانہ نے کہا۔ "مگر تم ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ ورنہ تم پھنس سکتے ہو۔"

"اتنی رات کو باہر نکلا تو......" میں متذبذب تھا۔

"جمال! بوبا دودھ والا پولیس کو مل گیا ہے۔ اس نے پولیس کو تمہارے بارے میں بتا دیا ہے کہ تم اس وقت ثمر کے گھر آئے تھے۔ بوبا تمہارا نام تو نہیں جانتا مگر اس نے پولیس کو تمہارا پورا حلیہ بتا دیا ہے۔ پولیس اب بڑی سرگرمی کے ساتھ اس حلیے کے نوجوان کو تلاش کر رہی ہے اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔" فرزانہ نے بڑی لجاجت سے کہا۔ پھر اس نے کھونٹیوں پر ٹنگے ہوئے میرے کپڑے اتارے' انہیں چادر میں رکھ کر ایک گٹھری بنائی اور مجھے ساتھ لے کر پچھلے دروازے سے باہر نکل آئی۔

"تم ایسا کرو کہ سیدھے ریلوے اسٹیشن چلے جاؤ۔ وہاں بہت سے ہوٹل ہیں۔ چھپر والے ہوٹل بھی ہیں جن میں رات گزارنے کے لیے چارپائیاں ملتی ہیں۔ ان پر بستر بھی ہوتا ہے۔ تم آج کی رات وہاں گزار لو۔ کل رات کو نو بجے میں ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ایک پر تمہیں ملوں گی۔ پھر آگے کے حالات پر بات ہوگی۔ اب تم جاؤ۔" یہ کہہ کر فرزانہ نے دو سو روپے نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔

میں نے پس و پیش کرنی چاہی تو اس نے کہا۔ "کوئی بات نہ کرنا...... کوئی اعتراض نہ کرنا۔ اس وقت تمہیں اس رقم کی ضرورت ہے۔ تم کو رات گزارنی

ہے۔ جاؤ جلدی نکل جاؤ۔"

میں نے اسے خدا حافظ کہا اور اندھیرے میں بچتا بچاتا آگے چل پڑا۔ میں جان بوجھ کر بیچ سڑک پر نہیں چل رہا تھا بلکہ دیواروں' دکانوں اور مکانوں کی آڑ لے کر چل رہا تھا۔ بادامی باغ لاری اڈے سے ریلوے اسٹیشن زیادہ دور بھی نہ تھا۔ لگ بھگ ایک گھنٹے میں' میں وہاں پہنچ گیا۔ اس دوران میں ایک مرتبہ بھی پولیس سے ٹکراؤ نہیں ہوا البتہ مصری شاہ پل کے نیچے ایک موبائل نظر آئی مگر اس میں سوار سپاہی آرام کر رہے تھے۔ ان کے چہروں پر تھکن تھی۔ انہوں نے میری طرف دھیان بھی نہ دیا اور میں ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔

چھپر والے ہوٹل کے باہر بہت سی چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر لوگ سو رہے تھے۔ یہ سب اجنبی مسافر تھے جنہیں اسٹیشن سے کسی نہ کسی جگہ کی ٹرین پکڑنی تھی اور رات گزارنے یہاں آئے تھے۔ میں اندر چلا گیا اور ہوٹل والے کو بتایا کہ میں ایک غریب مسافر ہوں' رات گزارنا چاہتا ہوں۔ چھپر والے نے چار پائی اور بستر کا ایک رات کا کرایہ بیس روپے بتایا' میں نے کرایہ ادا کیا اور اس نے ایک چار پائی پر میرے لیے بستر لگوادیا۔

تھوڑی دیر بعد میں بستر پر لیٹا ہوا اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا جس میں امن وسکون نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پولیس سے بھاگ کر میں غلطی کر رہا ہوں۔ اگر بوبے دودھ والے نے پولیس کو میرا حلیہ بتادیا اور پولیس مجھے ڈھونڈ رہی ہے تو مجھے پولیس کے پاس چلا جانا چاہیے' میں پولیس کو پوری بات بتا سکتا ہوں کہ میں فرزانہ کے کہنے پر ثمر سے دودھ لینے گیا تھا۔ مگر ایک مسئلہ اور بھی تھا' وہ یہ کہ فرزانہ نے پتا نہیں پولیس کو کیا بتایا تھا۔ میری اس بات کے بعد وہ جھوٹی پڑ سکتی تھی اور پولیس کو اس پر خواہ مخواہ شک ہو سکتا تھا۔

دوسری بات یہ تھی کہ پاکستان کی پولیس کا حال سبھی کو معلوم ہے' یہ بے قصوروں کی ساتھ وہ سلوک کرتی ہے کہ وہ بے چارے وہ تمام جرم قبول کر لیتے ہیں جو انہوں نے نہیں کیے ہوتے ہیں۔ بہر حال اب تو میں فرار ہو چکا تھا' اب مجھے خود کو پولیس سے دور رکھنا تھا۔ اسی میں عافیت تھی' بصورت دیگر میرا جو حشر ہو سکتا تھا' اس کے تصور سے ہی میری روح کانپ رہی تھی۔ سوچتے سوچتے میں نہ جانے کب سو گیا۔ چھپر ہوٹل میں کھلی سڑک پر سونے کا زندگی کا پہلا تجربہ تھا جس کا اختتام صبح سورج کی پہلی کرن نمودار ہونے کے ساتھ ہی ہو گیا۔

☆☆

چھپر ہوٹل میں علی الصباح بیداری آگئی تھی۔ چار پائیوں پر ایک رات کے لیے سونے والے مسافر جاگ چکے تھے۔ وہ سب جانے کی تیاریوں میں تھے۔ میں نے ہوٹل کے مالک کو بتایا کہ میں رات کو جاؤں گا۔ آج دن بھر یہیں رکوں گا' رات کو میرے دوسرے ساتھی بھی آئیں گے' پھر ہم سب مل کر جائیں گے۔

"باؤ جی! تمہیں کہاں جانا ہے۔" ہوٹل کے مالک نے پوچھا۔

"ہم سب دوست کراچی جا رہے ہیں' روزگار کی تلاش میں۔" میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا تو وہ میری جان کو آگیا۔

"باؤ جی! آج کل کراچی میں اتنا روزگار نہیں ہے۔ کسی زمانے میں ادھر بندہ گاڑی سے اترتا تھا اور ادھر اسے روزگار مل جاتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اتنے لوگوں کو روزگار کہاں سے ملے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ اسی شہر میں رہو۔ لاہور' لاہور ہے۔ داتا کی نگری کو چھوڑ کر جاؤ گے تو خوار ہی ہو جاؤ گے۔" وہ کہتا رہا اور میں سنتا رہا۔ شاید اس کی باتوں میں سچائی تھی۔

"ٹھیک ہے یار! میرے دوست آجائیں تو ان کو بھی سمجھاؤں گا۔ تمہارے مشورے کا شکریہ...... مگر مجھے رات تک تو ان لوگوں کا انتظار کرنا ہے نا۔" میں نے کہا۔

"اوہ...... تو کیا ہوا میرے بادشاہ! کوئی بات نہیں۔ آرام سے چار پائی پر لیٹو یا گھومو پھرو اور فکر مت کرو۔ کچھ کھانا پینا ہے تو بولو' ابھی مل جائے گا۔ چل اوئے منڈے! باؤ جی کے پاس آجا۔" چھپر ہوٹل کے مالک نے ملازم لڑکے کو آواز دی تو میں نے اس سے کہا کہ فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے' جب ہوگی تو بلالوں گا۔ میری جیب میں محدود رقم تھی۔ آگے کے حالات کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اس ملازم لڑکے سے ناشتا منگواتا تو وہ نہ جانے کیا' کیا لے آتا۔ پھر اسے ٹپ بھی دینی پڑتی۔ بے شک! یہ چھپر ہوٹل ہی سہی مگر ٹپ کا رواج تو یہاں بھی تھا۔

میں ہوٹل سے نکلا اور گھومتا پھرتا سڑک پر آگیا۔ میرے سامان کی مختصر سی گٹھری ہوٹل میں ہی رکھی تھی۔ اس میں چند جوڑی لباس اور ایک دو چادروں کے سوا تھا بھی کیا' جو ان کے چوری ہونے کا خطرہ ہوتا۔

اس دوران میں نو بج گئے۔ ایک پرانے سے ہوٹل پر میں نے چائے پی' وہیں ایک پراٹھا بھی چائے کے ساتھ کھایا۔ پیٹ میں رزق پڑا تو میں نے آگے کے بارے میں سوچا۔ رات نو بجے فرزانہ نے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ایک پر ملنے کو کہا تھا۔ مجھے پورے بارہ گھنٹے گزارنے تھے۔ رات کے نو بجے تک میں کیا کروں' کہاں جاؤں۔ میں سوچ رہا تھا' جب آدمی کا موڈ بھی اچھا ہو اور حالات بھی...... تو بارہ گھنٹے کیا' بارہ دن بھی پلک جھپکتے گزر سکتے ہیں لیکن میرے حالات ایسے تھے جن میں ایک ایک پل بھاری پڑ رہا تھا۔ پھر اس بات کی بھی احتیاط کرنی تھی کہ پولیس کے سامنے خواہ مخواہ نہ آؤں۔

میرا دل چاہا کہ اپنے محلے میں جاؤں اور دور سے حالات کا جائزہ لوں۔ یہ خیال آتے ہی میں چل پڑا مگر تھوڑی دور جانے کے بعد میں نے وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہاں میری موجودگی نہ صرف میرے لیے بلکہ ماسی سرداراں اور فرزانہ کے لیے بھی مسائل کھڑی کر سکتی تھی۔ میں نے طے کیا کہ یہاں سے سیدھا چوہدری فاسٹ فوڈ سینٹر جاؤں۔ مال روڈ ریلوے اسٹیشن سے بہت دور تھا۔ چوہدری کا فوڈ سینٹر عجائب گھر کے قریب واقع تھا۔ فاصلہ کافی تھا۔ اگر میں پیدل وہاں تک کا سفر طے کرتا تو میرا وقت بھی اچھا خاصا گزر جاتا۔ دوسرے کوئی نئی بات بھی معلوم ہونے کی امید کم ہی تھی۔ میرے محلے میں سوائے فرزانہ کے کسی اور کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں کہاں کام کرتا ہوں۔ فرزانہ پولیس کو اس جگہ کے بارے میں کبھی نہ بتاتی لہٰذا وہ جگہ مجھے محفوظ محسوس ہوئی اور میں پیدل ہی اس طرح چل پڑا۔

لاہور کی سڑکوں پر پیدل گھومنے کا ایک الگ ہی مزہ ہے مگر شرط یہ ہے کہ انسان آزادی سے گھومے پھرے۔ اس وقت میں جس مصیبت میں تھا' ایسے میں لاہور کی سڑکوں پر مٹر گشت مجھے کیا خاک مزہ دیتی۔ اس کے باوجود میں چلتا رہا اور اس پیدل سفر سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ اس طرح یہ ضرور ہوا کہ میں وقتی طور پر ذہنی دباؤ سے نکل آیا اور خطرے کا احساس تقریباً ختم ہو گیا۔ راستے میں ایک دو جگہ رک کر میں نے اخبارات کے اسٹالز کی طرف دیکھا۔ میں ثمر کے قتل کی خبر پڑھنا چاہتا تھا اور اس حوالے سے پولیس کا موقف جاننا چاہتا تھا مگر ہر اسٹال پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں میری اخبار خریدنے کی ہمت نہ ہوئی۔

راستے میں لنڈا بازار پڑا تو وہاں سے میں نے ایک جوڑی جوتا اور ایک پتلون قمیص خریدی۔ یہ سب سامان سو روپے میں آیا۔ مجھے فوری طور پر لباس بدلنا تھا۔ میں ایک حجام کی دکان میں گیا۔ وہاں نہا دھو کر لباس بدلا۔ پرانے کپڑوں کی گٹھری بنائی اور آگے چل دیا۔ حجام کے ہاں نہانے دھونے اور شیو کرانے میں بیس روپے خرچ ہوئے۔ اب مجھے محتاط رہنا تھا۔ رقم تیزی سے خرچ ہو رہی تھی۔ یہ بھی فرزانہ کی مہربانی تھی کہ میری جیب میں ان اخراجات کے لیے پیسے تھے ورنہ اس وقت نہ جانے میرا کیا حال ہوتا۔

لباس بدلنے کا خیال اس لیے آیا کہ مجھے جس

لباس میں بوبے دودھ والے نے ثمر کے گھر جاتے دیکھا تھا' وہی لباس اب تک میرے جسم پر موجود تھا۔ چنانچہ میں نے لباس بدل ڈالا' ساتھ ہی سینڈلوں کی جگہ پرانے جوتے لے لیے۔ میرا شیو بڑھا ہوا تھا یقیناً یہ بات بوبے نے پولیس کو بتائی ہوگی اس لیے مجھے شیو بھی کرانا پڑا۔ شلوار قمیض کی جگہ پتلون قمیص پہن کر میں نے اپنا حلیہ تقریباً پورا بدل ڈالا تھا۔ اب بوبا دودھ والا بھی میرے سامنے آجاتا تو وہ بھی مجھے پہچان نہیں سکتا تھا۔

لباس بدلنے کے بعد جب میں نے پرانے لباس کی جیبیں ٹٹولیں تو اس کی جیب سے ایک بال پین برآمد ہوا۔ یہ وہی بال پین تھا جو مجھے ثمر کے ہاں سے ملا تھا۔ میں نے یہ بال پین ثمر کو دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کردیا تھا بلکہ اس نے یہ بال پین تقریباً زبردستی مجھے دے دیا تھا۔ یہ غالباً اس کے ہاں آنے والے اس کے چچا کے دوست امیر خان کا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس بال پین کو پھینک دوں' یہ مقتولہ کے ہاں سے مجھے ملا تھا اگر پولیس نے مجھے پکڑ لیا تو یہ بال پین اس بات کا ثبوت بن جاتا کہ میں ثمر کے ہاں گیا تھا۔

میں اس بال پین کو پھینکنے لگا تھا مگر پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ وہ ایک عام سا بال پین ہے' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایسے ہزاروں لاکھوں پین لوگوں کے استعمال میں رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ثمر کے ہاں سے ملنے والا امیر خان کا وہ بال پین اپنے پاس ہی رہنے دیا۔

کچھ دور آگے جانے پر ایک اسٹال نظر آیا جہاں لوگ نہیں تھے۔ صرف ایک بچہ اسٹال پر بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے اخبار خریدا اور بغل میں دبا کر کسی ایسی جگہ کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا جہاں بیٹھ کر آرام سے اس اخبار کا مطالعہ کرسکوں۔ سامنے ہی دو طرفہ سڑکوں کے درمیان ایک چھوٹا سا پارک تھا جو اس وقت ویران نظر آرہا تھا۔ میں جلدی سے ا... ان پارک میں گھس گیا اور اندر جا کر اخبار کھول لیا۔

اخبار کے پہلے ہی صفحے پر ثمر کی تصویر تھی۔ عا... پولیس کو یہ تصویر اس کے کمرے سے ملی ہوگی اور میرے اندازے کے مطابق یہ لگ بھگ پانچ سال پرانی تھی۔ اس میں وہ بیس پچیس سال کی لڑکی نظر آرہی تھی۔ دوسری تصویر اس کے کمرے کی تھی جہاں اسے قتل کیا گیا تھا۔ اس کے قتل کا وقت ساڑھے بارہ بجے کا لکھا ہوا تھا۔ خبر کے مطابق سامنے والی خالہ کو ثمر سے کوئی کام تھا۔ انہوں نے اس کے دروازے پر دستک دی تو نہ اس نے دروازہ کھولا اور نہ جواب دیا۔

انہوں نے آس پاس کے لوگوں کو بتایا۔ ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ اس وقت ثمر کے ... بھی نہیں تھے۔ لہٰذا ان لوگوں نے مل کر دروازہ توڑ دیا اور اندر داخل ہوئے تو انہیں ثمر کی لاش نظر آئی۔ اس کے سینے میں کسی نے چاقو گھونپا ہوا تھا۔ لوگوں نے پولیس کو مطلع کیا۔ پولیس آئی' اس نے کمرے کی تلاشی لی تو بوبے دودھ والے کا بل ملا جو اسی تاریخ کا تھا۔ پولیس نے تھوڑی سی تگ و دو کے بعد بوبے کو تلاش کرلیا۔ اس سے اس معاملے میں پوچھ گچھ کی گئی تو بوبے نے ایک نوجوان کا حلیہ بتایا جو اس وقت ثمر کے ہاں آیا تھا جب بوبا ثمر کو بل دے رہا تھا۔ ثمر نے اسے اندر جانے کو کہا تھا۔

خبر میں یہ بھی لکھا تھا کہ بوبے کا کہنا ہے' وہ نوجوان ثمر سے خاصا بے تکلف معلوم ہوتا تھا جس سے پولیس نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اس نوجوان کا مقتولہ کے گھر اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ اخبار میں میرا یعنی 'مشتبہ شخص' کا جو حلیہ لکھا تھا۔ وہ اتنا عام سا تھا کہ میرے لیے کوئی فوری خطرہ نہیں تھا۔ شاید بوبے دودھ والے کو میرا حلیہ بیان کرنا نہیں آیا تھا پھر وہ خوف کی وجہ سے ایسا نہ کرسکا۔ ویسے بھی سرسری طور پر دیکھنے کے بعد کسی کے ناک نقشے کے بارے میں کوئی خاص بات یاد رکھنا مشکل بھی ہوتا ہے۔ مجھے امید تھی کہ اگر بوبے دودھ والے نے دوبارہ مجھے کہیں دیکھا تو وہ مجھے ہرگز نہیں پہچان سکے گا۔ مجھے اس کا چہرہ یاد نہیں تھا تو وہ میرا چہرہ کیسے یاد رکھ سکتا تھا۔ ہم دونوں نے

ایک دوسرے کو شاید لمحے بھر کے لیے دیکھا ہوگا۔

صرف فرزانہ کو یہ بات معلوم تھی کہ میں ثمر سے ملا تھا...... اور وہ لڑکی میری محبت میں اس قدر شدت سے مبتلا تھی کہ وہ مر تو سکتی تھی مگر میرا نام اپنی زبان پر کبھی نہیں لا سکتی تھی۔ البتہ ایک بات میرے خلاف ضرور جانتی تھی۔ وہ تھی میری اپنے کمرے سے گمشدگی۔

میں اچانک اپنے مالک مکان کو بتائے بغیر اپنا کمرہ چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ اس سے لوگ مجھ پر شک کا اظہار کرسکتے تھے مگر مجھے اس کی بھی زیادہ فکر نہیں تھی۔ جس عمارت میں' میں رہتا تھا' وہ لاری اڈے کے قریب تھی' وہاں صرف چھڑوں' دوسرے شہروں اور دیہات سے آنے والے نوجوانوں کا بسیرا ہوتا تھا۔ یہ لوگ چند روز وہاں قیام کرتے' پھر آگے بڑھ جاتے۔ گویا میری عمارت ایک ہوٹل کی طرح تھی۔ اگر میں مالک مکان کو وہاں نہ ملتا تو وہ تشویش میں مبتلا ہوئے بغیر میری کوٹھری کسی اور کو زیادہ کرائے پر دے دیتا اور خدا کا شکر ادا کرتا کہ مجھ سے جان چھوٹ گئی۔ مگر یہ میری خام خیالی بھی ہوسکتی تھی۔ خیر مجھے اب صرف آگے کا سوچنا تھا کہ اس مشکل سے کیسے نمٹنا ہے۔

میں فرزانہ کے کہنے کے مطابق اس محلے سے دور تھا جہاں ثمر قتل ہوئی تھی مگر سارے شہر سے دور رہنے یا چھپنے کی کوئی ضرورت نہ تھی لہٰذا میں نے اخبار سمیٹا اور چوہدری فاسٹ فوڈ سینٹر کی طرف دوبارہ چل دیا۔ راستے میں ایک اور اسٹال نظر آیا۔ میں نے اس کے اخبارات پر نظر ڈالی' ان میں بھی ثمر کے قتل کی خبر تھی مگر ایک اخبار میں ایک اور ایسی خبر تھی جس کی سرخی پڑھ کر میں چونک گیا۔ میں نے جلدی سے وہ اخبار بھی خرید لیا اور آگے جا کر بس اسٹاپ کے اندر بیٹھ کر پڑھنے لگا۔ اس وقت وہاں کوئی نہ تھا' خبر یہ تھی۔

''گلی میں پائی جانے والی لاش کی شناخت ہوگئی' مرنے والے کا نام امیر خان تھا۔''

مجھے یاد آیا کہ یہ نام میں نے ثمر کی زبان سے سنا تھا۔ اس نے اپنے چچا کے کسی دوست کا مجھ سے ذکر کیا تھا جو اکثر اس کے ہاں آتے رہتے تھے۔ آخری بار وہ اس کے گھر بڑے ہڑبڑاتے ہوئے آئے تھے۔ گھر کی تمام لائٹس بھی انہوں نے بند کردی تھیں۔ مجھے یہ نام یوں بھی یاد رہا کہ میری جیب میں جو بال پین تھا وہ بھی امیر خان کا ہی تھا جو اس روز مجھے صوفے پر سے ملا تھا۔ میں نے یہ بال پین ثمر کو دینا چاہا تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں اسے اپنے پاس رکھوں۔ اسی کی زبانی مجھے یہ پتا چلا تھا کہ یہ بال پین اس کے چچا کے دوست امیر خان کا ہے۔

میں نے امیر خان کے قتل کی پوری خبر پڑھی۔ لکھا تھا۔

''کل صبح سویرے ہی مال کے آخری سرے پر ایک ادھیڑ عمر شخص کی لاش ملی تھی جس کے سر پر کسی وزنی چیز سے ضرب لگا کر اسے ہلاک کردیا گیا تھا اور قاتل نے مقتول کی ساری جیبیں صاف کردی تھیں جس کے باعث اس کی شناخت میں مشکل پیش آرہی تھی مگر بعد میں اس کی شناخت ہوگئی۔ مرنے والے کا نام امیر خان ہے۔ اس کا پاکستانی پاسپورٹ بھی مل گیا ہے۔ وہ دو ایک روز پہلے ہی جاپان سے پاکستان پہنچا تھا۔ پولیس کو امیر خان کا پاسپورٹ شہر کے ایک تھری اسٹار ہوٹل کے کمرے سے ملا ہے جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ امیر خان کا درآمدات و برآمدات کا کاروبار تھا جس کے لیے وہ اکثر بیرون ملک جاتا رہتا تھا۔ اس کی رہائش فیصل آباد میں تھی۔ ایک ہفتے بعد امیر خان کو میکسیکو جانا تھا۔ اس کے پاسپورٹ پر میکسیکو کا ویزا لگا ہوا تھا جس کے ساتھ ایئر ٹکٹ بھی تھا۔ اس ٹکٹ پر ایک ہفتے بعد کی تاریخ درج تھی۔

''اوہ! تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ثمر کے قتل سے ایک روز پہلے رات کو امیر خان ہی ثمر کے گھر آیا تھا۔'' میں نے سوچا۔ ''اور اس وقت وہ خوفزدہ بھی تھا۔ یقیناً اس کے پیچھے دشمن لگے ہوں گے۔ جنہوں نے بعد میں اسے شکار کرلیا...... مگر کیوں۔ وہ کیا جرم کر کے بھاگا تھا۔ کہیں اس نے اپنے ہیروئن فروش ساتھیوں

کو دھوکا تو نہیں دیا تھا۔ عموماً اسمگلروں اور منشیات فروشوں کے گروہ اپنے سے غداری کرنے والوں کو زندہ نہیں چھوڑتے کیونکہ ان کی لغت میں معافی کا لفظ ہی نہیں ہوتا۔

میں کافی دیر تک اس خبر کو بار بار پڑھتا رہا اور واقعات کی کڑی کو جوڑنے کی کوشش کرتا رہا مگر کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تو ایک بار پھر چوہدری فاسٹ فوڈ سینٹر کی طرف روانہ ہوگیا اور ہر خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

گیارہ بجے کے قریب میں چوہدری فوڈ سینٹر پہنچا۔ چونکہ میں آج وقت سے پہلے ہی آ گیا تھا اس لیے چوہدری نے دانت نکالتے ہوئے ستائشی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں نے وہاں آ کر بہت اچھا کیا۔ اب کئی گھنٹے آرام سے گزر سکتے تھے۔ اس فوڈ سینٹر کے اندر میں زیادہ لوگوں...... بالخصوص پولیس والوں کی نظروں سے محفوظ تھا۔ مجھے رات نو بجے فرزانہ سے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ایک پر ملنا تھا۔ اس وقت تک میں اس جگہ آرام و سکون سے بھی رہتا اور چلتے وقت چوہدری سے کچھ پیسے کا آسرا بھی تھا۔ کھانے کا بھی اب کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ جس کے عوض مجھے چوہدری کو کچھ نہ دینا پڑتا۔ میں اندر جا کر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی منیر بھی آ گیا۔ آتے ہی وہ بھی اپنے کام میں لگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد گاہکوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔

''منیر! میں ابھی آ رہا ہوں' دس ایک منٹ میں! ذرا دکان کا خیال رکھنا۔'' چوہدری نے کہا تو منیر نے اور میں نے ایک ساتھ چوہدری کی طرف دیکھا۔

چوہدری کے جانے کے بعد ہم دونوں اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کل منیر میرے ساتھ کس قدر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہا تھا اور آج...... وہ اپنی عادت کے مطابق خاموش تھا۔ اچانک میں چونک گیا۔ میں نے اسے ایک بار دیکھا' پھر دوسری بار دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

اس کی پٹی کھل چکی تھی۔ اس کی پیشانی پر چار لمبے سے نشان نظر آ رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ نشان دیکھے دیکھے سے ہیں۔ وہ نشان کسی بندر کے پنجے کے معلوم ہو رہے تھے۔ گویا اس پر کسی بندر نے حملہ کیا تھا اور اسے پنجے مارے تھے۔ مجھے یکایک یاد آیا کہ میں نے ثمر کے گھر میں گزشتہ روز کھلونا بندر دیکھا تھا جو غالباً اسٹیل کا بنا ہوا تھا۔ مجھے وہ بہت پسند آیا تھا۔

میں اس کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ اس بال پین کی چبھن محسوس کر کے اٹھ کھڑا ہوا جو امیر خان وہیں صوفے پر بھول گیا تھا۔ بال پین کی وجہ سے میری توجہ اس بندر پر سے ہٹ گئی تھی مگر اب مجھے وہ یاد آ گیا تھا۔ وہ اسٹیل کا بندر اچھے خاصے بڑے سائز کا تھا اور ایک کونے میں اسٹینڈ پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں پیر آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اسٹیل کے اس بندر کے پنجے یقیناً تیز رہے ہوں گے۔ غالباً یہ نشان جو منیر کی پیشانی پر نظر آ رہے تھے اسی اسٹیل کے بندر کے تھے۔

''منیر بھائی!'' میں نے اس سے کہا۔ ''یہ نشان...... یہ تو کسی بندر کے پنجوں کے ہیں۔ کہیں تم ثمر کے گھر تو نہیں گئے تھے۔''

''کون ثمر۔'' منیر نے غصے سے سوال کیا۔

''اس کے ہاں ایک اسٹیل کا بندر تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ اسی بندر کے پنجوں کے نشان ہیں۔ اب میں سمجھ گیا...... تم ثمر کے ہاں گئے تھے۔ تم نے ہی اسے قتل کیا ہے۔ شاید ثمر نے اس کھلونے سے تم سے مقابلہ کرنے کی کوشش کی ہوگی' اس اسٹیل کے بندر سے تم پر اپنے بچاؤ کے لئے وار کیا ہوگا۔ تم تھوڑی دیر کے لیے مجھ سے کہہ کر کہیں گئے تھے۔ اسی دوران تم نے کام دکھایا ہے۔''

''تم ضرورت سے زیادہ جان چکے ہو۔'' منیر نے زہر خند کے ساتھ کہا۔ ''تمہارا زندہ رہنا میرے

حق میں زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ لگتا ہے ایک بندہ اور پھڑکانا پڑے گا ورنہ میں......'' یہ کہہ کر وہ خوفناک انداز میں مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا تو میں پلٹ کر بھاگا۔

چوہدری وہاں نہیں تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ میں پچھلے دروازے سے نکل رہا تھا کہ منیر نے مجھے دبوچ لیا۔ میں گھبرا کر نیچے گرا۔ اسی وقت میرے ہاتھ میں بھاری کفگیر آ گیا۔ میں نے وہ کفگیر مضبوطی سے پکڑا اور پیچھے سے منیر کے سر پر ضرب لگا دی۔ منیر کے منہ سے گھٹی گھٹی سے چیخ نکلی اور وہ لمحوں میں زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ میں نے گھبرا کر اس کی نبضیں ٹٹولیں' دل کی دھڑکن چیک کی' آنکھوں کے پپوٹے اٹھا کر دیکھے وہ بالکل بے حس و حرکت تھا۔

''اوہ میرے خدایا! لگتا ہے یہ مر گیا!'' میں نے دل میں کہا اور پچھلے دروازے سے نکل کر خاموشی سے کھسک گیا۔ ابھی ایک قتل کا معاملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ یہ دوسرا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس بار تو معاملہ بالکل صاف تھا۔ منیر میرے ہاتھوں ہی مارا گیا تھا۔ اب بچنے کو کوئی صورت نہ تھی۔ مجھے فوری طور پر فرزانہ سے رابطہ کرنا تھا اور رات کے بجائے اسے ابھی بلانا تھا۔ اس کو اس نئی مصیبت سے آگاہ کرنا تھا۔ اس شہر میں میرا اس کے علاوہ اور کون تھا۔ وہ کوئی بہتر مشورہ دے سکتی تھی جس سے بچاؤ کی کوئی صورت سامنے آ سکتی تھی۔

مسئلہ یہ تھا کہ فرزانہ سے رابطہ کیسے کروں۔ اس محلے میں جا نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ منحوس دودھ والا مجھے دیکھ لیتا تو ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ ادھر منیر کی لاش دریافت ہوتے ہی میری تلاش شروع ہو جاتی۔ وہ تو غنیمت تھا کہ میں نے چوہدری کو بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ میں لاری اڈے کے قریب بادامی باغ میں رہتا ہوں۔ ورنہ وہ پولیس کو اس علاقے کے بارے میں بتا دیتا۔ وہاں کی پولیس تو پہلے ہی میری تلاش میں تھی۔ میرا حلیہ بوبے کے بتائے ہوئے اور چوہدری کے بتائے ہوئے حلئے سے پچ کر جاتا تو دوہرے قتل کا الزام میرے سر آ جاتا۔

یکایک مجھے یاد آیا کہ فرزانہ کے برابر والے گھر میں ٹیلی فون تھا جہاں حمیرا رہتی تھی۔ فرزانہ نے مجھے حمیرا کا نمبر دے رکھا تھا مگر یہ تاکید کی تھی کہ صرف ہنگامی صورت میں وہاں فون کیا جائے اور پیغام نوٹ کرا دیا جائے۔ وہ نمبر میرے پاس تھا۔ میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں تو چھوٹی سی ٹیلی فون بک میں اس کا نمبر مل گیا۔ میں ادھر ادھر دیکھ کر ایک پبلک کال آفس میں گیا اور وہ نمبر ملانے کو کہا۔ پی سی او والا اونگھ رہا تھا۔ اس نے فون میری طرف سرکا دیا اور دوبارہ اونگھنے لگا۔

میں نے حمیرا کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے ہیلو کی آواز آئی تو میں نے ذرا آڑ میں ہو کر مدھم لہجے میں کہا کہ۔ ''میں کراچی سے بول رہا ہوں' مجھے فرزانہ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو اسے برابر سے بلوا دیں۔''

مجھے نہیں معلوم کہ دوسری طرف کون تھا۔ حمیرا تھی' اس کی ماں تھی' بھابھی یا بہن...... بہر حال بس نے کراچی کا حوالہ سن کر مجھے ہولڈ کرنے کو کہا اور فرزانہ کو بلانے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد فرزانہ کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں نے جب ہیلو کہا تو وہ اور بھی گھبرا گئی۔

''جمال! کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے۔ تم نے یہاں فون کیوں کیا ہے۔'' وہ بوکھلاہٹ میں میرا نام لے گئی۔

''سنو فرزانہ! مجھے تم سے ابھی اور اسی وقت ملنا ہے۔ فوراً آ جاؤ۔ بہت اہم بات ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''کہاں آ جاؤ۔'' اس نے پوچھا۔

''شاہی مسجد کے سامنے مینار پاکستان والے پارک میں! میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس وقت میں کرشن نگر کے کونے پر سیکریٹری کی عمارت کے سامنے تھا۔ یہ سیکریٹریٹ کا

…میں کچھ روایات کے مطابق انارکلی دفن تھی۔ آج ایک اور شہزادہ سلیم ایک اور انارکلی کے عشق میں گرفتار تھا مگر اس بار زیرِ عتاب انارکلی نہیں بلکہ شہزادہ سلیم تھا اور لاہور کی سڑکوں پا مارا مارا پھر رہا تھا۔ اسی شہزادے کو آج تاج و تخت کی مدد اور معاونت حاصل نہ تھی۔

میں نے سوچتے سوچتے سر جھٹکا اور وہاں سے جانے والی ویگن کو ہاتھ دے کر اس میں سوار ہو گیا اور مینارِ پاکستان کے سامنے اتر گیا پھر میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ باغ میں اچھے خاصے لوگ موجود تھے۔ میں فرزانہ کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا مگر وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ممکن ہے اسے آنے میں دیر ہو گئی ہو۔ کچھ دیر بعد میں نے فرزانہ کو باغ کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی اور ادھر ادھر پریشان نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ تیر کی طرح میری طرف بڑھی

"جمال...... جمال......" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"ایسے مت گھبراؤ' لوگ دیکھ رہے ہیں۔ نہ جانے کیا سمجھ رہے ہوں گے۔" میں نے اسے سمجھایا تو اس نے خود کو سنبھال لیا۔

وہ بڑی سی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ وہاں سے ہم دونوں نسبتاً ایک پرسکون گوشے میں جا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر تک میں بولنے کے لیے الفاظ ڈھونڈتا رہا' فرزانہ میری طرف بے چین نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"فرزانہ!" میں نے کہا۔ "مجھ سے ایک قتل ہو گیا ہے۔"

"کیا۔" فرزانہ کے منہ سے اتنے زور سے نکلا کہ میں اچھل پڑا اور آس پاس دیکھنے لگا مگر کوئی بھی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ سب سیر و تفریح میں لگے ہوئے تھے۔

"جمال! تم نے کیا کہا۔" فرزانہ نے کہا۔ "ذرا دوبارہ تو کہنا۔ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔"

"ہاں فرزانہ! میں نے منیر کو قتل کر دیا ہے۔ وہ آدمی ہے جو میرے ساتھ چوہدری کے فاسٹ فوڈ سینٹر میں کام کرتا تھا۔" میں نے کہا۔

"مگر کیوں۔ اس سے تمہارا جھگڑا ہوا تھا۔" فرزانہ نے پوچھا۔ "کس بات پر تکرار ہوئی تھی۔"

"میں نے سچ بولا تھا۔" میں نے کہا۔ "منیر نے ثمر کو قتل کیا تھا۔ جب مجھے اس پر شک ہوا تو میں نے اس سے پوچھ لیا۔ وہ مجھے بھی قتل کرنے پر آ گیا۔ میری قسمت اچھی تھی جو میں بچ گیا ورنہ کل اخبار میں میرے قتل کی خبر کے ساتھ تصویر بھی چھپی ہوتی۔"

"خدا نہ کرے جمال!" فرزانہ نے بے قرار ہو کر میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ جیسے ہی اسے اندازہ ہوا کہ اس کا ہاتھ میرے ہونٹوں پر ہے وہ جھینپ گئی اور اس نے اپنا ہاتھ جلدی سے ہٹا لیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور آنکھیں شرم سے جھک گئی تھیں۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ منیر نے ثمر کو قتل کیا ہے۔"

فرزانہ نے سوال کیا تو میں نے اسے منیر کی پیشانی پر پائے جانے والے زخموں کے نشانات کے بارے میں بتایا اور اس اسٹیل کے بندر کا بھی ذکر کیا جو میں نے ثمر کے گھر میں دیکھا تھا۔

میری بات سن کر فرزانہ جلدی سے بولی۔ "ہاں جمال! میں نے بھی ثمر کے گھر میں وہ کھلونا بندر دیکھا تھا۔ وہ اسٹیل کا بنا ہوا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ منیر نے ثمر پر حملہ کیا تو ثمر نے اس بندر کے ذریعے اپنا دفاع کیا ہو گا۔" میں نے کہا تو فرزانہ الجھ گئی۔

"جمال! منیر کا فرزانہ سے کیا تعلق۔ ان دونوں کے درمیان کس وجہ سے ایسی نوبت آئی تھی۔" فرزانہ نے سوال کیا۔

"اب میں کیا بتاؤں۔ تم بتاؤ۔ شاید تمہیں کچھ اندازہ ہو۔ میں سخت پریشان ہوں۔" میں نے فرزانہ سے کہا۔

"جمال! لاہور شہر میں تمہارے لیے مسائل بڑھ گئے ہیں۔" فرزانہ نے کہا۔ "بہتر یہ ہے کہ تم واپس کراچی چلے جاؤ۔ اگر تم یہاں رہے تو کسی نہ کسی وقت پولیس کی گرفت میں آ جاؤ گے۔ ویسے بھی اب تو تم سے منیر کا واقعی قتل ہو گیا ہے۔ جاؤ' کراچی چلے جاؤ۔ وہاں تمہارا گھر ہے' تمہارے ماں باپ ہیں۔ تم نے بہت مشکل دن گزار لیے۔ اب سکون کی زندگی بسر کرو۔"

"فرزانہ! یہ تم نے کیا کہہ دیا۔" میں نے دکھی لہجے میں کہا۔ "میں کراچی جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہم نے ساتھ مرنے جینے کی قسمیں کھائی ہیں۔ ہر دکھ سکھ میں ساتھ رہنے کے وعدے کیے ہیں تو اس مشکل وقت میں تمہیں کیوں چھوڑ جاؤں۔"

"جمال! جذباتی مت بنو۔" فرزانہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تمہیں اس شہر میں خطرہ ہے۔ مجھے نہیں ہے۔ اس لیے تم سے جانے کو کہہ رہی ہوں۔ رہی بات میرے اور تمہارے ایک ساتھ کراچی جانے کی...... تو میں جانتی ہوں کہ تمہارے والد مجھے کبھی قبول نہیں کریں گے۔ تم بڑے لوگ ہو' دولت مند ہو' تمہارا ہم غریبوں سے کیا مقابلہ۔ ایسی بات نہ کہو جو نہ تمہارے بس میں ہے اور نہ میرے بس میں۔"

"یہ نہیں ہو گا...... یہ کبھی نہیں ہو گا۔ ہم نے ہر مشکل میں ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ سو رہیں گے۔ اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہو گی۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "فی الحال منیر اور ثمر کے تعلق پر غور کر دیا کہ ان دونوں میں کیا رشتہ تھا۔ منیر نے ثمر کو کیوں اور کس طرح قتل کیا۔ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔"

فرزانہ تھکی تھکی سی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ آخر اس نے سر جھکا دیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ آج کے دور کا شہزادہ سلیم اپنی انارکلی کو آسانی سے دیوار میں نہیں چننے دے گا۔ اسے پورا تحفظ فراہم کرے گا اور اس کے لیے اپنی جان پر کھیل جائے گا۔

"یہ لو جمال!" یہ کہہ کر فرزانہ نے پانچ سو روپے کا ایک اور نوٹ میری طرف بڑھا دیا۔ "رکھ لو' کام آئیں گے۔ نہ جانے کب تک اس طرح بھٹکنا پڑے۔"

"مجھے پورا حساب لکھ لینا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "بعد میں اچھے حالات آتے ہی واپس کر دوں گا۔"

"اچھا لکھ لو۔" فرزانہ نے ہارے ہوئے انداز میں کہا۔ "اگر تمہاری خوشی اسی میں ہی تو پورا حساب لکھ لو...... بلکہ باقاعدہ بہی کھاتہ تیار کر لو۔"

میں نے جوش میں آ کر ایک کاغذ گھاس پر سے اٹھایا اور جیب میں سے ٹٹول کر بال پین نکال لیا۔

"جانتی ہو' یہ بال پین کس کا ہے۔ کس نے دیا ہے۔" میں نے فرزانہ کو وہ پین دکھاتے ہوئے سوال کیا مگر اس نے زبان سے کچھ نہ کہا بلکہ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔

"یہ بال پین مجھے مقتولہ ثمر کے گھر سے ملا تھا۔" میں نے نہ جانے کیوں ذرا فخر سے بتایا۔ "اس نے خود ہی یہ مجھے تحفے میں دے دیا تھا۔ اس کے گھر آنے والے اس کے چچا کے دوست امیر خان یہ بال پین اس کے گھر میں بھول گئے تھے جن کو بعد میں کسی بے رحم نے قتل کر دیا تھا۔ اس قتل کی تفصیلی خبر اخبار میں آ چکی ہے۔ تم نے پڑھ لی ہو گی۔"

"ہاں' میں نے یہ خبر پڑھی تھی۔" فرزانہ نے بال پین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس شخص کے بارے میں سنا ہے کہ وہ دنیا کے سبھی ملکوں میں جاتا تھا۔ ایسا دولت مند انسان اتنا معمولی بال پین جیب میں رکھے پھرتا تھا۔"

"فرزانہ! نہ جانے کیوں میرا دل یہ کہتا ہے کہ امیر خان نے اس بال پین کو جان بوجھ کر وہاں چھوڑا تھا۔ کیوں۔ اس کا جواب تو ان مرحومین کو ہی معلوم

ہوگا...... ثمر کو یا پھر امیر خان کو۔

میں نے اس بال پین کا ڈھکنا کھولا اور اس سے لکھنے کے لیے جھکایا تو اس میں نوک نکلنے کے بجائے باریک باریک اور چمک دار پتھر سے نکل کر اس کاغذ پر گر گئے جس پر لکھنے والا تھا۔ میں نے ہڑبڑا کر بال پین کو سیدھا کرلیا اور اس کے اندر جھانک کر دیکھا تو اس میں چھوٹے چھوٹے ننھے منے چمکدار پتھر بھرے ہوئے نظر آئے۔ گویا وہ بال پین نہیں بلکہ اس کا صرف خول تھا جو ان جگمگاتے پتھروں سے بھرا ہوا تھا۔

"یہ کیا بھرا ہوا ہے اس میں۔" میں نے قدرے چڑچڑاہٹ سے کہا۔ "پتا نہیں شیشے کا چورا ہے یا......" کہتے کہتے میری نظر فرزانہ کی طرف اٹھی تو وہ آنکھیں پھاڑے اس بال پین کو دیکھے جارہی تھی۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔

"فرزانہ...... اے...... خیالوں کی دنیا سے باہر آؤ...... کہاں کھو گئیں۔" وہ چونک اٹھی جیسے خواب سے جاگ گئی ہو۔

"خیریت تو ہے۔ کیا کوئی جن بھوت دیکھ لیا۔" میں نے پوچھا۔

"جمال! یہ چھوٹے چھوٹے چمکیلے پتھر واپس اس میں ڈالو...... اس بال پین کا ڈھکنا بند کرو اور اسے فوراً چھپالو۔" اس کی آواز میں کوئی ایسی بات تھی' جس کے باعث میں نے جلدی سے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور جلدی سے پارک سے باہر آ گئی۔ باہر آ کر بھی وہ غائب دماغی سے کھڑی آتے جاتے ٹریفک کو دیکھتی رہی۔ میں اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

"جمال! شاہی مسجد کے اندر چلو۔" اس نے کہا تو مجھے پھر حیرت کا جھٹکا لگا مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ اس کے ساتھ خاموشی سے شاہی مسجد کی طرف قدم بڑھا دیے جو سامنے ہی بڑی شان سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔

جس وقت ہم نے سیڑھیوں پر قدم رکھے اسی وقت عصر کی اذان ہوئی۔ ہم آہستہ آہستہ اوپر گئے۔ نماز میں ابھی کچھ دیر تھی اس لیے ہم دونوں ایک طرف جا کر بیٹھ گئے۔ میں ابھی تک پریشان تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے ایسی کون سی بات معلوم ہوگئی ہے' جو اسے چپ لگ گئی ہے۔

"جمال! اس وقت ہم خدا کے گھر میں ہیں لہٰذا جو بات کریں گے ایمانداری سے کریں گے۔" فرزانہ نے کہا۔ میں اب بھی اس کی بات نہیں سمجھا تھا۔

"جمال! اس بال پین کے خول میں ہیرے بھرے ہوئے ہیں۔" فرزانہ نے کہا تو میں اچھل پڑا۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ "خود پر قابو رکھو...... ضرور یہ ہیرے امیر خان کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امیر خان ہیروں کا اسمگلر تھا۔ وہ جاپان سے ہیرے لے کر پاکستان آیا تھا۔ یہاں وہ ثمر کے بیوٹی پارلر کے مالک فرحان کے ساتھ مل کر ہیروں کی اسمگلنگ کرتا تھا اور حسب ضرورت ثمر کے گھر بھی آ جاتا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ ثمر کے ہاں آیا تھا۔ تم نے بتایا تھا کہ ثمر نے تم سے ذکر کیا تھا کہ اس کے چچا کے دوست بوکھلائے ہوئے تھے۔ یقیناً وہ ہیرے لا رہے ہوں گے کہ کوئی دشمن ان کے پیچھے لگ گیا ہوگا۔ انہوں نے ہیروں کا یہ بال پین ثمر کے گھر میں چھپا دیا جس کا ثمر کو علم نہ تھا۔ اس نے انجانے میں یہ بال پین تمہیں دے دیا۔ جب دوسرے چوروں اور بدمعاشوں کو ان ہیروں کی خبر ملی تو وہ امیر خان کو پورے لاہور میں ڈھونڈنے لگے۔ شاید منیر بھی انہی میں سے ایک تھا۔ امیر خان' منیر کے ہاتھ لگ گئے۔ اس نے ان سے ہیروں کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کچھ نہ بتایا جس پر منیر نے ان پر تشدد کیا ہوگا۔ آخر انہوں نے شاید صرف یہ بتا دیا کہ ہیرے ثمر کے پاس ہیں۔ منیر نے انہیں سر پر ضرب لگا کر ہلاک کردیا اور ثمر کے گھر پہنچا مگر ثمر کو اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ ہیرے کہاں اور کس چیز میں چھپے ہوئے تھے۔ ویسے بھی وہ یہ پین تمہیں دے چکی تھی اسی لیے

[...]ن بے چاری کی جان گئی۔ یہ بال پین تم لا[...] [...]ں ساتھ لیے گھومتے پھرتے رہے۔ جس کی وجہ [...] دو انسانی جانیں ضائع ہو چکی تھیں۔ بعد میں منیر [...]ی تمہارے ہاتھوں مارا گیا۔"

"میں نے اسے ہلاک کرنے کی کوئی کوشش [...]یں کی تھی۔" میں نے کہا۔ "میں نے محض اپنا بچاؤ کیا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو خود مارا جاتا۔"

"جمال! خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ ان [...]وں کی وجہ سے منیر نے پہلے امیر خان کو...... اس [...]ے بعد ثمر کو قتل کیا تھا اور خدا نے تمہارے ذریعے منیر کو اس جرم کی سزا دلوا دی۔ وہ اپنی جان سے گیا۔"

"مگر اب...... اب تو یہ ہیرے ہمارے ہی ہیں [...]" میں نے فرزانہ سے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

"مجھے نہیں معلوم کہ یہ ہیرے کس کے ہیں۔" [ف]رزانہ نے کہا۔ "چونکہ یہ اس وقت تمہارے قبضے میں [ہ]یں اس لیے تمہارے ہیں۔ اگر تم نے اس کے [...]الے سے پولیس سے رابطہ کیا اور یہ بات بتائی تو تم [ا]س ایمان داری کے جرم میں اندر کردیے جاؤ گے۔ [تم]ہیں مجرموں اور اسمگلروں کا ساتھی سمجھا جائے گا۔"

"اب کرنا کیا ہے۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"ہیروں کا یہ بال پین اسی طرح اپنی جیب [م]یں رکھے کراچی روانہ ہو جاؤ۔ یہ تمہارے ہیں۔ [ک]راچی جا کر اپنے والدین کے ساتھ نئی زندگی شروع [ک]رو۔ تمہاری یہی ضد تھی نا کہ تم اپنے ہاتھ پیروں [...]ے...... اپنے بل بوتے پر کچھ کر کے دکھاؤ گے...... [خ]دا نے تمہاری مدد کر دی ہے۔ اب تم ان ہیروں کے [م]الک ہو۔ یہ تمہاری ملکیت ہیں۔ ان کی مدد سے تم اپنا [ذ]اتی کام بھی شروع کر سکتے ہو۔" فرزانہ نے کہا۔

"نہیں فرزانہ! میں تمہارے بغیر نہیں جاؤں [گ]ا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تم نے کہا تھا' یہ خدا کا گھر [ہ]ے یہاں ہم جو بھی بات کریں۔ گے' ایمان داری سے [ک]ریں گے...... تو میں پوری ایمان داری سے کہہ رہا [ہ]وں کہ مجھے تم سے محبت ہے...... سچی محبت! میں خدا [...]ے اس پاک گھر میں اقرار کرتا ہوں اور یہ عہد کرتا ہوں کہ میں تمہارے بغیر کراچی نہیں جاؤں گا۔ خدا میری مدد کرے اور مجھے میرے اس قول پر مضبوطی سے ڈٹے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ تم یہاں بیٹھو۔ میں نماز پڑھ کے آتا ہوں۔" نماز کے بعد میں نے خلوص دل سے خدا سے دعا مانگی اور اس سے رہنمائی کا طلب گار ہوا۔ دعا مانگنے کے بعد میرا دل ہلکا ہوگیا اور میں واپس فرزانہ کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے پاس ماسی سرداراں بھی موجود ہیں۔

"پتر جمال!" انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "جب وہ لڑکی حمیرا اس کو بتانے آئی تھی کہ اس کا فون آیا ہے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ فون تیرا ہی ہوسکتا ہے۔ محلے والوں سے اور پولیس سے میں نے جو کچھ سنا ہے اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ تو بالکل بے قصور اور بے گناہ ہے پھر میں نے اس کا پیچھا کیا اور اسے تجھ سے ملتے دیکھ لیا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ تم دونوں اس شہر سے کہیں بھاگنے والے ہو مگر جب تم دونوں شاہی مسجد میں آئے تو میرا دل تمہاری طرف سے صاف ہوگیا۔ تو جب نماز پڑھنے گیا تو میں فرزانہ کے پاس آ گئی۔ اس نے مجھے پوری بات بتا دی۔ بیٹا! تجھے واقعی کراچی چلا جانا چاہیے مگر اکیلے نہیں...... بلکہ فرزانہ کے ساتھ! میں' تم اور فرزانہ تینوں مسجد میں ہیں۔ میں ابھی اس کا نکاح تیرے ساتھ پڑھوا دوں گی۔ امام صاحب بھی موجود ہیں پھر تم دونوں کو کامیاب زندگی گزارنے کی دعا دوں گی۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔"

یہ کہہ کر ماسی سرداراں اپنے پلو سے آنسو صاف کرنے لگیں۔ فرزانہ کی بھی آنکھیں بھر آئی تھیں اور میں خوشی سے مسجد کے میناروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ واقعی خدا کے ہاں دیر ہے' اندھیر نہیں۔

قسمت

حسن علی خان

آج کے ترقی یافتہ دور میں ایک عجیب نفسا نفسی کا عالم ہے حصول زر کے لیے لوگ دیوانے ہوئے جارہے ہیں۔ جائز اور ناجائز کی تمیز ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ معمولی معمولی مفادات کی خاطر لوگ خونی رشتوں کو بھی داؤ پر لگانے سے نہیں چوکتے' ایسی ہی ایک مصنفہ کی کہانی جو اپنی بہن کے شب و روز کیش کرا رہی تھی۔

اس شمارے کی ایک فکر انگیز تحریر

مجھے یہ بات اخبار کے ذریعے پتہ چلی کہ میری بہن کی کتاب بیسٹ سیلر ناولوں کی فہرست میں شامل ہوگئی ہے۔ بیسٹ سیلر کا اعزاز ملتے ہی شہر کے تمام کتاب گھروں نے اس ناول کو اپنے اپنے شوکیسوں میں نمایاں طور پر سجا دیا۔ بعض کتب فروشوں نے ناول کے ٹائٹل کے ساتھ اس کے بیک کور کا ڈسپلے بھی شروع کر دیا۔

ناول کے بیک کور پر کورا کی تصویر چھپی تھی جس میں وہ اپنے ٹائپ رائٹر پر بیٹھی کام میں مصروف تھی۔ اس کی انگلیاں ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ پر تھیں۔ اس کے چہرے پر متانت اور سنجیدگی کے تاثرات تھے۔ اس کی یہ تصویر دیکھ کر اس پر عالم فاضل شخصیت ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

ٹائٹل پر جلی حروف میں ناول کا نام چھپا ہوا تھا۔

''اے ناول بائی کورا اسٹینز یون۔''

ان الفاظ کے نیچے ایک' مردہ عورت کی تصویر تھی جس کی لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس عورت کی عینک ترچھی ہو چکی تھی اور خون کی ایک لکیر اس کے چہری پر بہتی ہوئی گردن تک آچکی تھی۔

ناول کے ٹائٹل پر جس مقتول عورت کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ اس کے خدوخال ایک زندہ حقیقی شخصیت سے بے حد مماثلت رکھتے تھے۔

اور وہ زندہ حقیقی شخصیت میں تھی۔

چونکہ میں خود اس ناول کو پڑھ چکی تھی اس لیے یہ بات میرے لیے کسی طور پر قابل قبول نہیں تھی کہ یہ مشابہت محض اتفاقیہ تھی۔ مثال کے طور پر ناول میں جو فرضی کردار دکھایا گیا تھا' وہ عورت عینک پہنتی تھی۔ میں بھی عینک پہنتی تھی۔ اس فرضی کردار کی عمر پینتیس برس بتائی گئی تھی۔ میری حقیقی عمر بھی پینتیس برس تھی۔ میری بہن کورا کی عمر اکیس برس ہے۔ اس فرضی کردار کا نام لوئس تھا۔ میرا نام بھی لوئس ہے۔ ناول میں لوئس نیو یارک کے ایک بڑے تصویری میگزین میں عنوانات لکھنے کا کام کرتی ہے۔ میں بھی اپنی حقیقی زندگی میں یہی کام کرتی ہوں۔

جب کبھی دنیا کے کسی حصے میں کوئی ایسا واقعہ رونما ہوتا ہے کہ جس کی خبر اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہو تو ہمارا میگزین عام طور پر اس واقعے سے متعلق صرف تصویریں چھاپتا ہے۔ میرا کام یہ تحریر کرنا ہوتا ہے کہ یہ تصویر کب اور کہاں سے اتاری گئی۔ اس میں کون لوگ دکھائی دے رہے ہیں اور تھوڑا بہت اس منظر کی وضاحت کے بارے میں ہوتا ہے لیکن مجھے اپنی صلاحیتیں کھل کر آزمانے کا موقع نہیں ملتا۔

ہمارے میگزین کی زیادہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ اس واقعے کو تحریر کی بجائے تصویروں سے واضح کیا جائے اس لیے بہت سی ضروری باتیں تحریر کرنے سے رہ جاتی ہیں۔

ایک روز صبح میں اپنے کام میں مصروف تھی کہ میرے باس نے میرے کمرے میں قدم رکھا۔ اس وقت' ڈیڈ گیو اوئے' کو بیسٹ سیلر کی فہرست میں شامل ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔

میں اس وقت تصویروں کے لئے یہ عنوان لکھ رہی تھی۔ 'بائیں سے گھڑی کی مانند' میرے کانوں میں اپنے باس کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''تم اپنی بہن کے بارے میں کبھی کوئی بات مجھے نہیں بتاتی ہو۔'' اس کا لہجہ شکایت آمیز تھا۔

''ہوں۔'' میں نے چونکتے ہوئے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

وہ بولا۔ ''کیا تمہاری بہن نے تمہیں اپنے ٹیلیویژن معاہدے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''وہ بھلا مجھے اس بار میں کیونکر بتا سکتی ہے۔ ہمارا ایک دوسرے سے رابطہ ہی نہیں ہے اور یہ بات تم بخوبی جانتے ہو۔ میں خود تمہیں یہ بات بتا چکی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں کم از کم اٹھارہ ہزار مرتبہ تمہیں اپنے اور اپنی بہن کے بارے میں سب کچھ بتا چکی ہوں لیکن اس کے باوجود تم پھر وہی سوال دہرا دیتے ہو!'' میں نے جھنجھلائے لہجے میں جواب دیا۔

''میں نے یہ خبر' پبلشر ویکلی' میں پڑھی ہے۔'' میرے باس نے کہا۔ ''اے بی سی ٹیلیویژن نے' ڈیڈ گیو اوئے' کے حقوق چار گھنٹے کی منی سیریز کے لیے حاصل کر لئے ہیں۔ معاہدے کی رقم لاکھوں ڈالر میں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہاری بہن کے قلم میں واقعی زور ہے۔''

اور پھر اسی روز جب دوپہر کے کھانے کا

دفعہ ہوا تو میں اپنے دفتر سے نکل کھڑی ہوئی۔ راستے میں مجھے جو پہلی ٹریول ایجنسی نظر پڑی، میں اسی میں داخل ہوگئی۔

میں سیدھی استقبالیہ کی میز پر پہنچی۔ ”میں دور کسی جگہ جانا چاہتی ہوں۔“ میں نے استقبالیہ لڑکی سے کہا۔ ”لیکن میں اس سفر کے لئے بحری جہاز کو ترجیح دوں گی۔“ میں نے بحری جہاز کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا تھا کہ دوران سفر اگر کوئی کتاب پسند نہ آئے تو اسے باآسانی سمندر میں پھینکا جاسکتا ہے جب کہ ہوائی سفر کے دوران ایسا مشکل ہوتا ہے۔

میری بات سن کر استقبالیہ لڑکی نے ایک گوشے کی جانب اشارہ کیا اور بولی۔ ”آپ اس میز پر چلی جائیں۔“

میں نے اس لڑکی کے اشارے کی سمت میں نگاہ ڈالی تو ایک شخص کو ایک میز کے پیچھے اپنے ناخنوں کا معائنہ کرتے ہوئے پایا۔

میں سیدھی اس شخص کی میز پر جا پہنچی اور اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”فرمایئے۔“ اس شخص نے سر اٹھا کر سوال کیا۔ ”میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔“

میں بولی۔ ”مجھے بحری سفر کے دوران ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں میں اچھل کر سمندر میں نہ جا پڑوں۔ کیا اس صورت میں میرا بحری جہاز میں سفر کرنے کا ارادہ درست ہوسکتا ہے۔“

اس شخص کو میز پر اسکینڈے نیوین دیو مالا کے مشہور بالشتیے جن کا سرامک کا بنا ہوا ایک مجسمہ رکھا ہوا تھا میں نے اپنے سوال کرنے کے دوران یونہی غیر ارادی طور پر اس مجسمے کو اٹھالیا تھا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ اس مجسمے کے قدموں میں میڈان ناروے، کی مہر لگی ہوئی تھی۔

”آج کل تقریباً ہر بحری جہاز میں توازن برقرار رکھنے کے لیے اسٹیبلائزر موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے جہاز کے ڈولنے اور مسافر کے اچھل کر سمندر میں گرنے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔“

اس شخص نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تو واقعی بے حد اطمینان کی بات ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کیا آپ نے سفر کے لیے کسی خاص مقام کا انتخاب کیا ہے۔“ اس شخص نے پوچھا۔

”ناروے۔“ میں نے بے ساختہ جواب دیا۔ یہ نام خود بخود میری زبان پر آ گیا تھا۔ اگر میں نے ناروے کا نام اس بالشتیے جن کے قدموں میں لکھا ہوا نہ دیکھا ہوتا تو شاید میں کسی اور جگہ کا نام لے لیتی شاید میں کسی ایسے سمندر کا نام لیا، جہاں سفر کی طوالت مجھے بحری سفر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتی لیکن اب یہ نام میری زبان سے نکل چکا تھا اور میں اس میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کرسکتی تھی۔

”ناروے!“ اس شخص نے قدرے تعجب کا اظہار کیا۔ پھر شانے اچکاتے ہوئے اپنی میز کی درازیں ٹٹولنے لگا۔ ”میں دیکھتا ہوں کہ کوئی جہاز ادھر روانہ ہورہا ہے یا نہیں۔ مجھے زبانی اس بارے میں کچھ یاد نہیں۔“

میں چپ چاپ بیٹھی رہی۔

کچھ دیر کاغذات الٹ پلٹ کرنے کے بعد اس شخص نے اپنی دراز میں سے ایک بروشر نکال کر میز پر رکھ دیا اور فاتحانہ انداز میں بولا۔ ”ہاں یہ ایک اسٹیبلائزر سے مزین بحری جہاز ہے کہ جو سویڈن کی بندرگاہ گوٹبرگ سے روانہ ہورہا ہے۔ یہ بحریہ جہاز ناروے کے ساحلی علاقوں میں دوردیہ سفر کرتا ہے۔“

”یہ جہاز کب روانہ ہوگا۔“

”پرسوں۔“ اس شخص نے بروشر پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ کے لیے اتنی کم مہلت میں سفر کرنا ممکن ہوگا۔“

”ارادے کے سامنے وقت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔“ میں نے جواب دیا۔

دفتر پہنچ کر میں نے اپنے باس سے دس دن کی رخصت طلب کی۔ جب اس نے اس اچانک رخصت کی وجہ دریافت کی تو میں نے اپنے خاندان میں کسی کی بیماری کا بہانہ گھڑ لیا۔

”مجھے امید ہے کہ تمہاری بہن کورا بیمار نہیں ہوگی۔“ میرے باس نے کہا۔

”میں تمہیں کتنی بار بتا چکی ہوں کہ کورا اور میں آپس میں بات چیت نہیں کرتے۔“ میں نے چڑ کر کہا۔ ”ہمارا ایک دوسرے سے میل جول ہی نہیں ہے۔ کورا کی صحت اور اس کی خیریت سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم آخر یہ بات سمجھتے کیوں نہیں۔“

☆☆

دوسرے دن شام کو میں ہوائی جہاز سے سیدھی کوپن ہیگن جا پہنچی۔ وہاں سے ایک دوسرے پرواز نے مجھے سویڈن کے ساحلی شہر گوٹبرگ پہنچا دیا میں نے ایئرپورٹ سے ایک ٹیکسی پکڑی اور بندرگاہ پہنچ گئی۔ اس وقت سہ پہر ڈھل رہی تھی۔

اس بحری جہاز کا نام ’ایم ایس اسکوال‘ تھا۔ میں بھی مسافروں کی اس بھیڑ میں شامل ہوگئی جو جہاز کی سیڑھی کے نزدیک جمع تھے۔

جہاز ٹھیک چھ بجے اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔

ایک گھنٹے بعد میں ڈنر کے لئے ڈائننگ ہال میں پہنچی تو مجھے ایک ایسی میز پر لے جایا گیا۔ جو صرف دو افراد کے لئے مخصوص تھی۔ اس میز پر ایک شخص پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی نشست سنبھالی اور پھر اس شخص نے اپنا تعارف کرایا۔ میں نے بھی اپنا نام بتا دیا۔

اس شخص کا نام بلیڈون مارشل تھا۔

میرا نام سنتے ہی وہ شخص چونک پڑا۔ ”لوئس اسٹینز یوں!“ اس نے نام دہرایا۔ ”کیا تمہارا کورا اسٹینز یوں سے کوئی رشتہ ہے۔“

”ہاں۔“ مین نے سر ہلایا۔ ”وہ میری بہن ہے۔“

یہ سنتے ہی اس شخص نے میری بہن کی کتاب کی تعریفیں کرنا شروع کردیں۔ ”میں ٹیکساس کا رہنے والا ہوں۔ میں نے ڈیڈ گیو اوے، اپنے گھر میں پڑھی تھی۔ واقعی بے حد شاندار ناول ہے۔ مجھے یہ ناول کتنا پسند آیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگا سکتی ہو کہ میں نے اس ناول کی متعدد کاپیاں خرید کر اپنے تمام دوستوں کو تحفے کے طور پر بھیج دیں۔“

میں چپ چاپ سب کچھ سنتی رہی۔

”تمہیں تو اس بات پر بے حد فخر ہوتا ہوگا کہ تمہاری بہن اتنی قابل اور ذہین ہے۔“ بیلڈون نے رشک بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے آہستہ سے سر ہلایا اور پھر دوسرے موضوع پر گفتگو شروع کردی۔

”تم کس کاروبار سے منسلک ہو۔“ میں نے سوال کیا۔ ”میں کچھ نہیں کرتا۔“ اس نے جواب دیا۔

اور تب مجھے علم ہوا کہ وہ ایک کروڑپتی شخص ہے پھر مجھے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ اسے کورا کی کتاب کیوں پسند آئی تھی۔ اس کتاب میں مقتول عورت لوئس کے علاوہ تمام کردار بے حد امیر وکبیر بتائے گئے تھے۔ لازمی بات تھی اپنے ماحول اور رتبے کی عکاسی کون شخص پسند نہیں کرتا۔

ڈنر کے دوران ایک اسٹیورڈ نے تمام مسافروں میں اگلے دن کے تفریحی پروگراموں کے بارے میں ایک کتابچہ تقسیم کیا۔ میں اور میرے مقابل بیٹھے ہوئے کروڑپتی شخص نے اپنے اپنے کتابچوں میں پروگراموں کے مختصر جھلکیوں پر نگاہ دوڑانا شروع کردی۔

دس بجے صبح : شفل بورڈ۔

ایلسی اور لیزا، اپر لائف بوٹ ڈیک پر کلاسک کروز لائزڈ ڈیک گیم سے متعارف کرائیں گی۔ یہ ہمارا امتیازی اور منفرد کھیل ہے جس سے یقیناً آپ تمام حضرات بخوبی لطف اندوز ہوں گے۔

گیارہ بج صبح: ہونگز ویگ لاؤنج...... لاٹری۔

آپ بھی اپنی قسمت آزمائیں! شاید آج آپ کی قسمت کا ستارہ عروج پر ہو...... یہ سنہری موقع ہاتھ سے نہ گنوائیں۔

اتنے میں میری توجہ اپنے مقابل پر مبذول ہوگئی جو ڈائننگ روم میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔

مجھے متوجہ پا کر وہ بولا۔ ''وہ کونسی ہے۔''

''کون۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہاری بہن!'' اس نے جواب دیا۔

''میری بہن!'' مین نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''میں نے کتاب کے بیک ٹائٹل پر چھپی ہوئی اس کی تصویر تو دیکھی ہے اور مجھے اس کے خدوخال بھی یاد ہیں لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔''

''بھلا وہ تمہیں یہاں کیونکر دکھائی دے سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ تو نیویارک میں ہے۔ میں اس بحری جہاز میں تنہا سفر کر رہی ہوں۔''

''تو پھر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' بیلڈون نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آخر وہ لوگ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کیا اس کی آواز کا ٹیپ سنائیں گے۔''

مجھے یہ کروڑ پتی شخص خبطی محسوس ہونے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ''مجھے بتاؤ تو سہی آخر تمہیں کس قسم کی پریشانی لاحق ہے۔''

یہ سن کر اس نے اپنے کتابچے میں ایک جگہ انگلی رکھ دی، میں نے اپنے کتابچے میں وہ مقام تلاش کیا جس کی جانب وہ اشارہ کر رہا تھا۔ وہاں یہ پروگرام درج تھا۔

تین بجے سہ پہر۔ مقام! ہونگز ویگ لاؤنج

کورا اسٹینز یون اپنے بیسٹ سیلنگ ناول 'ڈیڈ گیو اوے' سے منتخب حصے پڑھ کر سنائیں گی۔ آپ سب کو اس سنسنی خیز نشست میں مدعو کیا جاتا ہے۔ یقیناً آپ محظوظ ہوں گے۔

''ایکسیکوزمی۔'' میں نے اپنے مقابل سے معذرت چاہتے ہوئے اپنی نشست چھوڑ دی۔

ڈائننگ روم سے نکل کر میں سیدھی پرسر کے دفتر میں جا پہنچی۔ میں نے وہاں پہنچتے ہی مسافروں کی فہرست دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ پھر میں نے مسافروں کی فہرست کا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لینا شروع کیا۔ مسافروں کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے درج تھے۔

کورا اسٹینز یون...... کیبن نمبر ۸۱...... ٹروسو ڈیک

لوئس اسٹینز یون...... کیبن نمبر ۱۱۶...... ہولڈی ڈیک۔

☆☆

اس شب مجھے نیند بالکل بھی نہیں آئی۔ میں رات بھر بستر پر لیٹی کڑھتی رہی۔

میں نے صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا بھی اپنی کیبن ہی میں طلب کیا۔ میں سہ پہر تک اپنے کیبن میں محدود رہی البتہ صرف تھوڑی دیر کے لئے اس وقت کیبن سے باہر نکلی جب تمام مسافروں کو ہنگامی حالت میں لائف بوٹ کے استعمال کے طریقے کے بارے میں ڈرل کرائی جاتی ہے اور اس میں ہر مسافر کی شرکت لازمی ہوتی ہے۔

اور پھر سہ پہر تین بجکر چند منٹ پر میں اپنے کیبن سے نکل کر ہونگز ویگ لاؤنج کی جانب چل پڑی۔

پورا لاؤنج مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ لاؤنج کی تمام نشستیں پر تھیں۔ مسافروں کی ایک بڑی تعداد نشستوں کے پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے لوگوں کے کاندھوں پر سے لاؤنج کا جائزہ لیا۔

لاؤنج کی دوسری جانب ایک اونچا پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔ کورا اسی پلیٹ فارم کی ایک نشست پر بیٹھی اپنے ماسٹر پیس ناول کے اقتباسات سنا رہی تھی۔

مجھ سے یہ سب کچھ نہ دیکھا گیا۔ میں لاؤنج سے نکل کر پرومیڈ ڈیک پر آ گئی اور تازہ سمندری ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ ہمارا جہاز اس وقت ایک پہاڑی چوٹی کے نزدیک سے گزر رہا تھا، میں نے اپنے ذہن سے سب کچھ فراموش کرتے ہوئے اپنی پوری توجہ اس دلکش منظر پر مرکوز کر دی۔

میں اس نظارے میں ایسا کھوئی کہ آس پاس کا دھیان ہی نہیں رہا۔ نہ ہی وقت گزرنے کا احساس ہوا۔

میں اس وقت چونکی جب میرے کانوں ہیں زوردار تالیوں کی گونج سنائی دی۔ میں سمجھ گئی کہ میری بہن کا شو ختم ہو چکا ہے۔ چند لمحوں بعد مسافروں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ڈیک پر نمودار ہونے لگیں۔ وہ سب کے سب اس شو کے بارے میں چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔

اتنے میں کسی نے چیخ کر میرا نام پکارا۔ آواز جانی پہچانی تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بیلڈون مارشل تھا۔

''میں نے تمہیں ہر جگہ تلاش کیا! تم کہاں تھیں۔'' اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''کتنا زبردست پروگرام تھا! خاص طور پر تمہاری بہن کے پڑھنے کا انداز...... واقعی تمہاری بہن ایک ذہین اور......''

''سنو، میں ذرا جلدی میں ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے...... گفٹ شاپ سے کچھ ضروری خریداری کرنی ہے۔ اس لیے میں تم سے گپ شپ نہیں کر سکتی۔'' یہ کہہ کر میں چل پڑی۔

لیکن چند قدم چلنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ کروڑ پتی بیلڈون بھی میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ جب مین ڈیک کی سیڑھیاں اترنے لگی تو وہ میرے پاس آتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ نہیں سکا تم نے مجھ سے یہ کیوں کہا تھا کہ تمہاری بہن نیویارک میں ہے۔''

''سمجھنے کی کوشش بھی مت کرنا۔'' میں نے اسے ٹالنا چاہا، لیکن وہ میرے ساتھ ساتھ گفٹ شاپ تک آ گیا۔ میرا رخ ٹیکس فری سوویئر بوتیک کی جانب تھا۔ بیلڈون کی نگاہ گفٹ شاپ میں داخل ہوتے ہی رینڈیئر کے فروں پر جم گئی جو ایک جانب نہایت سلیقے سے آویزاں تھے۔ وہ تحسین آمیز نگاہوں سے ان کا قریب سے جائزہ لینے لگا۔ میں دوسرے حصے میں چلی گئی۔

وہاں ایک عورت پہلے سے موجود تھی۔ وہ اس شوکیس پر جھکی ہوئی تھی جس میں منگول قوم کے طرز کے زیورات سجے ہوئے تھے۔ میں دبے پاؤں اس عورت کے نزدیک پہنچی اور اپنا منہ اس کے کانوں کے پاس لے جاتے ہوئے بولی۔ ''جوش آمدید کورا۔''

''لوئس! تم......'' وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے رہ گئی۔

''سرپرائز! سرپرائز۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا! یہ تم ہی ہو نا۔''

''ہاں، یہ میں ہی ہوں۔ میں مر کر دوبارہ زندہ ہو گئی ہوں۔''

''لیکن تم یہاں کیا کر رہی ہو۔'' کورا نے پوچھا۔

''یہی سوال میں تم سے بھی پوچھ سکتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

"بھلا نہیں اسکینڈے نیوین ساحلوں سے اچانک دلچسپی کیوں کر پیدا ہوگئی۔"

"میں یہاں سیر و تفریح کے لئے نہیں آئی ہوں۔" کورا نے وضاحت کی۔ "مجھے اپنی نئی کتاب پر کام کرنے کے لیے کسی پرسکون مقام کی تلاش تھی اور پھر اس کام کے لیے بحری جہاز سب سے بہتر سجھائی دیا۔ اس لیے ادھر چلی آئی۔"

"لیکن تم نے 'ایم ایس اسکوال' کا انتخاب ہی کیوں کیا۔" میں نے جاننا چاہا۔

"میں اس جہاز پر مہمان کی حیثیت سے سفر کر رہی ہوں۔" کورا نے جواب دیا۔

"تمہیں کس نے مدعو کیا ہے۔"

"جہاز کے کپتان نے۔" کورا نے کہا۔ "وہ درحقیقت میری تحریروں کا پرستار ہے۔"

اتنے میں میرے کانوں میں بیلڈون کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہا تھا۔ "لوئس۔ تم کہاں ہو۔"

میں نے بیلڈون کی آواز پر کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی بہن سے مخاطب ہو کر بولی۔ "کیا تمہاری نئی کتاب میں بھی قتل کا چکر ہے۔"

"شاید۔" اس نے گول مول جواب دیا۔

"اس مرتبہ تم نے شکار کے لیے کسے منتخب کیا ہے۔" میں نے وضاحت چاہی۔

اتنے میں ایک بار پھر بیلڈون کی آواز ابھری۔ "لوئس! تم کہاں ہو۔ دیکھو' میں نے تمہارے لیے کیا تحفہ خریدا ہے۔"

"یہ میرا اصول ہے کہ میں جس ناول پر کام کر رہی ہوتی ہوں اس کے بارے میں کوئی گفتگو کرنا پسند نہیں کرتی۔" کورا نے دوٹوک جواب دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم یہ بات ذہن نشین کرلو کہ اس مرتبہ تمہارے ناول کی مقتولہ کسی تصویری میگزین کی کیپشن رائٹر اور عینک پہننے والی نہ ہو!" میں نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

اس دوران بیلڈون مجھے تلاش کرتا ہوا آ گیا۔ "اچھا تو تم یہاں ہو۔" یہ کہہ کر اس نے کورا کی جانب دیکھا اور پھر چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ "وہ! تمہاری بہن بھی موجود ہے۔"

"براہ کرم مجھے یہ مشورہ مت دو کہ میں اپنی کتاب میں کیا شامل کروں اور کیا نہ شامل کروں۔" کورا نے مجھے ٹکا سا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے ناول میں جو کردار چاہے دے سکتی ہوں۔"

"کیا تمہیں یہ بات معلوم ہے کہ کسی فرد کے بارے میں ہتک آمیز تحریر پر نالش بھی کی جا سکتی ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کیا تم ہمارا تعارف نہیں کراؤ گی۔" بیلڈون نے کورا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

"نہیں' ابھی نہیں بیلڈون۔" میں نے جواب دیا۔

"شٹ اپ لوئس!" کورا نے مجھے ڈانٹ پلائی پھر بیلڈون کی جانب متوجہ ہو کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "مجھے کورا اسٹینز یون کہتے ہیں۔"

"میں بیلڈون مارشل ہوں۔" اس نے فوراً مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ "تم جیسی معروف مصنفہ سے شرف ملاقات میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔"

"اوہ! شکریہ۔" کورا کا سر فخر سے بلند ہوگیا۔ "تم بے حد پیاری باتیں کرتے ہو' بیلڈون۔"

میں دل ہی دل میں تڑپ کر رہ گئی۔ پھر کورا کو متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ "میں نے جو کچھ کہا ہے' وہ ذہن نشین کرلو' کورا' اگر اب کی بار تم نے مجھے کسی قابل نفرت لاش کے روپ میں پیش کیا تو یہ بات تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوگی۔ تمہیں اپنی اس حرکت پر پچھتانا پڑے گا۔"

"ارے! میں تو باتوں میں بھول ہی گیا

تھا۔" بیلڈون نے ہمارا جھگڑا ختم کرانے کی خاطر درمیان میں ٹانگ اڑائی۔ "دیکھو' لوئس' میں نے تمہارے لیے بالشتیے جن کا مجسمہ خریدا ہے۔"

"تم میرا کیا بگاڑ لوگی۔" کورا نے میری دھمکی کے جواب میں کہا۔ "کیا مجھ پر مقدمہ دائر کردوگی۔"

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "تم اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ میں بہن سمجھ کر تمہیں معاف کردوں گی۔"

"کیا معاف کردوگی۔" بیلڈون نے جاننا چاہا۔ اس کی توجہ شاید کسی اور جانب تھی' اس لیے وہ ہماری بات دھیان سے نہیں سن سکا تھا۔

"میں نے تم سے کچھ نہیں کہا' بیلڈون' پلیز' اس وقت میں کورا سے بات کر رہی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"بائی دے وے' لوئس کیا میں تم سے یہ بات پوچھ سکتی ہوں کہ تمہیں کس چیز کی کشش ایم ایس اسکوال' جیسے خوبصورت بحری جہاز پر لے آئی۔" کورا نے جاننا چاہا۔

"نہیں' تمہیں یہ پوچھنے کا کوئی حق نہیں۔" میں نے رکھائی سے جواب دیا۔

"تم جانتی ہو میں کیا سوچ رہی ہوں۔" کورا نے تیکھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ارے سنو! کیا تم دونوں لڑکیاں میری جانب سے مشروب پینے کی دعوت قبول کر رہی ہو۔" بیلڈون نے ایک مرتبہ پھر ہمارے جھگڑے کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں کسی طرح پتہ چل گیا کہ میں اس بحری جہاز میں سفر کر رہی ہوں۔ اس لیے تم نے سوچا کہ کیوں نہ میری شہرت کی شعاعوں سے تم بھی کچھ تپش حاصل کرلو اور لوگ تمہیں میری بہن کی حیثیت سے جاننے لگیں۔" کورا نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

"تم ایک بیمار ذہن کی مالک ہو۔" میں نے جل کر کہا۔ "تم ہمیشہ سے ایسی ہی بچی کی باتیں کرتی ہو۔"

"لڑکیو! تم نے میری پیشکش کا جواب نہیں دیا۔" بیلڈون نے پھر لقمہ دیا۔ "چاہو تو ہم بار میں چلے چلتے ہیں۔ یا پھر چاہو تو......"

"خدا بہتر جانتا ہے کہ تمہاری اپنی تو کوئی زندگی ہی نہیں ہے۔" کورا نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ "تم روزانہ اس خوفناک میگزین کے دفتر چلی جاتی ہو اور بے تکے چھتے ہوئے چند جملے لکھ کر اپنی گزر اوقات کرلیتی ہو۔ تمہاری اپنی تو کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

"لیڈیز! پلیز۔" بیلڈون نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے' میں جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر میں پلٹ گئی۔

"لوئس' سنو۔" مجھے بیلڈون کی آواز سنائی دی۔ "دیکھو' یہ میں نے تمہارے لیے خریدا ہے۔"

دوسرے لمحے اس نے لپک کر کوئی شے میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ اسکینڈے نیوین دیو مالا کے مشہور بالشتیے جن ٹرول کا مجسمہ تھا۔

میں نے وہ مجسمہ اپنی جیب میں ٹھونسا اور گفٹ شاپ سے نکل اوپر بار میں جا پہنچی۔ میں نے ایک تگڑے مشروب کا آرڈر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مشروب پینے کے بعد میری بھوک اڑ چکی تھی۔ اس لیے میں نے ڈنر گول کر دیا اور وہیں بار میں بیٹھی رہی۔ پھر میں جام پر جام انڈیلتی رہی۔ اس دوران میں نے گھڑ دوڑ پر رقم بھی لگائی لیکن قسمت نے کوئی یاوری نہیں کی۔ ڈنر کے بعد بار میں اسٹیریو کنسرٹ تھا۔ میں کنسرٹ کے دوران موسیقی پر سر دھنتی رہی۔

نصف شب کے قریب میں سونے کے لیے اپنی کیبن میں دوسرے روز صبح میری آنکھ اس

آواز پر کھلی جو جہاز کے پبلک سسٹم سے نشر ہو رہی تھی۔

اس اعلان کے مطابق ان تمام مسافروں کو فوری طور پر ہونگز و یگ لاؤنج میں جمع ہونے کو کہا جارہا تھا، جو جوسٹیڈلز برین نامی مشہور عالم گلیشئر کی سیر کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔

میرا اس گلیشئر کی سیر کا کوئی ارادہ نہیں تھا، اس لیے میں نے اطمینان سے لباس تبدیل کیا اور ناشتے کے لیے ڈائننگ روم میں جا پہنچی۔ پورا ڈائننگ روم خالی پڑا تھا۔ میرے علاوہ وہاں کوئی مسافر نظر نہیں آرہا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوکر میں پرومینیڈ ڈیک پر چلی آئی۔ تب مجھے پتہ چلا کہ جہاز لنگر انداز ہو چکا تھا۔ جو مسافر گلیشئر کی سیر کے لیے جانا چاہتے تھے، وہ سب نیچے ڈیک پر اکٹھا تھے۔ جہاز کے پہلو میں ایک ہرکارکشتی کھڑی تھی۔ مسافر ایک ڈھلان راستے سے اتر کر اس کشتی میں سوار ہو رہے تھے۔

اتنے میں میری نگاہ کورا اور بیلڈون پر پڑی۔ وہ دونوں مسافروں کی بھی سے قدرے الگ تھلگ ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے کشتی میں سوار ہونے کے منتظر کھڑے تھے۔

میں اس وقت تک کھڑی یہ تماشا دیکھتی رہی جب تک تمام مسافر کشتی میں سوار نہیں ہو گئے۔ جب کشتی مسافروں کو لے کر گلیشیئر کی جانب روانہ ہوئی تو میں پرومینیڈ ڈیک سے اتر کر نیچے ٹروسو ڈیک میں چلی آئی۔ کورا کا کیبن اسی ڈیک پر تھا، میں نے اس ڈیک کی راہدری میں ٹہلنا شروع کر دیا۔

میں اس وقت تک راہداری میں ٹہلتی رہی جب تک میں نے اسٹیورڈ، کورا کا بستر صحیح کرنے گیا تھا۔ میں اس وقت کیبن کے پاس منڈلا رہی تھی۔ پھر جیسے ہی میں نے اسٹیورڈ کو تولیہ تبدیل کرنے کے لیے باتھ روم میں جاتے دیکھا، میں دبے پاؤں کیبن میں جا گھسی اور کوئی آواز پیدا کیے بغیر کپڑوں کی الماری میں چھپ گئی۔

الماری بند ہوتے ہی مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ الماری کا خانہ چھوٹا تھا اور میں بمشکل اس میں سما پائی تھی۔ میرا چہرہ اپنی بہن کے گاؤن سے ٹکرا رہا تھا۔

پھر جیسے ہی اسٹیورڈ کے کیبن سے جانے اور دروازے کے تالے میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی، میں ہانپتے ہوئے الماری سے باہر نکل آئی۔ میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر تک لمبے لمبے سانس لیے تو پھر اوسان بحال ہوئے۔

طبیعت سنبھلتے ہی میں نے کیبن کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

ڈریسنگ ٹیبل پر کورا بیسٹ سیلر ناول ڈیڈ کیو اوے، دکھائی دیا۔ اس کے اوپر ایک نوٹ بک پڑی ہوئی تھی۔

میں نے بڑھ کر وہ نوٹ بک اٹھالی۔ کورا نے اپنے نئے ناول کا نام، خونی رشتے، تجویز کیا تھا۔ نوٹ بک کے ٹائٹل پر کورا کی تحریر میں جلی حروف میں بلڈ ریلیشنز، کے الفاظ درج تھے۔ میں نے نوٹ بک کے صفحات پلٹنا شروع کیے تو پتہ چلا کہ تقریباً تمام صفحات بھر چکے تھے۔

کورا نے اپنے نئے ناول کا مسودہ اس نوٹ بک میں پنسل سے تحریر کیا تھا۔

میں نے ایک کرسی سنبھالی اور عینک اتار کر جیب میں رکھ لی۔ پھر اطمینان سے بیٹھ کر نوٹ بک کا ابتداء سے مطالعہ شروع کر دیا۔

پہلا باب

مجھے یہ بات اخبار کے ذریعے پتہ چلی کہ میری بہن کی کتاب بیسٹ سیلر ناولوں کی فہرست میں شامل ہو گئی ہے۔ بیسٹ سیلر کا اعزاز ملتے ہی شہر کے تمام کتاب گھروں نے اس ناول کو اپنے شوکیسوں میں نمایاں طور پر...... مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں آنکھیں پھاڑے

اس تحریر کو دیکھتی رہ گئی۔ یہ لفظ وہی کہانی تھی جو میں نے ابھی تحریر کی ہے۔ ہر بات ہر جملہ من وعن وہی تھا۔

پھر میں نے دوبارہ ابتداء سے اس کہانی کو پڑھنا شروع کیا۔

میرا لنچ کے وقفے میں ٹریول ایجنسی میں جانا، ہوائی جہاز کے ذریعے سویڈن کے ساحلی شہر گوٹبرگ پہنچنا، وہاں سے ٹیکسی میں بندرگاہ جانا، ایم ایس اسکوال میں سوار ہونا، کروڑ پتی شخص سے ملاقات، پھر یہ انکشاف ہونا کہ کورا بھی اس بحری جہاز میں سفر کر رہی ہے۔ اس سے گفٹ شاپ میں ٹکراؤ، گھڑ دوڑ پر داؤ لگانا اور ہارنا، نیم مدہوشی کے عالم میں اسٹیریو کنسرٹ کے دوران سر دھننا...... غرض یہ کہ سب ہی کچھ اس بات میں تحریر تھا۔

"آخر اس تحریر کا کیا مطلب ہے۔" میں سوچ میں ڈوب گئی۔

"کیا میں حقیقت میں کوئی انسانی وجود رکھتی ہوں یا صرف کورا کی نئی کتاب کا ایک کردار بن کر رہ گئی ہوں۔" میں اس بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکی۔

پھر میں کہانی کے اس حصے پر پہنچ گئی جس میں وہ واقعات درج تھے جو مجھ پر صرف چند منٹ پہلے بیتے تھے۔ یعنی میرا کورا کے کیبن میں دبے پاؤں داخل ہو کر الماری میں چھپنا۔ اسٹیورڈ کے جانے کے بعد کورا کے میرے کی تلاشی لینا۔ اس کی نوٹ بک پر نگاہ پڑنا اور اسے اٹھا لینا۔

اب میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہو گئی کہ آگے کیا ہوگا۔ میں نے نوٹ بک کا صفحہ پلٹتے ہوئے آگے کی کہانی پڑھنا شروع کر دی۔

اگلے پیراگراف میں یہ بتایا گیا تھا کہ میں کورا کے کیبن میں بیٹھی اس کے غیر تکمیل شدہ ناول کے مطالعے میں مصروف ہوں، میں نے اس ناول کے تحریر شدہ ساڑھے پانچ باب پڑھ ڈالے

جب میں پڑھنے سے فارغ ہوئی تو گھنٹوں گزر چکے تھے۔ جو کشتی جہاز کے مسافروں کو گلیشئر کی سیر کے لیے لے گئی تھی، وہ اب لوٹ آئی تھی۔ پھر مجھے راہداری میں کورا کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ اپنے کیبن کی جانب آرہی تھی۔ پھر دروازے کے تالے میں کنجی گھومنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے کیبن میں داخل ہو کر مجھے اپنی نوٹ بک پڑھتے دیکھ لیتی ہے۔ وہ مجھ پر الزام لگاتی ہے کہ میں اس کی جاسوسی کر رہی ہوں۔ جواباً میں اس پر جاسوسی کا الزام عائد کرتی ہے ہوں کہ وہ میری ہر حرکت کی نگرانی کرتی چلی آئی ہے۔ ہم دونوں میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ جب میں اس کے کیبن سے نکلنے کے لیے دروازے کی جانب پلٹتی ہوں تو وہ برف کی ایک نوکدار قلم عقب سے میرے دماغ میں گھبو دیتی ہے۔ یہ برف کی قلم وہ گلیشئر کی سیر کے دوران وہاں سے ساتھ لائی تھی میں لڑکھڑاتے قدموں سے نیچے گر پڑتی ہوں۔

یہاں پہنچ کر ناول کا پہلا باب ختم ہو گیا تھا۔

تو کیا یہی میرا انجام ہے۔...... میں سوچ میں ڈوب گئی۔ میں صرف تینتیس برس کی عمر میں مر جاؤں گی۔ اور وہ بھی اپنی سگی بہن کے ہاتھوں۔ اس تصور کے ساتھ ہی میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

اور پھر میں نے لرزتے بدن کے ساتھ دوسرے باب کا مطالعہ شروع کر دیا۔

اس باب میں کہانی میری بجائے تیسرے فرد کی زبانی آگے بڑھائی گئی تھی۔

کہانی یہاں سے شروع ہوتی تھی کہ کورا نے ابھی ابھی لوئس کو قتل کیا ہے۔ پھر وہ برف کی نوکدار قلم جس سے اس نے لوئس کے دماغ پر وار کیا تھا۔ سنک میں اچھال دیتی ہے تاکہ وہ پگھلنے کے بعد پانی بن کر بہہ جائے اور آلہ قتل کا سراغ نہ مل سکے پھر وہ اپنے کیبن سے نکل کر کروڑ پتی

شخص کے پاس جاتی ہے اور اسے یہ اندوہناک خبر سناتی ہے کہ اس کی بہن کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔ اس کی بہن لوئس گزشتہ روز گفٹ شاپ کی بوتیک میں اپنے نامناسب رویے کی معافی مانگنے اس کے کیبن میں آئی تھی۔ وہ اپنے رویے پر بے حد شرمسار تھی۔ پھر وہ دونوں صلح کرنے پر آمادہ ہوگئیں۔ لیکن پھر جیسے ہی وہ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے کے لیے آگے بڑھی تھیں کہ اچانک لوئس کا پیر کسی چیز میں الجھ گیا اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھی۔ گرنے کے دوران اس کا سر ڈریسنگ ٹیبل کے کونے سے ٹکرایا اور دماغی چوٹ کے باعث وہ وہیں ختم ہوگئی۔

یہ قصہ سنانے کے بعد کورا اس کروڑ پتی شخص سے یہ بات کہتی ہے کہ اگر اس حدثے کی خبر اس کے کیبن سے باہر نکلی تو پھر آگ کی مانند پوری دنیا میں پھیل جائے گی جس سے اس کی شہرت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے کیوں نہ سب کی بہتری کے لیے سیدھے سادے طریقے سے لوئس کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ ادھر کروڑ پتی شخص کورا کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے اس کے ہمراہ اس کے کیبن میں چلا آتا ہے۔ پھر وہ دونوں رات ڈھلنے کا انتظار کرتے ہیں۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے جب جہاز کے تمام مسافر اور عملے کے لوگ گہری نیند میں ہوتے ہیں وہ دونوں لوئس کی لاش کیبن سے نکال کر پرومینیڈ ڈیک پر لے جاتے ہیں اور اسے خاموشی سے سمندر میں اچھال دیتے ہیں۔

اس مقام پر ناول کا دوسرا باب ختم ہوجاتا ہے۔

تب مجھے احساس ہوا کہ میرے جسم کی لرزش تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ میں اس دوران کہانی پڑھنے میں ایسی مگن رہی تھی کہ مجھے اپنی کیفیت کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

پھر میں نے تیسرے باب کی کہانی کا آغاز کردیا۔

اس باب میں کورا اور کروڑ پتی شخص ایک دسرے کی محبت میں گرفتار ہوجاتے ہیں اور پھر اس بحری سفر کے دوران جہاز کا کپتان ان دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کردیتا ہے۔ ادھر لوئس کی لاش بہتی ہوئی ناروے کے ساحل گیرینگر پر پہنچ جاتی ہے۔ لوئس کی لاش ملنے پر اس کی موت کے اسباب کی تحقیقات شروع ہوجاتی ہیں اور پھر اس کی موت کی وجہ خودکشی قرار دے کر کیس داخل دفتر کردیا جاتا ہے۔

یہ تیسرے باب کا اختتام تھا۔

چوتھے باب میں کورا اور کروڑ پتی شخص کو ٹیکساس میں مستقل رہائش اختیار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے جہاں اس کروڑ پتی شخص کا محل نما مکان اور جائیداد ہے۔ وہاں پہنچ کر کورا کو پتہ چلتا ہے کہ اس کے شوہر کا اپنی بچپن کی محبوبہ کے ساتھ معاشقہ چل رہا ہے وہ لڑکی ٹیکساس میں متعدد تیل کے کنوؤں کے مالک کی اکلوتی بیٹی اور اس کی تمام جائیداد کی واحد وارث ہوتی ہے۔ اس لڑکی میں اپنی شوہر کی دلچسپی کورا کی نگاہوں سے چھپی نہیں رہتی اور بالا آخر کورا کے اصرار پر وہ شخص اپنی محبت کا اعتراف کرلیتا ہے۔ یہ سنتے ہی کورا کے خوابوں کے محل چکنا چور ہوجاتے ہیں اور وہ خود کو تباہ و برباد سمجھے لگتی ہے۔

یوں چوتھا باب اختتام کو پہنچتا ہے۔

پانچویں باب میں بتایا گیا ہی کہ کورا اپنے بے وفا شوہر سے انتقام لینے کا مصمم ارادہ کرلیتی ہے۔ وہ اپنی بہن لوئس کی موت کی سرکاری سطح پر وہ خودکشی کو چیلنج کرتے ہوئے موت کے اسباب کی دوبارہ تحقیقات کا مطالبہ کرتی ہے۔ مقدمے کے دوران کورا ایک عینی گواہ عدالت میں پیش کرتی ہے۔ یہ گواہ بحری جہاز ایم ایس اسکوال کی گفٹ شاپ کی وہ سیلز گرل ہوتی ہے جس نے بالشتیے جن کا مجسمہ کروڑ پتی شخص کے ہاتھ فروخت

کیا تھا۔ یہ مجسمہ بعد میں لوئس کی لاش کے لباس سے برآمد ہوتا ہے۔ اس سیلز گرل کی حلفیہ شہادت سے مقدمے میں ایک نئی جان پڑ جاتی ہے۔ عدالت کیس کا اس نئے نکتے کی روشنی میں جائزہ لینے کے حکم دے کر برخاست ہوجاتی ہے۔

یہ پانچویں باب کا اختتام تھا۔

چھٹے باب کا آغاز بھی عدالت کی کارروائی سے ہوتا ہے۔ کروڑ پتی شخص پر قتل کے الزام میں مقدمہ چلتا ہے اور اسے عمر قید کی سزا سنا دی جاتی ہے۔ وہ شخص اپنی بے گناہی کے بارے میں خوب واویلا مچاتا ہے لیکن اندھا قانون انصاف کرچکا ہوتا ہے۔ اس شخص کو سزا کاٹنے کے لیے اوسلو کے ایک اصلاحی قید خانے میں بھیج دیا جاتا ہے۔ کورا کو طلاق مل جاتی ہے اور وہ ٹیکساس لوٹ آتی ہے۔

یہاں پہنچ کر کہانی نا تمام رہ گئی کیونکہ اس کے بعد نوٹ بک میں کوئی تحریر نہیں تھی۔

میں نے نوٹ بک واپس رکھ دی اور اپنی دستی گھڑی میں وقت دیکھا۔

اس وقت سہ پہر کے چار بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔

وقت ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ یہ میرے بچ نکلنے کا واحد موقع ہے...... مجھے اپنی قسمت دوبارہ تحریر کرنا ہوگی۔ لیکن کس طرح...... مجھے اپنی قسمت دوبارہ تحریر کرنا ہوگی۔ لیکن کس طرح...... بس یہی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اس سے پہلے کبھی زندگی میں کوئی من گھڑت افسانہ یا کہانی تحریر نہیں کی تھی۔

آخر یہ سب ناول نگار اپنے ناولوں کے لیے خیالات کہاں سے حاصل کرتے ہیں۔

میں نے اپنی عینک پہنی اور پورٹ ہول سے باہر سمندر کا نظاہرہ کرنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ شاید نصف شب کے سوچ کی سرزمین کے نظارے سے کوئی اچھوتا خیال ذہن میں آجائے اور میری یہ مشکل حل ہوجائے۔

لیکن مجھے زیادہ دیر نظارہ بازی کا موقع نہیں مل سکا اس کی وجہ وہ کشتی تھی جو دور سے آتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ وہی کشتی تھی جو مسافروں کو گلیشیئر کی سیر کرانے لے گئی تھی۔ اب یہ کشتی ایم ایس اسکوال کی جانب واپس آ رہی تھی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ سیر مکمل ہوچکی ہے۔

لیکن دوسرے لمحے مجھ پر خوف و دہشت طاری ہوگئی۔ مسافروں میں کورا بھی شامل تھی۔ اس کی واپسی کا مطلب تھا کہ میری زندگی کے دن پورے ہوچکے ہیں۔

میں پریشان ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔ میر ذہن ماؤف ہورہا تھا۔ اور پھر ادھر ادھر ٹہلنے سے مجھے اس مشکل کا بہترین حل سمجھائی دیا۔ اور وہ حل تھا...... ادھر سے ادھر۔

میں نے لپک کر نوٹ بک اٹھائی اور پھر میز پر رکھے ہوئے ربڑ کی مدد سے دوسرے باب میں جہاں جہاں میرا اور کورا کا نام تحریر تھا، اسے مٹا دیا۔ پھر میں نے خالی جگہوں پر لوئس کے نام کی جگہ کورا کا نام اور کورا کے نام کی جگہ لوئس کا نام تحریر کردیا۔

پھر میں نے پوری نوٹ بک میں یہ نام مٹاتے ہوئے کورا اور لوئس کے نام ایک دوسرے سے تبدیل کردیئے۔ البتہ پہلے باب کے ناموں میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی۔ صرف اس باب کا جو انجام کورا نے تحریر کیا تھا اسے بالکل ہی مٹا دیا۔ اس کی جگہ میں نے تیزی سے وہ انجام لکھنا شروع کیا جس کا خیال میرے ذہن میں ابھرا تھا۔

اپنی ملازمت کے دوران تصویروں کے عنوانات تحریر کرنے نے مجھے مختصر لیکن جامع جملے لکھنے کا فن سکھا دیا تھا۔ اس لیے میں نے اس باب کا انجام تحریر کرنے میں یہ بات ذہن میں رکھی کہ

میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ وہ سادہ مختصر لیکن بامقصد ہو۔

اور پھر کچھ دیر بعد میرے کانوں میں قدموں کی آہٹ سنائی دی جو بتدریج نزدیک آ رہی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ کورا ہے جو اس وقت راہداری میں پہنچ چکی ہے۔

میری انگلیاں برق رفتاری سے صفحے پر گردش کرنے لگیں۔ اور پھر ادھر جیسے ہی دروازے کے تالے میں چابی گھمانے کی آواز آئی میں نے اس باب کا آخری جملہ مکمل کر دیا۔ پھر فوراً ہی جملہ مکمل ہونے کا نشان لگاتے ہوئے لپک کر دروازے کی آڑ میں دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

دروازہ کھلا اور میری بہن کیبن میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں برف کی ایک نوکدار قلم دبی ہوئی تھی۔

میں نے اپنے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میری انگلیوں نے جیب میں پڑے ہوئے بالشتیے جن کے مجسمے کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔

دوسرے لمحے میں نے اچھل کر بالشتیے جن کے مجسمے سے کورا کی کھوپڑی پر ایک بھرپور وار کیا۔

کورا کوئی آواز نکالے بغیر کیبن کے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ میں نے جھک کر بالشتیے جن کا مجسمہ اس کے قیمتی کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔

اب میری زندگی کا ایک باب مکمل ہو چکا تھا۔

لیکن زندگی کا دوسرا باب بھی ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں کیبن سے نکل کر کروڑ پتی بیلڈون مارشل کی تلاش میں چل پڑی۔ میں اسے جلد از جلد اس افسوسناک حادثے کی خبر سنانا چاہتی تھی جو میری بہن کو پیش آ چکا تھا۔

ادھوری تکمیل

آمنہ ناصر حسین

بہت سی ایسی باتیں تھیں جن کو ابھی ہونا تھا
کچھ خواب تھے نامکمل جنہیں تعبیر ہونا تھا
زندگی تیرے سائے میں اگر گزرتی تو
بہت سے رنج والم کھو بھی سکتے تھے
تیری بانہوں کے سہارے میں
تیری نظروں کے دائرے میں
جیون کے کارزار میں کئی صدیاں جی بھی سکتے تھے
لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہو سکا
اب من کا ایسا عالم ہے
عجیب سی ہاری ہوئی شکستہ ذات کی تصویر ہیں ہم
جس کی تقدیر تیری کسی نظر میں نہیں
شبوں کے وحشت ناک لمحوں میں
بکھرے ٹوٹے حوصلوں کے بخت پہ روتے ہیں
خود اپنی ہی نظر میں کرب ناک سفر کی تفسیر ہیں ہم
کبھی بھول کر بھی تیری خوشبو اگر چھو جائے تو
اپنے ریزہ ریزہ وجود کی تاریکی پہ روتے ہیں
جو نظر پڑ جائے اپنے ہاتھوں پہ
تیرے نامکمل لمس کو بار بار چھوتے ہیں
اپنی ادھوری تکمیل کی بدبختی پہ روتے ہیں

بے بسی

نادیہ ملک

عمر بھر رفاقتیں اور رشتے اسی لیے استوار کیے جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹے جائیں لیکن کبھی کبھی.....

اس مایوس کن جوڑے کی کہانی

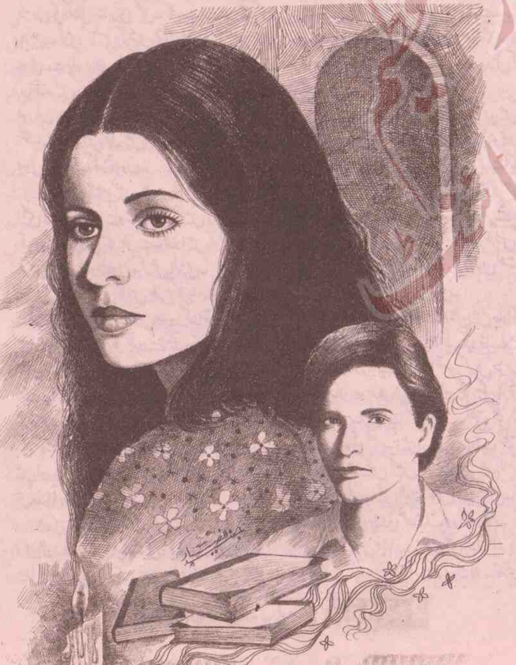

کرنل اور اس کی بیوی مجھے ہمیشہ سے یہ ایک مایوس کن جوڑا لگتا تھا۔ دونوں میں کوئی ہم آہنگی نہ تھی۔ پہلی بار میں نے انہیں ونڈسر کے آفیسرز میس میں دیکھا تھا۔ یہ سردیوں کا زمانہ تھا۔ کرنل کی بیوی نے ایک فرکوٹ پہن رکھا تھا۔ لگتا تھا یہ کرنل ہی کے شکار کردہ جانور سے بنا ہوگا۔ عورت کا چہرہ خشمناک قسم کا تھا اور وہ کسی پتھر کی طرح سخت لگتی تھی۔

رہا خود کرنل ہو سکتا ہے جنگوں میں حصہ لینے کی وجہ سے اس کے اندر یہ سردمہری پیدا ہو گئی ہو۔ بہرحال اس وقت وہ وہاں موجود تھا اور اس کے سینے پر تمغوں کی ایک جھالر لگی ہوئی تھی جو اس کے جنگی کارناموں کی کہانی سنا رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ بارعب آدمی مسلسل کوشاں تھا کہ اس کی آنکھیں اپنی بیوی سے چار نہ ہونے پائیں۔ اس کا پورا وجود جیسے کہہ رہا تھا۔ میں نے شمشیرزن افغانوں کا بھی مقابلہ کیا ہے اور ان جرمنوں نے نمٹا ہوں جن کے پاس آتشیں ہتھیار تھے مگر اس جگہ میں شکست کھا چکا ہوں میں اپنی بیوی سے خوف کھاتا ہوں۔

میں کرنل کا نام نہیں لکھوں گا کیونکہ اس کی بیوی ابھی زندہ ہے اور سیلو کے علاقے میں رہتی ہے۔ وہ آج بھی ویسی ہی تند خو ہے۔ لہٰذا میں کرنل کا ایک فرضی نام رکھے دیتا ہوں۔ کرنل پالٹری۔

ایک ایسے شخص کا اس طرح کا براسا ذکر، جسے میں نے بعد میں اس حالت میں مردہ دیکھا تھا کہ اس کے سینے میں ایک جاپانی کا خنجر دستے تک دھنسا ہوا تھا، کوئی اچھی بات نہیں۔ لیکن ہم دونوں ان دنوں جاوا میں ایک ساتھ، تین برس تک قید رہے تھے اور اس جگہ میں اس سے خاصا نفرت زدہ ہو گیا تھا۔ اس قدر کہ اس کی موت پر کوئی افسوس بھی مجھے نہیں ہوا تھا۔ اس عمر میں اور پھر جن تجربوں سے میں گزرا ہوں، آدمی ذرا کم ہی جذباتی رہ جاتا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں یہ کہانی درمیان سے شروع کرکے پیچھے کی طرف جاؤں۔ ذرا میرا تصور کریں۔ ایک تھکا ہوا برطانوی میجر، عمر تینتالیس سال، دبلا پتلا، لانبا اور خاموش طبع اپنے خیالات کو اپنے اندر بٹور کر رکھنے والا۔ کسی سمندری ہشت پا کی طرح خود کو سمیٹے سکوڑے ہوئے۔

منظر! بحیرہ سرخ میں چلتا ہوا، وہ سپاہیوں سے لدا ہوا جنگی جہاز، جو آخری جنگ کے خاتمے پر وطن واپس ہو رہا ہے۔

دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور میں عرشے پر سے ماؤنٹ سینائی کی بلند چوٹی کی دیکھ رہا تھا جو بحیرہ عرب کے نیلے آسمان تک چلی گئی تھی۔

میرے سامنے میری منزل تھی۔ انگلینڈ اور وہاں میرے والد تھے اور میرا بیٹا بھی۔ دونوں میرے منتظر تھے۔ میرا بیٹا کسی مرغی کی طرح موٹا ہے۔ یہ اطلاع میرے بوڑھے والد نے خط میں لکھی تھی۔ جو میری بیوی کی موت کے لمحے سے ہی اسے پرورش کر رہے تھے۔

گویا یہی دو نعمتیں تھیں جو میرے دامن میں گرنے والی تھیں۔ ایک بہت عزیز، بوڑھا باپ، جو بموں سے بچ رہا تھا اور کاران ویل کے میدانوں میں بنے ایک گھر میں رہ رہا تھا اور میرا بیٹا، وہ بھی محفوظ تھا اور صحت مند تھا اور یہ دونوں میرے گھر واپسی کے منتظر تھے۔ میری بیوی مر چکی تھی اور مجھے اکیلے ہی سونا تھا مگر اس گھر میں میرا باپ بھی تھا اور میرا بیٹا بھی اور یہ دونوں نعمتیں ایسی تھیں کہ واپسی اچھی لگ رہی تھی۔

میرے پیچھے وہ تین سال تھے جن میں جاوا کی ایک ریلوے لائن کے کنارے بنے ایک قید خانے میں مجھے رہنا پڑا تھا۔ ذرا ایک وادی کا تصور کریں جو پہاڑیوں کے درمیان ہو جہاں زیادہ تر وقت ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہتی ہو۔ یہاں جب کبھی دھوپ نکلتی تھی تو بلا کی گھمس ہوتی تھی۔ زمین سے جیسے بھاپ نکلتی تھی۔ اسی جگہ وہ عمارتیں تھیں بنگلہ نما۔ جن میں ہمیں رکھا گیا تھا۔ یہاں راتیں البتہ اچھی ہوتی تھیں۔ نکلا ہوا چاند، پھیلی ہوئی چاندنی، ٹھنڈک اور خاموشی۔

شاید میں اس فضا سے لطف بھی اٹھاتا، اگر وہاں ہوا ہر طرف، بے رحم، جاپانی سنتری نہ ہوتے جو ہمیں

مسلسل دیکھتے رہتے تھے اور نگرانی کرتے رہتے تھے جو دبے پاؤں چلتے تھے اور جن کے پیروں کی یہ ہلکی چاپیں بے حد پراسرار لگتی تھیں۔

"یہاں پر Cannas کے باغات تھے اور جب ان کے اندر بڑے بڑے سرخ اور زرد پھول لگتے تھے تو یہ ہمیں پرچم جیسے لگتے تھے اور ان سے ہمارے دلوں کو تقویت ملتی تھی۔ ہم کو اپنی عزت نفس، اپنے وقار اور اپنے صبر کو سنبھالنے میں مدد ملتی تھی۔ یہ معاملہ بھی ایک جنگ جیسا تھا اور چونکہ کرنل پالٹری نے یہ جنگ ہار دی تھی، مجھے اس شخص سے چڑ ہو گئی تھی۔"

کسی برطانوی کے لیے ایک باغ کسی ٹانک جیسا ہوتا ہے۔ زمین سے اسے عشق ہوتا ہے خواہ وہ کسی ملک کی کیوں نہ ہو۔ جیلابونگ کے اس قیدی کیمپ میں ہم اٹھارہ افراد تھے۔ سب کے سب آفیسر تھے۔

یہاں پہنچنے کے تیسرے ہی دن، ہم نے لکڑی کی پھاوڑے بنائے تھے اور پھر ہم نے اس جگہ چھ عدد بڑی بڑی، پھولوں کی کیاریاں کھودی تھیں۔ ان میں ہم نے کیناز اور اسی طرح کے متعدد جنگلی پھول بوئے تھے۔ سفاک آنکھوں والے نک چڑھے جاپانی سنتری ہم پر خاصا ہنسے تھے۔ خصوصاً" جب ہم نے اپنی اگائی سبزیاں کھانے کے لیے پکائی تھیں۔ ہمیں دن میں صرف پانچ اونس چاول ملتے تھے اور ہم نے خود اس کھانے میں ایک تنوع پیدا کیا تھا۔

ہم نے ٹین کے ڈبوں کو بطور گلدان استعمال کرتے ہوئے اپنے کمرے بھی سجائے تھے، تاکہ گھر جیسی فضا محسوس کر سکیں۔

اس دوران جاپانی سنتریوں میں سے ایک دو کا رویہ ہمارے ساتھ کس قدر بہتر ہو گیا تھا۔ البتہ کرنل پالٹری ایک ابدی قسم کا خبیث تھا۔ وہ ہمارے کسی کام میں شریک نہیں ہوتا تھا۔

بلاشبہ خاص طور پر مجھے جاپانیوں سے نفرت تھی اور وہ بھی ایک دشمن جیسے ہی تھے۔ سفاک، مغرور، سازشی، تاہم ان کی فطرت کا ایک رخ ایسا بھی تھا جو مجھے دلکش لگتا تھا۔ یہ سب کے سب اکثر بالکل بچوں جیسے بن جاتے تھے، انہیں ان باتوں میں بہت دلچسپی تھی جن میں عموماً" بچے دلچسپی لیتے ہیں۔ سنتریوں کی خواہش تھی کہ ہم انہیں انگریزی کی نرسری رائم اور گانے وغیرہ یاد کرائیں۔ ویسے تو یہ بات بڑی ہی مضحکہ خیز تھی کہ کوئی سنگین بردار سپاہی مستعدی سے کھڑے ہوکر بچوں کی نظم گنگنائے... رکوری... ڈکوری... ڈاک...

بہرحال ہمارے لیے بہتر یہی تھا کہ ان سنتریوں کے ساتھ اچھے روابط رکھیں کیونکہ ان کے ساتھ ہی ہمیں رہنا تھا مگر کرنل پالٹری بے حد نک چڑھا اور مغرور شخص تھا اور ان سنتریوں کو کبھی منہ نہیں لگاتا تھا۔ تمام سنتری اس سے چڑتے تھے۔ غالباً" اسے سیاسی فراست کی ذرا بھی تمیز نہ تھی۔ اس کے اندر کوئی گرمجوشی بھی نہ تھی۔ میں اس وقت جو کہانی سنانا چاہتا ہوں وہ اس روز کی ہے جب ایک دن اس کے پاس گیا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ غصے سے لال پیلا ہو رہا ہے۔ ایک سنتری اس کے پیٹ سے سنگین لگائے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کرنل کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا جبکہ سنتری مسکرا رہا تھا۔ پتا نہیں کیسے، ورنہ اس وقت تو وہی ہمارا آقا تھا۔

کرنل نے مجھے دیکھا تو کہا۔ "ارے اس گندے آدمی کو کسی طرح ہٹاؤ۔ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ مجھے اس وقت تک نہیں جانے دے گا جب تک میں اسے کوئی نرسری رائم نہیں بتاتا۔ یہ عجیب پاگل آدمی ہے۔"

میں سنتری کی طرف بڑھا، وہ مجھے دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرایا لیکن اس نے اپنی سنگین اس طرح لگائے رکھی، میں نے اپنا وقار قائم رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "کیا معاملہ ہے؟"

جواب میں کرنل پالٹری دوبارہ بولا۔ "یہ احمق مجھے روکے ہوئے ہے۔ کہتا ہے کہ میں اسے کوئی نرسری رائم سناؤں۔ مجھے کوئی رائم نہیں آتی تم ایک بچے کے باپ ہو۔ شاید تمہیں یاد ہو کوئی۔"

میں نے اپنی قیمتی پنسل نکالی اور سنتری نے فوراً" ہی سنگین جھکائی، اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ بھی نکال کر مجھے دیا۔ میں نے بڑے بڑے حروف میں اسے

"ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار والی رائم لکھ کرا سے دے دی۔"

کاش آپ کرنل کا چہرہ اس وقت دیکھ سکتے جب سنتری کے لیے میں بہت ٹھہر ٹھہر کر اس کے بول دہرا رہا تھا۔ کچھ بار جاپانی نے میری نقل کی' پھر بولا۔ "میں نے تھوڑی سے انگلش پڑھی ہے۔"

جب ہم وہاں سے چلے تو کرنل بڑبڑایا۔ "گدھا کہیں کا۔۔۔"

میں نے کہا۔ "اس سے قبل کہ ان سنتریوں میں سے کوئی ہمیں مار دے ہمیں کچھ رائم سیکھ لینی چاہیے۔"

کرنل نے مجھے گھور کو دیکھا مگر میں اپنی رفتار بڑھا کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

☼ ☼ ☼

یہ کوئی ہفتے' پھر بعد کی بات ہے کہ ایک روز میرے کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور میں نے کیپٹن لوگر کو اندر گھستے دیکھا۔

"کرنل کو کسی نے چاقو مار کر ہلاک کر دیا ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے بتایا۔ لوگر میرے کمرے سے ملحق کمرے میں رہتا تھا اور وہ عموماً" بوڑھے پالٹری کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ یہ دونوں کسی نہ کسی طرح ہم خیال ہی تھے' اسی لیے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔

میں لوگر کے ساتھ لپکا۔ میں نے غریب پالٹری کو دیکھا۔ اس کے سینے میں دل کی جگہ ایک گہرا زخم لگا ہوا تھا۔ کسی خنجر سے اسے مارا گیا تھا اور پھر خنجر کو مارنے کے بعد گھما بھی دیا گیا تھا۔

جاپانی خاموش تھے۔ ہم بھی خاموش تھے۔ اور کچھ ڈرے ہوئے بھی۔ ہم نے چشمے کے پاس ایک گڑھا کھود کر کرنل کو دفن کر دیا۔ پھر ہم نے ایک لکڑی کی صلیب اس کی قبر کے سرہانے نصب کر دی۔

پالٹری کی موت کے بعد چونکہ میں ہی سب سے سینئر آفیسر تھا' مجھے جاپانیوں کو رسمی احتجاج لکھ کر دینا پڑا۔ حالانکہ اس سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ رپورٹ بیس کو بھیج دی جائے گی۔ لیکن ہمیں پھر کبھی کچھ پتا نہ چلا۔

آئندہ چند روز تک میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ میں اندر سے بہت بجھا ہوا تھا۔ یہاں ہر طرف خاموشی تھی اور تناؤ تھا اور نفرت تھی لیکن ہم کر ہی کیا سکتے تھے؟ ہمارے ہاتھ تو بندھے ہوئے تھے۔

وہ سنتری جسے میں نے نرسری رائم سکھائی تھی۔ مجھے دیکھ کر دوستانہ انداز میں ضرور مسکراتا تھا اور مجھے اس پر حیرت ہوتی تھی۔ بہر حال مجھے کچھ خوشی بھی تھی۔ کم از کم اس دشمن جگہ پر کوئی تو دوست ہے۔ پھر میں نے اسے جیک اینڈ جل والی رائم بھی سکھائی اور ایک آدھ اور بھی تاکہ اس کے اندر مزید گداز پیدا کر سکوں۔

☼ ☼ ☼

لوگر کو' پالٹری کی موت کے ٹھیک ساتویں دن بعد اس طرح خنجر کے ذریعے مار ڈالا گیا۔ یہ زخم ویسا ہی تھا اور خنجر مارنے کے بعد چاقو کو گھما دیا گیا تھا۔ وہ دن بڑا دہشت ناک تھا۔ جاپانی آفیسر نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ البتہ اسے اپنے کمرے سے دیکھتا رہا تھا۔ ہم بھلا کیا کر سکتے تھے۔ بہر حال انہوں نے ہمیں لوگر کو بھی پالٹری کی قبر کی پاس ہی دفنانے دیا۔ ہم نے اس پر ایک صلیب لگا دی تھی۔

کوئی سامنے کے دشمن سے تو لڑ سکتا ہے لیکن اندھیرے میں چھپے ہوئے راز سے لڑنا دوسری بات ہوتی ہے۔ اس سے دل و دماغ پر جو بکھرا دینے والا بوجھ پڑتا ہے۔ وہ بڑا ہی خوف ناک ہوتا ہے۔ مجھے مسلسل ایسے خواب آنے لگے جن میں مجھے اپنے بستر کے اوپر کوئی جاپانی' ہیولا خنجر اٹھائے جھکا دکھائی دیتا تھا۔ پھر یہ اٹھا ہوا خنجر آہستگی سے میرے دل کی طرف بڑھتا تھا اور میں ایک چیخ کے ساتھ جاگ جاتا تھا۔ اپنے اس خواب میں مجھ سے حرکت بھی نہیں کی جاتی تھی۔ بس میں چیخ پڑتا تھا۔

ہر رات یہ خواب مجھے دکھائی دیتا تھا اور جب میں

جاگتا تھا تو لرزتا ہوا پسینے میں تر۔

لوگر کی موت کے بعد والی اتوار کی رات کو میں ذرا جلدی سونے کے لیے چلا گیا۔ میں بستر میں پڑا ہوا تھا اور اپنے گھر' اپنے والد اور اپنے بیٹے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ مجھے گھر خط لکھ کر پوچھنا چاہیے کہ میرا بیٹا اب کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ کیا قامت ہے۔ اس کی وغیرہ بلکہ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اب تو وہ اتنا بڑا تو ہی چکا ہے کہ وہ خود مجھے خط لکھ سکے۔

میں اسی طرح لیٹا سوچ رہا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا' یہ بہت آہستگی سے کھلا تھا۔ مسمیریزم کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم لیکن مجھے اس وقت اس دروازے نے جیسے سحر زدہ اور مبہوت سا کر دیا تھا اور میرا بدن جیسے مفلوج ہو کر رہ گیا۔ میں نے ایک جاپانی سپاہی کو اندر آتے دیکھا۔ یہ ایک منحنی سا متحرک سایہ تھا۔ اس نے اندر آکر اسی آہستگی سے دروازہ بھیڑ دیا اور پھر دبے قدموں میری طرف بڑھا۔

خوف سے میرا سارا وجود ساکت ہو چکا تھا۔ اس نے میرے بستر کے پاس پہنچ کر مجھے گھورا' پھر اس نے کمر سے بندھا خنجر کھینچا اور اس کا دایاں ہاتھ خنجر سمیت بلند ہوا۔ باوجود کوشش کے میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی۔ نہ ہی میں اچھل سکا۔ میں وہیں ہدف کی طرح پڑا ہوا تھا۔

یہ بھی دروازہ بھڑ سے کھلا اور کوئی برق رفتاری سے لپکا' دوسرے لمحے آنے والے نے حملہ آور سائے کو کمر سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا اور اسے کمرے کے ایک کونے کی طرف اچھال دیا۔ یہ ہیولی دیوار سے ٹکرایا اور اس کا چاقو دوسری طرف جا گرا۔ یہ نیا آنے والا ہی جاپانی سنتری تھا جس میں نے نرسری رائم سکھائی تھی۔ اس نے حملہ آور کے دو تین طاقت ور ٹھوکریں رسید کیں۔ اس کے بعد وہ چلتا۔ میری طرف آیا اور مسکرایا۔ اس کے بعد اس نے ہولے سے کہا۔ ٹوئنکل۔۔۔ ٹوئنکل۔۔۔ لٹل اسٹار۔۔۔

اس کے بعد اس نے بے ہوش حملہ آور کو کلائی سے گھسیٹا اور اسی طرح باہر لے کر نکل گیا۔

مجبوری

مچھلی کے دو شکاری جھیل میں بنسیاں ڈالے بیٹھے تھے' ایک کی قسمت خوب یاوری کر رہی تھی' اس نے بڑی مشکل سے کھینچ کھانچ کر ڈور نکالی تو تقریباً آٹھ کلو کی مچھلی پھڑ پھڑا رہی تھی' اس نے اس کا جائزہ لیا اور واپس جھیل میں چھوڑ دیا۔ اس نے دوبارہ ڈور ڈالی تو اس سے بھی بڑی مچھلی پھنس گئی' اس نے اسے بھی واپس پانی میں چھوڑ دیا۔

تیسری مرتبہ جو مچھلی پھنسی وہ بہ مشکل ایک بالشت کی تھی' شکاری نے تھیلے میں رکھ لیا' دوسرا شکاری پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔

"اصل میں ہمارے گھر میں بڑی دیگچی نہیں ہے۔" پہلے شکاری نے جواب دیا۔

☆

میرے اعصاب بالکل کھو چکے تھے اور میں جیسے بے حواس ہو گیا تھا بلکہ شاید صحیح الدماغ بھی میری طرح نہیں رہا تھا۔

بالآخر جنگ اختتام کو پہنچی تھی اور مجھے ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ میں انسومنیا کا مریض ہو گیا' مجھے نیند نہیں آتی تھی۔

جو لوگ اس کے مریض رہے ہوں' وہی جانتے ہیں کہ یہ کیسا کرب ناک مرض ہوتا ہے۔ رات کی آمد مریض کو مزید بوکھلا دیتی ہے۔ ہر ہر لمحہ بھاری اور سست ہو جاتا ہے اور رات کسی موت کی طرح سرسراتی

محسوس ہوتی ہے۔

کئی بار میرا جی چاہا تھا کہ اوپر سے کود کر خودکشی کروں مگر صرف تعقل مجھے روکے ہوئے تھا۔ ایسے میں میں اپنے بیٹے کے بارے میں سوچنے لگتا تھا۔ اپنے بوڑھے باپ کے بارے میں سوچنے لگتا تھا۔

پھر تھکان مجھے سلا دیتی تھی۔ میں ڈرتا تھا کہیں سوتے میں مجھے مار نہ دیا جائے۔ اس پاگل جاپانی حملہ آور کا چہرہ میرے تصور میں ابھرتا تھا۔ اس کا چاقو آہستگی سے نیچے آتا ہوا نظر آتا تھا اور میں بوکھلا کر چیخ اٹھتا تھا۔

☼ ☼ ☼

مجھے پانی کے جہاز کے ذریعے انگلستان لایا گیا تھا۔ میرا خواب میرے ساتھ تھا۔ البتہ اس کا تواتر نہیں رہا تھا۔ میں نے اس پر قابو پانے کے لیے اسے نظرانداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ یہ ایک زندہ حقیقت تھی کہ یہ خواب میرے دشمن تھے۔

کچھ ایسے ہی خیالات تھے جب میں گھر کی طرف بڑھ رہا تھا‘ جاوا سے دوری نے میرے ذہن میں جمع نقوش قدرے مدھم کر دیے تھے اور میں خود کو اس طرح سوچ کر دھوکا دے رہا تھا کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ نہیں بلکہ کسی اور کے ساتھ ہوا تھا۔

بالآخر کسی نہ کسی طرح میرا جہاز انگلستان پہنچ ہی گیا۔ میرے کلب میں جو لندن میں تھا‘ ایک خط میرا منتظر تھا۔ اسے میرے بیٹے نے لکھا تھا۔ یہ تین صفحات کا خط تھا۔ میں دیر تک اسے الٹتا پلٹتا رہا۔

زندگی اب اچھی لگ رہی تھی۔

بس کارن ویل کی طرف چل دیا‘ جہاں میرا گھر تھا۔ میرا بیٹا اور والد میرے منتظر تھے۔ بوڑھے باپ نے بڑی محبت سے میرا خیر مقدم کیا۔ البتہ وہ مرغی جیسا موٹا بچہ‘ جواب دبلا اور لمبا ہو چکا تھا۔ خاصا سرد سرد سا تھا۔ میں نے احتیاطاً اسے چمٹایا نہیں بلکہ مصافحہ کیا۔ اس نے بے دلی سے میرا ہاتھ تھاما اور چھوڑ دیا..... ہم کار میں گھر کی طرف چل دیے۔

راستے میں میرے اندر دو طرح کے جذبات لہریں لے رہے تھے۔ کبھی میں اپنے باپ کو دیکھتا تھا جو سراپا مسرت تھے اور اپنے آہستہ قدموں سے چل رہے تھے۔ انہوں نے میرے کان میں کہا یہ بچہ ابھی ذرا شرما رہا ہے۔ تم پریشان نہ ہونا۔ دو ایک دن میں گھل مل جائے گا۔

کھانے کے دوران بھی وہ چپ رہا اور میری باتوں میں اس نے دلچسپی نہیں لی۔ رات کو نو بجے وہ اپنے اوپری کمرے میں جانے کے لیے اٹھا تو میں نے ذرا اسے بہلانے کے لیے ایک حرکت کی اور اٹھ کر اس کے لیے اس طرح دروازہ کھولا جیسے ملازم کھولتے ہیں۔ میرے تعظیمی انداز کو اس نے سرد نگاہوں سے دیکھا اور کچھ کہے بنا اوپر سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔

اس کے بعد میں اطمینان سے بیٹھ کر اپنے والد سے باتیں کرنے لگا۔ میرے والد نے کہا۔ ”یہ بچہ خاصا شرمیلا ہے۔ اس سے بے تکلفی کے لیے تمہیں خود ہی کوشش کرنی ہوگی۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے..... اب میں اس کے کمرے میں جا کر شب بخیر کہا کروں گا۔“

پھر میں گیا بھی..... مگر وہ سو چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں کیا کہہ سکتا تھا۔ کمبل میں لپٹا ہوا وہ لیٹا ہوا تھا اور بالکل کسی بالغ آدمی کی طرح لانبا لگتا تھا۔ دوسرے روز ایک ساتھ ہم چہل قدمی کے لیے باہر نکلے۔ میں نے ذرا فضا بدلنے کے لیے اس سے کہا۔ ”آؤ ہم باغ کی دیوار تک ریس لگاتے ہیں۔“

بے شک میں نے اسی کو جتنے دیا تھا اور زور زور سے ہانپنے کی اداکاری بھی کی۔ اس نے بھویں سکوڑ کر مجھے دیکھا۔ ”یہ جنگ کا اثر لگتا ہے۔“

میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔ اب اسی طرح ہم دونوں گھر کی طرف پلٹے وہ میرے ساتھ چپک کر چلتا رہا اور میں نے سمجھا کہ وہ اب مجھ سے قریب ہو رہا ہے۔

☼ ☼ ☼

تین مزید دن گزر گئے۔ اس کا رویہ میرے ساتھ

دوستانہ تھا اور میں خوش تھا۔ میرے باپ نے یہ بھی دیکھا تو انہوں نے میری ہمت بڑھائی مگر تیسری رات مہلک نکلی۔ میرا خواب پلٹ آیا تھا اور میں چیختا ہوا جاگا تھا۔ پچھلی کچھ راتوں سے میں بڑا مطمئن ہو چلا تھا اور لیٹتے وقت مجھے کوئی خوف نہیں رہا تھا مگر اس کے بعد میں ایک بار پھر خوف کے اندھیرے میں پہنچ گیا تھا۔ وہی منظر..... جاپانی میرے اوپر جھکا ہوا۔ اس کے اٹھے ہاتھ میں کھلا چاقو وہ احساس کہ میں حرکت نہیں کر سکتا اور پھر چاقو کے نیچے آنے کا منظر اور میری چیخ۔

میرے پہنچتے ہی میرے والد کمرے میں آ گئے تھے۔ انہوں نے بتی جلا دی اور پھر میری طرف لپکے۔ میرا بیٹا بھی آ گیا تھا مگر وہ دروازے کے پاس ہی رکا رہا جبکہ میرے والد نے مجھے بازوؤں میں گھیر لیا تھا۔ خواب اب تک جیسے میرے نظروں میں رکا ہوا تھا۔ اس کا تجربہ مجھے اتنی بار ہو چکا تھا کہ یہ میری یادداشت کا جیسے ایک حصہ بن گیا تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد میرا بدن اس طرح ست ہو گیا تھا جیسے اس میں سے جان نکل رہی ہو۔ تاہم ذرا حواس بجا ہونے پر میں نے محسوس کیا کہ میرا بیٹا بدستور‘ دروازے ہی پر کھڑا ہوا ہے۔ وہ میرے پاس نہیں آ رہا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دراصل مجھ سے خوف کھانے لگا تھا۔ شاید میری چیخ نے اسے ڈرا دیا تھا۔ اس رات کے بعد سے اس نے مجھ سے گریزاں رہنا شروع کر دیا۔ ہر روز اسکول سے پلٹنے کے بعد وہ اپنے دوستوں کو باہر ہی روک دیتا تھا۔ پھر اپنا فٹ بال لے کر چلا جاتا تھا۔ مجھے اس کی اجازت نہ تھی کہ میں اس کے دوستوں سے مل سکتا۔

میرے والد نے اس سے کہا۔ ”تم اپنے دوستوں کو اندر لاؤ‘ اپنے باپ سے ملاؤ‘ ٹھیک ہے۔“ وہ بڑبڑایا اور چلا گیا۔

شب ارواح سے دو روز پہلے میں اپنی نیند میں‘ پھر چیخا۔ جب میں جاگا تو میرے والد مجھے سنبھالے ہوئے تھے۔ جس وقت میرے حواس ذرا بجا ہوئے تو مجھے احساس ہوا کہ میں شاید کچھ دیر قبل خواب کی حالت میں اس جاپانی سے لڑ بھی رہا تھا۔ ہو سکتا ہے میری کوئی ضرب میرے والد کو بھی لگی ہو مگر انہوں نے مجھے تھام رکھا تھا اور تسلی تشفی دے رہے تھے۔ ہوش بجا ہونے پر میں نے دیکھا کہ میرا بیٹا وہاں موجود ہے مگر وہ دروازے ہی پر رکا ہوا تھا۔ میرے دل نے کہا اگر یہ بھی میرے پاس آ کر دل بڑھاتا تو شاید میرا علاج ہو جاتا کیونکہ میں اس خواب کے بعد خود کو بری طرح تنہا محسوس کرتا تھا مگر وہ ابھی کم سن تھا اور میرے تصور کی بیماری کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اسی لیے وہ مجھ سے دور تھا۔

☼ ☼ ☼

شب ارواح کی صبح کو ذرا تاخیر سے سینٹ آوس گیا

کیا بات ہے؟

ہم زبان

فرانسیسی ناول نگار کولیٹ بلیوں کی بڑی شیدائی تھی‘ امریکہ کا دورہ کرتے ہوئے اسے بازار میں ایک بلی بیٹھی دکھائی دی۔ وہ اس سے باتیں کرنے کے لیے قریب چلی گئی اور دونوں ایک آدھ منٹ تک سر جوڑے میاؤں میاؤں کرتی رہیں۔

پھر کولیٹ اپنے ساتھی کی طرف مڑی اور کہنے لگی: ”آخر مجھے کوئی ایسا تو ملا جسے فرانسیسی بولنی آتی ہے۔“

مان میرا احسان

”اتنی زیادہ رقم کا بل......؟“ آپریشن کے بعد ایک مریض نے سرجن کا بل دیکھ کر احتجاج کیا۔

”میرے دوست!“ سرجن نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ ”اگر تمہیں معلوم ہو جاتا کہ تمہارا کیس کتنا پیچیدہ تھا اور کس طرح میں نے تمہارے آپریشن کو پوسٹ مارٹم میں تبدیل ہونے سے روکا۔ تو تم اس سے تین گنا بل بھی خوشی سے ادا کر دیتے۔“

☆

اور ڈاکٹر سے ملا۔ نہ جانے کیوں میں کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ میرا ہمیشہ سے خیال رہا ہے کہ ایک ذہین آدمی اپنی اعصابی تکالیف کو خود درست کر سکتا ہے۔ مگر ڈاکٹر سے مجھے کوئی تعاون نہ مل سکا۔ بھلا نیند کی گولیاں میرے مرض کا علاج تو نہ تھیں اور میں تو سونے سے بھی ڈرتا تھا۔ اس نے مجھے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ میرا یہ مرض وقت کے ساتھ ساتھ آرام اور صبر کے ساتھ رخصت ہو جائے گا۔

وہاں سے میں خاصا مایوس لوٹا۔

گھر آتے ہوئے میں سینٹ آوس کے آخری سرے پر واقع اسٹور سے میں جب کچھ چاکلیٹیں لینے اندر گیا تو میں نے وہاں چھ عدد لڑکوں کو دیکھا۔ یہ آئس کریم کاؤنٹر پہ بیٹھے تھے۔ ان میں میرا بیٹا بھی موجود تھا۔ مجھے ایک دم سے بڑی خوشی ہوئی۔ یہ ایک اچھا موقع تھا۔ جب میں ان کے پاس گیا اور اپنا تعارف کرایا تو سارے بچے خاصے خوش ہوئے۔ میں نے سب کو اپنی طرف سے آئس کریم کھانے کی دعوت دی۔ میں نے خاص خیال رکھا کہ اپنے بیٹے پر توجہ نہ دوں بلکہ ان سب کو ایک جتھے کے طور پر سمجھوں۔

آئس کریم کھانے کے بعد میں بچوں کے ساتھ ہی اسٹور سے باہر آیا۔ ہم تھوڑی دور تک ساتھ چلے۔ میں نے پوری کوشش کی کہ ان کے ساتھ گھل مل جاؤں اور شاید میں کامیاب بھی رہا تھا کیونکہ ایک لڑکے نے جو عمر میں کوئی چودہ سال کا ہوگا، کہا۔ ”سر میجر کیا آپ ہمارے ساتھ پوسٹ آفس تک دوڑ لگائیں گے؟“

میں نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس نے عجلت سے دوسری طرف نظریں پھیر لیں۔ بہرحال میں نے ان کا چیلنج قبول کر لیا اور دوڑ لگائی۔ جب میں پوسٹ آفس تک پہنچا تو میرا سر چکرا رہا تھا اور دل دھڑک رہا تھا۔

میں تیسری پوزیشن پر آیا تھا۔ میری حالت خاصی ابتر ہو چکی تھی۔ میں ایک کھمبے کا سہارا لینے کے لیے ہاتھ پھیلا رہا تھا کہ ایک لڑکے نے کہا۔ ”سر میجر آپ یقیناً“ ایک چیمپئن ہیں۔“

میں نے ان بچوں کو دیکھا، مگر ان میں میرا بیٹا نہیں تھا۔ اس نے ریس میں حصہ ہی نہیں لیا تھا۔ لیکن کے اختتام پر میں نے انہیں الوداع کہا اور تنہا ہی گھر کی طرف چل دیا۔ میرے والد سٹنگ روم میں نہیں تھے۔ میں اندر چلا گیا اور ایک گہری کرسی میں دھنس گیا۔ کوئی بیس منٹ بعد دروازہ کھلا اور میرا بیٹا اندر آیا۔ میں نے اسے گزرتے دیکھا۔ اس نے میری طرف نظریں تک نہیں اٹھائیں۔ مجھے اپنے اندر غصے اور ناگواری کا احساس سا جاگتا محسوس ہوا مگر میں نے اپنی آواز کو معتدل رکھا۔ میں نے لڑکے کو پکارا تو وہ دروازے پر ٹھہر گیا۔ کسی میمنے کی طرح..... میں نے کوشش کی کہ میری آواز سے ناگواری نہ جھلکے، میں نے کہا۔ ”میں تیسری پوزیشن پر آیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا مگر اس کی آنکھوں سے جھانکتی سرد مہری نے مجھے مکدر سا کر دیا۔ پھر میرا غصہ قابو سے باہر ہو گیا اور میں نے تقریباً ”چیختے ہوئے کہا۔ ”تمہیں شرم آتی ہے میری وجہ سے۔ میں رات میں چیختا ہوں!“ میں نے کرسی کے ہتھے پر ہاتھ مارا اور دہرایا۔ ”تو تم میری وجہ سے کھسیاتے ہو؟“

میرے بیٹے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے لمحے بھر کے لیے مجھے دیکھا۔ مڑا اور اوپری کمرے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

ایک دم سے مجھے سخت گرمی کا احساس ہوا۔ مجھے لگا میں جیلا بونگ کی ریلوے لائن کے پاس والی زمین سے اٹھتی حرارت میں کھڑا ہوں۔ مجھ پر ایک بارگی جیسے آہستگی سے کھلے دروازے اور میرے خواب کی دہشت نے حملہ کر دیا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں اپنی کرسی پر چرمرا سا گیا ہوں اور وہ خوف انگیز خنجر میرے جسم میں بالآخر اتر گیا ہے اور اسے میرے دل کے اندر گھما دیا گیا ہے۔

☼ ☼

ایک ایسے شخص کی داستان جس کا اعتبار کھو گیا تھا

شب رفتہ

راشد سبحان

اعتماد کی دولت ایک بار کھو جائے تو آدمی ہمیشہ کے لیے تہی دست اور قلاش ہو جاتا ہے۔

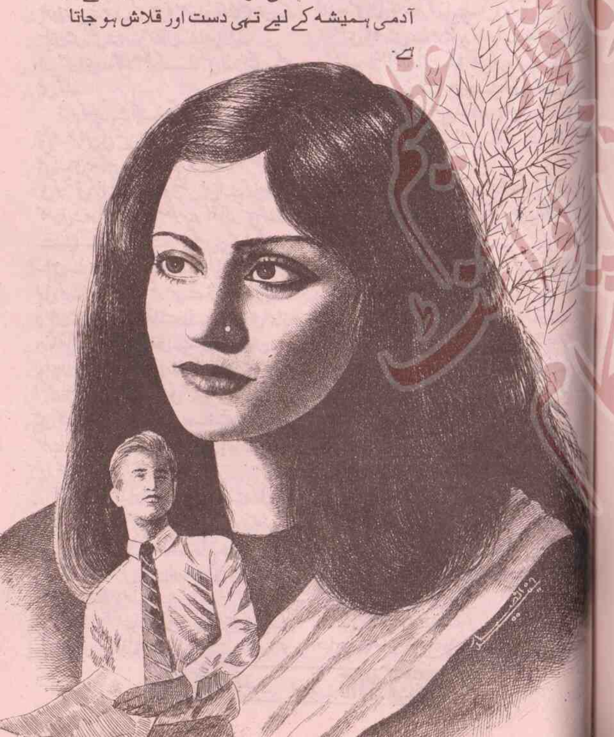

ہوٹل کے استقبالیہ کلرک کو بعد دوپہر ایک خاتون کی ٹیلیفون کال موصول ہوئی "آپ کے ہاں اگر کوئی انتہائی پرسکون قسم کا کمرہ خالی ہے تو اسے مسٹر ایڈگر ڈینول موڈی کے لیے چھ بجے سے بک کر لیجیے۔"

"ہمارے پورے ہوٹل کا ماحول ہی پرسکون ہے خاتون۔" استقبالیہ کلرک نے جواب دیا۔

"ہو سکتا ہے۔ بہرحال مسٹر موڈی کے لیے خصوصی طور پر ہمیں ایک انتہائی پرسکون کمرے کی ضرورت ہے جہاں کسی چیز کا معمولی سا کھٹکا بھی ان کے سکون میں مخل نہ ہو۔" خاتون نے اصرار کیا۔

"ایسا ہی ہوگا۔" کلرک نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔

شام کو چھ بجے ایک نوجوان، ہوٹل کے کاؤنٹر پر پہنچا۔ عمر اس کی تیس سال سے زیادہ نہ رہی ہوگی لیکن باریک سی مونچھیں رکھ کر وہ قدرے پختہ العمر نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کوشش میں اسے کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی تھی۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ کسی کھلنڈر سے بچے کے اوپری ہونٹ پر مونچھیں چپکا دی گئی ہیں۔ اس نے سردی سے بچنے کے لیے ایک بھاری بھرکم اونی کوٹ پہنچ رکھا تھا مگر سر سے ننگا تھا۔ اس کے دانتوں میں پائپ دبا ہوا تھا جسے دور سے دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تمباکو سے خالی ہے۔ وہ سازو سامان سے لدا پھندا نظر آ رہا تھا مگر اس سامان میں سے کوئی بھی چیز اٹیچی کیس یا سفری تھیلے قسم کی نہیں تھی تینوں جیبوں میں کاغذوں کے بنڈل ٹھسے ہوئے تھے۔ بغل میں سگریٹوں کا ایک کارٹن دبا ہوا تھا اور ہاتھ میں ایک پورٹیبل ٹائپ رائٹر جھول رہا تھا۔

"یہاں مسٹر ایڈگر ڈینول موڈی کے لیے کوئی کمرہ ریزرو کرایا گیا ہے؟" اس نے کاؤنٹر پر پہنچ کر پوچھا۔

"جی ہاں جناب!" کلرک نے جواب دیا۔

"وہاں مجھے مکمل سکون اور خاموشی میسر آ سکے گی نا؟" نوجوان نے پوچھا۔

"یقیناً" کلرک نے جواب دیا اور خانہ پری کے لیے کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ نوجوان نے ٹائپ رائٹر فرش پر اور بغل میں دبا ہوا کارٹن کاؤنٹر پر رکھ کر دستخط وغیرہ کیے۔

"جو۔" کلرک نے ایک بیرے سے کو آواز دی جس نے آ کر جلدی جلدی موڈی کے ہاتھ سے چیزیں لے کر سنبھالیں لیکن جب اس نے ٹائپ رائٹر اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو موڈی نے اسے روک دیا۔

"جرٹائی میرے ساتھ جائے گی۔" اس نے کہا۔

"جرٹائی؟" بیرا حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ شاید وہ کسی لڑکی کا انتظار کر رہا ہے۔

"اسی کا نام میں نے جرٹائی رکھا ہوا ہے۔" موڈی نے ٹائپ رائٹر اٹھا کر اس کے ڈھکن کو پیار سے تھپکتے ہوئے کہا "یہی میری رفیق حیات ہے اور جب میں اسے ساتھ لے کر کسی کام پر نکلتا ہوں تو میرے علاوہ کوئی اسے نہیں چھو سکتا۔" اس نے جو کے ساتھ لفٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

جو اس کے ساتھ لفٹ میں چند لمحے تو خاموش رہا مگر اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور محض گفتگو برائے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بولا۔

"اس سے پہلے میں نے کبھی کسی کو اپنے ٹائپ رائٹر سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا۔"

"میری بات اور ہے۔" موڈی نے ایک شان بے نیازی سے کہا۔ "میں ایک کہانی نویس ہوں۔" جو کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ مبہوت ہو کر موڈی کا چہرہ تکنے لگا۔ شاید اسے اعتبار نہیں آ رہا تھا اس کے خیال میں اتنا کم عمر نوجوان مشکل سے ہی کہانی نویس ہو سکتا تھا۔

"آپ کا مطلب ہے آپ رائٹر ہیں؟ کہانیاں لکھتے ہیں؟" اس نے بے حد حیرت مگر احترام سے پوچھا۔

"بے شک۔" موڈی نے متانت سے کہا۔ "تمہیں اتنی حیرت کیوں ہے؟"

"دراصل... دراصل..." جو نے ہچکچاہٹ اور قدرے خفت سے کہا "کبھی میں بھی ایک کہانی نویس بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔"

موڈی کو ایسے لوگوں سے مل کر بڑے تفاخر کا احساس ہوتا تھا جو رائٹر بننا چاہتے ہوں مگر بن نہ سکے ہوں۔

"آپ اپنے اصل نام سے ہی لکھتے ہیں؟" جو نے ایک ٹک اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"زیادہ تر ڈین موڈی کے نام سے لکھتا ہوں۔ تم نے کبھی مجھے پڑھا ہے؟"

"مجھے غور کرنا پڑے گا۔" جو نے سر کھجاتے ہوئے کہا "کچھ یاد نہیں پڑتا ویسے..."

"میرا خیال ہے تمہیں پڑھنے کے لیے زیادہ وقت نہیں ملتا ہوگا۔" موڈی نے جلدی سے کہا۔

"جی ہاں۔ جی ہاں۔" جو گویا ندامت سے بچ گیا۔ "لیکن میں آپ کی کوئی نہ کوئی چیز بہرحال ضرور پڑھوں گا خصوصاً" اب جب کہ مجھے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو گیا ہے۔" اس نے جلدی سے لفٹ کو واپس نیچے لے جانے والا بٹن دبایا کیونکہ وہ اپنے عقیدت مندانہ جذبات کے بہاؤ میں اسے مطلوبہ جگہ سے تین منزلہ اوپر لے آیا تھا۔

جو نے موڈی کو اس کے کمرے میں پہنچایا اور سامان وغیرہ رکھنے کے بعد بھی وہیں کھڑا رہا گویا اس کا واپس جانے کو دل ہی نہ چاہ رہا ہو یہ حقیقت تھی کہ وہ ٹپ وغیرہ کی امید پر نہیں، محض خلوص سے مجبور ہو کر کھڑا تھا اور پہلی مرتبہ اس قسم کے خلوص کا اس کی زندگی میں گزر ہوا تھا۔

موڈی نے اپنا خیمہ نما کوٹ اتار کر کرسی پر ڈالا۔ پھر اپنے ساتھ لایا ہوا ایک زرد رنگ کا بڑے سائز کا پیکٹ کھولا۔ اس میں سے ایک بڑا سا مربع شکل کا کارڈ بورڈ برآمد ہوا جس پر بڑی نفاست کے ساتھ شفاف کاغذ لپٹا ہوا تھا جس میں سے اس کارڈ بورڈ پر بنی ہوئی پینٹنگ نظر آ رہی تھی تجسس کے مارے دو قدم آگے بڑھ آیا اور حیرت سے اس تصویر کو دیکھنے لگا اس کی آنکھیں مارے استعجاب کے گول گول سی ہو گئی تھیں تصویر ایک خوب صورت لڑکی کی تھی جو خوف زدہ انداز میں پیچھے کو مڑ کر دیکھتے ہوئے ایک گلی میں بھاگی جا رہی تھی۔

"یہ آپ نے بنائی ہے۔" جو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نہیں، آرٹسٹ نے۔ یہ اگلے مہینے کا سرورق ہے۔ مجھے اس کے مطابق سرورق کی کہانی لکھنی ہے۔" موڈی نے متانت سے جواب دیا۔

جو کسی قدر پریشان سا نظر آنے لگا۔ "میں تو سمجھتا تھا کہ معاملہ اس کے الٹ ہوتا ہے۔ پہلے کہانی لکھی جاتی ہے پھر اس کے مطابق سرورق کی تصویر بنتی ہے۔"

"یہ تو بڑا فرسودہ طریقہ کار ہے۔" موڈی نے نخوت سے کہا۔ "یہ رسالے والے ہر ماہ اپنے سرورق کے مطابق خصوصی طور پر ایک کہانی لکھواتے ہیں۔ اس مرتبہ انہیں بڑی مشکل آن پڑی جس مصنف کو اس ماہ کے لیے کہانی لکھنی تھی، وہ غالباً" بیمار پڑ گیا۔ اس کے انتظار میں ایڈیٹر نے سارا وقت ضائع کر دیا حتیٰ کہ رسالے مارکیٹ میں آنے کی تاریخ سر پر آ گئی۔ چنانچہ ہنگامی طور پر مجھے اس سروق کے مطابق کہانی لکھنے کا کام سونپا گیا ہے۔"

"اوہ۔ یہ تو بہت مشکل کام ہوگا۔" جو نے کہا۔

"بس آغاز کی دیر ہوتی ہے۔ پھر تو مصنف کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

اصل مشکل تو کہانی شروع کرنے میں پیش آتی ہے پھر تو واقعات و الفاظ کے چشمے خود بخود ابل پڑتے ہیں۔" موڈی نے اسے کہانی کا فلسفہ سمجھایا اور اپنا ٹائپ رائٹر چھوٹی سی میز پر سیٹ کرنے لگا۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر اس نے جوتے اتارے۔

"جوتے پہن کر میں نہیں لکھ سکتا۔" اس نے وضاحت کی۔ "اور نہ ہی لکھتے وقت اپنی قمیص کے اوپری بٹن بند رکھ سکتا ہوں۔" اس نے ٹائی اتار کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے ٹائپ رائٹر کے قریب رکھا ہوا اور دوسرا پیکٹ کھولا اور سگریٹ کی ڈبیوں کا ایک بڑا سا ڈھیر اپنے سامنے لگا لیا۔

"یہاں ایش ٹرے ہوگی؟" اس نے اس طرح ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ فوجوں کا کمانڈر جنگ شروع کرنے

سے پہلے میدان کا جائزہ لے رہا ہو۔

جو مستعدی کے ساتھ کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں دوڑنے بھاگنے لگا اس نے مسہری کے نیچے جھانکا باتھ روم میں دیکھا مایوس ہو کر بولا "میرا خیال ہے ایش ٹرے اس کمرے میں ٹھہرنے والا کوئی شخص چرا کر لے گیا۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔" موڈی نے اپنے نئے متوقع پرستار کو زیادہ تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا۔ "ویسے بھی ایک ایش ٹرے تو ناکافی رہے گی۔ میں ردی کی ٹوکری سے کام چلا لوں گا۔"

دفعتاً" فون کی گھنٹی بجی۔ موڈی نے ریسیور اٹھایا دوسری طرف سے کچھ سن کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور جو سے مخاطب ہو کر کہا۔ "استقبالیہ کلرک تمہارے بارے میں پوچھ رہا ہے کہ تمہیں کس نے باندھ کر بٹھا لیا ہے نیچے واپس کیوں نہیں آتے۔"

"ایک تو یہ بدذوق اور کوڑھ مغز کلرک پیشہ لوگ کسی انسان کو ایک رائٹر کی صحبت سے مستفیض ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔" جو بڑی خفگی سے بولا اور چند مغلظات کا اضافہ کرتے ہوئے طوعاً" و کرہاً" دروازے کی طرف بڑھا "میرے لائق کوئی اور خدمت جناب؟"

موڈی نے ایک مڑا تڑا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ایک درجن بیئر کی بوتلیں پکڑتے لانا جب میں لکھ رہا ہوتا ہوں تو بیئر مجھے بڑی فرحت بخشتی ہے۔"

"بہت بہتر جناب عالی۔" جو دروازے کی طرف لپکا۔

جب وہ چلا گیا تو موڈی نے ایک بار پھر اپنی کارگاہ کا نقشہ درست کیا' جوتے ایک طرف کو کھسکائے' کاغذ ترتیب سے ٹائپ رائٹر کے قریب رکھے' دوسری طرف سگریٹ کے پیکٹ بھی ترتیب سے سجائے' ٹیبل لیمپ درست کیا' پھر کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے ٹیلیفون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور آپریٹر سے ایک نمبر مانگا۔ نمبر مل گیا تو دوسری طرف سے ایک خاتون کی آواز سنائی دی۔

"ماہنامہ پرل۔ شام بخیر۔"

"کورا۔ میں موڈی بول رہا ہوں۔ میں کمرے میں پہنچ چکا ہوں اور بس لکھنے کے لیے تیار ہوں۔ مسٹر ٹارلٹ گھر چلے گئے کیا؟"

"ہاں۔ وہ تقریباً" آدھا گھنٹہ پہلے گئے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر کوئی دقت پیش آئے تو گھر فون کر لینا۔"

"مجھے کیا دقت پیش آسکتی ہے۔ کیا میں کوئی نو آموز مصنف ہوں؟" موڈی نے خفگی سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر دیکھو نا یہ سرورق کی کہانی کا مسئلہ ہے مسٹر ٹارلٹ بہت پریشان اور متفکر ہیں کیونکہ صبح نو بجے ہر حال میں رسالہ پریس جانا ہے پریس والے مزید انتظار نہیں کر سکتے۔"

"میں ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے کہانی سمیت مسٹر ٹارلٹ کی میز پر بیٹھا ہوں گا۔" موڈی نے یقین سے کہا۔

"اچھا؟ میں تمہیں ایک خوش خبری بھی سنا دوں کہ مسٹر ٹارلٹ تمہیں اس کہانی کے لیے وہی معاوضہ دے رہے ہیں جو وہ سرورق کی کہانی مستقلاً" لکھنے والے مصنف ہمینڈ کو دیتے تھے بلکہ مسٹر ٹارلٹ نے تو یہ بھی کہا ہے کہ اگر تم نے واقعی کوئی معرکتہ چیز لکھ ڈالی تو وہ تمہیں اس معاوضے کے علاوہ ایک خصوصی بونس بھی دے گا۔"

"اوہ یقیناً" تم دیکھنا تو سہی۔ لوگ ہمینڈ کو بھول جائیں گے۔" موڈی نے یقین دلایا۔

"اچھا تو بس اب باتیں بند کرو اور کام شروع کردو۔" کورا نے دوستانہ لہجے میں کہا "خدا تمہاری مدد کرے۔" موڈی نے ریسیور رکھا تو جو بیئر کی چھ چھ بوتلیں دونوں ہاتھوں میں ٹکائے آن پہنچا۔

"نہیں میز کے قریب ہی فرش پر رکھ دو جہاں میرا ہاتھ بہ آسانی ان تک پہنچ سکے۔" موڈی نے ہدایت کی پھر جو کو ٹپ دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر جو نے اس کا مقصد سمجھتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "نہیں' نہیں مسٹر موڈی! میں آپ سے ہرگز ٹپ نہیں لوں گا۔ آخر آپ ایک مصنف ہیں عام انسانوں سے بہت مختلف اور خصوصی اہمیت کے حامل انسان ہیں۔ کاش میں نے آپ کی کوئی کہانی پڑھی ہوتی میں کوئی ایسا رسالہ ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا جس میں آپ کی کہانی موجود ہو۔"

موڈی نے اپنے ساتھ لائے ہوئے پیکٹوں اور لفافوں میں سے ایک لفافہ اٹھا کر ٹٹولا اس میں سے ایک رسالہ نکالا۔ "لو۔ یہ پچھلے مہینے کا شمارہ ہے یہ میں گھر لے جانے کے لیے لایا تھا لیکن خیر کوئی بات نہیں میں تو رسالے کے دفتر سے ہی دوسری کاپی لے لوں گا۔"

جس نے رسالہ تھامنے سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ ردی پر رگڑ کر صاف کیے گویا کوئی مقدس کتاب سنبھالنے جا رہا ہو۔ موڈی نے خود درمیان میں ایک جگہ سے رسالہ کھول کر دیکھا آگے کیا "یہ دوسرے نمبر پر میری کہانی ہے اور اگلے ماہ سرورق کی کہانی میری ہوگی جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو میری کہانیاں رسالے کے آخر میں چھپا کرتی تھیں جہاں "طاقتور بنیے" اور "روپیہ کمائیے" قسم کی کتابوں کے اشتہار چھپتے ہیں۔"

"فرشتہ اجل۔ از ڈین موڈی" اس نے اٹک اٹک کر کہانی کا عنوان اور مصنف کا نام پڑھا۔

"یہ ایڈیٹر لوگ ہمیشہ وہ عنوان تبدیل کر دیتے ہیں جو مصنف رکھتا ہے۔ مثلاً" میں نے اس کہانی کا نام "بندوق کی نالی کی ایک جھلک" رکھا تھا۔ تمہارے خیال میں یہ عنوان زیادہ بہتر نہیں تھا؟"

لیکن جو اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے ایک پنسل ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ موڈی نے پنسل اس کے ہاتھ سے لی اور کہانی کے حاشیے پر لکھ دیا۔ "اپنے پرستار جو کے لیے منجانب ڈین موڈی"

"میں اس رسالے کو ہمیشہ سنبھال کر رکھوں گا اور اس پر جلد چڑھوا لوں گا۔" جو نے رسالہ بحفاظت اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ دفعتاً" فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"اسی خرانخور کا فون ہوگا۔" جو نے استقبالیہ کلرک کی ایک عزیزہ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے کہا دروازے کی طرف بھاگا۔ "کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے طلب فرمالیجیے گا۔ خدا کرے آپ کی سرورق کی کہانی تہلکہ خیز ثابت ہو۔"

"شکریہ جو!" موڈی نے متانت سے کہا جو نے اپنے عقب میں دروازہ نہایت احتیاط سے بند کیا کہ کہیں اس تخلیقی عمل میں خلل واقع نہ ہو جو ابھی شروع ہونے والا تھا۔ اس کے جانے کے بعد موڈی نے فون پر آپریٹر سے ایک اور نمبر مانگا دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز آئی تو اس نے بڑے ملائم لہجے میں کہا۔

"یہ میں ہوں جان من!"

"اوہ! موڈی جان! جلدی سے بتاؤ کیا معاملہ رہا؟ سرورق کی کہانی لکھنے کا کام مل گیا یا نہیں؟" نسوانی آواز نے بے تابی سے پوچھا۔

"بھلا کیوں نہ ملتا۔ اس وقت میں ہوٹل کے کمرے میں ہوں اور تمام خرچ ادارہ اٹھا رہا ہے اور سنو اس بار مجھے معاوضہ بھی پہلے سے دوگنا مل رہا ہے یعنی دو سینٹ فی لفظ۔"

"سچ مچ؟" دوسری طرف سے بولنے والی عورت نے ریسیور پر ہی ایک پرجوش بوسہ لیا۔

"سنو تو سہی' ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ ایک خصوصی بونس بھی مل رہا ہے کیسی بات ہے؟"

اس بار تو دوسری طرف سے بوسوں کی بوچھاڑ ہو گئی اور جب ان کا سلسلہ تھما تو عورت نے سرگوشی نما لہجے میں کہا۔ "مجھے تم پر فخر محسوس ہو رہا ہے۔"

"ممنا جاگ رہا ہے یا سو گیا؟" موڈی نے مسرور لہجے میں پوچھا۔

"مجھے معلوم تھا تم اسے شب بخیر ضرور کہو گے اس لیے میں نے اسے سلایا نہیں تھا ایک منٹ ہولڈ کرو میں اسے لے کر آتی ہوں۔"

ایک منٹ بعد آواز دوبارہ سنائی دی مگر وہ موڈی سے مخاطب نہیں تھی۔ "ہاں بیٹے۔۔۔ ڈیڈی سے بات

کرونا۔ ڈیڈی تمہاری آواز سننا چاہتے ہیں۔۔۔ بولو نا۔۔۔"

جواب میں خاموشی رہی۔

"ہیلو۔ کیا حال ہے میرے پیارے پیارے بیٹے کا۔" موڈی نے لہک کر کہا مگر تب بھی جواب میں خاموشی رہی۔ نسوانی آواز پھر ابھری "بیٹے! تمہارے ڈیڈی ایک بہت بڑا کام کرنے والے ہیں ان کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار نہیں کرو گے؟"

جواباً" صرف ایک مختصر سی کلکاری سنائی دی اور دونوں میاں بیوی خوشی سے بے حال ہو کر بیک وقت چیخنے لگے جب دونوں کے جذبات کا ابال کچھ کم ہوا تو موڈی نے پرجوش لہجے میں کہا "تم نے سنا؟ منے نے میری کامیابی کے لیے دعا کی تھی یہ ایک اچھا شگون ہے اب تو مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ سرورق کی کہانی دھماکا ثابت ہو گی۔" عورت نے جواباً" صرف بوسہ لینے پر ہی اکتفا کیا۔

"میں صبح ٹارلٹ کے آفس میں کہانی پہنچا کر ساڑھے دس بجے گھر پہنچ جاؤں گا۔" موڈی نے کہا پھر دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کو بے شمار ہدایات دیں اور آخر کار یہ گفتگو ہوائی بوسوں پر ہی تمام ہوئی۔ ریسیور رکھنے کے بعد بھی مسکراہٹ موڈی کے ہونٹوں پر منجمد تھی۔ اپنی لکھنے کی تیاریوں کا از سر نو جائزہ لینے کے بعد موڈی کام کے لیے کمربستہ ہونے لگا۔ دونوں ہاتھ مسلے آستینیں چڑھائیں اور ٹائپ رائٹر کو اچھی طرح ایک جگہ جمایا تخلیق عمل شروع ہونے والا تھا تخلیقی عمل جس کے نتیجے میں مونا لیزا کی شہرہ آفاق تصویر نے جنم لیا' رومیو اور جولیٹ کے کردار امر ہوئے' ورڈز ورتھ کی نظموں نے آفاقیت حاصل کی اور اب ان آفاقی تخلیقات میں ڈین موڈی کی ایک قتل کی کہانی کا اضافہ ہونے والا تھا! یہ سوچتے ہوئے موڈی نے اپنے رفیق حیات ٹائپ رائٹر "جرٹائی" کو سیدھا کیا پھر اٹھ کر اس نے سرورق کی تصویر کو اپنے قریب پڑی ایک کرسی پر اس طرح پشتگاہ کے سہارے کھڑا کیا کہ آسانی سے اسے دیکھتا رہے پھر اس نے ٹیبل لیمپ کی روشنی کا دائرہ تصویر پر ہی مرکوز کر دیا کیونکہ اس نے اسی سے انسپائریشن حاصل کرنا تھا۔ ٹائپ رائٹر پر اسے روشنی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ ایک ماہر ٹائپسٹ تھا۔ نہ ہی اپنے ٹائپ کیے ہوئے مواد پر اسے نظرثانی کی ضرورت ہوتی تھی اس کے خیال میں اگر مسودے میں دو چار غلطیاں رہ بھی جائیں تو آخر مسٹر ٹارلٹ کے دفتر میں بیٹھے ہوئے دو دو پروف ریڈر کس مرض کی دوا تھے۔

اس نے ٹائپ رائٹر میں کاغذ چڑھایا بڑی نفاست سے اس کے دونوں سرے برابر کیے پھر مشین کے بورڈ پر انگلیاں رکھ کر پہلا جملہ سوچنے لگا پہلے جملے کا ہی سارا مسئلہ ہوتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں نقطہ آغاز سے ہی قاری کی توجہ کہانی کی طرف مبذول کرا لینا کامیابی کی دلیل تھی کوئی سنسنی خیز جملہ ذہن میں نہیں آرہا تھا اس نے ٹائپ رائٹر سے انگلیاں ہٹا کر سگریٹ کا پیکٹ کھولا ایک سگریٹ سلگائی پھر بیئر کی ایک بوتل کھول کر دو گھونٹ بھرے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر دھوئیں کا مرغولہ چھوڑتے ہوئے اس نے پرخیال نظریں دائیں طرف کرسی پر رکھی تصویر پر جما دیں۔

سرورق کی تصویر میں گلی میں بھاگتی ہوئی خوف زدہ لڑکی کا لباس نیلا تھا اور شب خوابی کے گاؤن سے ملتا جلتا تھا۔

"نائٹ گاؤن میں ملبوس لڑکی گلی میں بھاگی جارہی تھی۔۔۔" اس نے پہلا جملہ سوچا' لیکن خود ہی اسے مسترد کر دیا اس کے خیال میں یہ بات تو قاری کو سرورق دیکھ کر ہی معلوم ہو جاتی تھی کہ نائٹ گاؤن میں ملبوس لڑکی گلی میں بھاگی جارہی تھی۔

اصل میں لڑکی کا کردار کہانی میں آگے جا کر اجاگر کرنا چاہیے پہلے مجرم کا کردار آنا چاہیے موڈی نے فیصلہ کیا مگر اس کا کردار کس طرح شروع کیا جائے؟ اس سوال پر غور کرنے کے لیے اس نے دوسری سگریٹ سلگائی بیئر کے تین چار گھونٹ بھرے قمیض کا ایک بٹن مزید کھولا۔

"دروازے کی گھنٹی بجی۔ لڑکی نے دروازہ کھولا

چمکیلی آنکھوں اور طوطے کی چونچ جیسی ناک والا ایک آدمی ہاتھ میں پارسل لیے دروازے پہ کھڑا تھا۔" یہ آغاز ٹھیک رہے گا۔ موڈی نے سوچا پھر اسے خیال آیا کہ اصل لفظ "لڑکی" استعمال کرنے کی بجائے اسے لڑکی کا نام لکھنا چاہیے۔ لڑکی کا نام کیا ہونا چاہیے؟ اس نے بیئر کے دو گھونٹ بھر کر ایک بار پھر سرورق کی تصویر پر نظر جما دی۔ لڑکی بہت خوب صورت تھی ایسا ہی خوب صورت اس کا نام ہونا چاہیے۔ ریٹا' فلورا' ایڈنا' نینسی۔۔۔ اونہہ یہ سب چال باز کے نام ہیں۔ فیکوٹا؟ ہاں یہ نام ٹھیک ہے لیکن تصویر میں لڑکی نے نیلے رنگ کا گاؤن پہنا ہوا ہے اس کا تو ذکر ہی نہیں آیا۔۔۔ چلو لڑکی کو نیلا گاؤن پہنا کر تو بعد میں بھی دوڑایا جاسکتا ہے فی الحال تو واقعات کا آغاز کرنا چاہیے' لیکن مسئلہ تسلی بخش طور پر حل نہ ہوا۔ آغاز کی فکر میں سگریٹوں پر سگریٹیں جلتی رہیں' بیئر کی بوتلیں خالی ہو کر فرش پر لڑھکتی رہی ردی کی ٹوکری میں سگریٹوں کے ٹکڑے جمع ہوتے رہے اور ٹائپ رائٹر پر کاغذ جوں کا توں رکھا رہا کبھی کوئی نکتہ موڈی کے ذہن میں پھنس جاتا اور کبھی کوئی کردار' عین اس وقت جبکہ کہانی کا آغاز کرنے کے لیے ایک شاندار سچویشن اس کے ذہن میں آرہی تھی۔ یک لخت اس کے حساس اعصاب کو ایک عجیب سی بے چینی کا احساس ہونے لگا اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی خفیہ گوشے میں چھپی ہوئی کوئی آنکھ اسے گھور رہی ہے اس نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا اور یہ جان کر اسے حیرت ہوئی کہ اس کے اعصاب کی یہ حساسیت محض وہم نہیں تھی واقعی کھڑکی کے شیشے سے باہر ایک کبوتر آیا بیٹھا تھا اس کی صرف ایک آنکھ نظر آرہی تھی جو شیشے پر ٹکی ہوئی تھی اور وہ اس قدر ساکت بیٹھا تھا جیسے حنوط کر دیا گیا ہو۔

موڈی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے "ہش" کر کے ہاتھ ہلا کر اسے اڑانے کی کوشش کی مگر کھڑکی بند ہونے کی وجہ سے اس کی آواز غالباً" کبوتر تک نہیں پہنچی اور وہ اسی طرح بیٹھا رہا موڈی نے ٹیلیفون اٹھایا اور کاؤنٹر کلرک سے رابطہ قائم کیا۔

"یہی ہے وہ کمرہ جس کے پرسکون ہونے کی تم نے گارنٹی دی تھی؟" وہ ریسیور میں غرایا۔

"کیوں جناب۔ کیا وہاں کوئی شور مچا رہا ہے؟" کلرک نے معصومیت سے پوچھا۔

"یہاں کھڑکی کے شیشے سے ایک کبوتر چپکا بیٹھا ہے۔" موڈی نے تلخ لہجے میں کہا۔

"کیا وہ شور و غل کر رہا ہے؟" کلرک نے جاننا چاہا۔

"وہ شیشے پر ایک آنکھ ٹکائے مجھے گھور رہا ہے۔ کیا یہ بات میرے سکون میں خلل ڈالنے کے لیے کافی نہیں؟" موڈی تقریباً" چلا اٹھا۔

"آپ کھڑکی کھول کر اسے اڑا دیجیے۔" کلرک نے مشورہ دیا۔

"اور وہ دوبارہ آبیٹھا تو کیا میں ساری رات اسے اڑاتا ہی رہوں گا؟"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس نوعیت کے معاملے میں ہوٹل کے قواعد و ضوابط کے مطابق میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" کلرک نے بے چارگی آمیز طنز سے کہا۔ "بہرحال میں ایک لڑکا بھیج دیتا ہوں جو اسے اڑا دے گا اور کھڑکی کے قریب ہی کھڑا رہے گا تاکہ وہ دوبارہ نہ آبیٹھے۔"

"کیا کہا؟ لڑکا کھڑکی کے قریب کھڑا رہے گا؟" موڈی پھر چلایا "خبردار جو اسے کھڑا رہنے کے لیے کہا میں خود ہی اڑا لوں گا۔" اس نے ریسیور پٹخا اور اٹھ کر کھڑکی کھولی۔

کبوتر نے بمشکل وہ جگہ چھوڑی۔ موڈی اسے اڑاتا تو دوبارہ وہ ایک آدھ چکر لگا کر وہیں آبیٹھتا۔ عین اس وقت جبکہ اس کے پیچھے موڈی نے خود بھی فضا میں چھلانگ لگانے کا ارادہ کر لیا تھا' تب وہ ہوا میں اڑتا ہوا ایک طرف کو غائب ہو گیا۔

اپنی کرسی پر واپس آکر اس نے سانس درست کیا "بیئر کی نئی بوتل کھولی" نیا سگریٹ سلگایا اور از سر نو خیالات مجتمع کرنے لگا۔

ایک چوتھائی رات بیت جانے کے بعد آخر کار کہانی کا آغاز اس کے ذہن میں آہی گیا پہلا جملہ اس

نے رک رک کر ٹائپ کیا پھر تو اتنی روانی سے اس کا ہاتھ چلنے لگا کہ ٹائپ رائٹر کا رولر کسی پسٹن کی سی تیزی سے سطریں ختم کر کر کے آگے پیچھے جاتا محسوس ہونے لگا۔ دوسرے کے بعد تیسرا اور اس کے بعد چوتھا اس کے بعد تو دھڑا دھڑ فرش پر کاغذوں کا ڈھیر لگنے لگا۔ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا البتہ سگریٹ ایک کے بعد ایک ضرور سلگا لیتا اور بیئر کے گھونٹ بھی بھر لیتا تھا۔

سرورق کی کہانی عام کہانیوں سے کہیں زیادہ طویل ہوتی تھی اس لیے تمام تر تیز رفتاری سے ٹائپ کرنے کے باوجود جب اس نے "دی اینڈ" کے خوش کن الفاظ ٹائپ کیے تو اس کی کمر اکڑ کر تختہ ہو چکی تھی اور آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے ستارے ناچ رہے تھے۔ اس کے چاروں طرف فرش پر کاغذ ہی کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ بمشکل تمام وہ اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ننگے پاؤں ان کاغذوں پر سے گزر کر ہی بستر تک پہنچا اور ڈھیر ہو گیا اب اس میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ اپنے اعضا کو ذرا سی بھی جنبش دے سکتا لیکن اس کا رواں رواں خوشی سے سرشار تھا۔ اس نے ایسی شاہکار کہانی تخلیق کر ڈالی تھی جس نے مسٹر ٹارلٹ کی نظر میں اسے رسالے کا سب سے اہم کہانی نگار ہی نہیں بلکہ آڑے وقت میں کم سے کم مہلت میں زیادہ سے زیادہ لکھ سکنے والا مصنف بھی ثابت کر دینا تھا۔ یہ کہانی اس کے پیشے میں ایک سنگ میل ثابت ہونا تھا اور بلاشبہ قسمت نے ہی اسے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع دیا تھا۔ اس کی آنکھیں مدہوشی کی سی کیفیت میں بند ہوتی گئیں اور ذہن نہ جانے کب اندھیروں میں ڈوب گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو پہلے وہ یہی سمجھا کہ اپنے گھر میں ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو بیڈ ٹی لانے کے لیے آواز دی مگر جواب میں اس نے ایک کرخت آواز سن کر آنکھیں کھولیں مسٹر ٹارلٹ اس کے سر پر کھڑے چلا رہے تھے۔

"سوتے رہو، سوتے رہو۔ تمہیں کیا پروا ہے کہ میں نے کس قدر اہم ذمہ داری تمہارے سپرد کی تھی۔"

موڈی نے آنکھیں ملیں، حواس مجتمع کیے پھر مسٹر ٹارلٹ کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ "میں نے وہ ذمہ داری پوری کر دی ہے وقت کیا ہوا ہے؟"

"پونے نو۔ نو بجے ہمیں کہانی پریس والوں کو دینی ہے۔ میں ساڑھے آٹھ بجے تک دفتر میں تمہارا انتظار کر کے آرہا ہوں کہاں ہے کہانی؟" مسٹر ٹارلٹ بدحواس ہو کر چیخے جا رہے تھے۔

"یہ رہی کہانی۔" موڈی نے فرش پر ادھر ادھر پھیلے ہوئے کاغذوں کی طرف اشارہ کیا۔ "ان اوراق پریشاں کو جمع کرنے کی زحمت خود کر لیجیے مجھ سے تو مارے تھکن کے اٹھا نہیں جا رہا۔"

مسٹر ٹارلٹ کاغذوں کو اکٹھا کرنے لگے اس اثنا میں جو بھی کمرے میں آپہنچا اور جب اسے معلوم ہوا کہ سرورق کی کہانی کے پرزے اکٹھے کیے جا رہے ہیں تو وہ بھی ہاتھ بٹانے لگا۔ دفعتاً مسٹر ٹارلٹ کاغذ جمع کرتے کرتے رک گئے جمع شدہ کاغذوں کا پلندہ اٹھا کر وہ موڈی کے بستر کے قریب آئے۔

"یہ کہانی ہے؟" انہوں نے عجیب انداز میں غرا کر پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا۔" موڈی پلکیں جھپکا کر بولا۔

"یہ سارے کاغذ تو سادہ ہیں۔"

"یہ الٹے رخ فرش پر گرے ہیں انہیں سیدھا کیجیے۔" موڈی اطمینان سے کہا۔

مسٹر ٹارلت نے دونوں رخ سے کاغذ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائے۔ "یہ دونوں طرف سے سادہ ہیں۔"

موڈی اسپرنگ والے گدے کی طرح اچھل کر ٹائپ رائٹر تک پہنچا اس کا اوپری حصہ کھول کر دیکھا دوسرے ہی لمحے وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر فرش پر ڈھیر ہوتا چلا گیا اس کے منہ سے صرف "اوہ نو" نکلا۔ "ٹائپ رائٹر میں کاربن کی ربن چڑھانا تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

☼ ☼

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

لیکن اس سے پہلے کہ میں اس منگنی کے بارے میں علی الاعلان کسی پس و پیش کا اظہار کرتا التھیا نے باقاعدہ طور پر اس کا اعلان کردیا۔ اب اگر میں اس کی تردید کرتا تو کیا کیا اسکینڈل نہ بنتے اور آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ میں ٹھہرا ایک خاندانی آدمی! میں کس طرح اپنے آپ کو اسکینڈل کا نشانہ بناسکتا تھا۔ میرے اور التھیا کے چند دوستوں اور عزیزوں کی موجودگی میں آخر کار شادی ہو کر ہی رہی۔

وضعدار

محمد مقصود خان

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

عزیز من یہ بالکل سیدھا سادا اور معمولی سا قصہ ہے اور گو کہ میں اس قسم کی معمولی باتوں کی وضاحت کرنا بالکل پسند نہیں کرتا لیکن سر دست مجھے یہ ناخوشگوار فریضہ انجام دینا ہی پڑے گا ورنہ آپ اخبارات میں چھپنے والی ان احمقانہ داستانوں پر ہی یقین کرتے رہیں گے اور آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ یہ بے ہودہ اخبارات محض ان لوگوں کی تسکین طبع کے لئے شائع کیے جاتے ہیں جو ہر وقت اور ہر لمحہ آنکھیں پھاڑے اور کان کھڑے کیے کسی اسکینڈل کی تلاش میں در و دیوار کو سونگھتے پھرتے ہیں۔ میں ایسے انسانوں پر ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتا لیکن عجب ستم ظریفی ہے کہ آج کل میرے تذکرے اسی قبیل کے لوگوں کی زبان پر ہیں مگر میں کسی اسکینڈل کا شکار ہونے سے قبل مرجانا پسند کرتا ہوں۔ چنانچہ اس سے

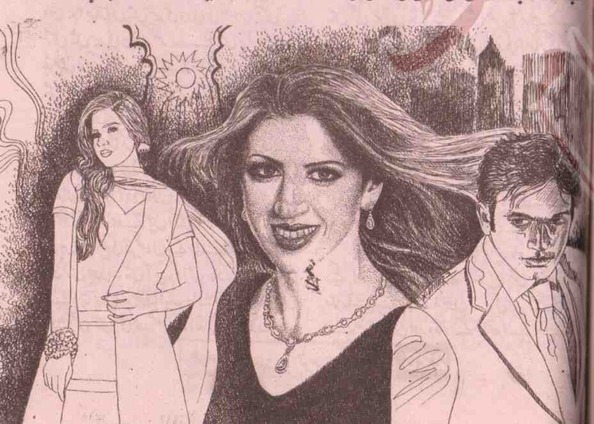

چاہے کہ آپ میرے ... کوئی اسکینڈل ہیں ہیں خود
یہ سیدھی سادی سی بات آپ کے گوش گزار کیے دیتا ہوں...... اسکینڈل سے بچنے کی میری یہ خواہش بلا جواز نہیں ہے۔ میرا خاندانی پس منظر ہی اتنا بے داغ ہے کہ اس پر کسی بدنامی کے داغ کی گنجائش نہیں اور میری خاندانی اعلیٰ ظرفی اور برتری میرے خون کے ذرات میں شامل ہے۔ میں اپنے شجرہ نسب پر نظر ڈالتا ہوں تو سو سال پیچھے تک مجھے اپنے خاندان میں ڈاکٹروں' پروفیسروں اور عالموں کی ایک طویل قطار نظر آتی ہے' یہ تو صرف میرے ددھیال کی بات ہے' ننھیال کی طرف بھی کسی غیر معزز عورت کا گزر نہیں رہا بلکہ سماجی کارکن اور تخلیقی کام کرنے والی نامور عورتوں سے ہمارا خاندانی قبرستان بھرا پڑا ہے۔

میری والدہ مرحومہ اکثر مجھے احساس دلایا کرتی تھیں کہ ہمارا خاندانی نام یعنی 'گرائڈن' ہی ہمارا قیمتی اثاثہ ہے اور اس اثاثے کو کبھی ہاتھ سے نہیں کھونا۔ ان کے نزدیک گرائڈن فیملی کا فرد ہونے سے زیادہ دنیا کی کوئی بات اہم نہیں تھی۔ اب میں بھلا ان کی اس بات کو سو فیصد درست کیوں نہ سمجھوں۔ آخر وہ میری والدہ تھیں۔

آپ اس حادثے کی بات کر رہے ہیں......
وہی جو اخباروں میں میری بیوی کی تصویر دیکھی ہے' جس میں میری بیوی کنکریٹ کے فرش پر ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں اور مسخ شدہ چہرے کے ساتھ مردہ پڑی ہے۔ میں خود جب بھی اس تصویر کے متعلق سوچتا ہوں' میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ یہ ایک خوفناک تصویر ہے' بلکہ اس لئے کہ اسے بے شمار لوگوں نے دیکھا ہوگا اور میں ایک معزز خاندان کا معزز آدمی ہوں۔ یہ فوٹوگرافر بھی کس قدر نامعقول لوگ ہوتے ہیں انہیں اتنا بھی احساس نہیں کہ ہر چیز عوام کی آنکھوں کے سامنے ڈال دینے کے لئے نہیں ہوتی۔ میں آپ کو اس حادثے کے متعلق بتائے دیتا ہوں' یہ حقیقتاً ایک حادثہ تھا۔ ایک خالص حادثہ جس میں کسی اور قسم کے اتفاق کی ملاوٹ نہیں

ہے۔ آپ تو میرے الفاظ پر یقین کرنا ہی چاہ... کیونکہ یہ کسی ایرے غیرے کے نہیں' ایک 'گرائڈن' کے الفاظ ہیں۔ آپ خود ہی دیکھ لیجئے گا کہ یہ کتنی سادہ اور معمولی سی بات تھی۔

میں آپ کو اپنے اعلیٰ خاندانی پس منظر کے متعلق تو بتا ہی چکا ہوں' اب آپ اپنے تخیل پر ذرا سا زور دیں تو تصور کی آنکھ سے میرا وہ گھر دیکھ سکتے ہیں' جہاں نے بچپن گزارا' جہاں ہر چیز اپنی جگہ پر سلیقے سے سجی ہوتی تھی اور جہاں میری ماں فارغ وقت میں پیانو پر باوقار قسم کی دھنیں بجایا کرتی تھی' اس نے مجھے بھی پیانو کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اس سلسلے میں کوئی امید افزا ردعمل ظاہر نہیں کیونکہ میں کبھی پیانو نواز نہیں بن سکتا تھا۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ جسے پیانو بجانا آتا ہو' لوگ عام طور پر محفلوں اور تقریبات میں اس سے پیانو بجانے کی فرمائش کرنے لگتے ہیں اور میں کبھی مجمع کا سامنا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا' کیونکہ میں بچپن ہی سے بہت شرمیلا اور تنہائی پسند تھا۔ مزید یہ کہ میں بہت ترتیب پسند واقع ہوا تھا۔ ہر چیز میں باقاعدگی اور ترتیب کا خیال رکھنا بڑی چھوٹی عمر سے ہی میری عادت بن گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اس چھوٹی سی عمر میں بھی جوتوں کے فیتے اچھی طرح برابر ناپ کر باندھتا تھا اور پتلون کی کریز بھی تلوار کی دھار کی طرح رکھنا پسند کرتا تھا۔ میری خادمہ' اللہ اسے جنت نصیب کرے' یہی شکوہ کیا کرتی تھی کہ میرا کمرہ بالکل یوں سجایا اور چھیڑ چھاڑ سے محفوظ رہتا ہے' جیسے اس میں کوئی رہتا ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ وہ کسی بچے کا کمرہ ہرگز نہیں لگتا اور وہ بے چاری یہی ارمان لئے دنیا سے رخصت ہوگئی کہ میرا کمرہ کسی بچے کا کمرہ نظر آسکے۔ مجھے اس کی یہ حسرت پوری نہ ہونے پر افسوس ہے۔

جب میں کالج میں پہنچا تو چھ ماہ کے دوران یکے بعد دیگرے میرے والدین بھی مجھے داغ مفارقت دے گئے۔ انہوں نے اپنا یہ آخری سفر بڑے صبر و سکون اور وقار کے ساتھ اپنے اپنے بستر

...ں لیٹے لیٹے اختیار کیا۔ انہوں نے آخری سانس ...ک کوئی ہاؤ ہو' کوئی شور شرابا نہیں مچایا' اور اپنی ...ہذبانہ خاندانی روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑی ...اموشی سے اپنی جان' جان آفریں کے سپرد کردی۔

ورثے کی تقسیم کا کام مکمل ہوتے ہی مجھے اندازہ ...ا کہ مجھے تعلیم جاری رکھنے کی بجائے نوکری تلاش کرنا ...ہیے۔ اتفاق سے ہمارے ایک ایسے خاندان سے ...ے پرانے گھریلو مراسم چلے آرہے تھے جو بینکاری ...ے بزنس میں نمایاں مقام رکھتے تھے اور دو بار سے ان ...ی جڑیں بھی ہمارے خاندان سے آملتی تھیں۔ ان ...گوں کی نظر عنایت سے مجھے ایک بینک میں ...کاؤنٹنٹ کی نوکری مل گئی۔ یہ نوکری مجھے دل و جان ...ے پسند تھی کیونکہ اس میں مجھے ہندسوں کو ترتیب سے ...لکھنے کا موقع ملتا تھا۔ رجسٹروں اور بہی کھاتوں کو ترتیب ...ے رکھنے کا موقع ملتا تھا۔ یہاں کوئی چیز بے ہنگم اور ...بے ترتیبی نہیں ہوتی تھی۔ ماہ و سال گزرتے گئے' حتیٰ ...کہ میں خود اس مقام تک پہنچ گیا کہ لوگوں کو ملازم ...رکھنے کی حد تک با اختیار ہوگیا۔ تاہم میں یونہی ...آنکھیں بند کرکے کسی کو ملازم رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ ...میں اس کے خاندانی پس منظر اور اعلیٰ خون کو اہمیت دیتا ...تھا۔ خواہ مخواہ کسی معمولی خاندان کے آدمی کی بھرتی ...کرلینے سے کل کلاں کو اس کی کسی گھٹیا حرکت کی ...دولت بینک کی شہرت کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ میں ...اپنے ہی جیسے اعلیٰ خاندان کے لوگوں کو فوقیت دیتا تھا' ...لیکن میرے جیسے اونچے خاندان والے روز روز ...ملازمت تلاش کرنے نہیں آتے۔ عورتوں کی طرف ...میں کچھ زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا کیونکہ میں اپنے اس ...اپارٹمنٹ سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا' جہاں چھوٹی ...سے چھوٹی چیز بھی میری مرضی کے مطابق اپنی صحیح جگہ ...سجی ہوئی تھی۔ وہاں کبھی فرش پر ذرا سی سوئی یا بال ...برابر تنکا بھی فالتو پڑا نظر نہیں آتا تھا۔ اس طرح کوئی ...چیز میرے مشاغل میں حائل نہیں ہوتی تھی۔ اور ...میرے مشاغل ہی صرف دو تھے۔ ایک تو ٹکٹیں جمع ...کرنا اور دوسرے ہندسوں سے کھیلنا۔ مجھے ہندسوں سے گہری دلچسپی تھی اور میں مختلف ہندسوں کو توڑ جوڑ کر خود کو ہی مختلف کرتب دکھا کر محظوظ کیا کرتا تھا۔

واحد عورت جس کی طرف میں متوجہ ہوا' وہ التھیا تھی۔ میری اس سے ملاقات انہی لوگوں کے گھر ہوئی تھی' جنہوں نے مجھے ملازم رکھا تھا اور اس وقت میں دفتر کے کسی اضافی کام کے سلسلے میں ان کے ہاں گیا تھا۔ کام کے اختتام پر اس نے ہمیں چائے پیش کی اور اس دوران میری طرف دیکھ کر میٹھے انداز میں مسکرائی بھی تھی۔ عمومی پیمانے کے مطابق وہ خوبصورت نہیں تھی لیکن مجھے بے حد خوبصورت لگی کیونکہ وہ میرے مالکان کی کزن تھی۔ اس کے بعد میری اس سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ ہم نے اکٹھے کھانے کھائے' ان کے گھر میں بیٹھ کر کئی مرتبہ گپ شپ کی اور ٹی پروگرام دیکھے' کئی تقریبات میں گئے اور ایک مرتبہ بعد دوپہر ایک پارک میں چہل قدمی بھی کی۔ اس تمام مصروفیت کے دوران میں اپنے مشغلوں پر بھی زیادہ توجہ نہیں دے سکا۔ حالانکہ ان دنوں میں پانچ کوڈ نمبروں پر کام کر رہا تھا اور اگر میری توجہ حسب معمول برقرار رہتی تو میں اب تک یہ پانچ کوڈ نمبر ایجاد کرچکا ہوتا۔ اس کے بجائے ہوا یہ کہ ایک شام میں نے اپنے مالکان کے ڈرائنگ روم میں ہی التھیا کو شادی کی پیشکش کردی۔

میری بات سنتے ہی وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گئی۔ اس نے خوشی سے چیخ ماری' اس کی آنکھوں میں باقاعدہ آنسو آگئے' اس نے زور سے مجھے چوما جس سے میرا چہرہ تھوک میں لتھڑ گیا' اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک آگئی۔ یہ سب کچھ اس سنجیدہ اور لئے دیئے رہنے والی خاموش طبع اور پرسکون لڑکی کے طرز عمل کے خلاف تھا۔ میں جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔

اس نے میرا رشتہ فوری طور پر منظور کرلیا۔

جب میں گھر واپس آرہا تھا تو اس فیصلے سے اتنا مضطرب تھا کہ راستے میں معمول کے مطابق اخبار لینا بھی بھول گیا۔ الجھن یہی تھی کہ کیا میں نے

یہ فیصلہ صحیح کیا ہے۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ انسان جو کچھ بظاہر نظر آتا ہے اس کے علاوہ بھی اس میں کچھ پوشیدہ خاصیتیں ہوتی ہیں جو کبھی کبھار اتفاقاً روشنی میں آجاتی ہیں۔ اسی نظریئے کے مطابق درحقیقت میں نے آج ایک نئی التھیا کو دیکھا تھا۔ وحشی اور جنونی قسم کی التھیا۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں اس منگنی کے بارے میں علی الاعلان کسی پس و پیش کا اظہار کرتا' التھیا نے باقاعدہ طور پر اس کا اعلان کردیا۔ اب اگر میں اس کی تردید کرتا تو کیا کیا اسکینڈل نہ بنتے اور آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ میں ٹھہرا ایک خاندانی آدمی! میں کس طرح اپنے آپ کو اسکینڈل کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ میرے اور التھیا کے چند دوستوں اور عزیزوں کی موجودگی میں آخر کار شادی ہو کر ہی رہی۔

ہم نے اپنے اپارٹمنٹ کو سجانا شروع کردیا اور انہی دنوں میں التھیا کی نئی نئی عادتیں مجھ پر منکشف ہونے لگیں۔ وہ ایک بے ہودہ قسم کے گاؤن میں صبح ہی صبح چائے کا کپ اٹھائے میرے سامنے آجاتی یا دیر تک سوئی ہی رہتی۔ شاپنگ کرنے جاتی تو مطلوبہ چیزوں کی کوئی فہرست بھی ساتھ لے جانا گوارا نہ کرتی۔ شام کے کھانے پر عموماً آدھہ گھنٹہ تاخیر سے ہی پہنچتی۔ یہ یقیناً میری وہ آئیڈیل التھیا نہیں تھی جس سے شادی کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ حد درجے کی کوڑھ مغز اور پھوہڑ بھی تھی۔ اسے میرے مشاغل سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ ایک طرح وہ اس بات سے حسد کرتی تھی کہ میں ان میں کیوں وقت صرف کرتا ہوں۔

جناب عالی! آپ سوچ نہیں سکتے کہ مجھ پر کیا گزرتی تھی جب میں اپنے اپارٹمنٹ کو روزانہ نئے طریقے سے تہہ و بالا ہوتے دیکھتا تھا۔ میں نے جب سے ملازمت اختیار کی تھی تب سے شادی والے دن تک اس اپارٹمنٹ میں ایک سوئی بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلائی گئی تھی مگر اب اس میں کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں رہی تھی اور جانے وہاں کس کس الابلا کا اضافہ ہو چکا تھا۔ مجھے یہی محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے خوابوں کی جنت سے نکال کر عفریتوں سے بھرے جنگل میں پھینک دیا ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں' کہاں بھاگ جاؤں۔ مجھے اپنا وجود قابل رحم لگنے لگا تھا لیکن یہ ساری کیفیات میرے اپنے آپ تک محدود تھیں' لوگوں کی نظر میں میں ایک پرسکون اور مطمئن شوہر تھا۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ میں کس جہنم میں سلگ رہا ہوں۔ لوگوں کو بھلا میں علم ہو بھی کس طرح دیتا۔ میں نے کوئی اسکینڈل بنوانا تھا۔

میں ان مسائل پر سوچتا رہا' سوتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ دن آیا جب التھیا نے اپنی جہالت کے سبب میرے وہ تمام کاغذات ضائع کرادیئے جن پر میں ہندسوں کا کوڈ ایجاد کرنے کے لئے کام کررہا تھا اور تبھی میں نے فیصلہ کیا کہ یہ سب کہ اب برداشت سے باہر ہو چکا ہے۔

اس دن تو انتہا ہی ہوگئی۔ میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر میرے سر پر ہتھوڑا سا پڑا کہ پورا رہائشی کمرہ نئے فرنیچر سے بھرا پڑا تھا۔ اس قدر تیز' چبھتے ہوئے رنگوں اور عجیب عجیب ڈیزائنوں کا فرنیچر تھا۔

''ہیلو ڈارلنگ!'' وہ چہکی۔ ''کہو یہ چیزیں پسند آئیں۔''

''تم کیا کررہی ہو التھیا......'' میں نے اپنی آواز پرسکون رکھنے کی کوشش کی۔

''ارے تم سمجھے نہیں......'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''میں اپارٹمنٹ کی ازسرنو آرائش کررہی ہوں۔''

''اوہ...... اچھا......'' میں نے بمشکل کہا اور لڑکھڑاتا ہوا اس چھوٹے سے ڈربہ نما کمرے کی طرف بڑھا جو شروع دن سے میری پناہ گاہ تھا۔ جہاں ہر چیز میری مرضی کے مطابق رکھی تھی اور جہاں میں پریشانی کی حالت میں داخل ہو کر اپنے مسائل اور ان کے سلجھاؤ کے بارے میں غور و خوض کیا کرتا تھا۔ جب میں اس کمرے میں پہنچا تو یہ دیکھ کر مجھ پر بجلی سی گر پڑی کہ التھیا کہ آرائش خانہ کی مہم یہاں

تک بھی پہنچ چکی تھی۔ یہاں بھی ہر پرانی چیز کا تختہ الٹ دیا گیا تھا اور نئی چیزوں نے ان کی جگہ لے لی تھی۔ میری محبوب میز وہاں سے ہٹائی جا چکی تھی۔ میرے پیارے شیلف جن میں میرا ہندسوں کا حساب کتاب ترتیب سے رکھا تھا' وہ بھی اب وہاں نہیں تھے۔

''التھیا...... التھیا......'' میں بے قابو ہو کر چلایا۔ ''یہ تم نے یہاں کیا کیا ہے۔''

''میں گھر کو نئے رنگ میں رنگ رہی ہوں ڈارلنگ......'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے وہ پرانا لیمپ ہٹا دیا ہے جس کی روشنی آنکھوں کے لئے نقصان دہ تھی' اور وہ فرنیچر بھی میں نے ٹھکانے لگا دیا جسے دیکھ کر آج کے دور میں لوگوں کو وحشت ہوتی ہے۔''

''اور میرا وہ ہندسوں کا ریکارڈ......'' میں نے پوچھا۔

''اوہ...... وہ پرانے بوسیدہ کاغذات......'' اس نے پوچھا۔ ''وہ تو میں نے باہر پھینک دیئے تھے...... کیا بات ہے تمہارا رنگ کیوں پیلا پڑ رہا ہے...... ہوریس......''

یقیناً یہی بات تھی' میرا غالباً رنگ ہی پیلا نہیں پڑا تھا بلکہ میں اپنے آپ کو برسوں کا بیمار محسوس کررہا تھا لیکن وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکتی تھی...... میں سوچ رہا تھا کہ کاش میں نے اسے نہ دیکھا ہوتا یا کاش وہ دھوئیں کے ایک مرغولے کی طرح ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔

''میرا خیال ہے تم لیٹ جاؤ ڈارلنگ......'' میں نے اس کی آواز سنی۔

میں نے بمشکل اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور ایک نئی کرسی پر ڈھیر ہو گیا جو کچھ اس طرح میرے جسم میں چبھی کہ میری کراہ نکل گئی۔

''نہیں...... میں بالکل ٹھیک ہوں......'' میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ وہ بولتی رہی۔ بالکل روایتی بیویوں کی طرح بے تحاشا باتیں کرتی رہی۔ یہ بتاتی رہی کہ آخر کار کس طرح اس نے اس دقیانوسی گھر کا یا پلٹ دی ہے۔ پھر اس نے پلاسٹک کور والی گدیاں اٹھائیں اور بالکونی کے بند دروازے کی طرف چل دی۔ اس دروازے کو میں نے کبھی نہیں کھولا تھا کیونکہ مجھے کبھی بالکونی استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ التھیا نے دونوں ہاتھوں میں گدیوں کا ڈھیر اٹھا رکھا تھا اس لئے مجھے آواز دے کر بولی۔

''ہوریس' ذرا دروازہ کھول دینا پلیز۔''

جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا تو مجھے ایک اور صدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے بالکونی میں بھی لوہے کی ایک میز اور اس سے میچ کرتی ہوئی چار کرسیاں سجادی تھیں اور انہی کرسیوں کے لئے اس نے گدیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔

میں نے بڑی مایوسی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ دور بلندیوں پر ایک جہاز پرواز کررہا تھا اور اپنے عقب میں دھوئیں کی لکیر چھوڑتا جارہا تھا' نیچے سے ٹریفک کا شور بہت مدھم ہو کر یہاں تک پہنچ رہا تھا۔ فضا میں ڈوبتے سورج کی کندنی کرنیں لرز رہی تھیں۔ نیچے ایک طرف فٹ پاتھ پر اخبار بیچنے والا لڑکا جارہا تھا۔ ہر چیز معمول کے مطابق تھی مگر میرے معمولات کی دنیا تہہ و بالا ہو چکی تھی اور میں جانتا تھا کہ میری اجڑی ہوئی دنیا کو آباد کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔

التھیا گدیوں کو کرسیوں پر رکھ چکی تھی اور اب کھڑی ناقدانہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکونی کے جنگلے کے بالکل قریب تھی۔ چار منزل نیچے کنکریٹ کا فرش نظر آرہا تھا۔ میں عقب سے التھیا کے مزید نزدیک پہنچا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اسے اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ اس کی باریک سی چیخ اسے دور لے گئی۔ میری دنیا سے دور' زندگی سے دور اور ان تبدیلیوں سے دور جو وہ میرے گھر میں لے کر آئی تھی۔

''واہ!'' میرے سینے سے کس قدر آسودہ سانس برآمد ہوئی تھی' جیسے میں نے اپنے کندھوں

سے ہزار ہا ان دری بوجھ اتار پھینکا ہو لیکن میں اس پرمسرت لمحے سے زیادہ دیر تک لطف اندوز نہیں ہوسکتا تھا' مجھے ابھی اپنا المیہ کردار ادا کرنا تھا۔اب یہ فریضہ مجھے کچھ زیادہ ناخوشگوار محسوس نہیں ہو رہا تھا کیونکہ انعام کے طور پر مجھے' میری پرانی جگہ واپس ملنے والی تھی۔ میرا وہ گھر جہاں میری ہر متروک چیز کو واپس آنا تھا اور جسے میں نے اپنی مرضی اور ترتیب سے آراستہ کرنا تھا تبھی میری زندگی کی خوشیاں لوٹ سکتی تھیں۔

میں ایک زوردار چیخ مار کر ہال کی طرف دوڑا' کئی دروازے میں نے دھاڑ دھاڑ کر کے کھولے تاکہ پڑوسی آن پہنچیں۔

"ہائے بے چاری میری بیوی......" میں نے دہائی دی۔"وہ بالکونی سے نیچے گر گئی ہے......" اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

پڑوسی مجھے اٹھا کر واپس اپارٹمنٹ میں لائے' مجھے لٹایا اور چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگے۔ میری مطلوبہ بھاگ دوڑ' افراتفری اور ہنگامہ مچ گیا تھا۔ کوئی چیخ رہا تھا' ارے زیادہ پانی منہ پر مت ڈالو۔کوئی ہدایت دے رہا تھا کہ ڈاکٹر کو بلاؤ' ایمبولینس طلب کرو' پولیس کو بلاؤ وغیرہ وغیرہ۔ بے چارے بھولے پڑوسی! بے اختیار میرا جی چاہ رہا تھا کہ ان سب کی سادگی پر مسکرا پڑوں مگر آپ جانتے ہیں کہ یہ موقع اس قسم کے خوشدلانہ فعل کے لئے موزوں نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک کھردرا سا آدمی پولیس کی وردی میں ملبوس' مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس وقت تک میں ہوش میں آ چکا تھا۔

"تم گرائڈن ہو......" اس نے پوچھا۔

"ہاں......ہورلیس گرائڈن......" میں نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے' نقاہت بھری آواز میں کہا۔

"تو پھر اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ......" اس نے حکم دیا۔

"آفیسر......" میں نے اس کی طرف نظریں اٹھا کر کہا۔"میں ایک دلدوز سانحے سے گزرا ہوں۔

"مجھے ہر حق حاصل ہے......نوجوان......" اس نے لاپرواہی سے کہا۔"غالباً تم اب دعویٰ کرو گے کہ وہ گر گئی ہے۔"

"یقیناً......وہ گری تھی۔"

پولیس آفیسر نے یوں میری طرف دیکھا جیسے میرے منہ پر تھوکنا چاہتا ہو۔"تم نے اسے بالکونی سے اٹھا کر پھینکا ہے جھوٹے......اس وقت آسمان پر ایک جہاز پرواز کر رہا تھا اور نیچے ایک لڑکا اخبار بیچ رہا تھا جس سے تم روزانہ اخبار خریدتے ہو' جہاز کی آواز سن کر ایک لمحے کے لئے وہ لڑکا اپنا کاروبار چھوڑ کر اوپر دیکھنے لگا تھا جیسا کہ عام طور پر کم عمر لڑکے کیا کرتے ہیں' وہ تصور ہی تصور میں خود کو مستقبل کا پائلٹ سمجھ کر اپنی ناتمام خواہشوں کو تسکین دیتے ہیں......اسی لمحے اس لڑکے نے تمہیں یہ کارنامہ انجام دیتے دکھا تھا۔"

اپارٹمنٹ پر سناٹا چھا گیا......میں بت بنا بیٹھا تھا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا......" پولیس آفیسر نے پوچھا۔

"وہ......وہ میری زندگی تباہ کر رہی تھی......" میں نے جواب دیا۔

"تو تم اس سے علیحدگی بھی اختیار کر سکتے تھے......" پولیس والے نے کہا اور یہی بات گویا اپارٹمنٹ میں موجود ہر شخص کے چہرے پر لکھی گئی۔وہ سب متنفرانہ نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

"اچھے چھوڑ دیتا......" میں نے اس طرح کہا گویا اس نے زیادہ احمقانہ بات ممکن ہی نہیں تھی۔

"میں اسے چھوڑ دیتا......اور زندگی بھر کے لئے طلاق کا اسکینڈل بنوا لیتا۔ بے وقوف کہیں کے......تمہیں علم نہیں گرائڈن فیملی کا کوئی فرد کبھی کسی اسکینڈل کا شکار نہیں ہوا۔"

مشہور و مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گردپوش

کتاب کا نام		قیمت
آوارہ گرد کی ڈائری	سفرنامہ	450/-
دنیا گول ہے	سفرنامہ	450/-
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	سفرنامہ	450/-
چلتے ہو تو چین کو چلیے	سفرنامہ	275/-
نگری نگری پھرا مسافر	سفرنامہ	225/-
خمار گندم	طنز و مزاح	225/-
اُردو کی آخری کتاب	طنز و مزاح	225/-
اس بستی کے کوچے میں	مجموعہ کلام	300/-
چاند نگر	مجموعہ کلام	225/-
دل وحشی	مجموعہ کلام	225/-
اندھا کنواں	ایڈگر ایلین پو/ابن انشاء	200/-
لاکھوں کا شہر	او ہنری/ابن انشاء	120/-
باتیں انشاء جی کی	طنز و مزاح	400/-
آپ سے کیا پردہ	طنز و مزاح	400/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

Art With You

Paint with Water Color & Oil Colour

First Time in Pakistan
a Complete Set of
5 Painting Books
in English

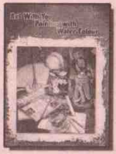

Water Colour I & II
Oil Colour
Pastel Colour
Pencil Colour

آپ آرٹ کے طالب علم ہیں یا پروفیشنل آرٹسٹ برش پکڑنے سے، مکمل پینٹنگ تک آپ بن سکتے ہیں ایک مکمل آرٹسٹ

اب پینٹنگ سیکھنا بہت آسان ایک ایسی کتاب جس میں پینٹنگ سے متعلق ساری معلومات

Art With You

شائع ہو گئی ہے

قیمت -/350 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔فون: 32216361

اندھے راستے

جاوید راہی

زندگی طویل ہو یا مختصر، ایک کہانی میں لپٹی ہوتی ہے۔انسان جینے کے لیے سفر کا آغاز کرتا ہے اور آغاز کے لیے روشن راستے تلاش کرنا سب سے مشکل کام ہے۔ جبکہ تاریکیوں میں بڑھنے والے ہر قدم کے لیے احتیاط کی ضرورت ہے۔

ایک اندھے رستوں کے مسافر کی داستان

ہزاروں بار یہ بات کہی گئی ہے۔ لکھی گئی ہے کہ انسان فطری طور پر برا نہیں ہوتا وقت' عوامل اور حالات اس کی اپنی کوئی شخصیت نہیں رہنے دیتے یہی کیفیت جلال الدین کی تھی اٹھارہ سال کی عمر سے تیس سال کی عمر تک برا نہیں تھا۔ عزت کی روٹی اور سر چھپانے کا ٹھکانہ تلاش کرتا رہا تھا' لیکن زندگی تجربات کا نام ہے اور اس کے پاس تجربات کا خزانہ تھا۔

آخر کار اس نے اس خزانے میں سے کچھ حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے اس کے پاس بہت سے ذرائع اور بہت سے کردار تھے۔ اکثر ہی قلاش رہتا تھا نوکری ملتی تھی چھوٹ جاتی تھی کردار تھے ملتے تھے بچھڑ جاتے تھے لیکن شرافت سے نہیں بلکہ..... عموماً"....

خیر چھوڑیں۔ انسان اگر اپنی داستان حیات سنانے بیٹھے تو کتاب بن جائے۔ ہر انسان ایک کتاب ہے اور اس میں بے شمار کردار ہوتے ہیں۔ **مثلاً** "کرایہ نہ دینے پر مالک مکان کے دھکے' کئی کئی دن کے فاقے' بہت سی بار دل میں برائی جاگی لیکن اس نے اسے تھپک کر سلا دیا لیکن وقت کہہ رہا تھا کہ کچھ تو ہو بے شک ایسا نہ ہو کہ اپنے ہی کسی کو زندہ در گور کر رہے لیکن خود بھی تو زندہ رہے۔ اور اس نے ایک ہوٹل میں ان تینوں سے تعارف حاصل کیا۔ ان میں ایک بدر الدین تھا جو ٹھیکیدار تھا دوسرا ایک سرکاری بڑا افسر' تیسرا ابھی اسی حیثیت کا بندہ تھا۔ جلال الدین خود بھی ان سے بڑی حیثیت رہا تھا۔ اور ان تینوں نے اسے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا تھا۔ لیکن اس ملاقات کے دوران جلال الدین نے خاص طور پر اس شخص کو نوٹ کیا تھا جو ان کی نگرانی کر رہا تھا' جلال الدین نے کچھ اس طرح ان تینوں کو متاثر کیا جو بدر الدین نے اسے اپنی شاندار گاڑی میں اس کی مطلوبہ جگہ چھوڑا۔ بدر الدین کی گاڑی چلی گئی تو اچانک جلال الدین کے اس شخص کو اپنی طرف جھپٹتے دیکھا جو ہوٹل میں ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ جلال الدین کے قریب پہنچ کر بولا۔

"معاف کیجئے۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"میں نے کچھ دیر پہلے آپ کو ہوٹل میں دیکھا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے آپ کی صورت آشنا لگی تھی۔ جلال الدین اب اپنے آپ کو آزمانا چاہتا تھا۔ دنیا اسی طرح قابو میں آتی ہے۔"

"زندہ باد۔ شکر ہے۔ میں نے آپ کو فوراً" پہچان لیا تھا۔ دوبئی میں میری شاپ ہے۔ آپ اکثر وہاں آتے تھے۔"

"کمال ہے' آپ نے مجھے خوب پہچانا۔"

"آپ کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ کوئی بھول نہیں سکتا۔ مجھے کچھ وقت دیجئے۔ خوشی ہوئی ویسے میرا نام اقرار احمد ہے۔"

دونوں کھیل رہے تھے اقرار احمد نے جلال الدین کو کچھ دولت مند لوگوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ اور جلدل الدین کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اب دونوں کو اعلا پیمانے پر ایک دوسرے سے جھوٹ بولنا تھا۔

"دبئی میں آپ کا کیا کاروبار ہے۔" اقرار احمد نے پوچھا۔

"بس۔ گھر سے نکلنے کے بعد کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آپ فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ جلال الدین نے گول مول سی بات کی۔"

"میں ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ آپ کو علم ہے کہ عرب ریاستوں میں کاروبار کے لیے کسی مقامی آدمی کو اسپانسر بنانا پڑتا ہے۔ جو مفت میں حصہ وصول کرتا ہے۔ بس میں بھی اسی ہی الجھن کا شکار ہوں۔ میں بڑے ہنگامی حالات میں یہاں آیا ہوں۔ میرا پارٹنر انتہائی بد اخلاق انسان ہے۔ جتنا کہ میں نے آپ کو بتایا یا شاید نہیں بتایا کہ میں ایمرجنسی میں یہاں آیا ہوں اس لیے وہاں معقول انتظامات کر کے نہیں آیا اور وہاں میرے پارٹنر کو اس کی مطلوبہ رقم نہیں مل سکی۔"

"آپ سمجھ رہے ہیں نا۔"

"جی۔ جی جلال الدین کی سمجھ میں ابھی تک تو کچھ نہیں آیا تھا۔"

"وہاں میرے پارٹنر نے اپنی رقم کے لیے ہنگامہ مچا

رکھا ہے۔"

"اوہ!"

"یہ لوگ جنہیں میں نے آپ کے ساتھ دیکھا ہے ارب پتی لوگ ہیں۔ یہ آپ کے دوست ہیں ان میں سے ایک کا تو دبئی میں بہت بڑا بزنس ہے۔ میں جانتا ہوں۔

"جی بالکل۔ جلال الدین نے کہا۔"

"میرا منیجر سخت پریشان ہے اور بار بار مجھے فون کر رہا ہے۔ میں وہاں دوبئی میں فوری طور پر دو لاکھ ریال بھیجنا چاہتا ہوں۔ اگر مطلوبہ وقت پہ رقم دوبئی نہ پہنچی تو میں سخت نقصان سے دوچار ہو سکتا ہوں۔ اقرار احمد نے کہا۔"

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ جلال الدین نے کہا۔

"میرے پاس یہ رقم پاکستانی کرنسی میں موجود ہے۔ اقرار احمد نے اپنا بریف کیس سامنے کرتے ہوئے کہا۔" اگر آپ اپنے دوبئی آفس کال کر کے اپنے متعلقہ منیجر کو حکم دے دیں کہ یہ رقم میرے آدمی کو پہنچا دے تو یوں سمجھ لیں مجھے نئی زندگی مل جائے گی۔

جلال الدین کے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا۔ دو لاکھ ریال کی کتنی رقم بنتی تھی اسے صحیح طور پر اندازہ بھی نہیں تھا۔ اقرار احمد نے بریف کیس کھول کر سامنے کر دیا۔ پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں معنی خیز نظر آ رہی تھیں۔ اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کا یہ کام کیے دیتا ہوں۔"

اس کے بعد بقیہ کارروائی اس نے بڑی ذہانت سے کی تھی۔ اقرار احمد نے اپنی دانست میں اسے جعلی نوٹ دے کر اسے دو لاکھ ریال کی چوٹ دی تھی۔ نوٹوں کی گڈیوں پر اوپر نیچے لگے ہوئے نوٹ اصلی تھے باقی نقلی لیکن وہ بھی پینتیس ہزار بنتے تھے۔ لیکن جس کمپنی کو جلال الدین نے دوبئی کال کر کے یہ رقم ادا کرنے کی ہدایت کی تھی اس کا دنیا میں کوئی وجود نہیں تھا۔ مار اقرار احمد نے ہی کھائی تھی لیکن جلال الدین کو راستہ نظر آ گیا تھا۔

اس نے جرم کے راستے نہیں اپنائے تھے لیکن عقلی جرائم کی طرف قدم بڑھا کر کئی ایسے کام کیے تھے جن سے اس کی مالی حالت بہتر سے بہتر ہوتی چلی گئی۔ اس نے ایسے جرائم پیشہ لوگوں کو اپنا شکار بنایا جو دوسروں کے ساتھ فراڈ کر کے ان کی رقمیں کھا جاتے تھے۔ وہ ان سے مختلف انداز میں اپنا حصہ وصول کرتا تھا۔ کبھی پولیس افسر بن کر کبھی بلیک میلر بن کر۔

اس طرح وہ خاصی بہتر حالت میں آ گیا۔ ایک اچھے گھر کو کرائے پر حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے ایک پرانی کار بھی خرید لی تھی۔ اور پھر اسے عریشہ مل گئی۔ ایک کروڑ پتی باپ کی بیٹی کے راہ و رسم بڑھا کر اس سے شادی کرنے کا تصور بڑا سنہرا تھا۔ عریشہ رائے بلند اقبال کی بیٹی تھی۔ اور بلند اقبال صرف بلند اقبال ہی نہیں تھے بلکہ ان کی دولت بھی بہت بلند تھی۔ جلال الدین کو یہاں اپنی تمام صلاحیتیں جمع کرنی پڑیں اور اس نے دوسرے تمام مشغلے ترک کر کے ان باپ بیٹی پر وقت صرف کرنا شروع کر دیا۔

آہستہ آہستہ اسے بلند اقبال کے بارے میں تفصیلات معلوم ہونے لگیں۔ جن میں کچھ تفصیلات بڑی حیرت انگیز تھیں۔ مثلاً "بلند اقبال نے قانون کی اعلا ترین تعلیم حاصل کی تھی لیکن کبھی پریکٹس نہیں کی تھی بلکہ کاروبار پر توجہ دی تھی اور قانون کا بے حد احترام کیا تھا۔

جلال الدین نے ان کے گھر تک رسائی حاصل کر لی۔ اب وہ اکثر ان کے گھر چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ عریشہ گھر پر نہ ہوتی اور وہ صرف بلند اقبال کو مل کر چلا آتا۔ دراصل اس میں بھی اس کی گہری چال تھی۔ وہ بلند اقبال پر ہاتھ ڈال رہا تھا تاکہ بیٹی تک رسائی میں آسانی ہو۔

بلند اقبال اس کے اس کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے اور جس طرح وہ ان سے باتیں کرتا تھا وہ اس سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ ایک دن انہوں نے کہا۔

"کبھی کبھی میں تقدیر کی نارسائی پر بہت حیران ہوتا ہوں۔"

"میں نہیں سمجھا نہ۔"

"تمہارے بارے میں کہہ رہا ہوں۔"

"اب بھی نہیں سمجھا۔" جلال الدین نے مسکرا کر کہا۔

"تم کس قدر ذہین انسان ہو، لیکن وقت نے تمہارا ساتھ نہیں دیا۔ ورنہ تم کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہوتے۔"

"ایک بات عرض کروں۔" جلال الدین نے بڑے پراعتماد لہجے میں کہا۔

"ہاں ضرور کہو۔"

"وقت کو ہاتھ میں رکھنا ضروری ہے۔ کون جانے وہ کب آگے دھکیل دے۔"

"واہ۔ کیا عمدہ بات کہی ہے۔"

"آپ اس سے متفق ہیں۔"

"سو فیصدی اور خوش بھی ہوں۔"

"میں اس خوشی کی وجہ ضرور پوچھوں گا۔"

"کیونکہ میں نے تمہارے بارے میں جو سوچا تھا تم اس پر پورے اترتے ہو، میں ایک اہم ترین کام تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں اور تم پر اندھا اعتماد کرنے لگا ہوں۔"

"یہ میری خوش بختی ہے۔" جلال الدین نے اپنے جوش پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے شاہ نگر اچھی طرح دیکھا ہوا ہے"

"جی سر۔ میرے ملک کا بڑا شہر ہے۔"

"تمہیں میرے ایک اہم کام سے وہاں جانا ہو گا۔ کیا تم اس سے انکار کر دو گے۔"

"کبھی نہیں سر۔"

"جیتے رہو۔ مجھے یقین تھا۔ وہاں تمہیں رابعہ سلطان سے ملنا ہو گا۔ رابعہ سلطان وہاں کی ایک بڑی شخصیت ہے اور میرا بزنس پارٹنر بھی ہے۔ تم ایک اہم ترین دستاویز لے کر وہاں جاؤ گے جو تمہیں اس کے سپرد کرنی ہے۔ میں تمہاری آمادگی کے بعد فوراً "شاہ نگر کے لیے تمہاری سیٹ بک کرا دوں گا۔ یہ فلائٹ ساڑھے چار بجے روانہ ہو گی۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں انکار کیسے کر سکتا ہوں۔" جلال الدین نے نیاز مندی سے کہا اور بلند اقبال بہت خوش نظر آنے لگا۔ پھر اس نے ایک لفافہ جلال الدین کو دیا جو سیل بند تھا لیکن اس پر ایک چھوٹی سی تحریر تھی۔ "یہ لفافہ اتوار کے دن ٹھیک بارہ بجے دوپہر مسٹر جلال الدین رابعہ سلطان کی موجودگی میں کھولیں۔" جلال الدین کو حیرت ہوئی۔ اس نے کہا۔

"یہ تحریر میرے لیے ہے۔"

"سو فیصدی۔ تمہارے اور رابعہ سلطان کے لیے۔"

"لیکن۔"

"نہیں میری جان۔ یہ لفظ 'لیکن، پھر، مگر' زندگی میں بڑی مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ ان کے چکر میں نہ پڑو۔ تم آج ساڑھے چار بجے کی فلائٹ سے شاہ نگر پہنچ جاؤ گے اور وہاں کسی اچھے ہوٹل میں قیام کرو گے۔ کل ہفتہ ہے پرسوں اتوار کے دن تم رابعہ سلطان سے ملو گے۔ یہ سب کچھ ایک بڑے مسئلے کا حصہ ہے اور میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ تمہیں اس راز میں شریک کیا ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ تم میرے معیار پر پورے اترو گے اور ہمارے ساتھی بن جاؤ گے۔"

"جی۔ ٹھیک ہے۔"

"تمہارے جانے کے بعد مجھے بھی سنگاپور روانہ ہو جانا ہے۔"

"آج ہی۔" جلال الدین حیرت سے بولا۔

"ہاں۔ تم سے پہلے۔ جب تم ایئرپورٹ پہنچو گے تو میری فلائٹ جا چکی ہو گی۔ میرا آدمی تمہیں تمہارا ٹکٹ اور دوسری چیزیں ایئرپورٹ پر تمہارے حوالے کر دے گا۔ او کے میں چلتا ہوں۔" بلند اقبال نے اٹھتے ہوئے کہا۔ جلال الدین کو بدل ناخواستہ باہر نکلنا پڑا۔"

اسے ناگہانی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اپنی دانست میں جلال الدین عریشہ پر ڈورے ڈال کر بلند اقبال کا داماد بننا چاہتا تھا لیکن یہ تو کام ہی دوسرا شروع ہو گیا تھا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچ کر اسے

اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑا تھا اور اس نے تیس سال کی عمر تک وہ زندگی تلاش کی تھی جو اچھے انسانوں کی ہوتی ہے۔ وہ کہیں نہ ملی اور اسے اندازہ ہوا کہ بس اب کچھ عرصہ کے بعد ایک مظلوم بڑھاپے کا آغاز ہو جائے گا تو اس نے رنگ بدل لیا۔

یہ رنگ ابھی تک پکا تو نہیں ہو سکا تھا لیکن سڑک نظر آ گئی اور اس نے سوچا تھا کہ عریشہ نہ سہی اس کا باپ ہی سہی۔ جس کا اقبال اتنا بلند ہو اسے معمولی انسان نہیں سمجھنا چاہیے۔

شاہ نگر کے موسم کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ بہت سرد ہوتا ہے۔ اس لیے اس نے اس مناسبت سے لباس منتخب کیے۔ ایئر پورٹ پر اسے جو شخص ملا اسے جلال الدین نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن وہ سیدھا اس کی طرف آیا تھا اور مسکرا کر بولا تھا۔

"میں بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہا تھا جلدل الدین صاحب۔ اگر آپ جلدی آجاتے تو میں آپ کو ایک کپ کافی کی پیشکش ضرور کرتا اور ہم کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرتے۔ لیکن اب وقت کم ہے۔ آپ یہ چیزیں سنبھالئے اور اس کے بعد...."

اس نے مسکرا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ٹکٹ، کرنسی اور کچھ دوسری چیزیں جلال الدین کے حوالے کر کے اس نے اسے الوداع کیا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ کافی مہذب آدمی تھا لیکن جلال الدین نے اسے اپنے ذہن پر سوار نہیں کیا اور پوری توجہ سے اپنے آگے کے کام میں مصروف ہو گیا۔

جہاز کے سفر کے دوران وہ سوچ رہا تھا کہ آخر کار اسے مطلوبہ راستے ملتے جا رہے ہیں۔ یہی احتیاط ضروری ہے۔ پھر جہاز شاہ نگر ایئر پورٹ پر اتر گیا۔ لیکن جہاز سے باہر نکلتے ہی جان نکل گئی۔ سردی اپنی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ اتنی سردی کہ اسے چکر آنے لگے۔ لیکن اس نے عقل سے کام لیا تھا۔ ایئر پورٹ آنے والے شخص نے جس کا نام تک اسے پتا نہیں چل سکا تھا دوسری چیزوں کے ساتھ ایک کاغذ پر اسے شاہ نگر کے ہوٹلوں کے کچھ نام بھی دیے تھے جن میں کچھ نام جانے پہچانے تھے۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے سب سے پہلے اسے لپکا اور اسے اپنی ٹیکسی پر چلنے کی پیشکش کی تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔

"میریٹ۔" اس نے ٹیکسی میں بیٹھ کر کہا۔

"جی سر۔" مستعد ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

چند لمحے وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"ڈرائیور۔"

"جی سر جی۔"

"گاڑی میں ہیٹر نہیں ہے۔"

"نہیں سر جی۔ آج کل گاڑیوں میں میٹر کہاں ہوتے ہیں" "میں میٹر نہیں، ہیٹر کی بات کر رہا ہوں۔ ہیٹر جو گاڑیوں کو اندر سے گرم کر دیتے ہیں۔"

"ارے نہیں صاحب جی۔ یہ پرانی گاڑیاں ہیں۔ ان میں انجن ہی ہوتے ہیں یہ بڑی بات ہے۔ بس اور کچھ نہیں ہوتا ان میں۔"

"تمہیں سردی نہیں لگتی۔"

"سردی ہے کہاں سر جی۔ سردی تو ابھی پڑے گی۔ دیکھنے والی۔"

اس کے بعد جلال الدین کے منہ سے آواز نہیں نکلی۔ کہیں سردی ابھی نہ پڑنی شروع ہو جائے۔ میریٹ بہت اچھا ہوٹل تھا۔ اسے کمرہ بھی حاصل ہو گیا۔ چونکہ معیاری ہوٹل تھا اس لیے ہر طرح کے انتظامات تھے۔ گرم کافی کے دو کپ پی کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اب حالت کچھ بہتر ہو گئی تھی۔

کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ بہت دیر بستر پر لیٹ کر لحاف میں گھسا رہا۔ پھر اس نے سوچنا شروع کر دیا۔ کام جو کچھ بھی ہے پراسرار ہے۔ رائے بلند اقبال اعلا پائے کا قانون داں ہے لیکن اس نے وکالت وغیرہ کبھی نہیں کی اور کاروبار میں داخل ہو گیا۔ اس نے جلال الدین کا انتخاب اپنے کسی خاص کام کے لیے کیا۔ جبکہ وہ پوری طرح جلال الدین کو جان بھی نہیں پایا تھا کہ وہ چیز کیا ہے.... ؟ کیوں.... اس نے یہ کیوں کیا۔

پھر وہ پراسرار لفافہ۔

نہیں جلال الدین صاحب آنکھیں بند کر کے دوڑو گے تو کسی گہری کھائی میں بھی گر سکتے ہو۔ ہوشیار رہو۔ یہی زندگی کی ضمانت ہوتی ہے۔ اس نے اس پراسرار لفافے کو نکال لیا اور اس کا ہر طرف سے جائزہ لینے لگا۔ کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں سے لفافے کو کھول کر دیکھا جا سکے۔ وہ پوری طرح سیل بند تھا۔

اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کرتا رہا۔ پھر کسی خیال کے تحت اس نے ویٹر کو بلانے کے لیے بیل بجائی اور چند لمحوں کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ۔" اس نے کہا اور ویٹر اندر داخل ہو گیا۔

"دوست مجھے کچھ چیزیں چاہئیں۔"

"حکم سر۔" ویٹر نے ادب سے کہا۔

"لکھنے کے لیے کاغذ۔ اور قلم مل جائیں گے۔"

"نیچے جنرل اسٹور ہے سر۔" ویٹر نے جواب دیا۔

"اوہ۔ گڈ۔ ایک عمدہ سا رائٹنگ پیڈ اور قلم لے آؤ۔" اس نے ویٹر کو رقم دیتے ہوئے کہا۔ اور وہ گردن جھکا کر چلا گیا۔ ویٹر نے اسے مطلوبہ اشیاء لا کر دیدیں۔ رات کو بہت دیر تک رائٹنگ پیڈ پر بہت کچھ لکھتا رہا تھا پھر گہری نیند سو گیا تھا۔"

☼ ☼ ☼

رابعہ سلطان کا آفس بے حد شاندار تھا۔ لیکن اس کی اپنی شخصیت اس آفس کے برعکس تھی۔ سیدھا سادا منسکو المزاج انسان تھا۔ جلال الدین کبھی یقین نہ کرتا کہ اس شاندار آفس کا مالک یہ شخص ہے۔ لیکن طویل و عریض میز جس پر مختلف ڈیزائنوں کے جدید ترین وائرلیس فون رکھے ہوئے تھے پیچھے رکھی انتہائی قیمتی کرسی پر بیٹھے شخص کو دیکھ کر یقین کرنا پڑا کہ وہی رابعہ سلطان ہے۔

جلال الدین بڑی شان سے اس آفس میں داخل ہوا تھا تو رابعہ سلطان اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"آئیے جناب۔ آئیے تشریف رکھیے۔" اس نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے آپ کے آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔"

"مجھے دیر تو نہیں ہوئی۔" جلال الدین نے سامنے والے کو دیکھنے کے بعد اپنے دل کی حسرتیں نکالنے کا موقع بھی مل گیا تھا سو وہ خود کو بارعب ظاہر کر رہا تھا۔

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔"

"یہ لفافہ رائے بلند اقبال کی طرف سے ہے۔" جلال الدین نے لفافہ نکال کر سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"جی۔ جی۔ اسے کھولیں...." رابعہ سلطان نے بے چینی سے کہا۔

"ابھی تیس منٹ باقی ہیں۔ آپ نے اس تحریر کو نہیں دیکھا۔" جلال الدین نے کہا۔

"جی جی ضرور!" رابعہ سلطان نے مری مری آواز میں کہا۔ اس کے بعد یہ تیس منٹ بڑی خاموشی سے گزرے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہے تھے۔ پھر جیسے ہی وقت پورا ہوا جلال الدین نے رابعہ سلطان کے سامنے لفافہ کھول دیا۔ وہ خود بھی اسے کھولنے کے لیے بے چین تھا۔ لفافے کے دو کاغذ نکلے تھے جن پر اردو تحریر تھی۔

جلال الدین نے خط کھول لیا اور اس پر نظریں دوڑانے لگا۔ جبکہ رابعہ سلطان سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

ان دو اوراق میں دو الگ الگ تحریریں تھیں۔ پہلے ورق پر لکھا تھا۔ عرشیہ بلند اقبال کی طرف سے جلال الدین کے نام۔

"مسٹر جلال الدین۔ میرا پہلا احسان آپ پر یہ ہے کہ جب میرے ڈیڈی کو یہ معلوم ہوا کہ آپ مجھ پر ڈورے ڈال کر ہماری دولت تک پہنچنا چاہتے ہیں تو انہوں نے غصے سے فیصلہ کیا کہ آپ کو کوئی معقول سزا دلوائی جائے۔ مثلاً" آپ کو روزانہ شہر کے کسی چوراہے پر کپڑے اتروا کر پچاس جوتے لگوائے جائیں۔ اس کام کے لیے معقول معاوضہ پر بہت سے لوگ حاصل کیے جائیں۔

لیکن۔ میں نے انہیں روکا۔ اور ان سے سفارش کی کہ ایسا نہ کیا جائے البتہ آپ کو کوئی دلچسپ سزا دی

جائے۔ میری تجویز پر آپ کو شاہ نگر بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جہاں کی سردی اس وقت آپ کو لطف دے رہی ہوگی۔ جس ہوٹل میں آپ ٹھہرے ہیں وہاں کا دوبارہ رخ نہ کریں کیونکہ آپ نے وہاں قیمتی ادائیگیاں کی ہیں وہ جعلی کرنسی میں ہیں اور وہاں آپ کا سامان ضبط کرلیا گیا ہے۔ آپ کے پاس جو رقم ہے وہ۔ فوراً ضائع کردیں۔ ورنہ پولیس کو آپ کی نشاندہی کردی جائے گی کیونکہ پولیس کو کچھ عرصے سے شاہ نگر میں جعلی کرنسی پھیلانے والے گروہ کی تلاش ہے۔

امید ہے آپ صورت حال سمجھ گئے ہوں گے۔ دوسرے خط میں راجہ سلطان کو ہدایت کردی گئی ہے کہ وہ آپ کے ساتھ خاطر خواہ سلوک کریں اور آپ کو ایک پیسہ بھی نہ دیں۔

میں نے غلط تو نہیں کہا۔ آپ اپنی اور میری حیثیت دیکھیں آپ کی اوقات میرے گیٹ کے چپڑاسی سے زیادہ نہیں ہے۔ اور آپ نے میری قربت کے خواب دیکھے تھے۔ افسوس۔ خیر آئندہ خیال رکھیے اور اپنی اوقات کو نظر انداز نہ کیجیے۔

عرشیہ بلند اقبال۔

جلال الدین نے خط پڑھا۔ سارے طبق روشن ہوگئے تھے۔ لیکن ایک بڑی کار آمد بات تھی۔ جب تک برا ہوا تھا یعنی اٹھارہ سال سے تیس سال کی عمر تک۔ وہ بے حد ڈرپوک اور بات بات پر خوف زدہ ہوجانے والوں میں سے تھا۔ لیکن جب اس نے برا ہوجانے پر کمر باندھی تھی اور یہ سوچا تھا کہ اب اسے ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا اس نے اپنے اعصاب کو مضبوط کیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اس میں پختہ ہوتا چلا گیا تھا۔ اور اب سب ٹھیک تھا۔ وہ بے حد محتاط ہوچکا تھا اور اس کی ذہنی قوتیں بڑھ چکی تھیں۔

چنانچہ اس نے پرسکون انداز میں پرچہ تہہ کرکے رکھا اور دوسرا پرچہ کھول لیا۔ اس میں لکھا تھا۔ رائے بلند اقبال کی طرف سے رابعہ سلطان کے لیے۔

"پیارے رابعہ سلطان"

اس نوجوان کے بارے میں تفصیل سے تو تمہیں ملاقات پر ہی بتاؤں گا فی الحال تم اس کے لیے اتنا کرو کہ اسے ٹرین کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ دلوا کر شان نگر سے بھگا دو۔ میں اس وقت سنگاپور جارہا ہوں وہاں سے واپسی پر تمہیں فون کروں گا۔

رائے بلند اقبال۔

دفعتاً" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اور رابعہ سلطان اچھل پڑا۔

"کیا لکھا ہے۔" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"پہلے پرچے میں تو آپ کی مکمل ہسٹری لکھی ہے کہ ان کے آپ کے درمیان کس طرح کے تعلقات ہیں اور کس طرح ہوتے ہیں۔ گویا آپ کی مکمل تفصیل ہے۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ آپ اس قدر کنجوس ہیں۔"

"کنجوس۔؟" رابعہ سلطان نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ اس قدر سردی ہورہی ہے لیکن آپ نے نہ چائے کے لیے اور نہ کافی کے لیے پوچھا ہے۔" جلال الدین نے بدستور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے... اوہ... ہاں... وہ..." رابعہ سلطانی جلدی سے اپنی جگہ اٹھا۔ پھر بیٹھ گیا اور اس نے کسی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجادی۔ بس۔ اس دوران جلال الدین نے کام دکھادیا۔ اس کی جیب سے وہ دوسرا پرچہ نکل آیا جو اس نے ویٹر سے کاغذ قلم منگا کر خود لکھا تھا۔ یہ اس کے پیشہ وارانہ فن کا کارنامہ تھا اور نہایت کامیاب تھا۔ اس نے خط پڑھا۔

ڈیئر رابعہ سلطان۔ سلام۔

حامل رقعہ ہذا کو ایک نہایت اہم مشن پر روانہ کررہا ہوں۔ صورت حال کچھ ایسی ہے کہ میں اسے نہ تو اپنے پاس سے کیش دے سکتا ہوں اور نہ اسے چیک ایشو کرسکتا ہوں جلدی بھی بہت ہے کیونکہ میں سنگاپور جارہا ہوں۔ تم فوری طور پر اسے پچیس لاکھ کی رقم فراہم کردو۔ ہم بعد میں حساب کرلیں گے۔

والسلام۔ بلند اقبال۔

جلال الدین نے پرچہ پڑھ کر رابعہ سلطان کو دیکھا۔ رابعہ سلطان مطمئن تھا۔ جلال الدین نے کہا۔

"بہت سے کام سونپ دیئے ہیں بلند اقبال صاحب نے مجھے۔ آپ سے رخصت ہو کر دارالحکومت جاؤں گا۔ وہاں سے میرے لیے تھائی لینڈ کی فلائٹ تیار ہوگی۔ جہاں پہنچ کر صرف ایک دن گزارنا ہوگا پھر سنگاپور۔"

"جی جی۔" رابعہ سلطان نے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ اور آدمی حاضر ہوگیا۔ "کافی نہیں آئی ابھی تک۔"

"بس آرہی ہے سر۔"

"امان خان کو بلاؤ۔" رابعہ سلطان نے کہا۔ کچھ لمحوں کے بعد امان خان آگیا۔ یہ غالباً" فرم کا کیشیئر تھا۔ امان خان پچیس لاکھ کیش بڑے نوٹوں کی شکل میں لے آؤ۔ کیش ہے۔

"جی سر۔ موجود ہے۔"

"کسی مضبوط لفافے میں لے آؤ۔"

"جی سر۔" امان خان باہر نکل گیا۔ اتنی دیر میں کافی آگئی۔ کافی کا آخری گھونٹ ختم ہوا تھا کہ پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی پانچ گڈیاں لفافے میں پیک ہوکر اندر پہنچ گئیں۔ جلال الدین نے نوٹ سنبھال کر بیگ میں رکھتے ہوئے رابعہ سلطان کا شکریہ ادا کیا۔

"دونوں چیزوں کا شکریہ۔ رابعہ صاحب۔ آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ میں دوبارہ آپ سے ملاقات ضرور کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل آیا تھا۔

نوسربازی میں ہوشیاری ہی کار آمد ہوتی ہے ورنہ کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ حالانکہ جلال الدین کے فرشتوں کو بھی یہ شبہ نہیں ہوگا کہ رائے صاحب اتنے کائیاں نکلیں گے اور اتنا خطرناک عمل کرڈالیں گے اور۔ اور۔ ان کی بیٹی۔

ارے باپ رے۔ عرشیہ بھولی بھالی صورت والی جلاد۔ بظاہر اس نے جلال الدین سے متاثر ہونے کا ڈھونگ رچایا تھا لیکن اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ جلال الدین اس پر صرف اپنے مفاد کے لیے ڈورے ڈال رہا ہے۔

ہوٹل کی طرف رخ کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ سب سے بڑی کامیابی اس میں ہوتی ہے کہ خطرے سے دور رہا جائے۔ چنانچہ سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ ایک گاڑی روانگی کے لیے تیار تھی۔ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا۔

پچیس لاکھ کی گرمی سینے کے قریب موجود تھی۔ فوری طور پر اپنے شہر یا اپنے گھر واپسی کا تصور بھی خطرناک تھا کچھ وقت کسی پرفضا مقام پر گزارا جائے۔ پھر دیکھیں گے آگے کیا ہوتا ہے۔ ریل چل پڑی اور اس کے ذہن میں یہ نئی کہانی چل پڑی۔ جن کے پاس دولت ہوتی ہے وہ بے وقوف نہیں ہوتے۔ بلند اقبال اور اس کی چابک دستی نے اپنی دانست میں ایک دلچسپی کھیل کھیلا تھا۔ لیکن بس جلال الدین کی ذہانت کام آگئی تھی۔ اس نے دوسرا خط تیار کرلیا تھا اور یہ خط بھی کام آگیا۔ ورنہ واقعی شاہ نگر کی سڑکوں پر لوگوں سے اور امداد امداد مانگی جارہی ہوتی۔

آخری فیصلہ اس نے یہ کیا تھا کہ خوب صورت لڑکیوں سے خاص طور پر ہوشیار رہا جائے۔ اٹھارہ سے تیس سال کی عمر تک وہ برا نہیں تھا۔ لیکن عمر کے اس دور میں اس نے زندگی کے اتنے تلخ تجربے کیے تھے کہ کبھی کبھی سوچتا کہ وہ دنیا کے لیے غیر ضروری ہے۔ کسی فرد، کسی انسان کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔

"تو کیا مرجاؤں۔ کئی بار اس نے خودکشی کے طریقے سوچے تھے لیکن پھر خوف زدہ ہوکر اپنے ہاتھ سے منہ پر تھپڑ لگائے تھے۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا تھا کہ زندگی کچھ اور چاہتی ہے۔ اور پھر اس نے زندگی کو "وہ کچھ اور" دے دیا تھا۔"

خرچ کے معاملے میں وہ محتاط انسان تھا۔ اتنا خرچ کرو کہ دنیا کی نگاہوں میں نہ آجاؤ۔ اپنا کام جاری رکھو خود کو محفوظ رکھو۔ بے شک پریشانی کا شکار ہو، لیکن باقی سب نصیب ہے۔ رائے بلند اقبال پر کیا گزری نہ اس نے کہیں معلوم کرنے کی کوشش کی نہ اسے معلوم ہوا۔ بس ابتدا میں تمام حفاظتی اقدامات کرے۔ اور پھر اپنا کھیل دوبارہ شروع کردیا۔

ایک اور نظریہ اس نے اپنے تجربات میں شامل کیا تھا۔ تھوڑا تھوڑا کرکے کھاؤ۔ مثلاً" اگر کوئی کروڑپتی

ہے تو اس دس بیس لاکھ سے زیادہ کی چوٹ نہ دو۔ اسی رقم کے لیے وہ زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرے گا اور تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں مار کر خاموش ہو کر بیٹھ جائے گا۔ زیادہ رقم ہوتی تو پھر اس کی جدوجہد بھی زیادہ ہوتی۔ رائے صاحب نے بھی خاموشی ہی رکھی۔ ویسے یاد تو کیا ہو گا انہوں نے کوئی ملا تھا۔

لیکن غور کرنے پر اس نے سوچا تھا کہ بلند اقبال کے پاس کروڑوں روپے تھے۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ جلال الدین ایک عجیب آدمی ہے۔ اس نے اپنی دوست کے بل پر اسے سزا دی تھی۔ کسی ایسے شخص کو نہ ستاؤ جو اپنے نقصان کو برداشت نہ کر سکے۔ لیکن انہیں ضرور بتاؤ جو خود کو بہت چالاک سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنا کام جاری رکھا اور کئی بڑے بڑے ہاتھ مارے۔ بے ایمان اور بددیانت لوگوں سے وہ خراج وصول کرتا تھا۔ اور اس کے شکار اس طرح کے لوگ ہوا کرتے تھے جو غریبوں کا خون چوس کر دولت جمع کرتے ہیں اور انہیں کچھ نہیں دیتے۔

جیسے ابرار احمد شاہ۔ شاہ جی ایک بہت بڑے ڈیری فارم کے مالک تھے۔ ڈیری فارم کے سینکڑوں ٹن دودھ پورے شہر میں نہیں بلکہ آس پاس کے شہروں وغیرہ میں بھی جاتا تھا اور ان کی بے شمار گاڑیاں جن پر شاہ ڈیری لکھا ہوتا تھا صبح ہی صبح ان بھینسوں کا دودھ لے کر نکل پڑتی تھیں جن کا اس دنیا میں کوئی وجود نہیں تھا۔ دس پندرہ بھینس بے شک اس فارم میں موجود تھیں لیکن ان میں یہ بھینس ایک وقت میں آٹھ دس من دودھ ضرور دیتی تھی کیونکہ ان کی سپلائی اتنی ہی تھی۔

ان شاہ صاحب کو جلال الدین نے ایک شاندار کوٹھی فروخت کی تھی جس کی اصل قیمت کوئی دو ڈھائی کروڑ تھی لیکن چونکہ مالک ملک چھوڑ کر ملک سے باہر جا رہا تھا اس لیے اس سے یہ کوٹھی صرف ایک کروڑ بیس لاکھ میں دے دی تھی۔ البتہ اب اس کے کئی مالکان آپس میں مقدمہ بازی کر رہے تھے۔

جائیدادوں کے کئی کھیل کھیلنے کے بعد جلال الدین نے سوچا کہ اب ٹریک بدلا جائے۔ اور پھر ایک دن اس کا خیال ریس کورس کی طرف ہو گیا۔ پہلے اس نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور پھر اس نے یہاں بھی اپنی ذہانت کے کارنامے دکھانے شروع کر دیئے۔

یہاں ذرا زیادہ خطرناک لوگوں سے واسطہ تھا اس لیے وہ محتاط انداز میں کھیلتا تھا لیکن اس کی جیت نے بہت سی آنکھیں اس کی طرف نگراں کر دیں۔ انہیں میں دو خوب صورت آنکھیں بھی تھیں۔

"میرا نام فرازیہ ہے۔ فرازیہ انعام علی۔"

"واہ۔ دونوں نام خوب صورت ہیں۔" جلال الدین نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"کیسے۔" وہ بھی بے تکلفی سے بولی۔

"فراز۔ یعنی بلندی۔ فرازیہ' بلندیوں کی طرف رواں دواں' اور پھر انعام علی یعنی قدرت کی طرف سے انعام علی کو بلندی انعام میں ملی ہے۔"

"ارے۔ آپ تو کافی منطقی ہیں۔ ویسے ہونا چاہیے۔ آخر کار ہندوستان پر ایک کامیاب حکومت کر چکے ہیں۔"

"ہندوستان پر۔" جلال الدین نے کچھ نہ سمجھ کر کہا۔

"جلال الدین محمد اکبر۔ اس نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ جلال بھی خوب ہنسا۔ اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔"

"حاضر دماغ لوگ میری کمزوری ہیں۔ میں انہیں بے پناہ پسند کرتا ہوں۔ آپ نے جس طرح مجھے ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا وہ کمال ہے۔ مزید کمال یہ ہے کہ آپ میرا نام بھی جانتی ہیں۔"

"ریس کورس کی دنیا میں آپ اجنبی نہیں ہیں۔"

"آپ کی زبانی سن رہا ہوں۔"

"اور آپ دوست بھی نہیں بناتے کسی کو۔" وہ بولی۔

"بہت انکشافات کر رہی ہیں آپ۔"

"ایک اور انکشاف کروں۔! وہ بولی۔"

"جی ضرور۔"

"میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔" اس نے بے باکی سے کہا۔

"اس بات پر مجھے خاموش ہو جانا چاہیے۔" جلال الدین نے کہا اور دونوں خوب ہنسے۔ دوستی ہو گئی۔ انعام احمد بھی دولت مند انسان تھا۔ اور فرازیہ اس کی چہیتی بیٹی۔ اس کے ساتھ ہی بے باک بھی۔ جلال الدین کو اکثر اس نے ایسے لمحات سے دوچار کر دیا تھا کہ اس کی راتیں بے سکون ہو جاتی تھیں اور وہ اپنے تنہا بدن کو کسی لمس سے دوچار ہونے کا خواہش مند ہو جاتا تھا۔

لیکن وقت نے اسے برے کچوکے دیے تھے اس لیے وہ بے حد محتاط تھا بہت غور و خوض کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ فرازیہ سے شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ فرازیہ ایک بہت بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اس کے ذریعہ اونچے گھرانوں تک رسائی حاصل ہو سکتی تھی۔ پھر عمر کے بتیس سال بے کیفی میں گزرے تھے اور زندگی چاند سی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں چنانچہ اس نے اس چاند سی عورت کو اپنا لیا اور اس کی رسائی بہت بلندیوں تک ہو گئی۔

تب ہی اس نے ایک دن سیٹھ زاہد باری کو دیکھا۔

"ان میں کیا خوبی ہے جو لوگ ان پر مکھیوں کی طرح بھنک رہے ہیں۔"

"اخبار دیکھتے ہو۔"

"نہیں۔"

"یہی وجہ ہے۔"

"کیوں۔"

"بڑی روایتی شخصیت ہے سیٹھ باری کی۔"

"وہ کیسے۔"

"جوانی میں یہ بڑا اہم جو رہا ہے۔ ساری زندگی سونے اور جواہرات تلاش کرتا رہا ہے۔ اور آخر اس نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔"

"وہ کیسے۔"

"دنیا کے قیمتی ترین ہیرے ہیں اس کے پاس ملکہ برطانیہ نے ان ہیروں کی قیمت کروڑوں پاؤنڈ لگا دی تھی اس نے فروخت نہیں کیے۔ وہ ان ہیروں کے لیے دیوانہ ہے رات کو سونے سے پہلے وہ ان ہیروں کو تجوری سے نکال کر دیکھتا ہے تب سو جاتا ہے۔"

"گڈ۔" جلال الدین نے کہا اس کے بعد وہ ہیرے اس کی آنکھوں میں ناچنے لگے اپنی نوسربازی کی زندگی میں اس نے کبھی چوری کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا وہ اسے ایک گھٹیا کام سمجھتا تھا جبکہ بڑے بڑے عقل مندوں کو گھاس کھلانا وہ ایک فن سمجھتا تھا۔

"لیکن..... یہ ہیرے اس کے ذہن میں اٹک گئے تھے۔"

فرازیہ کے ذریعہ ہی اس نے زاہد باری سے ملاقات کی تھی۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی بیوی امریکی تھی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بیوی نو عمر تھی اور شادی کے کچھ عرصے کے بعد ہی کسی حادثے میں ہلاک ہو گئی پھر اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ ایک عالیشان بنگلے میں رہتا تھا اور ملازموں کی پوری فوج بنا رکھی تھی جو اپنے اس خاندان کے ساتھ اس بنگلے میں رہتے تھے۔

جلال الدین نے اس کے ڈرائیور تاکا تھا کیوں کہ اس نے محسوس کیا تھا کہ ڈرائیور زاہد باری سے زیادہ قریب ہوتا ہے زاہد باری باقاعدہ کاروباری تھا اس نے شہر کے ایک بارونق اور کاروباری علاقے میں اپنا دفتر بنا رکھا تھا' جلال الدین نے کئی روز تک اس ڈرائیور کی نگرانی کی اور پھر ایک روز وہ خود بھی ڈرائیوروں والی وردی چن کر اور اپنا حلیہ ایسا ہی بنا کر اس ڈھابے میں جا بیٹھا جہاں زاہد باری کا ڈرائیور بیٹھا تھا۔

اس نے بڑی مہارت سے ڈرائیور اعجاز سے تعارف حاصل کیا۔

"آپ بھی یہیں کھانا کھاتے ہیں۔"

"ہاں۔ یہ جگہ ہمارے لیے ہی تو ہے۔"

"مگر کھانا اچھا ملتا ہے۔"

"ہاں۔ بہت اچھا۔"

"پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا۔"

"نئی نوکری ملی ہے۔"

پورے ایک ہفتے اعجاز پر محنت کی تب وہ راہ پر آسکا

"ایک بات بتاؤ اعجاز۔"

"ہوں۔ پوچھو۔"

"کیا ہم ڈرائیور پیدا ہوئے تھے۔"

"پیدائش کے وقت کے معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر وہ کیا ہے۔"

"تمہارے بچے ہیں؟"

"ہاں۔"

"بیٹا ہے کوئی؟"

"دو بیٹے ہیں۔"

"کتنے بڑے ہیں۔"

"ایک چار سال کا ہے دوسرا ڈھائی سال کا۔"

"انہیں گاڑی چلانا سکھا دو۔" جلال الدین نے کہا۔

"ابھی سے؟" معصوم اعجاز نے حیرت سے کہا۔

"یہی تو لکھا ہے اعجاز ہماری تقدیر میں۔ ہمارے بچے بھی وہی کریں گے جو ہم کر رہے ہیں ہم ان کے لیے اور کیا کر سکتے ہیں۔ مالکوں کے لیے کاروں کے دروازے کھولنا ان کی جھڑکیاں سنا اور بس۔"

جلال الدین نے اعجاز کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔

"پھر کیا کریں ہم؟" وہ بولا۔

"تقدیر بدلو اپنی اپنی بچوں کی۔"

"مگر کیسے۔"

"اس کے لیے سوچنا پڑے گا۔ غور کرنا پڑے گا۔"

"تمہارے بھی بچے ہیں۔"

"ہاں۔ اور میں انہیں بہت پیار کرتا ہوں۔" جلال الدین نے کہا۔

"ان کے بارے میں بھی یہی سوچتے ہو۔"

"ہاں، لیکن میں انہیں ڈرائیور نہیں بناؤں گا۔"

"پھر کیا کرو گے؟"

"محنت، عمل ہم بھروسا کرو گے۔"

"نہیں۔"

"ہاں تمہارے مالک کا نام زاہد باری ہے نا۔"

"ہاں۔"

"بہت دولت مند ہے وہ سنا ہے اس کے پاس بڑے قیمتی ہیرے ہیں کیا وہ ہیرے ہماری ملکیت نہیں بن سکتے۔" اعجاز دیر تک سکتے میں رہا تھا پھر اس نے مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں ان ہیروں کے بارے میں دیکھے بھی ہیں میں نے مگر ہم انہیں نہیں چرا سکتے۔"

"کیوں۔۔۔ آخر کیوں؟" جلال الدین جوش سے بولا۔

"میں ان کے بارے میں تقریباً" سبھی کچھ جانتا ہوں حتیٰ کہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ سرخ رنگ کے ایک مخملی ڈبے میں رکھے ہوئے ہیں اور تعداد میں پانچ یا چھ نہیں پورے نو ہیں' یہ بات مجھے خانساماں نے بتائی تھی وہ ایک مرتبہ صاحب کو دودھ کا گلاس دینے عین اس وقت ان کے بیڈ روم میں چلا گیا تھا جب وہ ہیروں کا ڈبہ کھول کر سامنے رکھے بت بنے بیٹھے تھے صاحب گویا ان ہیروں کی پوجا کرتے ہیں انہیں سامنے رکھ کر صاحب کو بہت دیر تک کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا وہ ہیرے ہیں ہی اتنے خوب صورت کہ انہیں دیکھ کر آدمی مبہوت ہو سکتا ہے لیکن انہیں چرانا ناممکن ہے۔"

"دنیا میں کسی چیز کا چرانا ناممکن نہیں ہے، بشرطیکہ عقل سے کام لیا جائے بڑی بڑی چوریوں میں بڑی ذہانت سے چور مال لے اڑتے ہیں اور سب دیکھتے رہ جاتے ہیں ہم نے تو پھر بھی ہیروں کے ایک ننھے سے ڈبے کی بات کر رہے ہیں تمہارے خیال میں اسے چرانا ناممکن کیوں ہے؟"

"دیکھو بنگلے پر دو چوکیدار ہیں دونوں مل کر چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی دیتے ہیں ان کو سختی سے حکم ہے کہ گیٹ نہ چھوڑا جائے اور صاحب کی عدم موجودگی میں کسی کو گھر میں داخل نہ ہونے دیا جائے اگر کوئی خود کو رشتے دار یا عزیز بتائے تو گیٹ پر لگے فون سے فون کر کے صاحب سے تصدیق کی جائے پھر اسے اندر آنے دیا جائے، پچھلے حصے میں انہوں نے ایک کتا رکھا ہوا ہے

جو کھلا پھرتا رہتا ہے اور اگر وہ سو بھی رہا ہو تو ذرا سی آہٹ پر جاگ جاتا ہے۔"

"خیر۔۔۔ اگر میں نے تمہارے ساتھ مل کر ہیروں کی چوری کا منصوبہ بنا بھی لیا تو دن میں بنگلے میں داخل ہونے کی جرات نہیں کر سکتا۔" جلال نے محتاط انداز میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بالفرض تم رات کو عقبی دیوار پھاند کر آؤ اور میں کتے کو گوشت میں بے ہوشی کی دوا کھلا کر اسے پہلے ہی سے سلا کر رکھوں اور میں صاحب کے بیڈ روم تک تمہاری رہنمائی کا بندوبست بھی کر دوں تب بھی کوئی فائدہ نہیں سردی ہو یا گرمی صاحب اپنا بیڈ روم مقفل کر کے سوتے ہیں سردیوں میں ہیٹر آن رہتا ہے اور گرمیوں میں ایئر کنڈیشنر چلتا رہتا ہے بالفرض کسی ترکیب سے تم بیڈ روم کا تالا بھی کھول لو تو تجوری کے تالے کا مسئلہ آجاتا ہے اس کے تالے کی چابی صاحب اپنے سرہانے رکھ کر سوتے ہیں اور کھولنے کا سسٹم کچھ ایسا ہے کہ ایک خفیہ بٹن دبائے بغیر اگر تالے میں چابی لگائی جائے تو الارم بجنے لگتا ہے۔"

"لیکن تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم؟" جلال نے اعجاز کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ان کی بہت سی خاص باتیں ہم نوکروں کو معلوم ہیں اور پھر تمہارا کیا خیال ہے میں نے ان ہیروں کے بارے میں کبھی نہیں سوچا لیکن کیا کروں اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے۔"

"ہوں۔" جلال نے پر خیال انداز میں ہنکارا بھرا۔ "آدمی کام کے ہو' بہرحال اب یہ سمجھو کہ ایک اور ایک گیارہ ہو گئے ہیں اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے صاحب نیند کیسی سوتے ہیں؟"

"ہیروں کو دیکھ لینے کے بعد تو وہ اتنی گہری نیند سوتے ہیں کہ شیر بھی ان کے سرہانے دھاڑے تو ان کی آنکھ نہ کھلے۔" اعجاز نے جواب دیا۔

"بس تو پھر سمجھو سارے مسئلے حل ہو گئے۔" جلال نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "میں ذرا اس مسئلے پر غور کر لوں پرسوں تمہیں بتاؤں گا کہ الارم کو بیکار اور

کتے کو بے ہوش کیسے کیا جاتا ہے اور چابی کی ڈپلیکیٹ کیسے بنوائی جاتی ہے اس کے بعد ہم باقی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی طے کر لیں گے اور اپنے کام کا دن بھی مقرر کر لیں گے۔"

اعجاز نے **جھجکتی** ہوئی سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا آس پاس کوئی بھی نہیں تھا کہ ان کی گفتگو سن سکتا گرد و پیش سے مطمئن ہو کر اعجاز نے قدرے ہچکچاہٹ سے کہا "فرض کرو ہم۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ میری مدد سے تم اس چکر میں کامیاب ہو گئے تو مجھے کیا ملے گا؟"

جلال کو کافی دیر سے اس سوال کی توقع تھی اور جواب اس کے ذہن میں تیار تھا۔ "دیکھو میاں ایک صورت تو یہ ہے کہ نو ہیروں میں سے اپنی پسند کے تین ہیرے تم لے لینا چھ ہیرے میرے ہوں گے اور تم چاہو تو میں ہیرے حاصل ہونے کے دوسرے ہی دن تمہیں پانچ لاکھ روپے نقد لا دوں گا اور تم اس بات سے کوئی سروکار نہیں رکھو گے کہ ہیرے کتنے کے فروخت ہوئے بولو کون سی صورت قبول ہے تمہیں؟"

"پانچ لاکھ روپے والی بات ہی ٹھیک ہے۔" اعجاز نے اپنے مخصوص شرمیلے لہجے میں کہا "میں کہاں ہیرے فروخت کرتا پھروں گا۔"

جلال کو اسی بات کی توقع تھی دو دن بعد ملاقات کا وقت طے کر کے وہ لوگ اس جگہ سے باہر نکل آئے۔

☼ ☼ ☼

دوسری طرف جلال کی شام کی مصروفیات بھی جاری تھیں روزانہ شام کو فرزانہ کے ساتھ وہ کسی اچھے ہوٹل پہنچتا یا پھر کسی نہ کسی تقریب میں ان کی ملاقات پہلے سے طے ہوتی تھی۔ اعجاز سے بھی اس کا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ اگلے اتوار کی رات عمل کے لیے منتخب کی گئی تھی۔ ابھی اس میں تین چار دن باقی تھے کہ نیو ایئر نائٹ آگئی جن حلقوں میں جلال کا اٹھنا بیٹھنا تھا ان میں نیو ایئر نائٹ دیوانگی آمیز جوش و خروش کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ جلال بھی اس رات فرزانہ کے ساتھ

ایک صاحب کی کوٹھی ڈیفنس کوٹھی میں موجود تھا
تقریبات کے لیے اس کوٹھی میں ایک خاص ہال موجود تھا جس میں شام ہی سے خوب بھیڑ بھاڑ تھی اور مختلف مشاغل جاری تھے۔ بارہ بجے سے ذرا پہلے تمام بتیاں بجھادی گئیں تمام شور شرابا تھم گیا' ماحول پر یوں اندھیرا اور سکوت چھا گیا جیسے کوٹھی میں کوئی ذی روح موجود نہیں ہے پھر جیسے ہی وال کلاک نے بارہ بجے کا پہلا گھنٹہ بجایا شور کا ایک طوفان امنڈ پڑا۔ لوگ چیخ رہے تھے جھوم رہے تھے' ناچ رہے تھے۔ جلال اور فرازیہ بھی ان سب کے ساتھ شریک تھے پھر فرازیہ کو اس کا کوئی کزن مل گیا اور اس سے باتیں کرتے کرتے وہ کچھ دور چلی گئی یا شاید مہمانوں کے ریلے میں جلال خود ہی ایک طرف کھسک گیا تھا۔ اسی دوران اس کی کہنی کسی کی کمر سے ٹکرائی اور اس کا گلاس چھلک گیا۔
دونوں ہی نے بیک وقت مڑ کر دیکھا اور دونوں ہی اپنی جگہ ساکت ہوگئے اس سے ٹکرانے والی لڑکی عرشیہ بلند اقبال تھی۔ ہونق سی شکل والا ایک بے ہنگم سا نوجوان اس کے ساتھ تھا جس کے بھدے وجود پر ایک نہایت نفیس سوٹ اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔
بہرحال عرشیہ نے بھی اسے پہچان لیا تھا اور پوری طرح اس کی طرف گھوم گئی تھی اس نے اپنے ساتھی کو نظرانداز کردیا تھا۔
"تمہارے وجود سے دولت کی خوشبو آرہی ہے.... لگتا ہے دھندہ زوروں پر جارہا ہے۔" اس کی آواز اتنی مدہم تھی کہ صرف جلال ہی اسے سن سکے۔
"کون سا دھندہ؟" جلال نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
"نوسربازی کا اور کون سا دھندہ؟"
"آپ کی حس مزاح بڑی ظالمانہ ہے مس عرشیہ۔" جلال نے کھوکھلا سا قہقہہ لگایا اس کے ساتھی نوجوان نے منمناتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا لیکن عرشیہ نے ہاتھ کے تحکمانہ اشارے سے اسے پیچھے کردیا اور وہ کھسیانا ہوتے ہوئے بغیر کسی اور طرف کو چلا گیا۔

[illegible] میں تمہارے کارناموں کا تذکرہ [illegible] اور سے نہیں کروں گی' میں تو تم سے کچھ اور باتیں کرنا چاہتی تھی آؤ باہر چلتے ہیں۔ تمہارے ساتھ کوئی ہے کیا؟" اس نے جلال کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔
"ہاں لیکن فرازیہ میرے ساتھ ہے۔" جلال نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔
"اسے گولی مارو اس مگرمچھ کی بچی کو اتنی ڈل لڑکی کے ساتھ تم کیا جھک مارتے پھر رہے ہو؟" اس نے اسے تقریباً" کھینچتے ہوئے کہا اس کے گرم و گداز ہاتھ کا لمس اس کے جسم میں ایک نئی اور انوکھی کشش اور حرارت پیدا کررہا تھا حالانکہ یہ پہلی لڑکی نہیں تھی جس کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں آیا تھا تب اس نے سوچا کہ جسموں کے ردعمل بھی تو دراصل ذہن اور محسوسات کے تابع ہوتے ہیں اسے یاد تھا کہ یہی وہ لڑکی تھی جو پہلی نظر میں اسے جچی تھی اور آنکھوں کی راہ سے دل میں اتر گئی تھی مگر وہ اسے اپنی دانست میں بھلا چکا تھا۔
وہ ہال کا ساؤنڈ پروف دروازہ کھول کر باہر نکل آئے باہر تازہ اور خنک ہوا میں انہیں اپنے وجود بے حد ہلکے پھلکے محسوس ہونے لگے۔ وہ عمارت سے نکل کر لان میں چلے گئے اور فوارے کے گرد بنی ہوئی مرمریں دیوار پر بیٹھ گئے جو اوس سے نم تھی آدھے چاند کی دھندلی چاندنی میں وہ جلال کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور اس کی مسکراہٹ نے جیسے چاند کا سارا دھندلاپن ختم کردیا۔
"تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مجھے اس وقت تاسف یا ناگواری کے بجائے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوئی تھی جب ڈیڈی نے غصے کے عالم میں مجھے تمہارے کارنامے کے بارے میں بتایا تھا اور میں اپنے کمرے میں جا کر ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی تھی اور اس کے بعد ہفتوں تک تمہارے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ وہ اس کے کچھ اور قریب کھسک آئی۔" جلال کو یہی محسوس ہورہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔
"شخصیت کے اعتبار سے بھی بہرحال تم اسمارٹ اور ہینڈسم ہو۔" وہ بلاجھجک بات جاری رکھتے ہوئے

ہوں۔ لیکن تمہاری اسمارٹ نس نے مجھے زیادہ متاثر کیا کہ تم کسی بھی قسم کی صورت حال میں ہاتھ پاؤں نہیں چھوڑتے' نروس نہیں ہوتے اور اپنا کام ہر حال میں دکھا جاتے ہو۔ خواہ حالات موافق ہوں یا غیر موافق' یہ سب ذہانت اور مستعدی کی دلیلیں ہیں۔ ایسی ذہانت اور مستعدی جو غلط راہ پر پڑ گئی ہے اور میں تمہیں سچی بات بتاؤں میں خوابوں کی دنیا میں کھوئی رہنے والی لڑکی نہیں لیکن اگر میں کبھی خواب دیکھتی تھی تو ایسے ہی تیز طرار چالاک اور اسمارٹ نوجوان کے خواب دیکھتی تھی ہم امیروں میں تم جیسے لڑکے کم ہی ہوتے ہیں عموماً" بڑے ڈل اور لکیر کے فقیر ہوتے ہیں باپ نے بزنس کروایا بس اس کو چلا رہے ہیں لگے بندھے معمولات ہیں اور محدود سا ذہن ان میں سوچ بچار اور تخلیقی صلاحیت کی بڑی کمی ہوتی ہے اپنے طور پر کوئی اچھوتی بات نہیں سوچ سکتے۔"
وہ جیسے اپنے جوش کو دباتے ہوئے بول رہی تھی' جس سے اس کی سانس بھی پھول گئی تھی' جلال اب نہایت صبر و سکون سے بیٹھا تھا اور توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔
"لیکن میں تمہیں مکمل طور پر فراڈ بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی کہ تمہاری گزر اوقات ہی جعلسازی اور نوسربازی پر ہو اور میں تمہیں سوفیصد پارسا انسان بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی سوفیصد پارسا انسان بھی آج کی دنیاداری میں نہیں چل سکتا۔ آج کی سوسائٹی کے سانچے میں فٹ نہیں ہوتا بس یہی سب کچھ ذہن میں رکھتے ہوئے میں تمہارے بارے میں سوچتی رہی' حتی کہ میں نے ڈیڈی کو بھی قائل کرلیا کہ تم بڑے کام کے آدمی ثابت ہوسکتے ہو' لیکن اس کے بعد تم کبھی مجھے نظر ہی نہیں آئے اور پھر رفتہ رفتہ تمہارا تصور ذہن کے کباڑ خانے میں جاگرا۔"
"میں تمہیں نظر آجاتا تو کیا کرتیں؟" جلال نے ملائمت سے پوچھا۔
"تمہیں اپنی مرضی کا آدمی بنانے کی کوشش کرتی کام کا آدمی۔"

"ہر عورت' جس مرد کو تھوڑا بہت پسند کرتی ہے یا جس سے اس کی شادی ہوجاتی ہے اسے وہ مکمل طور پر اپنی ہی مرضی کا آدمی بنانے کی کوشش کیوں کرتی رہتی ہے؟" جلال نے نہایت سادگی سے پوچھا اور وہ گھور کر جلال کو دیکھنے لگی پھر قدرے پرے کھسک کر بولی۔
"چالاک انسان.... میں تم سے تمہاری ذات کا کوئی جزو نہیں چھینوں گی' تمہیں کچھ دینے ہی کی کوشش کروں گی' میں تمہیں توڑنا پھوڑنا نہیں تعمیر کرنا چاہتی ہوں' میں چاہتی ہوں کہ تم اس سوسائٹی میں سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکو' آئندہ تمہیں کوئی اور ایسی نظر نہ آئے جسے دیکھ کر تمہارا رنگ فق ہوجائے۔"
"کیا تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔" جلال نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔
"اور اب تم یہ بات اور کس طرح مجھ سے کہلوانا چاہتے ہو؟" اس نے قدرے خفگی سے جلال کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا "اب ہم ٹین ایجرز تو ہیں نہیں کہ تم تنہائی پاکر مجھ سے اقرار محبت مانگو گے اور میں اثبات میں سر ہلا کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر اندر بھاگ جاؤں گی ہم دونوں نہ تو اب اس عمر میں ہیں اور نہ اس کلاس میں۔"
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا تمہارے ڈیڈی مجھ سے تمہاری شادی کرنے پر رضامند ہوجائیں گے۔" جلال نے گویا فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔
"ہاں بشرطیکہ میں ان سے کہوں۔" وہ کھسک کر دوبارہ جلال کے قریب آتے ہوئے مسکرائی۔ "آخر میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں اور اب تو ان کا آدھے سے زیادہ بزنس بھی چلا رہی ہوں لیکن میں ان سے تب ہی کہوں گی جب مجھے یقین ہوجائے گا کہ تم اپنی لائن بدل چکے ہو اور مجھ سے مخلص ہو کیونکہ اپنا سب کچھ کسی کو سونپ دینا بڑا نازک کام ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر کرنا پڑتا ہے۔"
"بے شک۔" جلال نے تسلیم کیا اور ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ "بہرحال اگر تمہاری یہی منشا ہے تو

یوں ہی سہی ہم نے اپنا آپ آج ہی سے تمہارے نام لکھ دیا۔"

"اوہاؤ سوئٹ یو آر۔ لگن سچی ہو تو من کا میت تاخیر سے ہی سہی مل ہی جاتا ہے اگر تم کچھ عرصہ اور مجھے نہ ملتے تو میری شادی اس ہونق نوجوان سے ہو جاتی جسے تم نے اندر ہال میں میرے ساتھ دیکھا تھا اور یہاں اب ہمارے درمیان عہد و پیمان ہو گئے ہیں لیکن مجھے تمہارا اصل نام نہیں معلوم ہی نہیں ویسے اتنا مجھے یاد ہے کہ پہلی ملاقات میں تم نے اپنا نام جلال بتایا تھا مجھے۔"

"میرا اصل نام جلال ہی ہے۔" جلال اس کا رخسار تھپتھپاتے ہوئے مسکرایا۔

"بڑے دیدہ دلیر ہو' وارداتوں میں بھی اصل نام استعمال کرتے ہو۔"

"دراصل میں نے کبھی کوئی ایسا خاص قابل گرفت کام نہیں کیا جسے صحیح معنوں میں واردات کہا جاسکے یا ثابت کیا جاسکے۔" جلال نے متانت سے جواب دیا "اس لیے میں زیادہ کبھی متفکر نہیں ہوا آؤ اب اندر چلیں۔"

وہ واپس ہال میں آگئے جہاں مشروبات کے بعد موسیقی کی بدلی ہوئی دھن پر اب باقاعدہ رقص کا آغاز ہو چکا تھا فرازیہ رقص نہیں کر رہی تھی اس نے دونوں کو یکجا دیکھا اور غالباً ان کے چہروں پر ایک خاص تعلق خاطر کا پرتو بھی محسوس کیا وہ ایک لمحے کے لیے حیران ضرور ہوئی کہ اتنی سی دیر میں یہ بساط کیونکر پلٹ گئی لیکن اس ایک لمحے کی حیرانی کے سوا اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا وہ از خود نہ تو جلال کے قریب آئی اور نہ ہی اس نے جاننے کی کوشش کی کہ جلال کہاں گیا تھا اور عرشیہ سے اس کا تعارف کیسے ہوا۔

جلال نے فرازیہ کی طرف دیکھ کر رسمی سے انداز میں مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور فرازیہ منہ پھیر کر جینز جیکٹ میں ملبوس ایک نوعمر لڑکے کی طرف بڑھ گئی جو اکیلا ہی ڈانس کر رہا تھا جلال عرشیہ کے ساتھ رقص کرنے لگا زندگی اسے آج جتنی حسین لگ رہی تھی اس سے پہلے کبھی نہیں لگی تھی عرشیہ ایک ایسی لڑکی تھی جس کے اس نے خواب تو بار بار دیکھے تھے لیکن یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایسی لڑکی اس کا مقدر بھی ہو سکتی ہے۔ فرازیہ سے پیچھا چھڑانے کی اسے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی' وہ اسی رات سے کچھ کہے سنے بغیر اس کا پیچھا چھوڑ گئی تھی اور جلال نے اس پر شکر ادا کیا تھا۔

پھر عمل کی رات جلال بے حد چاق و چوبند تھا' اس نے چیتے کی سی پھرتی اور خاموشی سے بنگلے کی دیوار پھاندی اور چند لمحے کے لیے سفیدے کے درخت کے عقب میں دبک گیا حسب توقع کسی طرف سے کتے کے بھونکنے یا غرانے کی آواز نہیں سنائی دی تاہم آگے بڑھنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر سوچا کہ اسے یہ کام مکمل کرنا چاہیے یا واپس لوٹ جانا چاہیے کچھ منٹ سوچنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ عرشیہ سے کیا ہوا وعدہ ضرور پورا کرے گا لیکن اس آخری کام کے بعد اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ شادی کے بعد عرشیہ کا سب کچھ عملی طور پر جلال ہی کا ہو جانا تھا اور وہ اتنی محبت کرنے والی اور اعلیٰ ظرف کی لڑکی تھی کہ کبھی جلال کو اپنے مقابلے میں کم ظرف ہونے کا احساس نہیں دلا سکتی تھی لیکن جلال اپنی تسلی اور اپنی انا کی تسکین کے لیے اپنے پاؤں زیادہ سے زیادہ مضبوط رکھنا چاہتا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ یہ ثابت کر سکے کہ شادی کے وقت اس کی اپنی حیثیت بھی معمولی نہیں تھی۔

ہیروں کی کامیاب چوری کے بعد وہ خود کو مزید مستحکم کر لے گا یہی سب کچھ ذہن میں دہراتے ہوئے اس نے برآمدے کی طرف دیکھا برآمدے میں دودھیا بلب نشان منزل کی طرف روشن نظر آرہا تھا۔ اعجاز نے کہا تھا کہ اگر بلب روشن نظر آئے تو راستہ صاف ہے ورنہ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے یا کسی وجہ سے تیاریاں مکمل نہیں ہو سکیں اس صورت میں وہ وہیں سے واپس لوٹ جائے۔

پھر اس نے دبے قدموں لان عبور کیا اور عقبی برآمدے میں پہنچا عقبی دروازہ غیر مقفل تھا اعجاز نے اسے سمجھا دیا تھا کہ یہ دروازہ کھول کر وہ اندر آسکتا ہے چنانچہ جلال نے دروازے کی ناب اس طرح گھمائی تھی کہ ذرا بھی آواز پیدا نہ ہو' پھر وہ خواب گاہ کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے اندر کی سن گن لی اور پھر پانچ منٹ کے بعد اس نے کمرے کے دروازہ کی ڈپلیکیٹ چابی نکال کر تالے کے سوراخ میں داخل کی' چابی کو گھمانے میں اس نے پورے پانچ منٹ صرف کیے تھے خواب گاہ میں داخلے کا مرحلہ بھی بخیر و خوبی طے ہو گیا' خواب گاہ کے ایک گوشے میں تپائی پر نائٹ بلب روشن تھا اور مدہم روشنی میں سیٹھ کمبل لپیٹے دنیا و مافیہا سے بے خبر سوتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے سرہانے سے چابی نکالنا بے حد کڑا ثابت ہوا' اس عمل کے دوران جلال کے اعصاب تن گئے تھے یہی وہ مرحلہ تھا جس کے بارے میں اعجاز نے اعتراف کیا تھا کہ اگر وہ اسے سر کرنے کی ہمت کرتا تو کب کا وہ خود ہیروں پر ہاتھ صاف کر چکا ہوتا۔

چابی نکال لینے کے بعد بھی دیر تک جلال دیوار سے ٹیک لگائے اپنے اعصاب کو معمول پر لانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے تجوری کھولنے کا مرحلہ شروع کیا۔ دو تین ٹرائیوں میں اسے تجوری کھولنے کی ترکیب پتا چل گئی اور اس نے ترکیب آزما کر تجوری کھول لی' دروازہ کھولنے کے بعد اس نے قدرے پرسکون انداز میں تجوری کے اندر ہاتھ مارا اور فوراً" ہی اسے مخملی ڈبے کا لمس محسوس ہو گیا' ڈبہ نکال کر وہ اسے کھول کر دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ ڈبہ کھولتے ہی ہیروں کی جھلملاہٹ سے گویا کمرہ منور سا ہو گیا' ہیرے واقعی پورے نو تھے اور ان کا حجم خوب صورت تراش اور چمک دمک ان کے بے حد قیمتی ہونے کا پتا دے رہی تھی اس کی محبت بار آور ہو چکی تھی۔

وہ خاصا غیر جذباتی آدمی تھا لیکن اس وقت نجانے کیوں خوشی سے اس کے ہاتھ پاؤں کچھ بے قابو سے ہو گئے اور ڈبہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا قالین پر ڈبہ گرنے سے تو کوئی خاص آواز پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن یک لخت وہ جب اضطراری طور پر اسے اٹھانے کے لیے جھکا تو اس کی کہنی تجوری کے دروازے سے ٹکرائی اور دروازہ ایک کھٹکے سے بند ہو گیا' یہ کھٹکا خاصا زوردار تھا اور گہری نیند سوئے ہوئے انسان کو بھی بیدار کرنے کے لیے کافی تھا یہ احساس جلال کو ڈبہ اٹھا لینے کے بعد ہوا اس نے ہڑبڑا کر بیڈ کی طرف دیکھا لیکن سیٹھ اسی طرح لیٹا تھا' کسمسایا تک نہیں تھا۔

جلال کو اس کا انداز غیر حقیقی سا محسوس ہوا' پہلی بار اس کی چھٹی حس نے جھرجھری لی وہ دبے قدموں بیڈ کے عین قریب جا پہنچا اور ہمہ تن گوش ہو گیا مگر اسے سیٹھ کی سانسوں کی آواز نہ سنائی دی تب اس نے احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سیٹھ کے اوپر جھک کر اس کا چہرہ بغور دیکھا چہرہ زندگی سے محروم تھا نہایت وحشت کے عالم میں اس نے سیٹھ کے جسم سے کمبل ہٹایا اور فوراً" ہی اسے اس خنجر کا دستہ نظر آگیا جس کا پورا پھل سیٹھ کے پہلو میں پیوست تھا ایک لمحے کے لیے تو اسے یہ سب کچھ ڈراؤنا خواب محسوس ہوا' اعجاز۔۔۔ وہ بہت شرمیلا اور اناڑی نوجوان اتنی ہنرمندی سے جال نہیں بن سکتا تھا۔

دفعتاً" اس کی چھٹی حس نے اس کے جسم میں ہیجان سا برپا کر دیا' وہ بجلی کی سی تیزی سے پلٹا مگر یہ تیزی اس کے کسی کام نہ آئی' کوئی ٹھوس چیز اس کے سر سے ٹکرائی اور فوراً" ہی اس کا ذہن یوں اندھیرے میں ڈوب گیا جیسے کسی بلب کا سوئچ آف کر دیا گیا ہو۔ آنکھ کھلی تو سب سے پہلا احساس اسے سر میں تکلیف کا ہوا اس نے سر کو چھونے کے لیے ہاتھ ہلانا چاہا تو احساس ہوا کہ ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اس نے نقاہت آمیز انداز میں ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ کمرے میں گاڑھا اور سفید دھواں سا نظر آرہا تھا اور اس میں کچھ پرچھائیاں ادھر سے ادھر آجا رہی تھیں۔ پھر اس نے قریب ہی کہیں سے ایک آواز سنی اس آواز کو وہ پہچانتا تھا یہ اس کے ساتھی اس کے شریک جرم اعجاز کی آواز تھی۔

"ہاں جی۔ گیراج میں گاڑی کھڑی کر کے میں خواب گاہ کے نیچے سے گزر کے اپنے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔" وہ غم زدہ انداز میں کہہ رہا تھا "کہ میں نے اوپر کھٹکے کی سی آواز سنی میں نے احتیاطاً" پچھلے دروازے پر ہاتھ مار کر دیکھ لیا مجھے اس کا تالا ٹوٹا ہوا ملا میں دوڑا دوڑا اوپر آیا بیڈ روم کا تالا بھی ٹوٹا ہوا تھا اور دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا میں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو نظر آیا کہ صاحب کہنی کے بل بیڈ سے اٹھ کر اس شخص کو دیکھ رہے تھے جو ہیروں کا ڈبہ بغل میں دبائے باہر جانے کے لیے مڑ ہی رہا تھا صاحب نے غالباً" چیخنے کی کوشش کی مگر اس بدبخت نے انہیں مہلت نہ دی اور میرے سامنے ہی خنجر ان کی پسلیوں میں گھونپ دیا صاحب نے اس کے باوجود اس پر جھپٹنے کی کوشش کی مگر وہ بس بیڈ سے لٹک کر رہ گئے میں حواس باختہ ہو گیا تھا مگر پھر مجھے دروازے کے قریب ہی پیتل کی یہ اسٹینڈ والی بھاری سی ایش ٹرے رکھی نظر آ گئی اور میں نے یہ اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری پھر میں نے چوکیدار کو آواز دی اس نے آ کر اس چور کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔"

"کسی نے لاش کو چھوا تو نہیں۔" ایک تحکمانہ سی آواز نے پوچھا۔

"نہیں صاحب ہمارے اندر تو اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔" اعجاز نے جواب دیا۔

"ہیروں کو بھی کسی نے نہیں چھیڑا؟"

"نہیں جناب یہ اسی طرح بکھر گئے تھے جب میں نے چور کو ایش ٹرے ماری۔"

"یہ تعداد میں نو ہی تھے؟"

"میرے خیال میں نو ہی ہوں گے صاحب ہمارے صاحب اکثر مذاق میں کہا کرتے تھے کہ ان کے پاس نو ایسے ہیرے ہیں جن سے وہ کسی بھی اچھے علاقے میں نو بنگلے خرید سکتے ہیں۔" اعجاز نے اب سسکیاں بھی لینی شروع کر دی تھیں۔

جلال حیران و پریشان تھا اگر اعجاز نے ہیروں پر بھی ہاتھ صاف نہیں کیا تو اس نے مجھے کس لیے اس جال میں پھنسایا ہے میری اس سے کیا دشمنی تھی پھر اس احساس سے اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی کہ کس طرح عین کنارے پر پہنچ کر اس نے اپنی کشتی ڈبو لی اگر وہ ہیروں کے چکر میں نہ پڑتا چوری جیسے مکروہ جرم کا ارادہ ترک کر دیتا تب بھی کیا عرشیہ سے شادی کے بعد اس کی زندگی میں کوئی کمی رہ جاتی۔ اب اسے یہ سوال اہم نہیں لگ رہا تھا کہ وہ بچ جائے گا یا ناکردہ جرم میں تختہ دار تک پہنچ جائے گا اس کا دل تو اس سوال سے ہول رہا تھا کہ وہ عرشیہ کو کیا صورت دکھائے گا اور آیا وہ اس کی صورت دیکھنے حوالات یا جیل میں آئے گی بھی یا نہیں۔

☼ ☼ ☼

ہائی کورٹ نے بھی اس کی سزائے موت برقرار رکھی تھی۔ اعجاز نے ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھا تھا جن کی بنا پر جلال کو شک کا فائدہ دے کر بری کیے جانے کا کوئی امکان موجود تھا۔ جلال کو اگر صحیح معنوں میں حیرت کا دورہ پڑا تھا تو وہ اعجاز کو گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے دیکھ کر پڑا تھا اس نے کس خوب صورتی سے کس صفائی سے جھوٹ بول کر جلال کو تختہ دار تک پہنچانے کا سامان کیا تھا۔ جلال بہت چیخا چلایا تھا اس نے اپنے وکیل کی معرفت پوری اصل کہانی بار بار دہرائی تھی لیکن عدالت ثبوت اور گواہوں پر یقین کرتی ہے بغیر گواہ اور ثبوت کے اسے محض کہانی ہی سمجھا گیا۔ عدالت اس بات کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھی کہ ہیروں کی چوری کا منصوبہ ان دونوں نے مل کر بنایا تھا اور بعد میں اعجاز نے اسے جال میں پھنسا دیا تھا' لیکن ہیرے جوں کے توں موجود تھے کوئی اور چیز بھی چوری نہیں ہوئی تھی' جلال نے یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ اعجاز سے اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی اپنے آقا سے اس کی کیا عداوت ہو سکتی تھی جو وہ اسے قتل کر کے الزام جلال کے سر پر ڈالتا۔

جلال کے وکیل نے سپریم کورٹ میں اپیل کی تیاری شروع کر دی تھی اور جلال کو یقین دلایا تھا کہ

اپیل سماعت کے لیے منظور ہو جائے گی لیکن سپریم کورٹ کا فیصلہ کیا ہو گا اس بارے میں وہ قطعاً" پر یقین نہیں تھا وہ شہر کے قابل اور مشہور وکیلوں میں سے تھا لیکن کسی مقدمے کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑا قابل اور ذہین ترین وکیل بھی بے گناہ شخص کی بے گناہی ثابت کرنے میں ناکام رہ جاتا ہے۔ قانون تو اندھا ہوتا ہے جذباتی تقریریں نہیں شہادتیں اور ثبوت مانگتا ہے اور سب ہی جلال کے خلاف تھیں اور جو اس کے حق میں جا سکتی تھیں ان کا بھی اعجاز نے ایسا پکا بندوبست کر دیا تھا کہ وہ ہرگز جلال کے حق میں نہ جا سکیں۔

شروع شروع میں جلال کو بڑا سہارا رہا کہ اسے بہت بڑے وکیل کی خدمات حاصل تھیں مگر اب اس کا دل بجھ چکا تھا یہ بھی عرشیہ ہی کی نوازش تھی کہ اسے عامر بیگ جیسا وکیل میسر تھا ایک عرشیہ کا دم غنیمت تھا جو از خود ہی اس پر مہربان تھی جلال کی توقعات کے قطعی برخلاف وہ ہائی کورٹ کے فیصلے تک جیل میں اس سے ملنے آتی رہی اور جو کچھ بھی اس کے بس میں تھا کرتی رہی تھی اس نے کبھی جلال کو شرمندہ بھی نہیں کیا تھا کہ بے شک اس نے قتل نہیں کیا تھا لیکن وہ چوری کرنے تو کسی کے گھر میں گھسا تھا البتہ آخری ملاقات پر اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے جلال کی طرف دیکھتے ہوئے اتنا ضرور کہا تھا۔

"تم نے سب کچھ بہت غلط وقت پر کیا جلال بہت غلط وقت پر جب منزل دو چار گام ہی رہ گئی تھی ویسے بھی آخر تمہیں ہیرے چرانے کی ضرورت ہی کیا تھی تمہارے پاس کس چیز کی کمی تھی' شاندار اپارٹمنٹ عمدہ گاڑیاں بینک بیلنس پھر آخر تم نے کیوں یہ قدم اٹھایا تھا بہرحال جلال میرے بس میں جو کچھ بھی تھا میں نے وہ کیا لیکن قسمت جب انسان کے خلاف ہو تو ہر جگہ ہاتھ الٹا ہی پڑتا ہے' میں نے جس پولیس افسر کو ایف آئی آر تبدیل کرنے کے لیے بھاری رشوت کی پیش کش کی وہ حد سے زیادہ ایماندار اور رشوت کا سخت مخالف نکلا جبکہ وہ مجھ سے اتنا ناراض ہوا کہ اس نے کسی اور وسیلے سے بھی میرا کام بننے کی راہ روک دی جس مجسٹریٹ پر اثر و رسوخ کا دباؤ ڈالنے کے لیے میں نے انتظام کیا اس نے اس معاملے کو انا کا مسئلہ بنا لیا اور میرے سفارشی کو کھڑے پیروں اپنے کمرے سے باہر نکال دیا میں نے اپنی دانست میں تمہیں بہترین وکیل فراہم کیا ہے مگر حالات کے سامنے وہ بھی بے بس ہو گیا ہے۔ میں نے یہ سب کچھ اپنی عزت و ناموس اور خاندانی ساکھ کو داؤ پر لگا کر کیا ہے جلال' اخبار والوں کو یہ بات معلوم ہے کہ میں تمہارے لیے بھاگ دوڑ کرتی رہی ہوں اور جیل میں بھی تم سے ملنے آتی ہوں ان کے لیے یہ بہت بڑا اسکینڈل ہے لیکن وہ کھل کر کچھ لکھنے سے اب تک اس لیے باز رہے ہیں کہ ان کے اخباروں کو ڈیڈی کے گروپ آف کمپنیز سے بے شمار اشتہارات ملتے ہیں مگر مجھے معلوم ہے یہ پردہ داری زیادہ دیر نہیں چلے گی جلد ہی کوئی مہربان اخبار کوئی نہ کوئی شوشا چھوڑ دے گا اور پھر ایک نیا محاذ کھل جائے گا' مجھ میں اس صورت حال کا سامنا کرنے کی جرات نہیں' میں جتنا آگے جا چکی ہوں اتنا ہی کافی ہے میں اب تمہیں حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر واپس اپنی دنیا میں جا رہی ہوں اگر تمہاری اپیل سماعت کے لیے منظور ہو گئی تو تمہیں دھولگری جیل منتقل کر دیا جائے گا ظاہر ہے وہاں تو میں ویسے بھی تم سے ملنے نہیں آ سکوں گی اگر قسمت تم پر مہربان ہو جائے اور کچھ عرصے تک تمہیں رہائی مل جائے تو ایک بار پھر مجھے دیکھنے ضرور آ جانا شاید میں تمہیں منتظر ملوں اور شاید میں ڈیڈی کو آمادہ کر سکوں کہ وہ تمہیں تمہارے ماتھے پر لگی ہوئی رسوائی کی کالک کے باوجود قبول کر لیں۔ میں اگر تمہارے لیے کچھ کر سکی ہوں تو اس کے لیے مجھے اپنے دل میں اچھے لفظوں میں یاد کرنا اور اگر میں کچھ نہیں کر سکی تو مجھے معاف کر دینا۔" عرشیہ کی آنکھوں سے نمی رخساروں پر چھلک آئی تھی اور آواز رندھ گئی تھی اس نے جسم پر ایک بڑی چادر اوڑھ رکھی تھی اسی چادر کے پلو سے آنسو پونچھتے پونچھتے یک لخت مڑی اور ملاقات کے مخصوص حصے سے باہر چلی گئی۔

اس کے ساتھ ہی جیسے جلال کی زندگی سے محبت بھی چلی گئی ایک دم اس کا وجود کھوکھلا ہو گیا اپنی نظر میں تو وہ گر ہی چکا تھا اب تو اپنا وجود ریت کے گھروندے سے بھی زیادہ بے وقعت ہو کر رہ گیا تھا۔ یکایک ہی ساری چیزوں ساری باتوں سے اس کی دلچسپی ختم ہو گئی اسی شام اس کے وکیل عامر بیگ نے اس سے ملاقات کی اور سپریم کورٹ میں اپیل کی تیاریوں کے بارے میں بتایا۔

"نہیں وکیل صاحب اب میں کسی کورٹ میں اپیل نہیں کرنا چاہتا۔"

"نہیں جلال! ایک آخری امید ہے ہو سکتا ہے اس اپیل کے دوران کوئی ایسا ثبوت کوئی ایسی چیز ہاتھ آجائے جو اس کیس کو پلٹ دے دیکھو میں ایک پیشہ ور وکیل ہوں بعض اوقات ہمارا مقصد کیس جیتنا ہوتا ہے لیکن اس طرح کے کیسوں میں حد سے زیادہ ضروری ہے ایک انسان کی جان بچانا اگر تم بے گناہ ہو تو پھانسی یا عمر قید سے تمہاری جان ضرور بچنی چاہیے اس لیے میں یہ اپیل ضرور کروں گا۔"

"ٹھیک ہے وکیل صاحب جیسی آپ کی مرضی۔"

اب صورت یہ تھی کہ جلال کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ اس نے داڑھی بڑھالی تھی اور اس کا بیشتر وقت جائے نماز پر گزرتا تھا گفت و شنید اس نے تقریباً ترک کردی تھی جائے نماز پر وہ اکثر مراقبے کے عالم میں بیٹھا رہتا اس کی حرکات و سکنات میں بلا کا سکون ٹھہراؤ اور طمانیت سی آگئی تھی کبھی کبھی وہ جیل کے محافظوں سے باتیں کرتے وقت اتنا ضرور کہتا۔

"قتل تو میں نے نہیں کیا لیکن شاید میں نے زندگی میں کوئی اور ایسا سنگین گناہ کیا ہو جس کی سزا قدرت مجھے دینا چاہتی ہو شاید میں نے کسی مظلوم کا دل دکھایا ہو شاید میں نے کسی کی دنیا اندھیر کی ہو۔"

اس نے کئی بار عامر بیگ سے کہا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اعجاز کو اس سے ملاقات کے لیے بھیجے اس سے کہے کہ جلال اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس سے چند منٹ گفتگو کرنا چاہتا ہے عامر نے اسے بتایا کہ اعجاز اس سے ملنے پر آمادہ نہیں ہے پھر ایک روز محافظ نے اسے اطلاع دی۔

"صوفی صاحب آپ کی ملاقات آئی ہے۔" جب جلال ملاقاتیوں کے مخصوص کمرے میں پہنچا تو اس نے وہاں اعجاز کو کھڑے ہوئے پایا وہ کچھ مضمحل سا نظر آرہا تھا مگر اب جلال کو وہ اتنا سادہ لوح اور مسکین نہیں دکھائی دے رہا تھا جتنا ماضی میں نظر آتا تھا۔

"کیا بات تم تم کیوں مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟" اس نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

"اگر تمہارا خیال ہے کہ کسی طریقے سے تمہاری پھانسی ٹل جائے گی تو یہ خیال دل سے نکال رکھو۔"

"تمہیں شاید یقین نہ آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اب اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ مجھے پھانسی لگتی ہے یا سزائے موت عمر قید میں تبدیل ہوتی ہے یا رہائی ملتی ہے میں زندگی بھر معرکے پر معرکہ مارتا رہا لیکن نامطمئن اور ناآسودہ رہا اب میں تختہ دار کی طرف سفر کر رہا ہوں لیکن جانے کیوں مجھے قرار سا آگیا ہے میں نے یہ خیال ہی دل سے نکال دیا ہے دنیا سے کبھی میرا کوئی ناتا تھا۔ مجھے اگر کوئی خلش کبھی بے چین کرتی ہے تو وہ صرف ایک سوال کی خلش ہے تمہارا مقصد تو پورا ہو ہی چکا ہے خدارا اب صرف میری یہ خلش دور کردو میں اپنے دل میں اس سوال کی خلش لے کر مرنا نہیں چاہتا آخر تم نے کیوں مجھے قربانی کا بکرا بنایا مجھ سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟"

اعجاز نے محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھا جلال کو آج پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس کی آنکھیں لومڑی کی سی تھیں پھر جب اسے اطمینان ہو گیا کہ کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہے تو اس نے جلال کے مزید قریب آکر کہا۔

"تم سے تو میری کوئی دشمنی نہیں تھی البتہ سیٹھ اکرام سے ضرور تھی۔ بات بڑی مختصر سی ہے اور اب میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ اس دشمنی کی وجہ کیا تھی تو وجہ یہ ہے میرے دوست کہ میری بیوی بہت خوب

صورت ہے بہت کمسنی میں اس کی مجھ سے شادی ہو گئی تھی سولہ سترہ سال کی تھی اس وقت وہ اور آج بھی شادی کے تین برس کے بعد اور ایک بچے کی ماں بن جانے کے بعد بھی وہ ویسی کی ویسی ہی ہے شوخ و چنچل حسین اور شگفتہ۔ وہ تھوڑی بہت پڑھی لکھی بھی ہے میری جب اس سے شادی ہوئی تو میں بے انتہا خوش تھا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے اتنی پیاری بیوی مل جائے گی لیکن پھر اس کی خوب صورتی میرے لیے عذاب بن گئی غریب کی جھونپڑی میں لعل کون رہنے دیتا ہے اس ادھیڑ عمر موٹے سیٹھ نے ایک مرتبہ میری بیوی کو دیکھ لیا اور اس کی رال ٹپک پڑی اس نے تحفے تحائف روپے پیسے اور دیگر نوازشات کا زہر اسے دینا شروع کردیا۔ اپنی دولت کی چمک سے اس الہڑ شوخ اور کمسن لڑکی کی آنکھیں خیرہ کردیں۔ چپکے چپکے وہ اس کے جال میں پھنستی چلی گئی۔ مہینوں تو مجھے پتا ہی نہ چلا میں اس کے عشق میں اتنا اندھا تھا یا میرا اعتماد اتنا معصوم تھا کہ مجھے اپنی بیوی پر کبھی شک نہ ہوا میں اس کے پاس اتفاق سے کوئی ایسی چیز دیکھ لیتا جو مجھے اپنی حیثیت سے باہر نظر آتی تو اس کی موجودگی کا وہ جو بھی جواز پیش کرتی میں آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کرلیتا۔ وہ راتوں کو اٹھ کر دبے قدموں کوارٹر سے نکل کر سیٹھ کی خواب گاہ میں چلی جاتی اور نجانے کتنی دیر وہاں رہتی اور مجھ احمق کو پتا ہی نہ چلتا اصل میں ہر چیز کے ٹیڑھے پن پر انسان کی نظر اس وقت جاتی ہے جب اس کے دل میں شک کا بیج پھوٹ پڑے میرے دل میں شک کا بیج بہت دیر سے پھوٹا۔"

اس نے رک کر جھرجھری لی اور جلال سے نظریں چراتے ہوئے مزید مدہم لہجے میں بولا۔

"تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ اس وقت میری کیا کیفیت ہوئی جب مجھے صورت حال کا علم ہوا میرے پاس اپنے کرب کو بیان کرنے کے لیے الفاظ ہی نہیں ہیں میں نے اپنی بیوی کا شکنجہ کس کر اسے تو گھر کی چاردیواری میں تقریباً مقید کردیا لیکن سیٹھ کو یا اسے اس بات کا علم نہ ہونے دیا کہ مجھے ساری بات کا علم ہے بلکہ میں نے صرف یہ تاثر دیا جیسے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میری کم عمر اور نادان بیوی بھٹک نہ جائے لیکن میرے اندر ہی اندر سیٹھ سے نفرت کا جو الاؤ روشن ہو چکا تھا اسے وقت بھی نہ بجھا سکا۔ اسے دیکھ کر میری حالت عجیب ہو جاتی تھی دل چاہتا تھا کہ خنجر لے کر اس پر پل پڑوں اور اس کے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کردوں گاڑی میں اسے لے کر جاتا تھا تو دل چاہتا تھا کہ گاڑی فل اسپیڈ پر کسی درخت یا عمارت سے ٹکرادوں خود بھی مرجاؤں اور اسے بھی ماردوں لیکن۔ لیکن میں بے حد بزدل تھا۔ مجھے جان بہت پیاری تھی میں سیٹھ کو بھی مارنا چاہتا تھا اور خود بھی محفوظ رہنا چاہتا تھا مجھے اپنی بیوی بھی بہت پیاری تھی میں نے اسے اس کی بیوفائی کی کوئی سزا نہیں دی تھی سوائے اس کی نقل و حرکت پر کڑی پابندی عائد کرنے کے پھر مجھے تم مل گئے ہیروں کی چوری کے منصوبے کے ساتھ جوں جوں تمہارا منصوبہ میرے سامنے پھیلتا چلا گیا میرے ذہن میں اپنا ہی ایک منصوبہ جڑ پکڑنے لگا اور میں نے جوا کھیلنے کا فیصلہ کر ہی لیا لیکن مجھے خود بھی امید نہ تھی کہ میں اس قدر کامیاب رہوں گا بس یہ تھی ساری بات دراصل تمہیں سزا دلوانے میں میں جو اتنا ثابت قدم رہا ہوں اس میں سیٹھ کے رشتے داروں کا بھی بڑا حصہ ہے وہ چونکہ آنکھیں بند کر کے یقین کر چکے ہیں کہ قاتل تم ہی ہو اس لیے وہ میری پیٹھ پر تھپکی دیتے رہے کہ میں تھانے کچہری سے بالکل نہ گھبراؤں اور جو کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں من و عن بیان کرتا رہوں ویسے بھی انہیں بڑی جلدی ہے کہ سیٹھ کا معاملہ نمٹنے اور وہ اس کی املاک و جائیداد کا بٹوارہ کریں کہو اب تمہارے دل کی خلش دور ہو گئی یا ابھی بھی کچھ اور باقی ہے۔"

جلال نے ایک سکون کی سانس لی اور بولا "ہاں اب میں سکون سے مرسکوں گا۔" یہ کہہ کر وہ واپس اپنی کوٹھری کی جانب چل پڑا۔

سپریم کورٹ میں اپیل کی سماعت شروع ہو گئی تھی وہی بار بار دہرائی گئی باتوں کی تکرار" وہی ججوں کے بے

پرانی فائلوں کی الٹ پلٹ جلال اتنی بے دلی سے سب کچھ دیکھتا تھا کہ ایک بار تو عامر کو اس پر شبہ ہوا کہ شاید وہ کارروائی کے دوران اونگھنے لگا تھا' اس کی لاتعلقی کا یہ عالم تھا کہ یہ تمام کارروائی اسے کسی ڈرامے کا حصہ محسوس ہوتی تھی جسے وہ نیم خوابی کے عالم میں دیکھ رہا تھا' اس نے اعجاز سے ہونے والی ملاقات اور ان باتوں کے بارے میں عامر کو کچھ نہیں بتایا تھا کیونکہ محض زبانی کلامی دعووں سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا' جس کی صفائی میں کوئی شہادت موجود نہیں تھی۔ جیل میں اس کے شب و روز حسب معمول صوفیانہ انداز میں گزر رہے تھے" لیکن استغاثے کے گواہوں کے بیانات کی نوبت آنے سے ایک دن پہلے عامر بیگ غیر متوقع طور پر جیل میں اس کے پاس پہنچ گیا۔

عامر بیگ کا چہرہ جوش کے مارے سرخ ہو رہا تھا' وہ اپنا بریف کیس کبھی نیچے رکھتا پھر اٹھا لیتا اس نے پرجوش انداز میں جلال سے کہا۔

"میں تمہارے لیے بہت بڑی خوشخبری لے کر آیا ہوں جلال' اپنی ساری پیشیاں چھوڑ کر میں صبح ہی صبح سفر کر کے تمہارے پاس پہنچا ہوں' سنو غور سے سنو' اعجاز نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا اور سیٹھ کے قتل کا اعتراف کر لیا ہے' میرا خیال ہے اپیل آج ہی کالعدم ہو جائے گی اور کل پرسوں تک تم پولیس کی معیت میں میرے ساتھ اپنے شہر چلو گے اور ایک آدھ ہفتے میں تمہاری بریت عمل میں آجائے گی۔ تم آزاد ہو جاؤ گے۔" اس نے پرجوش انداز میں جلال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور جلال اسی طرح نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا' عامر اس طرح خوش ہو رہا تھا جیسے اعجاز کا اقرار جرم اس کی وجہ سے ممکن ہو' جلال محض مسکرا دیا' وہی مخصوص مسکراہٹ جو کچھ عرصے سے اس کی شخصیت کا جزو بن چکی تھی۔

عامر بیگ کی تمام تر کوششوں کے باوجود جلال کو رہا ہونے میں کئی ماہ لگ گئے' ہاں ایک کام ضرور ہوا تھا' عرشیہ کے خاموشی اختیار کر لینے کے بعد اخبار خاموش نہ رہے تھے اور انھوں نے عرشیہ کی کوششوں کا ذکر کیے بغیر جلال کے کارنامے کی خبریں بڑھ چڑھ کر بیان کی تھیں۔ قتل کے مقدمے میں تو وہ بری ہو گیا تھا' لیکن اس کے بعد چوری کی نیت سے کسی کے گھر میں داخل ہونے کے مقدمے کے سلسلے میں اس کی سزا شروع ہو گئی' لیکن بہرحال اس سزا کے دوران اسے علم تو تھا کہ فلاں تاریخ کو وہ جیل سے رہا ہو کر باہر کی دنیا میں پہنچ جائے گا۔

پھر وہ دن بھی آ ہی گیا جب اس نے جیل کے بلند و بالا گیٹ کے چھوٹے سے کھڑکی دروازے میں قدم رکھا اور آزادی کی فضا میں سانس لی ایک خاکی لفافہ اس کی بغل میں موجود تھا جس میں اس کی وہ چیزیں موجود تھیں جو اس کی ملکیت تھیں اور جیل والوں نے اسے واپس کر دی تھیں۔ چند لمحوں تک وہ گیٹ کے قریب کھڑا گہری گہری سانسیں لیتا رہا وہ نکھری نکھری دھوپ کھلی فضا اور پرہنگامہ دنیا میں کھڑا تھا یہ دیکھ کر ایک بار پھر محرومی اور تنہائی کا احساس اسے ڈسنے لگا کہ کوئی اسے لینے نہیں آیا تھا زندگی میں ایسا تنہا بھی کوئی نہ ہو کہ جنازہ اٹھے تو اشک بہانے والا کوئی نہ ہو اور حیات نو ملے تو محبت سے ہاتھ تھامنے والا کوئی نہ ہو اس نے سوچا اور دھیرے دھیرے کسی سواری کی تلاش میں ایک طرف قدم بڑھا دیے۔

ٹیکسی کا پہیہ گردش میں آیا تو اس کی رگوں میں خون کی گردش بھی جیسے تیز ہو گئی۔ مایوسی کا غبار ذہن سے چھٹنے لگا بہرحال اپنے فلیٹ والی بلڈنگ کے سامنے ٹیکسی رکوائی اور پھر وہ مارکیٹ چلا گیا مارکیٹ پہنچ کر اس نے شیو بنوائی شیو بنوانے سے چہرہ نکھر گیا تھا لیکن اس کے رخساروں کی ہڈیاں کچھ ابھر آئی تھیں وہ اوپر اپارٹمنٹ پہنچا اس کی معمر پڑوسی عورت اپنے دروازے میں کسی کام سے کھڑی تھی اسے دیکھتے ہی وہ پلٹ کر اپنے فلیٹ میں گئی واپس آکر اسے نے ایک چابی جلال کو دیتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کا نوکر دے گیا تھا گھر میں پیسے ختم ہو گئے تھے تو وہ کہیں چلا گیا۔" جلال نے شکریے کے ساتھ

چابی لے لی دراصل اس نے اپنے کسی ریکارڈ میں اپنے اس فلیٹ کا پتا نہیں لکھوایا تھا' شناختی کارڈ پر بھی ایک پرانا پتا درج تھا اس لیے پولیس اس جگہ تک نہیں پہنچی تھی شاید یہی وجہ تھی کہ بڑھیا کو یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ جلال جیل میں تھا یا پھر ایک اچھے پڑوسی کی طرح وضعداری نبھاتے ہوئے جلال کو شرمندہ نہ کرنے کی غرض سے انجان بنی ہوئی ہے۔ جلال سوچ رہا تھا مگر وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے کے نیچے مختلف بلوں اور نوٹسوں کا پلندہ دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ گھر کی بجلی اور فون کٹ چکا ہے لیکن پانی آرہا تھا لہٰذا خوب جی بھر کر نہایا نہا دھو کر اس نے چھوٹے سے فلیٹ کا جائزہ لیا اور اسے ایک خوش گوار حیرت ہوئی کہ نوکر نے کوئی چیز غائب نہیں کی تھی۔

کھانے پینے اور دوسرے معمولات سے فراغت کے بعد اس نے سب سے پہلے بجلی کی بحالی کا بندوبست کیا فون لائن کی بحالی میں دیر تھی۔ گاڑی کو بھی چیک کیا اس کی بیٹری بھی کھڑے کھڑے ڈاؤن ہو گئی تھی چنانچہ اسے بھی چارجنگ کروا کر اسٹارٹ کیا اور گاڑی کو چلتی ہوئی حالت میں لے آیا۔

شام کو وہ تیار ہو کر باہر نکلا کسی خیال کے تحت ایک پبلک بوتھ کے سامنے کار روک کر اس نے بوتھ سے عرشیہ کے گھر کا نمبر ڈائل کیا دوسری طرف سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

"مس عرشیہ ہیں؟" جلال نے پوچھا۔

"آپ کون بول رہے ہیں؟" بھاری بھرکم آواز نے پوچھا۔

"مم... میں جی... وہ جی میں عرشیہ کا دوست..."

"شٹ اپ نان سینس..." دوسری طرف سے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا گیا تھا' جلال ریسیور دیکھتا رہ گیا' پھر باہر نکل آیا۔ اس کے بعد دیر تک جلال بلامقصد ادھر ادھر گاڑی گھماتا رہا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے عرشیہ کے گھر جانا چاہیے یا نہیں اس نے سوچا کہ محض اس کے گھر کے سامنے چکر لگا لینے میں تو کوئی حرج نہیں عرشیہ کی کوٹھی پر آرائشی لائٹس دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا لیکن جب وہ کھلے گیٹ کے سامنے سے گزرا تو اسے کوٹھی بالکل سنسان نظر آئی۔ لان کی روش پر صرف ایک شخص ٹہلتا نظر آرہا تھا جو شاید چوکیدار معلوم ہوتا تھا جلال گاڑی سے اتر کر اس کے پاس پہنچا۔

"سب لوگ کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"سب گھر والے میرج ہال گئے ہوئے ہیں؟" چوکیدار نے جواب دیا۔

"کیوں؟" جلال نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ چوکیدار نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہو کہ کیا اب بھی کسی سوال کی گنجائش باقی ہے پھر بھی اس نے طوعاً" و کرہاً" جواب دیا۔

"عرشیہ بی بی کی شادی ہے نا صاحب آج۔"

جلال جب وہاں سے روانہ ہوا تو اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ بار بار کوٹ کی آستین سے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو صاف کرنے لگتا تھا۔ اس کے بعد اس کی گاڑی نجانے کتنی دیر تک سڑکوں پر سست رفتاری سے بھٹکتی رہی اس کے ذہن پر عرشیہ کا خیال تھا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ پھر دفعتاً" اسے احساس ہوا کہ وہ جس گلی سے گزر رہا ہے وہ اس کے لیے جانی پہچانی سی ہے اس نے سر جھٹک کر گویا دھیان ہٹانے کے لیے ادھر ادھر دیکھا تو اسے ایک جانا پہچانا گیٹ نظر آیا۔ وہ فرازیہ کی کوٹھی کا گیٹ تھا۔ اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے کوٹھی کی بیرونی دیوار سے جلال نے اندر دیکھا تو طویل و عریض لان پر ایک جگہ دودھیا روشنی میں اسے فرازیہ کی جھلک نظر آئی' وہ ایک میز کے گرد رکھی ہوئی لان چیئرز میں سے ایک پر بیٹھی تھی۔ جلال پہلے تو آگے نکلتا چلا گیا پھر نجانے کیا سوچ کر اس نے گاڑی ریورس کی اور گیٹ کے سامنے روک کر اتر کر ڈرائیو وے میں چلا گیا وہاں سے وہ رات کی رانی کے پودوں کو پھلانگ کر لان پر فرازیہ کی طرف بڑھنے لگا۔

فرازیہ نے دور ہی سے اسے دیکھ لیا تھا' مگر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا' اس کے سامنے میز پر

رنگ برنگی تیلیاں رنگی ہوئی تھیں اور وہ اپنے ناخنوں پر نیل پالش لگانے میں مصروف رہی تھی۔ جلال دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تو اس نے سر اٹھایا اور کٹے ہوئے بالوں کی لٹیں ماتھے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے، کسی سے ملنا ہے؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"فرازیہ۔۔۔" جلال کی آواز حلق میں پھنسنے لگی، وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی ہونٹ جیسے پتھرا گئے تھے۔

"میں یہ پسند نہیں کرتی کہ اجنبی یوں بے تکلفی سے مجھے مخاطب کریں یا یوں لان پر قلانچیں بھرتے میرے قریب چلے آئیں۔" فرازیہ نے پہلے سے زیادہ سخت اور بے مہر لہجے میں کہا۔ "مناسب اور مہذبانہ طریقہ یہ ہے کہ آدمی اطلاعی گھنٹی بجائے نوکر کے ہاتھ پیغام بھجوائے اور اگر اسے بلایا جائے تب اندر آئے۔ ورنہ اپنی راہ لے۔"

"اپنے پاس ہی رکھو اپنے آداب اور تہذیب" جلال نے سنبھل کر ایسے لہجے میں کہا جس میں غصہ بھی تھا اور اس کی مجروح انا کی کراہیں بھی غصے میں اس نے ایک لان چیئر کو ٹھوکر بھی ماردی کرسی الٹ کر دور جا گری۔ فرازیہ نیل پالش کی شیشی اور برش پٹخ کر اٹھ کھڑی ہوئی، وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔ اس نے زور سے اپنے نوکروں کو آواز دی مگر کسی نوکر کے نمودار ہونے سے پہلے ہی جلال مڑا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا گیٹ کی طرف چل دیا۔

☼ ☼ ☼

اس کے اپارٹمنٹ کی تمام سہولیات بحال ہو گئی تھیں، مگر اس کے باوجود زندگی سے اس کا رابطہ تمام تر کوششوں کے باوجود بحال نہیں ہوا، اس کے من میں بدستور اندھیرا تھا اس کا دل بجھ گیا تھا اسے نیا نوکر بھی مل گیا تھا اور تب سے تو اس نے اپارٹمنٹ سے قدم ہی نہیں نکالا تھا، روزانہ وہ بالکونی میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا اور کھوئی کھوئی نظروں سے رواں دواں ٹریفک کو دیکھتا رہتا اس کا بیشتر وقت وہیں گزرتا۔ اس وقت بھی جبکہ شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا اور وہ وہیں بیٹھا تھا۔ دفعتاً کال بیل نے اسے چونکا دیا پچھلے دنوں میں کوئی بھی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ چند لمحے بعد نوکر نے اسے اطلاع دی کہ کوئی عورت اس سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ پراشتیاق انداز میں اٹھ کر ڈرائنگ روم کی طرف لپکا مگر نوکر نے عورت کو ڈرائنگ روم میں نہیں بٹھایا تھا وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا وہ عورت راہداری میں ہی کھڑی تھی وہ نہ تو عرشیہ بلند اقبال تھی اور نہ ہی فرازیہ انعام احمد وہ شاید کوئی بھکارن تھی۔ مفلوک الحالی نے سر سے پاؤں تک اس کے وجود کو ڈھانپ رکھا تھا اس کے کپڑے میلے، بال پریشان اور گرد میں اٹے ہوئے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں اور آنکھوں میں ویرانی تھی اس کی گود میں ایک بچہ تھا اس کے کپڑے موسم کے لحاظ سے ناکافی اور میلے چیکٹ تھے اس کی ناک بہہ رہی تھی اور میل زدہ رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔ عورت کا چہرہ بتاتا تھا کہ زیادہ پرانی بات نہیں کہ ان لبوں کی لالی گلاب کی پنکھڑیوں کو شرماتی تھی ان آنکھوں میں ستارے جھلملاتے تھے ان رخساروں پر شفق پھولتی تھی اس مانگ میں افشاں چمکتی تھی اور ان زلفوں کی گھنیری چھاؤں میں محبت ستاتی تھی۔

جلال نوکر کو آواز دینے ہی لگا تھا کہ وہ اس عورت کو دس پانچ روپے دے کر رخصت کردے، مگر اسی لمحے عورت کے خشک ہونٹ کپکپائے اور وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی۔

"میں بڑی مشکل سے آپ کا پتا لگاتی ہوں اور ڈھونڈتی ڈھانڈتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہوں جلال صاحب۔"

جلال کو حیرت ہوئی کہ وہ اسے اس کے نام سے مخاطب کررہی تھی، عورت نے اس کی آنکھوں میں ابھرتا ہوا سوال پڑھ لیا تھا دیوار کا سہارا لیتے ہوئے وہ بولی۔

"میں سیٹھ صاحب کے ڈرائیور اعجاز کی بیوی ہوں،

بیوی کیا بیوہ ہی سمجھئے، آپ نے شاید اخبار میں پڑھا ہو کہ تین دن کے بعد اسے پھانسی دی جانے والی ہے میں ہی وہ عورت ہوں جس نے اسے تختہ دار تک پہنچایا ہے لیکن اگر میں ایسا نہ کرتی تو زندگی بھر دہری اذیت میں مبتلا رہتی، اب اگر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے تو صرف اپنے کردار کی لغزش پر ہی کرتا ہے لیکن کم از کم یہ اطمینان تو ہے کہ اصل قاتل پھانسی کے تختے پر پہنچ رہا ہے خواہ وہ میرا شوہر ہی ہے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کی باتوں کا، میں سمجھا نہیں۔" جلال نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

عورت نے اپنی میلی سی چادر سے آنکھیں پونچھیں اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں نے اس وقت اخبار میں آپ کی تصویر دیکھی تھی جب آپ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی اور تب سے میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی مجھے معلوم تھا کہ سیٹھ صاحب کا قاتل اعجاز ہے اور اس کے حصے کی سزا ایک بے گناہ کو مل رہی ہے لیکن میں کچھ کرنے سے معذور تھی، کرتی بھی تو کیا، کون میری بات پر یقین کرتا جبکہ آپ پوری طرح پھنس گئے تھے اور پھر اعجاز نے مجھے تالے کنڈیوں میں بند کر رکھا تھا لیکن میں نے طعنے تشنوں سے اس کا جینا حرام کردیا، اٹھتے بیٹھتے میں آپ کی تصویر اس کے سامنے کردیتی اور کہتی دیکھ تو سہی، کیسا خوب صورت جوان ہے یہ۔۔۔ یہ بھی کسی ماں کا لعل ہوگا، کسی کا دلبر و دلدار ہوگا، کسی کا چہیتا ہوگا، کسی کی آرزوؤں کا مرکز ہوگا اور یہ محض تجھ جیسے مکار اور بزدل کے کیے کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔ اس بھری جوانی میں موت کی نیند سو جائے گا اور وہ بھی ایسے جرم کی سزا میں جو اس نے کیا ہی نہیں، ٹھیک ہے میں بھٹک گئی تھی لیکن اگر میری لغزش سے تیری غیرت پر ایسی ہی چوٹ لگی تھی تو مجھے مار دیتا اور اگر سیٹھ ہی کو مارا تھا تو سینہ تان کر اس کی سزا میں پھانسی چڑھ جاتا، مگر تو تو لومڑی کا بچہ ہے، مکار اور منحوس، مجھے تیری صورت سے نفرت ہے۔" ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہو گئی پھر اس نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جلال صاحب وہ یہ سب کچھ سنتا تھا، دانت پیستا تھا اور غصے کے عالم میں میری طرف دیکھتا تھا، میرا خیال تھا کہ کسی روز وہ مجھے بھی قتل کردے گا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور ایک روز خود کو پولیس کے سامنے پیش کر کے اقبال جرم کرلیا اس سارے فساد کی جڑ میں ہوں جلال صاحب۔۔۔ میں۔۔۔"

آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے، وہ بری طرح یاسیت کا شکار تھی، اس کے لہجے میں بے پناہ کرب تھا، جسے جلال محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا، اس نے پھر کہا۔

"نہ میں بھٹکتی نہ اتنا فساد کھڑا ہوتا، لیکن میں بھی کیا کروں جلال صاحب، میری کھیلنے کودنے کی عمر تھی جب ماں باپ مر گئے اور میں دور پار کے رشتے داروں کے در پر ٹھوکریں کھانے کے لیے رہ گئی۔ انہوں نے جتنی جلدی ہو سکا مجھے بوجھ کی طرح سر سے اتار پھینکا بلکہ کچھ رقم بھی کھری کرلی، میں کمسن تھی تھوڑی سی پڑھی لکھی تھی شادی کے بارے میں میرے کچھ خواب تھے جلال صاحب، بڑے معصوم سے خواب۔۔۔ میں کسی پڑھے لکھے تعلیم یافتہ شخص کی بیوی بننے کے خواب دیکھتی تھی کیونکہ بچپن ہی سے میری سہیلیاں اور استانیاں مجھے احساس دلاتی رہتی تھیں کہ میں بڑی حسین ہوں میرا بیاہ کسی بابو صاحب سے ہوگا، لیکن پھر میری شادی ایک کالے کلوٹے ڈرائیور سے کردی گئی

نقلی دانت

ایک بوڑھا گلوکار اسٹیج پر گانے کے لئے کھڑا ہوا تو اس کے نقلی دانت گر پڑے۔ اس نے جلدی سے انہیں منہ میں فٹ کیا، لیکن جب گانے کے لیے منہ کھولا تو وہ پھر گر پڑے۔

جب چار پانچ دفعہ ایسا ہی ہوا تو ایک آدمی جل کر بولا۔

"کیسٹ ہی بدلتے رہوگے یا کچھ گاؤ گے بھی۔"

جو تقریباً "چوبیس گھنٹے" سیٹھ صاحب کی خدمت میں حاضر رہتا تھا، گھر میں غربت و افلاس کے سائے تھے تقریباً "ساری" تنخواہ وہ گاؤں اپنے ماں باپ کو بھیج دیتا تھا اور تنخواہ بھی کیا ہی ملتی تھی، میں سیٹھ کے ذرا ذرا سے تحفوں سے پسیج گئی، نادان تھی بہک گئی اور ظاہر ہے مجھے سیٹھ صاحب سے کوئی الفت نہیں تھی، بس وہ میری ہر طرح کی ضرورتیں پوری کرنے لگے اور میں ان کی ہوس پوری کرتی رہی، مگر میں نے سزا بھی تو بہت بھگت لی ہے، اب آپ مجھے بتایئے جلال صاحب میں کہاں جاؤں، میرے رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا، اپنا پرایا کوئی بھی مجھے اپناتا نہیں کیونکہ میں ایک قاتل کی بیوی ہوں۔ بغیر ضمانت کے کوئی نوکری نہیں دیتا، بچہ بھوک سے بلکتا ہے، کہاں سے اپنا رزق اور اس کا دودھ پورا کروں، میرا آپ سے پوچھنے کا حق تو نہیں بنتا لیکن آپ ہی مجھے بتایئے کہ میں کسی سے یہ سوال کروں کہ میں کیا کروں۔" وہ جیسے ہیجان کے عالم میں روتی جا رہی تھی ہیجان ختم ہوا تو وہ رونے لگی تھی۔

جلال عجیب سے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا، اس نے عورت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"دیکھو لڑکی یا عورت یا جو بھی تمہارا نام ہی، مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری اور تمہاری کہانی ملتی جلتی ہے، میں بھی اس زندگی میں اکیلا ہوں، میں نے جرم کی دنیا اپنائی، چھوٹے موٹے جرائم کیے جن میں کچھ تھوڑا بہت کما بھی لیا، یہ فلیٹ اور گاڑی وغیرہ حاصل کر لی، پھر میری ایک جگہ بات چل رہی تھی کہ میں بھی بھٹک گیا۔ پھر مجھے اعجاز ملا اور میں نے اس کے ساتھ مل کر سیٹھ صاحب کے ہیروں کی چوری کا پروگرام بنایا، پھر اس پر عمل بھی کر ڈالا، لیکن اعجاز کے ذہن میں سیٹھ صاحب کی موت کا پلان ترتیب پا چکا تھا، اس نے بڑی محنت سے سیٹھ صاحب کے قتل کے الزام میں مجھے پھنسا دیا، دنیا کی ہوس میرے اندر بھی تھی اور اسی ہوس نے مجھے ہیرے چرانے پر مجبور کر دیا لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں اس طرح قتل کے الزام میں پھنس جاؤں گا میرے کئی بار بلانے پر ایک دفعہ اعجاز میرے پاس جیل میں ملنے آیا اور اس نے مجھے اس قتل کی تمام وجہ بتائی، لیکن ظاہر ہے میرے پاس اس کے اس اقرار جرم کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ میں جیل میں اپنی زندگی کے دن گن رہا تھا، میرے وکیل نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی، لیکن مجھے یقین تھا کہ کوئی فائدہ نہیں ہے مجھے پھانسی ہو کر رہے گی۔ پھر ایک دن صبح میرا وکیل میرے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ اعجاز نے پولیس کے سامنے پیش ہو کر اقرار جرم کر لیا ہے اور پھر میرے وکیل کی کاوشوں سے میں جیل سے باہر آ گیا اور اب اعجاز کو پھانسی ہو جائے گی، لیکن میری ایک درخواست ہے تم سے۔" جلال نے کہا، عورت کچھ دیر کے لیے اپنا رونا بھول کر اس کی صورت دیکھنے لگی تھی۔ جلال نے پھر کہا۔

"اگر ہو سکے تو تم مجھے اپنا لو۔"

"کک۔۔۔ کیا کیا کہا آپ نے؟"

"جو تم سن رہی ہو وہی کہا، دیکھو ہم دونوں دنیا کی چمک میں اپنی ڈگر سے بھٹک گئے تھے، لیکن اب ہماری زندگی میں کچھ بھی نہیں رہا، نہ اس دنیا میں تمہارا کوئی ہے نہ میرا، میں تمہیں یہ پیشکش کرتا ہوں کہ ہم دونوں مل کر ایک نئی زندگی شروع کر دیں، جس میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں۔ اپنے لیے اس بچے کے لیے، لاؤ اسے مجھے دو۔" جلال نے بچہ اس کی گود سے لے لیا اور اسے پیار کرنے لگا پھر اس نے عورت کی طرف دیکھ کر کہا۔

"چلو اب اندر، یہاں کھڑی کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو، اندر چلو، آج دو بھٹکے ہوئے راہی پہلی مرتبہ ایک ساتھ اپنے گھر میں داخل ہونے لگے ہیں، آؤ اندر آ جاؤ۔"

عورت تھوڑی دیر تک حیران سے انداز میں اسے دیکھنے لگی، پھر اس نے اپنا چھوٹا سا بیگ اٹھایا اور جلال کے ساتھ فلیٹ کے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔

✡ ✡